

# کالی دیوی کا مندر



ایم اے راحت

اسرار و تحیر کے پردے میں لپٹی ہوئی ایک پراسرار داستان

# کالی دیوی کا مندر

ایم اے راحت

القیش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور

فون: 042-37652546 042-3766888

www.alquraish.com E.mail: info@alquraish.com

لا تعداد روحوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہہ سکتا نہ سوچ سکتا ہوں۔ اس دور میں تعلیم کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ یہ شوق بس بڑے بڑے رئیس لوگوں تک محدود تھا اور وہی اپنی ادا اداوں کو تعلیم دلاتے تھے۔ میرے پورے خاندان میں کیا، بلکہ ہماری نسلوں میں کوئی رئیس نہیں تھا۔ لیکن قبلہ سمندر شاہ سینک کٹا کر پتھروں میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اکلوتے لارند یعنی سکندر شاہ کو تعلیم دلائی تھی اور جب ہم یعنی سکندر شاہ دسویں میں پاس ہوئے تھے تو پورے محلے نے کیا، بلکہ آس پاس کے دوسرے محلے والوں نے بھی ہمارے ہاں دعوت اڑائی تھی اور یہ ایک اداکار دعوت تھی جو پیر سمندر شاہ نے اپنے بیٹے کے میٹرک پاس کرنے پر دی تھی۔

البتہ ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ دسویں پاس کرنے میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔ ہم نے تو پہلی کلاس سے لے کر دسویں تک کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھی تھی۔ بس یہ قبلہ والد صاحب کی کرامات تھیں جو ہمیں شروع سے میٹرک تک پاس کراتی رہی تھیں۔ میٹرک کے لئے بھی انہوں نے ہمیں دس گانٹھوں والا گنڈا پڑھ کر دیا تھا اور امتحان دیتے ہوئے ہمیں یوں لگا تھا جیسے ہمارے ہاتھ کسی نے قابو میں کر لئے ہوں اور وہی سب کچھ کر رہے ہوں۔ پھر قبلہ و کعبہ نے ہم سے پوچھا۔

”آگے کیا ارادہ ہے؟“

”شادی کریں گے۔“ ہم نے کہا اور بہت ہی پرانی اور فرسودہ چند گالیاں سننے کو ملیں۔ پھر کہا

میا۔

”شادی کے بچے میں تعلیم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ کالج میں داخلہ لو گے؟“

”لڑکیوں کے کالج میں داخلہ دلا سکتے ہیں؟“ جواب میں انہوں نے پہلے ایک جوتے سے پھر دوسرے جوتے سے ہم پر نشانہ لگایا۔ جسے خالی دیتے کے ہم باہر تھے۔ تیسرا جوتا ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ بے بسی سے بل کھاتے رہ گئے اور ہم باہر نکل آئے۔ اس طرح آگے کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا، لیکن والد صاحب ہمارا مستقبل بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں بھی گنڈے تعویذ کا علم سکھانا

شروع کر دیا۔ جس سے ہمیں کوئی رغبت نہیں تھی۔ پہلے سبق کے طور پر انہوں نے کہا۔  
 ”کالا علم ارواح خبیثہ کا علم ہوتا ہے۔ کالے جادو کے علم کے ارکان بیرونی، دیر، بھیروں، پھر مکمل  
 بیری یعنی چڑیل، پھر لوٹا چماری، اس کے بعد پدا پھر شکھا تک ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تمہیں سفلی علم  
 کی کاٹ سیکھنا ہوگی۔ اس کے لئے ان ارواح سے رابطہ کرنا ہوگا۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ ان سے  
 رابطہ کس طرح کیا جائے گا؟

”ہم کچھ عرض کریں۔“ ہم نے کہا۔

”ہاں بولو۔“

”ہمیں ان میں صرف دو نام دلکش لگے ہیں۔“

”کون سے.....؟“

”وہ چڑیل یا پھر لوٹا چماری۔ سنا ہے دونوں خلیصورت ہوتی ہیں، بس پاؤں کا رخ بدلا ہوتا  
 ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

اس جواب کا نتیجہ ہمیں معلوم تھا۔ چنانچہ فوراً فرار ہو گئے۔ بہر حال والد صاحب نے ہمیں  
 پراسرار علم سکھانے کی بہت کوشش کی، مگر جب بھی وہ ہمیں کوئی وظیفہ پڑھانے کی کوشش کرتے اور  
 ہمیں کسی ویرانے میں بھیج دیتے، ہم اطمینان سے کیا مل گیا بھگوان مرے دل کو دکھا کر، ارمانوں کی  
 مگرمی میں مری آگ لگا کے جیسے گانے سنا کرتے تھے یا پھر آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کئے، کچھ بھی نہ  
 زباں سے کام لیا، وغیرہ.....

البتہ ایک انوکھا تجربہ ضرور ہوا تھا۔ پتہ نہیں وہ ارواح خبیثہ ہوا کرتی تھیں یا ارواح ریشہ فلفلی  
 گانوں کی شوقین ضرور ہوتی تھیں، کیونکہ جب بھی ہم یہ گانے لگاتے تھے ہمیں اپنے ارد گرد سر اٹھیں  
 سنائی دیتیں۔ ایک آدھ آدھ یا واہ کی آواز بھی کبھی سنائی دے جاتی۔ اس طرح اچھی خاصی کہنی مل جاتی  
 تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وظیفے کے نام کی کوئی چیز تو ہم نے کبھی نہیں کی، لیکن ان ویرانوں کے باسیوں  
 سے اچھی خاصی یاری ہو گئی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ کسی کو ہم سے کوئی اختلاف نہیں تھا، بلکہ وہ سب  
 ہمارے دوست بن گئے تھے۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی فوراً پوری کر دی جاتی۔ کہیں کوئی خطرہ  
 ہوتا ہماری مدد کی جاتی۔ مثلاً ایک بار ایک قبرستان میں بیٹھے فلم ”ناگن“ کا وہ گانا سن رہے تھے۔ ”من  
 ڈولے مرا تن ڈولے میرے دل کا گیا قرار کون بجائے بانسریا۔“ ڈائریکٹر کوئی پونے دو تھا، کیونکہ  
 بین کو اس نے بانسریا میں بدل دیا تھا۔ بہر حال بین بچ رہی تھی کہ کہیں سے ایک شوقین سانپ نکل آیا  
 اور لگا ہمارے سامنے پھن اٹھا کر جھومنے۔ جان تو نکلتی ہی تھی اس خوفناک کوڑیا لے کو دیکھ کر۔ بین کی

آواز ختم ہوئی تو سانپ ناراض ہو گیا اور سر کا ہماری طرف، لیکن اسی وقت کہیں سے ایک اینٹ آئی اور  
 سانپ کے کھلے چمن پر لگی یہ صاف محسوس ہوا کہ کچھ ناویدہ ہاتھوں نے سانپ کو کچل کر پھینک دیا۔ یا  
 پھر ایک بار ہم نے بادل کا ایک گانا ”میں راہی بدلنے والا ہوں، کوئی کیا جانے متوالا ہوں۔“ بچ رہا  
 تھا کہ میوزک میں سیٹیوں کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ ہم چونک پڑے۔ لگا جیسے ریکارڈ میں کچھ خرابی ہو  
 گئی ہو، لیکن سیٹیوں کی آوازیں ریکارڈ سے نہیں سنائی دی تھیں، بلکہ کچھ پولیس والے بیٹیاں بجاتے  
 ہوئے ادھر ہی دوڑے چلے آ رہے تھے، لیکن وہ دوسرے نمبر پر تھے۔ پہلے نمبر پر وہ چور تھا جس کے  
 ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی اور وہ اسے بغل میں دبائے بھاگ رہا تھا۔ شاید اس کی نگاہ ہم پر پڑ گئی اور اس  
 نے اس گٹھڑی سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے گٹھڑی ہمارے اوپر پھینکی اور قبروں کو پھلانگتا  
 ہوا دوڑتا چلا گیا۔ پھر تین پولیس والے جو بڑی باقاعدگی سے میوزک کے سٹائل میں بیٹیاں بجا رہے  
 تھے۔ گڈ گڈ کر کے دوڑتے ہوئے ہم سے کوئی اڑھائی فٹ کے فاصلے سے گزرے، لیکن کسی نے بھی  
 ہمیں نہیں دیکھا اور چور کے پیچھے قبریں پھلانگتے ہوئے دوڑتے چلے گئے۔

ہم حیرت سے ہکا بکا ”راہیں بدلنے والا سنتے رہے۔“ ریکارڈ ختم ہو گیا اور پولیس والے بھی  
 لٹکے ہوں سے اوجھل ہو گئے۔ جب ہمیں ہوش آیا اور ہم نے حیرت سے سوچا کہ آخر ان پولیس والوں  
 نے ہمیں کیوں نہیں دیکھا۔ ویسے یہ بھی سوچا تھا ہم نے کہ اگر وہ ہمیں دیکھ لیتے تو بڑے آرام سے  
 رنگے ہاتھوں پکڑ لیتے۔ بھلا انہیں کیا معلوم کہ ہم چور ہیں یا نہیں۔ گٹھڑی تو ہمارے پاس سے ہی  
 برآمد ہوتی اور وہ یہ ہی سمجھتے کہ ہم انہیں بیوقوف بنانے کیلئے اس طرح بیٹھ گئے ہیں۔

لیکن انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ بعد میں ہم نے گٹھڑی کو دیکھا۔ اس میں خاصا مال بندھا ہوا  
 تھا۔ بہت سے نوٹ، کچھ سونے کے زیورات، ہماری تو گویا لاشی نکل آئی۔ اب ظاہر ہے ہم یہ نوٹ  
 اور زیورات لے کر ان کے مالک کا پتہ چلانے کی کوشش کہاں سے کرتے۔ چنانچہ گٹھڑی بغل میں دبا  
 کر خاموشی سے گھر واپس آ گئے۔ بعد میں ہم نے اس دولت کی مالیت کا اندازہ لگایا تو ہمیں پتہ لگا کہ  
 ہم تو اچھے خاصے رئیس بن گئے ہیں۔ بعد تک میں یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ مال کس کا تھا؟ لیکن اب تو ہمارا  
 تھا اور ہم اس کے بارے میں بہت سے منصوبے بنانے لگے تھے۔

پھر گریڈ ہو گئی والد صاحب کے بارے میں تو ہمیں پہلے بھی یہ ہی شبہ تھا کہ ڈنڈا بھر ہیں یعنی  
 بس بھر بنے ہوئے ہیں اور اللہ نے عزت رکھی ہوئی ہے ورنہ جانتے جوتے کچھ نہیں ہیں۔ ایسے ہی  
 تھوڑی سی شدد ہے جس سے کام چلا رہے ہیں۔ دس میں سے دو کو فائدہ ہو ہی جاتا ہوگا۔ جس کو  
 فائدہ ہو جائے وہی عقیدت مند۔ تو ہوا یوں کہ کوئی انہیں جن اتروانے لے گیا، جن کوئی بگڑا ہوا رئیس



تھا۔ والد صاحب کو دیکھ کر بگڑ گیا اور سب سے پہلے تو وہیں اٹھا کر زور دار بخنی ایسی دی کہ ریڑھ کی ہڈی کے دھمکے ٹوٹ گئے اور اس کے بعد بات نہیں تک نہ رہی۔ پورے گھر میں آگ لگا دی۔ ایک ایک چیز جل کر خاکستر ہو گئی۔ یہاں تک کہ والدہ محترمہ بھی۔ ادھر ہم چونکہ والد صاحب کے پاس ہسپتال میں تھے اس لئے بچ گئے، لیکن والد صاحب کو انہوں نے نہیں چھوڑا ہسپتال ہی میں بری طرح مار لگائی اور والد صاحب ہسپتال ہی میں فوت ہو گئے، لیکن ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ وہاں پر بھی ہمیں ہماری دوست روحوں نے بچا لیا تھا۔ ورنہ جن صاحب تو ایسے بگڑے تھے کہ اگر ہماری نسل میں بھی کچھ اور افراد ہوتے تو انہیں بھی ٹھکانے لگا دیتے۔ غرض یہ کہ اب بے گھر اور بے بار ہو گئے تھے اور بقول شخصے چوڑی بھول گئے تھے۔

ماں باپ کی موت معمولی نہیں تھی۔ کافی عرصے تک جانے کیسے کیسے پریشان ہوتے رہے۔ وہ مال جو چور صاحب چھوڑ گئے تھے ہم نے گھر میں نہیں رکھا تھا بلکہ اسے ایک محفوظ جگہ چھپا دیا تھا۔ جب ہوش و ہواس قائم ہوئے تو ہم نے سوچا کہ اب تھا تو وہ گئے ہیں نئی زندگی کا آغاز کیا جائے۔ شکل و صورت شاید ہماری بہت اچھی تھی، جسامت بھی ٹھیک تھا، میٹرک بھی پاس کر لیا تھا۔ چنانچہ اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مشورہ دینے والا تو کوئی تھا نہیں، جہاں تک ہماری عقل کام کرتی تھی اپنی دوست روحوں کے بارے میں تو ظاہر ہے ہم نے کسی کو دیکھا نہیں تھا۔ صرف مفروضات تھے جن پر بھروسہ کر لیا تھا اور بعض اوقات بھروسہ انوکھے کام سرانجام دیتا ہے۔

ہم نے بہر حال اپنے اس ساز و سامان کو یعنی مال کو بڑی احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا اور اس میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر خرچ کرنے لگے۔ بس دل میں کوئی امنگ، کوئی احساس نہیں تھا۔ وقت گزاری ہو رہی تھی۔ حسن پرستی ہماری فطرت کا ایک حصہ تھی اور جہاں بھی کہیں حسینہ نازک اندام کو دیکھا دھڑام سے پھسل گئے۔ ایک ہی شوق تھا ہمارا اور وہ تھا حسین چہرے، لیکن بات کنٹرول میں تھی۔ آنکھوں کی حد تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ اس سے آگے بڑھنے کی نہ تو ہمت تھی اور نہ ہی بات ہے کہ خواہش۔ اصل میں قدرت کی نشانی کے قائل تھے۔ پھول ڈالیوں پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ ان کا حسن قائم رہتا ہے۔

دیکھو اور نگاہوں کو سیراب کرلو۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کی مسکراہٹ مل جائے تو سمجھو منافع ہو گیا۔ بس یہ ہی فطرت کا حصہ تھا اور ہم مسلسل اپنی اسی فطرت کے سہارے جی رہے تھے۔ وقت بڑے بڑے رخم بھر دیتا ہے۔ ماں باپ کی یاد تو خیر دل سے کبھی نہیں نکل سکتی، لیکن مبرا آ گیا تھا۔ زندگی کے بارے میں سوچا کہ بلا وجہ اپنے آپ کو زندگی کے اس صندوق میں بند نہ کیا جائے۔ جس میں تالا

لگتا ہے تو پھر کبھی نہیں کھلتا۔ یعنی شادی اور اس کے بعد بچے پھر ساری زندگی کا رونا پیٹنا۔ آخر ضرورت کیا ہے؟ دنیا بلا وجہ تو اتنی وسیع نہیں ہے۔ اس دنیا کو کیوں نہ دیکھا جائے۔ چنانچہ جناب ایک فیصلہ کر لیا اور اس کے بعد وارہ گردی کرنے لگے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں، کبھی کہیں، کبھی کہیں۔ اپنی ہمتی اپنا علاقہ تو چھوٹ گیا تھا۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا، جس کیلئے اپنے آپ کو محدود کرتے۔ بس دنیا دیکھنے کا شوق تھا البتہ ایک بات فطرت کا حصہ بن چکی تھی اور وہ تھی پراسرار علوم سے دلچسپی۔ چونکہ خیر میں انہی علوم سے کمائی ہوئی دولت کا خون دوڑ رہا تھا۔ باپ کی طرف سے ان علوم میں دلچسپی ورثے میں ملی تھی۔

اب یہ الگ بات ہے کہ پیارے ابا جان! انہی پراسرار علوم کا شکار ہو گئے تھے۔ ہم تو یہ ہی سوچتے ہیں کہ انہیں آتا جاتا کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر جن پہلے کبھی اتارا بھی ہوگا تو جن ہی شریف ہوگا جو ان کی صورت دیکھ کر علاقہ چھوڑ کر چلا گیا ہوگا، ورنہ ان کے اندر کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کہ جن ان سے ڈر جاتا۔ اب انہوں نے سب دھام ستائیں سیر سمجھ لئے تھے۔ چنانچہ غلط جن سے لکرا گئے تھے۔ خیر ان کی بات پرانی ہو گئی۔ ہم اپنی بات کرتے ہیں۔ گھومتے پھرتے رہے اور پھر کالی کے دیس آ گئے۔ یعنی کلکتہ کالی کے بارے میں سنا تھا کہ کالی کال کو ڈھائے دشمن کا کلیجہ کاٹ کر لائے تب ہی کالی کہلائے۔ یہ مقولہ کہیں سے کالوں میں پہنچ چکا تھا لیکن باقی تفصیل کیا تھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

بہر حال کلکتہ پہنچ گیا۔ ویسے تو دہلی آ کر ہزاروں اور ایسی بہت سی جگہوں کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہاں کی زندگی بے حد پراسرار ہے لیکن کالی کے بارے میں ذرا سی دلچسپی تھی اور میں اسی چکر میں کلکتہ پہنچ گیا تھا۔ وہ جون کی ایک گرم صبح تھی جب میں کلکتہ کے اسٹیشن پر اترا تھا۔ ابھی زیادہ دور نہیں چلا تھا کہ اچانک ہی میں نے ایک حسینہ کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے محسوس کیا۔ گہری آنکھوں کی رنگت، تھکے نقوش، شربی آنکھیں۔ اس کی شخصیت میں ایسی سحر انگیز کشش تھی کہ انسان خود بخود اس کی طرف کھینچا چلا جائے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو میرے ہونٹوں پر بھی خود بخود مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیسے ہیں آپ.....؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”میرا نام کالی ہے۔“ اس نے کہا اور میں اچھل پڑا۔ کالی کے دیس میں آیا تھا اور کالی فوراً میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ تو وہ مسکرا کر بولی۔

”ہاں صورت شکل اتنی کالی بھی نہیں ہے، لیکن کالی ہمارے لئے ایک مقدس نام ہے۔ میرے

ماں باپ نے میرا نام بھی رکھا ہے۔ آپ شاید کچھ اور سمجھ رہے ہیں۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ میں اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔ یہ بات تو آپ لوگ بھی جانتے ہوں گے کہ کالی ہندوؤں کی وہ دیوی ہے جسے موت اور بربادی کے ساتھ ساتھ ہی مانتا کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ایک لمحے کو چونکنے کے بعد میں نے فوراً ہی اپنے دل سے سارے خیالات نکال دیئے تھے۔ میری سوچ تو اس کے توبہ شکن حسن تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“ اس نے کہا۔

”بس آپ نے جس انداز میں مجھ سے ملاقات کی ہے میں تو اسی پر دنگ رہ گیا ہوں۔“

”نہیں..... حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا ذریعہ معاش ہے۔“ وہ بولی تو میں پھر

چونک پڑا۔

”مم..... میں سمجھا نہیں۔“

”کلکتہ وہ مقدس مقام ہے جہاں دیویوں دیوتاؤں کا بہت بڑا استھان ہے اور یہاں آنے والوں کیلئے ایسی ایسی دلچسپ اور دلکش جگہیں موجود ہیں جنہیں دیکھ کر آتما خوش ہو جائے۔ میں آنے والے مہمانوں کو یہاں کی سیر کراتی ہوں اور انسان جو بھی کام کرتا ہے۔ اس کے بارے میں اس کا تجربہ کافی ہو جاتا ہے۔ اس بات کا مجھے فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کلکتہ میں اجنبی ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کو کلکتہ کی سیر کراتی جائے۔ معاوضہ بہت کم آپ یوں سمجھ لیجئے کہ نہ ہونے کے برابر اور کلکتہ کی سیر ہی نہیں بلکہ کلکتہ کے بارے میں اتنا کچھ بتاؤں گی آپ کو کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔“

”میں تو آپ کو دیکھ کر ہی خوش ہو گیا ہوں۔“ مس کالی اور وہ مسکرا دی۔ درحقیقت اس وقت بنگال کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں اس کے حسن کا شکار ہو گیا تھا۔ نارنجی رنگ کی ساڑھی کمر سے نیچے تک جمولتے ہوئے سیاہ بال موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت اور شرقی آنکھیں۔ جن میں عجیب سا نشہ تھا۔ عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال ہوگی۔ اس کی جوانی کے غماز اور حسن کے سحر نے ہی مجھے مغلوب کر ڈالا تھا اور میں اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکا تھا۔

”تا نگہ منکواؤں۔“ اس نے کہا اور میں نے بے خیالی کے انداز میں گردن جھکا دی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سڑکوں پر انسانی رکشے سائیکل رکشے اور گھوڑے والے تانگے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ اس نے ایک تانگا روکا اور اس سے بات کرنے لگی۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں سب کچھ

ہول کرتا ننگے میں بیٹھ گیا۔

”اور یہ ایک سچ ہے۔“ وہ ایک دلغریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”اگر آپ کلکتہ کے قابل اہم مقامات دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھ سے بہتر گائیڈ آپ کو اور کوئی نہیں مل سکتا۔“

”آپ سے بہتر واقعی کوئی نہیں مل سکتا۔“ میں نے کہا۔ تانگے میں بیٹھتے ہی اس نے ان مقامات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا جنہیں کوئی بھی سیاح دیکھنے کی خواہش کر سکتا تھا۔ اس کا لہجہ لہایت شیریں اور انداز گفتگو مسکور کن تھا۔ وہ ان مقامات کے بارے میں مجھے تفصیل بتا رہی تھی۔

پھر اس نے میری شکل دیکھی اور آہستہ سے ہنس پڑی۔ ہنسی کیا تھی میری زندگی میں ایک طوفان تھا۔ جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح بے تکلف ہو گئی جیسے ہماری برسوں کی شناسائی رہی ہو۔

”اب بتائیے آپ مجھے کہ کیا دکھا رہی ہیں؟“

”پہلے یہ بتائیے کہ آپ قیام کہاں کریں گے؟“

”اس کا بندوبست بھی آپ ہی کو کرنا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور وہ ہنس پڑی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہر بات پر ہنستی ہو۔ یا پھر اسے یہ احساس ہو کہ اس کی ہنسی بہت ہی خوبصورت ہے اور کوئی بھی اس ہنسی کا دیوانہ ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے کہا۔

”چلئے ٹھیک ہے اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اب آپ یہ بتائیے کہ ہم سب سے پہلے کون سی جگہ دیکھیں گے؟“

”کلکتہ آنے والا ہر شخص سب سے پہلے کالی دیوی کا مندر ہی دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ کلکتہ کی سب سے بڑی روایت یہ ہی رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے میں بھی یہ ہی چاہتی تھی۔ ویسے بھی وہ مندر دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ ہی اچھی بات تھی کہ اس نے مجھ سے میرے مذہب کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ بہر حال مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ بھی یہ ہی چاہتی ہو کہ میں کالی کا مندر سب سے پہلے دیکھوں۔ جب میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تو کالی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔

”مندرو دنیا کے عجوبوں میں سے ہے۔“

”ایسا نہ کہیں عجوبہ ایک الگ چیز ہوتی ہے۔ وہ تو دیوی کا چسکار ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کالی کے مندر پر اب بھی خون کی سمینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ پہلے یہ خون انسانی ہوا کرتا تھا اور اب اس دور میں اسے جانوروں کے خون میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ میں نے زندگی میں میٹیوں جانور ذبح

ان سڑاھٹ تھی، لیکن اسے دیکھ کر بھکاریوں کا اس طرح ڈر جانا میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ مندر میں اور لوگ بھی موجود تھے اور ان کا انداز عقیدت مندانہ تھا۔ مگر کالی اس طرح گردن اٹھائے چل رہی تھی، جیسے کوئی مہارانی اپنی راجدھانی کی سیر کو نکلی ہو۔ یہ بات میں نے اسی وقت نوٹ کر لی تھی کہ کالی کو دیکھ کر لوگوں کی نظریں جھک جاتی تھیں اور وہ اس کے راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ میں نے اپنے طور پر یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ میں چونکہ بہت اچھے لباس میں ہوں اور لوگ میری شخصیت سے مرعوب ہو رہے ہیں، کیونکہ شکل و صورت اور قد و قامت میں بھی میرا کوئی جواب نہیں تھا۔

مندر کے اندر جتنے بھی لوگ موجود تھے انہوں نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پھول یا بھینٹ چڑھانے کیلئے جو بھی چیز لائے تھے وہ کالی دیوی کے چرنوں میں رکھ کر اٹے قدموں ہی سے واپس پلٹ رہے تھے اور کچھ ہی لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہاں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اور پھر جب میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرا یہ خیال ٹھیک نکلا۔ اس وقت مندر میں، میں اور کالی ہی رہ گئے تھے اور کالی اس دیوی کے سامنے کھڑی ہوئی تھی جس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے جمر جمری سی آگئی تھی۔ اس وقت میں نے پہلی بار کالی کے حوالے سے اپنے اندر ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کی تھی۔ کالی دیوی کا مجسمہ میرے سامنے کھڑا تھا اور میرے خیال میں یہ دنیا کی بسیا تک ترین تخلیق تھی۔ یہ سنہرا مجسمہ چار فٹ اونچا تھا۔ تین آنکھیں، چار ہاتھ، کھلا ہوا منہ اور باہر نکلی ہوئی سرخ زبان۔ اس کے جسم پر دھات کے سانپ لپٹے ہوئے تھے اور وہ ایک لاش پر رقص کر رہی تھی۔ گلے میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا منہ اور سینے پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

اس کے چار ہاتھوں میں سے ایک میں خون آلود تلوار دوسرے میں کٹا ہوا انسانی سر اور دوسرے دو ہاتھ اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ اپنے آپ کو کسی حملے سے بچانا چاہتی ہو۔ یہ ہی وہ کالی تھی جسے 'مات' موت اور تباہی کی علامت کہا جاتا تھا۔ 'مات' موت اور تباہی کے اس مجسمے کو دیکھ کر مجھ پر عجیب سی دہشت طاری ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہوں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے ساتھ موجود لڑکی کی طرف دیکھا، لیکن اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کالی ہلک جھپکے بغیر بڑی خوبیت سے مجسمے کو دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا سے اس کے سارے ناتے ٹوٹ گئے ہوں۔ اس مجسمے کے علاوہ وہ اپنے ارد گرد کی ہر چیز کو یہاں تک کہ مجھے بھی فراموش کر چکی تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ لڑکی بھی کالی دیوی کے جسم کا کوئی حصہ ہی ہے جو اس سے عارضی طور پر الگ ہو گیا تھا۔ وقت ایسا لگتا تھا جیسے اپنی جگہ جم گیا ہو۔

مندر کی فضا بڑی بوجھل سی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر کالی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی خوبیت

ہوتے ہوئے دیکھتے تھے مگر میرے ذہن میں بھینٹ کا تصور کچھ الگ ہی تھا اور میں اپنی آنکھوں سے یہ دلچسپ منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ آخر کار ہم تانگے سے اتر گئے اور پیدل چل پڑے۔ وہ پہلے سے زیادہ سحر انگیز لگ رہی تھی۔ اب اس کا لہجہ بھی بدل گیا تھا اور وہ کسی بے تکلف دوست کی طرح مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ بے شک یہ میری حماقت تھی۔ ہندوستان جیسے ملک میں ایک دلربا صورت کا کسی اجنبی مرد کے ساتھ اس طرح قہقہے لگانا ناقابل اعتراض بات تھی، لیکن اس وقت میں نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ بہت سے لوگوں نے میری طرف دیکھا تھا اور ہونٹ سکڑ کر بار بار نفی میں سر ہلا رہے تھے۔ اس وقت میں کچھ نہیں سمجھ پایا تھا۔

مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب میری قسمت پر رشک کر رہے ہوں۔ میں یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے کالی کے ساتھ جانے سے منع کر رہے ہیں۔ میں اس گلی کا نام بھول گیا ہوں جس میں وہ کالی کا مندر واقع ہے لیکن وہ جگہ ڈھبوزی اسکوائر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ فاصلے طے ہو گئے تھے لیکن اب بھی بار بار راستے رک جاتے تھے۔ کہیں کوئی گائے سامنے آ جاتی تھی، کہیں کوئی ٹھیلہ بھارت میں ویسے تو جہاں جہاں بھی جاؤ زیادہ تر لوگ دھوتی باندھے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہر علاقے کا انداز تقریباً ایک ہی جیسا ہے لیکن کلکتہ میں لوگوں کے دھوتی باندھنے کا انداز بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے ہندو عام طور پر دھوتی کا ایک پلو ہاتھ میں اوپر کو اس طرح اٹھائے رکھتے ہیں جیسے انہوں نے پھولوں کا دستہ تمام رکھا ہو۔

کالی کے مندر کے سامنے بھکاریوں کی پوری فوج نظر آ رہی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی اور بچے بھی۔ یوں تو ہر جگہ کے بھکاری گندے اور کریمہ ہوتے ہیں لیکن کالی کے مندر کے قریب بیٹھے ہوئے بھکاریوں کو دنیا کے غلیظ ترین بھکاری کہا جاسکتا ہے۔ ان کے لباس اور جسموں سے ایسے بو کے جھکے اٹھ رہے تھے کہ متلی سی ہونے لگتی تھی۔ مندر کی عمارت بہت پرانی تھی۔ مگر سامنے کے رخ پر سنہرے اور نقرئی پتھر چمک رہے تھے جو غالباً سونے اور چاندی کے تھے۔ کئی بھکاری ہماری طرف لپکے تو پچی بات یہ ہے کہ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر بہم سا گیا تھا۔ ان میں سے کئی تو بٹے کئے اور خوفناک شکل و صورت کے مالک تھے جنہیں دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ میں ان سے بچنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ تمام بھکاری ایک دم رک گئے۔ مجھے ان کے اس طرح رک جانے پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو کالی عجیب سے انداز میں انہیں گھور رہی تھی اور یقیناً اسے ہی دیکھ کر بھکاری سہم کر پیچھے ہٹے تھے۔ ان کے چہروں پر ہلکے سے خوف کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے ان کی اس کیفیت پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ کالی نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ اس کے ہونٹوں پر تو دہسی

سے مجھے کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تو میں اسے متوجہ کرنے کیلئے ہولے سے کھانسا۔ وہ یوں حرکت میں آئی جیسے یکا یک ہوش میں آگئی ہو۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر کالی کے جسم کی طرف دیکھتے ہوئے ہندی میں کچھ بڑبڑائی جسے میں نہیں سمجھ سکا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھے لے کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”کتنی پیاری ہے یہ؟“ وہ میری طرف دیکھے بغیر پھر بولی۔ انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ ”اور طاقتور بھی۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے غیر ارادی طور پر اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

”آؤ اب میں تمہیں کالی کے گھر دکھانا چاہتی ہوں۔“ اس کے چہرے کے تاثرات وہی تھے جو میں مجسمے کے سامنے دیکھ چکا تھا۔ مندر کے ہال سے نکل کر وہ ایک طرف چل پڑی۔ ایک بار پھر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے بھول گئی ہو، لیکن میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ کالی یقیناً ہر روز یہاں آتی ہوگی۔ کالی دیوی کی بحیثیت کا منظر میں محض تجسس کی بنا پر دیکھنا چاہتا تھا۔ میری اس خواہش میں کوئی اور جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ مندر کے احاطے میں جہاں کالی مجھے لے گئی تھی۔ لوگوں کا ایک مجمع سا لگا ہوا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو بحیثیت چڑھانے آئے تھے۔ لکڑی کی تقریباً دو فٹ اونچی چوکی تھی جس کے سامنے جلاد کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اگرچہ اپن باندھ رکھا تھا۔ مگر لباس خون سے تر تھا۔ چہرے پر بھی خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں چوڑے پھل کا تینڈ تھا۔ یہاں بکریوں کی بحیثیت دی جا رہی تھی۔ بکری کے چہرے باندھ کر اسے منڈھی پر اس طرح لٹا دیا جاتا تھا کہ اس کا سر منڈھی کے ایک طرف لٹک جاتا تھا۔ بحیثیت چڑھانے والے اشوک پڑھتے رہتے۔ جلاد کا نتیجہ حرکت میں آتا اور بکری کا سر کٹ کر دور جا گرتا۔ جلاد بکری کے سر کو اٹھا کر اس سے ٹپکنے والا خون پیتل کی چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں جمع کر کے بحیثیت چڑھانے والوں کے سامنے پیش کر دیتا۔ وہ اپنی انگلیوں کو اس خون میں لپیٹ کر اپنی پیشانیوں پر نشان لگا لیتے اور بکری کا گوشت لے کر رخصت ہو جاتے۔ جس جگہ یہ بحیثیت دی جا رہی تھی وہاں عجیب سا قہقہہ پھیلا ہوا تھا۔ مکھیوں کی بھرمار کے ساتھ ہی لائقہ ادا کتے بھی موجود تھے جو بار بار جھپٹ رہے تھے۔

میں نے اکثر بکریوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ خاص طور پر بکرا عید کے موقع پر جو میرے والد صاحب خود قربانی کیا کرتے تھے، لیکن میں نے اتنی سنسنی کبھی محسوس نہیں کی جو بحیثیت کے اس منظر کو دیکھ کر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کالی کی طرف دیکھا۔ اس کی کیفیت مجھ سے کہیں مختلف

تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک مرتبہ پھر بدل گئے تھے۔ وہ اس طرح ذبح ہوتے ہوئے ادا کو دیکھ رہی تھی جیسے یہ بحیثیت اسی کے سامنے پیش کی جا رہی ہو۔ وہاں سے ہٹنے کے لئے ایک بار مجھے ہی پھل کرنا پڑی۔

میں نے کالی کو متوجہ کیا تو اس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پوچھل سے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی۔ مندر کی حدود سے نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے کالی خاموش تھی۔ میں نے کن آنکھوں سے اسے دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خواب میں چل رہی ہو۔ ہم لوگ کالی دور تک پیدل چلتے رہے۔ پھر اچانک ہی کالی میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

”بحیثیت کا یہ منظر دیکھ کر شاید تم ڈر گئے تھے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”سچ بول رہے ہو؟“

”نہیں..... لیکن ایک سنسنی کی عجیب سی کیفیت ضرور محسوس کی تھی میں نے۔“

”اکثر باہر سے آنے والے جب یہ منظر دیکھتے ہیں تو دہشت سے کانپ اٹھتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے کالی کی ہونٹوں پر پھر ایک دم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لیکن میرے لئے بحیثیت کا یہ منظر زیادہ دہشت ناک ثابت نہیں ہوا، کیونکہ میں نے اکثر بکروں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

کالی نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور میرے جسم میں سنسنی کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی۔

پھر اس نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ”بہت وقت گزر گیا..... بہت وقت گزر گیا۔ کالی کے سامنے جانوروں کی جگہ انسانوں کی بحیثیت چڑھائی جاتی تھی، لیکن اب..... اب..... اب..... اس کے لہجے میں ایک غراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ جیسے اسے اس بات کا سخت افسوس ہو کہ اب کالی کے سامنے انسانی بحیثیت نہیں دی جاتی۔ میں نے صرف گردن ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری طرف سے کچھ بولے جانے کی منتظر تھی۔ لیکن مجھے خاموش پا کر اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی۔ ایک ایسی چمک جیسے کسی شکار کو دیکھ کر شکاری کی آنکھوں میں ابھر آتی ہے۔

”مجھے خوشی ہے کہ اس صورتحال نے تمہیں زیادہ خوفزدہ نہیں کیا۔ کیوں..... میں سچ کہہ رہی ہوں.....؟“ اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ لیکن میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔ اس



میں اپنے ماضی پر غور کرنے لگا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ قصور میرے والد صاحب قہلہ کا تھا۔ وہ اگلے سیدھے چلے وٹیفے کرتے رہتے تھے اور انہوں نے نجانے کون کون سی اموں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا اور پھر یہ روٹیں مجھے درٹے میں مل گئی تھیں اور میں انہیں بھگت رہا تھا۔ ہر حال اس وقت تو کالی کا معاملہ تھا اور وہ پردے کے پیچھے غائب ہو گئی تھی اور اس کی واپسی میں دو ہفتہ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے ہیتل کا ایک کٹورہ میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں گاڑھے مک کا نیم گرم سیال بھرا ہوا تھا۔ ایک بار پھر مجھے بکری کے کسی بچے کے میانے کی آواز سنائی دی۔ ہر ایہ اندازہ تھا کہ بکری کا یہ بچہ کسی پڑوس کے گھر میں بندھا ہوا ہے مگر نجانے کیوں اس کی آواز سن کر میرے جسم میں بار بار سنسنی کی لہریں دوڑ جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کالی کے مندر میں بھینٹ کا طہر بھی میری آنکھوں میں گھوم جاتا تھا۔

”لو پی لو.....“ کالی نے کٹورہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

”اور تم.....“ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”میں بعد میں پی لوں گی۔“ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیل گئی۔

”یہ ہے کیا.....؟“ میں نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پی لو..... یہ تمہارے لئے ہے۔“ کالی نے مختصر سا جواب دیا اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے بمشکل چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کٹورہ نیچے رکھ دیا۔ کالی میری طرف سرک ائی۔ میں اپنے آپ میں ایک بار پھر سنسنی کی سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ اس کے بدن کا گرم لمس میرے ہوش و ہواس چھینے لے رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سوا اس کائنات میں کوئی چیز اتنی نہ رہی ہو۔ اس نے کٹورہ اٹھا کر کہا۔

”یہ سب پی لو۔“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ پھر وہ بولی۔ ”جلدی سے پی۔ پھر میں تمہیں کسی سے ملواؤں گی۔ تمہیں اس سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔“

میں وہ بدذائقہ مشروب نہیں پینا چاہتا تھا، لیکن کالی نے کٹورہ اٹھا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں بادل خواستہ وہ مشروب حلق سے اتارنے لگا۔

نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی کا خون پی رہا ہوں لیکن وہ مشروب پیتے ہی میرے سم پر ہلکی سی کھپکی طاری ہو گئی۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے میں ہوا میں اڑا جا رہا ہوں۔ میں نے کالی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے پہلے سے زیادہ حسین لگنے لگی تھی۔ میں نے جیسے ہی خالی کٹورہ نیچے رکھا وہ

کے بعد ہم دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر اس نے ایک تانگے کو روکا اور مجھے اس میں سوار ہونے کا اشارہ کر کے خود بھی تانگے میں بیٹھ گئی۔

”اب تمہارے لئے رہائش کا بندوبست بھی کرنا ہے کیوں.....؟“

”تم گائیڈ ہو میری۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔“ میں نے کہا اور وہ پھر ایک بار ہنس پڑی۔ کجنت کی ہنسی اس قدر حسین تھی کہ انسان سب کچھ بھول جائے۔ تانگہ اسی طرح سفر کرتا رہا اور پھر ایک انہائی گھٹیا اور پسماندہ ترین علاقے میں جا کر رک گیا۔

”اترو۔“ اس نے کہا اور میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ تنگ و تاریک گلیاں جن کے بیچ میں بہتی ہوئی گندے پانی کی نالی اور نالی کا گندہ پانی جو گلی میں پھیل رہا تھا۔ جگہ جگہ غلاعت کے ڈھیر، ہم جس گلی میں داخل ہوئے تھے وہ اس قدر تنگ تھی کہ سامنے سے آتی ایک گائے کو دیکھ کر ہمیں گلی سے واپس باہر آنا پڑا۔ گائے بڑے اطمینان سے ٹہکتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی گلی سے باہر نکلی ہم اندر داخل ہو گئے۔ اس طرح کی دو تین گلیاں عبور کرنے کے بعد کالی ایک جگہ رک گئی۔ سامنے راستہ بند تھا۔ گلی کے اس اختتامی حصے کو ککڑی کے تختوں سے گھیر کر رہائشی مقاصد کیلئے استعمال میں لایا جا رہا تھا۔ تختے بھی بے ترتیبی سے جڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے سامنے پردے کے طور پر پھٹا ہوا ناٹ لٹکا ہوا تھا۔ دروازہ زیادہ بلند نہیں تھا۔ مجھے جب تک کہ اندر داخل ہونا پڑا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ کالی کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے واقعی کسی بکری کے میانے کی آواز سنئی تھی یا وہ میرا وہم تھا۔ یہ جگہ کینوں کی عسرت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ کمرے میں کوئی ککڑی یا روشندان نہیں تھا۔ بان کی ایک جھلکا سی چار پائی ایک پرانا سا صوفہ جس کے نیچے ایک پائے کی جگہ اینٹیں رکھی ہوئی تھیں، دو تین پرانی کرسیاں، ایک میز، ایک ڈریسنگ ٹیبل، جس کا آدھا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میز پر مٹی کے تیل کا ایک لیپ جسے کالی نے اندر داخل ہوتے ہی جلادیا تھا۔ کمرہ ایک بھاری اور میلے کپیلے پردے کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ اس پردے کے دوسری طرف کیا ہے۔

”بیٹھو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے لئے کچھ لے کر آتی ہوں۔“ اور پھر وہ پردے کے پیچھے غائب ہو گئی اور میں عجیب سے انداز میں سوچنے لگا کہ حسن و جمال کی اس صورت نے تو میرا تپا ناچ کر کے رکھ دیا ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے.....؟

ساڑھی سنہالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پردے کی طرف جاتی ہوئی بولی۔

”تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں ایک منٹ میں۔“ وہ پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ میرے لئے وقت کا احساس مٹ چکا تھا۔ مجھے قطعی احساس نہیں ہوا تھا کہ ایک منٹ گزرا تھا کہ ایک گھنٹہ اس دوران میں عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ جیسے میرے اندر کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہو۔ پھر مجھ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کمرہ اور اس میں موجود ہر چیز کی اصلیت بدل گئی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں بے پناہ قوت آ گئی ہو۔ میں اپنے آپ کو کوئی ایسا دیوتا محسوس کرنے لگا جو سب کچھ کر سکتا تھا جس کے اختیار میں ہر چیز ہو اور اس کے ساتھ ہی مجھے عجیب سی بو یا خوشبو کا احساس ہونے لگا۔ یہ بہت سی ملی جلی خوشبوئیں تھیں جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ صرف ایک بو ایسی تھی جس کی شناخت میرے ذہن میں باقی رہ گئی۔ یہ ہی بو میں نے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کالی کے مندر میں اس وقت محسوس کی تھی جب بکریوں کی بھیٹ دی جا رہی تھی۔

اچانک ہی مجھے محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی بکری موجود ہو۔ کمرے میں کسی بکری کے خیال سے میں نے صرف ایک لمحے کی بے چینی محسوس کی۔ اس کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے بکری میری خواہش پر ہی یہاں لائی گئی ہو۔ میں اس وقت اپنے آپ کو کوئی دیوتا تصور کر رہا تھا جو بکری کی بھیٹ طلب کر رہا ہے۔ میں عجیب سی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ہر چیز ٹھیک تھی۔ مجھے کہیں بھی کسی گڑبڑ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ دفعتاً پردے کو حرکت ہوئی اور وہ سامنے آ گئی۔ لیکن اب اس کی ہیئت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ وہ کالی نہیں کالی دیوی تھی جس نے بکری کے ایک بچے کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے بکری کا بچہ میرے حوالے کر دیا اور خنجر نما ایک چاقو بھی جب اس نے بتایا کہ میں اس کے سامنے بکری کے اس بچے کی بھیٹ دوں گا تو مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میں ایک دیوتا تھا جسے خون پسند تھا۔ میں نے کالی ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے دیوی کا روپ دھارنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر کالی کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن ایسا نہ کر سکا۔ وہ میرے سامنے موجود تھی اور میں اسے دیکھنے پر مجبور تھا۔ اس نے دو اضافی بازو اپنے کندھوں پر جوڑ لیے تھے۔ نجانے کس طرح، لیکن اب وہ دو کی جگہ چار ہاتھوں کی مالک بن گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر ایک تیسری آنکھ بھی تھی جو غالباً ششے کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔

بازوؤں پر دھات کے سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے کانوں میں انسانی ہڈیوں کے بندے اور گلے میں مالا بھی انسانی ہڈیوں ہی کی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں تیز دھار تلوار اور دوسرے ہاتھ

میں ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ دونوں مصنوعی ہاتھ اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی سے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ بکری کا بچہ میرے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے وہ بکری کا نہیں انسان کا بچہ ہو۔ اس کے میانے کی آواز بھی انسانی بچے جیسے ہی تھی۔ وہ میا لکھ رہا تھا بلکہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

میں جو اس وقت اپنے آپ کو ایک دیوتا سمجھ رہا تھا اور ایک دیوتا کی حیثیت سے مجھے اس بچے سے ہمدردی تھی جو دیوی کی بھیٹ چڑھنے والا تھا۔ میری نگاہیں ایک بار پھر کالی کی طرف اٹھ گئیں جو تقریباً ایک فٹ اونچی لکڑی کی چوکی پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات کالی دیوی کے اس مجسمے سے مختلف نہیں تھے جو میں نے کالی کے مندر میں دیکھے تھے۔ اسی وقت کالی کی آواز سنائی دی جو کسی گہرے اندھیرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”میں کالی دیوی ہوں، ماما، جاہی اور موت کی علامت۔ میں اس بچے کی بھیٹ قبول کرتی ہوں جس طرح میں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی بھیٹ قبول کی تھی۔“

وہ آواز میرے دل کی گہرائیوں تک اترتی چلی گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کالی دیوی ہی ہے۔ جس نے روایت کے مطابق کئی سو سال پہلے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھیٹ کر دیا تھا۔ اس کے بعد کالی کے چروں میں انسانی جانوں کی بھیٹ چڑھائی جانے لگی۔ میں نے کالی کی طرف دیکھا اور وہ اوپر کی طرف دیکھ کر زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں اور اس کے ہونٹوں سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔

”اب وقت آ پہنچا ہے اس بچے کی مجھے بھیٹ دو۔“ میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بکری کے بچے کی گردن پر خنجر چلا دیا۔ کالی کی ایک خوفناک چیخ کرے کی محد و دفعا میں گونجی۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میرا لباس خون سے تر ہونے لگا۔ گرم گرم خون میرے ہاتھوں پر بہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے اوپر طاری خواب کی سی وہ کیفیت بھی ختم ہو گئی۔ میرے ذہن کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور میں پوری طرح ہوش میں آ گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے خوف و دہشت سے کانپ اٹھا۔ میرے ایک ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے زمین پر پڑے ہوئے ایک انسانی بچے کو دبا رکھا تھا۔ جس کا جگر کٹا ہوا تھا۔ بچے کی عمر دو سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کا خون فرش پر بہہ رہا تھا۔ میں نے دہشت بھری نگاہوں سے کالی کی طرف دیکھا۔ وہ چوکی پر کھڑی ہوئی پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی۔ لکڑی کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے لوگوں کے شور کی آواز سنائی دینے لگی۔ کالی کے قہقہوں کو بریک لگ گیا۔



عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور کچھ عرصے کیلئے بالکل خاموشی اختیار کی جائے۔ چنانچہ میری کلکتہ سے دہلی منتقلی کا منصوبہ طے پایا اور ایک رات مجھے اس خفیہ مکان سے نکال کر ٹرین میں سوار کرا دیا گیا۔ زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو چکا تھا۔



مجھے جس انداز میں لے جایا گیا تھا۔ وہ بڑا محتاط انداز تھا۔ ایک عام سالباں پہنایا گیا تھا، لیکن عیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی ہوئی تھیں اور ایک کبل سا اڑھا کر ڈبے میں بٹھایا گیا تھا، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس ڈبے میں چار پانچ مسافر ہی سفر کر رہے تھے یا پھر وہ چھ پولیس والے تھے جو میری نگرانی اور حفاظت کیلئے وہاں موجود تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ سب مسلح ہیں اور اگر میں نے راستے میں کوئی گزبزن کرنے کی کوشش کی تو میرا پورا بدن چھلنی کر دیا جائے گا اور یہ ان کی مجبوری ہوگی۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ دہلی کی عدالت میں مقدمہ چلنے کے بعد اگر عدالت نے میری بے گناہی قبول کر لی تو مجھے آزادی بھی مل سکتی ہے۔ اس لئے میں قانون سے تعاون کروں۔

ٹرین کا سفر مناسب رفتار سے جاری تھا اور میرے ذہن میں نجانے کیا کیا سوچیں تھیں۔ میں اپنی ان دوست روجوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، جنہوں نے ہمیشہ میری مدد کی تھی۔ جب بھی میں کسی مشکل کا شکار ہوتا وہ میرے ارد گرد پھیل جاتیں اور میرا تحفظ کرتیں۔ اب نجانے کیوں وہ مجھ سے دور ہو گئی تھیں۔ میں نے انہیں آواز دی۔

”میری نگران روجا! کیا بات ہو گئی تم مجھ سے دور کیوں ہو گئی ہو۔ میں تو بڑی مشکل میں گرفتار ہوں۔“ پر کہیں سے مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ ان کی قربت کا تو مجھے اندازہ تھا۔ جب بھی وہ میرے آس پاس ہوتیں مجھے فوراً احساس ہو جاتا کہ میرے ارد گرد حصار قائم کر لیا گیا ہے، لیکن اب کوئی میرے پاس نہیں تھا، بلکہ پورے کلکتہ میں میں نے کبھی کوئی ایسا احساس نہیں کیا تھا۔ رات کا غالباً تیسرا پہر شروع ہوا تھا۔ جب اچانک ٹرین کی رفتار مدہم ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ رک گئی۔ میں نے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ باہر کوئی روشنی نہیں تھی۔ گویا کوئی اسٹیشن نہیں آیا تھا بلکہ ٹرین ایسے ہی کسی دہانے میں رک گئی تھی، لیکن کپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور دو افراد اندر داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک دبلے پتلے بدن اور چھوٹے قد کا مالک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جس کے جسم پر دھوٹی، ٹکڑا، سر پر گاندھی کیپ ٹوپی لیکن گلے میں بے شمار قیمتی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کی دسوں انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں جھگڑا رہی تھیں۔ خیر اسے دیکھ کر تو کوئی حیرت نہیں ہوئی لیکن جب میری نگاہ دوسرے شخص پر پڑی تو میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔ یہ میں تھا۔ ہاں..... سو فیصدی میں۔ میرے ہی نقش و نگار میرا

اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور چوکی سے اتر کر پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

دروازہ اب زیادہ شدت سے چٹا جا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ پر سن سا بیٹھا ہوا تھا۔ میری نظر دروازے پر لگی ہوئی تھی، جواب توڑا جا رہا تھا۔ دروازہ توڑا گیا اور بس مجھے اتنا یاد ہے کہ بہت سے لوگ چیخے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا، مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہوش میں آیا تو میر پولیس اسٹیشن میں حوالات کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر پھنکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ یہ ان لوگوں کی مار پیٹ اور پولیس کے تشدد کا نتیجہ تھا۔ مجھے ایک ہندو بچے کے قتل کا الزام تھا۔ میں نے اپنی دردناک کہانی پولیس کے اعلیٰ افسران کو سنائی، لیکن کوئی بھی میری اس کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا، کیونکہ وہ جگہ جہاں سے مجھے رکتے ہاتھوں پکڑ گیا تھا۔ بالکل خالی تھی۔ وہاں پولیس کو کوئی ایسے آثار نہیں ملے تھے جیسے کسی اور کی موجودگی بھی وہاں ہو۔ بہر حال یہ ساری ہنگامہ خیزی جاری رہی۔ سب لوگ مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں ایک مسلمان ہوں تو میرے خلاف نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ جدھر بھی نگاہ اٹھا کر دیکھتا غیر ہی غیر نظر آتے۔ اب نجانے ان سارے معاملات کا کیا انجام ہونا تھا، کچھ پتہ نہیں تھا۔ اخبارات کو تو بس کوئی گرم گرم خبر چاہئے۔ اس بارے میں بھی پوری تفصیل سنی گئی اور اخبارات نے انہیں چھاپے بے شمار اخباری نمائندے میرے پاس لاک اپ پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بھی وہی کہانی سنائی تھی۔

لیکن اس کہانی کو بالکل توڑ مروڑ کر لکھا گیا اور صرف یہ کہا گیا کہ ایک مسلمان نے ایک ہندو بچے کا بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ بہر حال اس کے نتائج بھی بڑے سنگین نکلے۔ ہندوؤں میں جوش پھیل گیا اور پھر ایک شام پولیس کے عملے نے مجھے لاک اپ سے نکالا اور سادہ وردی والوں کی تحویل میں دے کر ایک پرائیویٹ گھر میں منتقل کر دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ہندو نوجوانوں نے قاتل پر حملہ کر کے اسے نذر آتش کر دیا۔ وہ میری تلاش میں تھے۔ کئی پولیس والوں کو زخمی کر کے انہوں نے ان سے میرا پتہ پوچھا، لیکن انہیں یہ بتایا گیا کہ میں لاک اپ سے فرار ہو گیا ہوں۔

اخبارات نے پھر گرم گرم سرخیاں چھاپیں اور لکھا کہ آخر کار مسلمانوں نے تعصب کا ثبوت دیتے ہوئے ہندو بچے کے قاتل کو لاک اپ سے فرار کرا دیا اور اسے تلاش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ غرض زبردست ہنگامہ ہو گیا تھا اور بڑی خوزیزی ہونے کا خطرہ تھا، کیونکہ ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے تھے اور مسلمان بھی جوابی کارروائی کیلئے بھرپور طریقے سے تیار ہو گئے تھے۔ انتظامیہ کیلئے بڑی مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ خفیہ اجلاس میں طے پایا کہ مجھ پر دہلی کی کسی

ہی قد و قامت بالکل میرے ہی جیسا لباس۔

میں نے آنکھوں کو زور زور سے بھیج کر کھولا کہ کہیں غنودگی کی کیفیت نے آنکھوں پر اثر تو نہیں ڈالا ہے، لیکن جب بھی میں نے اسے دیکھا مجھے اپنی ہی صورت نظر آئی۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے آئینہ میرے سامنے ہو، لیکن وہ میری شبیہ ہی نہیں تھی بلکہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب پہنچ گئے۔ پھر دھوتی کرتے والے شخص نے کہا۔

”چلو اس کی بیڑیاں اور جھکڑیاں کھولو۔“

”جی شاستری جی!“ میرے ہم شکل نے کہا اور میرے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔ نجانے بیڑیوں کی چابی اس کے پاس کہاں سے آگئی تھی۔ ایک لمبے کے اندر اندر اس نے بیڑیاں کھول دیں۔ تب ہی شاستری نے کہا۔

”جھکڑیاں بھی۔“ اور کچھ دیر کے بعد میں بالکل آزاد ہو گیا تھا، لیکن مجھے حیرانی ان پولیس والوں پر تھی جنہیں چوکس رہنے کیلئے کہا گیا تھا، لیکن پورے کمپارٹمنٹ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پولیس والے اس طرح بالکل بے خبر سو رہے تھے جیسے یہ نیند نہیں بے ہوشی ہو اور حیرانی کی بات ان مسافروں پر بھی تھی جو خود بھی گہری نیند سو رہے تھے۔ تبھی دبلے پتلے آدمی نے مجھ سے کہا۔

”اٹھو..... اور ادھر آ جاؤ۔“ نجانے اس کی آواز میں کیا جادو تھا کہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی وہ شخص میری جگہ بیٹھ گیا، جو میرا ہم شکل تھا اور اس بار شاستری نے خود بیٹھ کر باقی کام کیا تھا۔ یعنی اس کے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈال دی تھیں۔ پھر میرے ہی انداز میں اسے کبل اڑھا دیا گیا اور شاستری نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم ذرا بھی نہیں گھبراؤ گے اور جو ہدایات تمہیں دی گئی ہیں انہی کے مطابق عمل کرو گے۔ تمہیں اس کی جگہ لینی ہے کسی کو ذرا برابر بھی شک نہیں ہونا چاہئے کہ تم یہ نہیں ہو۔ سمجھ رہے ہونا میری بات۔“

”آپ بالکل مطمئن رہیں شاستری جی! آپ کا داس ہوں میں۔“ تب وہ شخص سے شاستری مخاطب کیا جا رہا تھا۔ میری طرف رخ کر کے بولا۔

”ہاں اب تم سنو۔ ابھی کچھ لمحوں کے بعد ٹرین رک جائے گی۔ ہمیں نیچے اترنا ہے۔ ہوشیار ہو جاؤ۔“ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی اور شاستری مطمئن ہو گیا، لیکن یہ سب کیا ہے؟ میرے فرشتوں کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ بس ایک بار دل میں خیال آیا تھا کہ شاید میری محافظ روحوں نے کوئی کارروائی کی ہو۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا اور

ارلی ہاری ان دونوں کی شکلیں دیکھتا رہا۔ میرا ہمشکل تو خیر میرے جیسا ہی تھا، لیکن آنکھیں بڑی ہمار تھیں۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ٹرین کی رفتار کچھ سست ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں تیار ہو گیا اور بالہ دی دیر کے بعد ٹرین رک گئی اور شاستری مجھے اشارہ کر کے آگے بڑھا اور ہوا کی طرح ٹرین سے الگ اتر گیا۔ میں بھی ٹرین سے نیچے کود پڑا تھا۔

بہت دور دور تک اندھیرا تھا، لیکن کافی فاصلے پر کچھ روشنیاں ٹمنماتی نظر آ رہی تھیں۔ ٹرین ایک دم آگے چل پڑی تھی۔ یہ حیرانی کی بات تھی۔ شاستری نے پھر کہا۔

”آؤ.....“ اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ بڑی برق رفتاری سے فاصلہ طے کر رہا تھا اور بہت جگہ مجھے اس کے پیچھے پیچھے دوڑنا پڑ رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کون سی آبادی تھی اور کتنی بڑی تھی، لیکن ہم روشنیوں کے درمیان پہنچ گئے تو شاستری نے ایک سمت کا رخ کیا اور پھر ایک بڑے دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ قرب و جوار میں اندھیرا نہیں تھا، بلکہ آس پاس مدھم روشنیاں جل رہی تھیں۔ شاستری مجھے لئے ہوئے مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ درمیانے درجے کا مکان تھا۔ پانچ چھ کمرے ہوں گے۔ صاف سترا شفاف لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ شاستری ایک کمرے کے پاس پہنچا اور اس کا دروازہ کھول کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ تمہارے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ ذرا بھی پریشان مت ہونا۔ رات کا جتنا بھی وقت باقی ہے آرام کی نیند سو جاؤ اور اگر نیند نہ آئے تو کمرے میں ایک الماری ہے جس میں نیند کی ایک دوا رکھی ہوئی ہے۔ بوتل میں سے تھوڑی سی دوا گلاس میں نکالنا اور پی جانا، سکون کی نیند آئے گی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیتا۔

شاستری مجھے یہ ہدایات دینے کے بعد چلا گیا۔ ایسی کوئی آواز نہیں آئی تھی جس سے یہ پتہ چلے کہ شاستری دروازہ باہر سے بھی بند کر گیا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ میں دروازہ اندر سے بند کر لوں۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اس نے میرے اوپر اعتماد کیا ہے اور یہ نہیں سوچا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ میں نے کمرے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ کافی کشادہ جگہ تھی اور کمرہ اسی صاف سترا تھا۔ ایک طرف بستر پڑا ہوا تھا اور اس پر بڑا نرم اور آرام دہ گدا بھی بچھا ہوا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ صرف شاستری کی ہدایت کے مطابق اندر سے بند کیا اور پھر بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر کے دماغ کو پرسکون کرنے کی کوشش کی، لیکن اندازہ یہ ہوا کہ سکون کا نام و نشان نہیں ہے۔ نیند کا اس عالم میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیا انوکھی کہانی تھی میری۔



کر مجھے دیکھا۔ آہ..... شاید میں پاگل ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا؟ کیونکہ میں نے سلگتا ہوا ایک حسین چہرہ دیکھا۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نہایت ہی دلکش نقوش اس چہرے کا رنگ بڑا عجیب سا تھا۔ تاریخی تاریخی سا۔ کالے کالے گٹھاؤں جیسے ہال بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ان میں غصے اور نفرت کی کیفیت تھی۔ ہونٹ عجیب انداز میں کچھ بدبوائے اور اس کے بعد وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ نجانے کون تھی یہ اور پھر وہی خوشبو کا احساس۔ یہ خوشبو بھی جانی پہچانی تھی۔ ارے سنو تو سہی! آج مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے۔ دیکھو تمہارا دوست مشکوں میں پھنسا ہوا ہے۔ میری محبت کرنے والی روح! تم اس قدر حسین ہو گی! مجھے اس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ روکو تو سہی۔ خدا را روکو تو سہی۔ میں تو تمہارا وہی سکندر شاہ ہوں۔ وقت نے مجھے جو کچھ بنا دیا ہے اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں اپنی حسن پرستی کا شکار ہو گیا۔ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ یہ بات اب صرف وہم یا خواب نہیں رہی تھی! کیونکہ جو دروازہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اندر سے بند کیا تھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس کھلے دروازے سے دو قدم باہر نکل آیا اور چاروں طرف نگاہیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا! لیکن نہیں صاحب! کہیں کوئی ہلکا سا نشان بھی نہیں تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے میں یہ سمجھ لوں کہ اب بھی میرے آس پاس کوئی ہے! لیکن اچانک ہی مجھے پھر ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

کسی مضبوط اور طاقتور ہاتھ نے مجھے دھکا دیا اور میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ میں نے دھکا دینے والے کو پلٹ کر دیکھا تو اس بار پھر ایک ہوا نظر آیا اور دھوئیں کی لکیروں کی شکل میں ایک مرد کا چہرہ جس کی آنکھوں میں شدید غصے کے آثار تھے اور وہ بری سی شکل بنا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھواں تحلیل ہو گیا اور میں سشدر کھڑا رہ گیا۔

پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس پلٹا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک بار پھر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا۔ میں انتہائی حد تک کوشش کر رہا تھا کہ مجھے نیند آ جائے۔ سر درد سے پھنسا جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اچانک شاستری کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر نیند نہ آئے تو الماری میں ایک مشروب رکھا ہے۔ وہ تھوڑا سا پی لینا تو نیند آ جائے گی۔ چنانچہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے الماری کی طرف چل پڑا۔

الماری میں واقعی ایک بڑی سی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی گلاس بھی۔ مشروب کیا ہے اور اس سے نیند کیسے آئے گی؟ اس کا کوئی تجویز کیے بغیر میں نے کوئی آدھا گلاس میں نے مشروب بوتل سے نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے میں نے اسے حلق میں اٹھ لیا۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہوئی تھی میری۔

جوانی کا وہ دور جو ماں باپ کے سائے میں گزرا تھا، سنہری دور تھا۔ قبلہ والد صاحب تعویذ گنڈوں کے کاروبار سے اچھا خاصا کمالیے تھے اور ہم چونکہ اکلوتے تھے اس لئے ان کی کمائی کا زیادہ حصہ ہم ہی برباد کرتے تھے۔ کبھی کوئی تکلیف نہیں اٹھائی تھی۔ بعد میں بھی قسمت نے ساتھ تو دیا تھا۔ یعنی وہ چور صاحب جو ہماری خدمت کر گئے تھے۔ اس سے کافی فائدہ اٹھایا تھا، لیکن کلکتہ میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ کیسے عجیب و غریب واقعات گزرے تھے۔ وہ کجنت کالی کلونی میرا خانہ خراب کر گئی تھی۔ جتنا غور کرتا دماغ الجھتا ہی جاتا۔ کوئی ایک بات جو سمجھ میں آتی ہو۔

اور اب جیل کی کوٹھری سے لے کر یہاں تک کا سفر میں تو خیر کچھ سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میری وجہ سے کلکتہ میں ہندو مسلم فساد پیدا ہو گیا تھا۔ نجانے کتنی خونریزی ہو گئی ہوگی۔ یا ہونے والی ہوگی۔ جب کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ بیٹھا ہوا انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک زوردار تھپڑ گال پر پڑا اور میں بستر پر جا گرا۔

”کک..... کک..... کون ہے؟ کون ہے.....؟“ میرے حلق سے سہی ہوئی آواز نکلی۔ کیوں کہ قرب و جوار میں کسی کا نام و نشان نہیں تھا، لیکن دماغ کے پردوں پر ایک پراسراری خوشبو نے حملہ کیا۔ جی ہاں میں ناک کے بجائے دماغ کی بات کر رہا ہوں کیونکہ یہ خوشبو میری ناک ہی میں نہیں دماغ میں بھی بسی ہوئی ہے اور یہ خوشبو اس وقت مجھے اکثر آتی رہتی تھی جب قبرستان میں چلہ کشی کے دوران میں فلمی گانے سنا کرتا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے ارد گرد بہت سے نادیدہ وجود بیٹھے میرے ساتھ ان گانوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”اے میری دوست روح! کہاں چلی گئیں تم سب کی سب۔ تم تو ہر موقع پر میری مدد کیا کرتی تھیں۔ آج جبکہ صحیح معنوں میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو تم مجھ سے دور چلی گئی ہو اور یہ تم نے میرے ساتھ تھپڑ والا سلوک کیا کیا؟“ کئی بار یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے اور اس کے جواب میں مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔

میرا دماغ درد سے پھنسا جا رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور میں نے روتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا تم مجھ سے روتھ گئی ہو؟ مگر میرا قصور کیا ہے؟ مجھے کچھ تو بتا دو۔“ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری مسہری کے عقب سے کوئی باہر نکلا اور میرے برابر سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میرے منہ سے ایک مدھم سی آواز نکلی تھی اور میری آنکھوں نے اس ہیولے کا تعاقب کیا تھا۔ دل تو چاہا کہ بھاگ کر آگے بڑھوں اور اسے پکڑ لوں! لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ ہویلا دروازے کے پاس رکھا اور اس نے پلٹ

پتا جا رہا تھا۔

چائے ختم ہوگئی تو دل میں خواہش ابھری کہ کاش چائے کا ایک بڑا سا پیالہ اور مل جاتا، لیکن اب گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ٹرے ایک طرف سرکا دی اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ پھر باہر دوبارہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور اس کے بعد وہی دبلا پتلا آدی گھر میں داخل ہو گیا۔ جس نے دھوتی کرتا پہنا ہوا تھا اور سر پر گاندھی کپ لگائی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پر بہت سے نشان لگے ہوئے تھے۔ لیکن لگ رہا تھا کہ خون سے بنے ہوئے ہیں۔ ایک بار پھر مجھے اپنے لباس کا خون یاد آ گیا اور میں نے کڑی نظروں سے شاستری کی طرف دیکھا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور بولا۔

”کیسے ہیں سکندر شاہ جی مہاراج!“

”ٹھیک ہوں۔ آپ شاستری ہونا؟“

”اب بھی مجھے نہیں پہچانیں گے مہاراج۔ آپ کا داس ہوں بیٹھے۔“

شاستری نے کہا اور خود ایک تپائی ٹھیکٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”آپ سے کچھ باتیں کرنا بڑا ضروری ہو گیا ہے۔ میرے لئے۔ کیا سمجھ مہاراج!“

”ہاں میں خود تم سے ان ساری باتوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں شاستری جی!“

”ٹھیک.....“

”تو مہاراج آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے یہ سب کچھ جو کیا ہے کسی کے اشارے پر کیا ہے۔“

”یعنی.....“

”یہ ہی کہ آپ کو ریل سے اتار کر محفوظ طریقے سے یہاں لے آیا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے

کہ کسی کو آپ کی ضرورت ہے۔“

”مجھے کچھ اور بتائیے شاستری جی کسے میری ضرورت ہے؟“

”وہ تو آپ کو آہستہ آہستہ ہی پتہ چلے گا۔ ایک ایک بات بتائی جائے گی آپ کو۔ فی الحال

آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کالی کے داس ہیں اور آج سے میں نے آپ کا نام کالی داس رکھ دیا ہے۔“

”دامخ خراب ہوا ہے تمہارا۔ میں مسلمان ہوں اور میرا نام سکندر شاہ ہے۔ ایک مسلمان کا بیٹا

ہوں میں۔“ جواب میں شاستری ہنس پڑا اور بولا۔

”بھول جائیے مہاراج! بھول جائیے۔ اب آپ کا دین دھرم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب

آپ کا دین آپ کا دھرم صرف کالی ہے۔ مہا کالی اور اس کے لئے آپ کو مہا کالی نے اپنے ہاتھوں

بدذائقہ مشروب تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آیا کہ جب کالی مجھے ایک رہائش گاہ میں لے گئی تھی۔ جہاں میرے ہاتھوں ایک بچے کا قتل ہوا تو اس نے بھی پردے کے پیچھے سے آکر ایک کٹورے میں مجھے جو مشروب دیا تھا وہ اسی مزے کا تھا، پتہ نہیں کیا تھا۔ کجنت مشروب پیتے ہوئے تھوڑا سا میرے لباس پر چھلک گیا تھا، لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ درحقیقت پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔

مشروب واقعی خواب آور تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں گہری نیند سو گیا اور صبح کو بہت دیر تک سوتا رہا۔ آکھ کھلی تو خوب دن چڑھ رہا تھا۔ دل و دماغ پر وہی اداس سی کیفیت طاری تھی۔ جو اس وقت میری شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھا تو کوئی غسل خانہ وغیرہ نظر نہیں آیا۔ چنانچہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ویران گھر میں میرے علاوہ کوئی اور معلوم نہیں ہوتا تھا۔ البتہ دن کی روشنی میں یہ گھر بہت کشادہ اور روشن نظر آیا۔ سامنے ہی ایک ہاتھ روم نما جگہ موجود تھی۔ میں اس کی جانب بڑھ گیا اور دل چاہا کہ غسل کر لوں۔ چنانچہ لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے لباس پر خون کے دھبے بنے ہوئے تھے۔ ”یہ خون کہاں سے آیا۔ یقیناً پہلے یہ سرخ اور پتلا ہوگا“ لیکن اب وہ میرے لباس پر پڑ کر سوکھ گیا تھا۔ حیرانی سے سوچتا رہا کہ خون آخر کہاں سے آیا اور اچانک ہی مجھے یاد آیا کہ رات کو جو میں نے الماری سے نکال کر مشروب پیا تھا۔ میں نے سوچا اور پھر ایک دم طبیعت پر کراہت سی سوار ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے الٹی آجائے گی، لیکن البتہ میں بڑے کرب سے اس خون کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اسی کے بارے میں سوچتا ہوا میں واپسی کے لئے پلٹ رہا تھا کہ مجھے قدموں کی آٹھیں سنائی دیں اور اس کے بعد دو آدمی آگئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھائی ہوئی تھی۔ ٹرے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ دونوں چہرے میرے لئے اجنبی تھے۔ انہوں نے کمرے میں آکر ٹرے ایک میز پر رکھ دی اور ہاتھ جوڑ کر جھکتے ہوئے بولے۔

”بھوجن کر لیجئے مہاراج شاستری جی! تھوڑی دیر بعد آپ کے پاس آئیں گے۔“ ان کی آواز بالکل مشینی تھی۔ جیسے کسی ٹیپ ریکارڈر سے نکل رہی ہو، لیکن وہ میرے سامنے جیتے جاگتے اور زندہ سلامت تھے۔ پھر وہ اسی طرح اٹے قدموں واپس چلے گئے اور میں ٹرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پوریاں..... گرم گرم پوریاں اور سبزی رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی چائے کا ایک کپ بھی، جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اب یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ سب کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ میں ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا اور پھر میں نے ساری پوریاں اور بھاتی چٹ کر ڈالی۔ ساتھ ہی گرم گرم چائے بھی

سے وردان دیا ہے۔“

”کیا بک رہا ہے تو..... مجھے کچھ معلوم نہیں مردو۔“

”نہیں مہاراج نہیں۔ ہم آپ کو کتنے پریم سے پکار رہے ہیں اور آپ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں۔ مہاکالی نے آپ سے بھینٹ لے کر آپ کو اپنا داس بنایا ہے۔ آپ کیلئے ایک بلی دی گئی ہے۔ کیا سمجھتے آپ؟ آپ کلکتہ میں ہندو بچے کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے۔ سارا کلکتہ آپ کے خلاف تھا اور آپ کو وہاں سے صرف اس لئے نکالا گیا کہ آپ کی وجہ سے فسادات ہونے کا خطرہ تھا۔ مہاراج خطرے ہی خطرے میں تھے آپ۔ مگر کالی جسے پسند کر لے اس سے ہر خطرہ دور ہو جاتا ہے۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے آپ کو سوم رس پلایا تھا۔“

”سوم رس۔“

”یہ کیا ہوتا ہے.....؟“

”امر ہفتی مہاراج امر ہفتی۔ آپ کے شریر میں ایک ہفتی سما گئی ہے جسے آپ نے ابھی استعمال نہیں کیا۔ لیکن جب آپ استعمال کرو گے تو آپ کو اعزاز ہو جائے گا کہ آپ کتنے بلوان بن چکے ہو۔“

”جو بکواس تم کر رہے ہونا شاستری میرے دماغ میں تمہاری ایک بھی بات نہیں آ رہی۔“

”بات سن لو مہاراج پھر خود فیصلے کر لو گے۔ مہاکالی تمہیں کلکتہ میں ملی۔ اس نے تمہیں اپنا داس بنایا۔ تمہارے لئے ایک بلی دی گئی ہے۔ جاننے ہو کیسی بلی۔ تم ریل میں جا رہے تھے اور تمہیں دلی لے جایا جا رہا تھا۔ وہاں پر تمہارے اوپر قتل کا مقدمہ چلتا اور اس کے بعد تمہیں سزائے موت دے دی جاتی۔ بڑا زور ہوتا ہندوؤں کا کہ تمہیں سزائے موت دے دی جائے ورنہ بات بہت زیادہ بگڑ جاتی۔ سمجھ گئے مہاراج! اب جو منٹ تمہارے روپ میں دلی بھیجا گیا ہے۔ سارا کام وہ کرے گا۔

اسے تمہارے روپ میں موت کی سزا دی جائے گی اور پھانسی گھاٹ تک لے جایا جائے گا۔ لیکن مہاراج وہ بھی کالی کا چیلہ ہے۔ بے شک اسے پھانسی ہو جائے گی۔ لیکن اس کے بعد وہ اپنے خول میں آزاد ہو جائے گا۔ اس طرح اسے تمہاری جان بچا دی گئی ہے۔ اگر تم سکندر شاہ ہی کی حیثیت سے سامنے آئے تو تمہارے جیون کیلئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ لیکن مہاکالی نہیں چاہتی کہ تم موت کے گھاٹ اتر جاؤ۔ سو مہاراج اس نے تمہارے لئے یہ کام کر دیا ہے اور ابھی جو تم نے سوم رس پیا ہے یہ وہی سوم رس ہے جو کالی نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے پلایا تھا۔ اس میں گائے ہی کا پیشاب اور گائے ہی کا خون تھا۔ دونوں چیزیں ملا کر تمہارے شریر میں اتار دی گئیں، لیکن ان دونوں چیزوں

مہاکالی کا ہاتھ ہے اور ان چیزوں نے تمہارے جسم میں داخل ہو کر تمہیں پہلے سے سوگنا طاقتور بنا دیا ہے۔ اب آسانی سے کوئی تم پر قابو نہیں پاسکتا۔ تم ایک بڑے بہادر آدمی ہو۔ تھوڑا سے گزر جانے دو ٹیمری دفعہ سوم رس اور پھر لو۔ پھر تم محسوس کرو گے کہ تم زمین سے چٹانوں تک کو اکھاڑ کر پھینک سکتے ہو۔ یہ مہاکالی کا وردان ہے۔ تمہارا نام کالی داس ہے۔ جہاں کہیں بھی جاؤ اپنا نام کالی داس ہی بتانا۔ ایک بار بھی اگر تمہارے من میں دین دھرم جاگا تو سمجھ لو کہ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔“

”عجیب بات ہے۔“

”بالکل عجیب بات ہے۔ تمہارے جیون کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے سمجھ مہاراج! اپنے آپ ہناز کرو کہ تمہیں کیا سے کیا مل گیا۔“

”مگر مجھے ایک بات بتاؤ ایسا کیوں ہوا ہے؟“

”بلی کہانی ہے مہاراج! بلی کہانی ہے۔“

”اب تم مجھے وہ کہانی بھی سنا دو۔“

”چلیں آپ مجبور کرتے ہیں تو میں بتائے دیتا ہوں۔ آپ کے پتا جی بڑے دین دھرم والے لہناں۔ تعویذ گنڈے کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چھیڑ دیا مہاکالی کو۔ بس اس سے تو انہوں نے اپنے دم سے مہاکالی کو نقصان پہنچا دیا تھا، لیکن کالی دیوی نے یہ بات طے کر لی تھی کہ ان کے پر یوار کو ل چھوڑا جائے گا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہ مہاکالی نے تمہیں کلکتہ طلب کر لیا اور جب تم کلکتہ پہنچے تو اس نے راسواگت کیا۔ تمہیں اپنے مندر لے گئی اور مندر لے جانے کے بعد تمہیں سوم رس پلایا۔ اس حتم اس کے چیلوں میں شامل ہو گئے۔ وہ اکثر تم سے ملتی رہے گی کیونکہ وہ تمہیں پسند کرنے لگی۔ پر اس طرح نہیں، تمہیں ایک مقام ملے گا۔ ایک بڑا مان ملے گا تمہیں اور تم اس مان سے خوش گے۔ سمجھ رہے ہونا۔ اس کے علاوہ اگر جو کچھ بھی کرنا چاہو گے تو سمجھ لو کہ وہ کامیاب نہیں ہو

”ملعون کتے!..... میں کہی وہ نہیں کروں گا جو تو چاہتا ہے۔“

”یہ سب اس سے کی بات تھی مہاراج! جب تم نے سوم رس نہیں پیا تھا۔ سوم رس پینے کے بعد مل طور پر کالی کے داس بن گئے ہو۔ ہاں اگر تھوڑا سا آزمانا چاہے ہو تو الگ بات ہے آزما تے

”کیا مطلب ہے تیرا.....؟“

”پتا چل جائے گا مہاراج! پتا چل جائے گا۔ میں چلتا ہوں۔ ایک بات کہے دیتا ہوں تم۔ کہ جب بھی کبھی من اکتا جائے اور تمہارا جی چاہے کہ تم جیو اور اپنا نام کالی داس تسلیم کر لو تو پھر بیچ آواز دے لیتا۔ مجھے کہنا کہ مہاشاستری میرے پاس آؤ مجھے تیری ضرورت ہے۔ اب میں چ ہوں۔“ اس نے کہا اور اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں حیرانی۔ اس دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔



اس بار شاستری نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا، لیکن دفعتاً ہی میرے سینے پر ایک گھونہ سا لگا۔ ماحول ایک دم بدل گیا تھا اور اس وقت بس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا، وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری تھی۔ جس سے نفٹن اٹھ رہا تھا۔ میں اچھل کر اہلی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اسی وقت باہر چند لوگ نظر آئے۔ اس میں سے دو آدمی بڑی خوشخوار لاکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ انہوں نے اشارہ کیا اور ایک سنتری نے آگے بڑھ کر سلاخوں والا دروازہ کھول دیا۔ دونوں اندر کھس آئے تھے۔ ان کی خونی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور میرے اسان خطا ہو رہے تھے جو کچھ مجھ پر بیت رہی تھی وہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ ان میں سے ایک میرے پاس پہنچ گیا اور بولا۔

”کتے.....! اس چھوٹے سے معصوم بچے کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے تجھے ذرا بھی لاج نہیں آئی۔ کیا دشمنی تھی اس سے تیری۔ بس یہ ہی ناکہ وہ ایک ہندو کی اولاد تھا۔ کتے کے بچے! اتنا گلدل تھا تو..... کہ..... کہ.....“ یہ کہہ کر اس نے ایک ایسا ہاتھ میرے منہ پر جڑا کہ میں بری طرح دیوار سے ٹکرایا اور اس کے بعد ان لوگوں نے مجھ پر لاتوں، گھونوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ لکھ بولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ میں پٹارہا اور اس کے بعد بے ہوش ہو کر گر گیا۔

نجانے کب تک یہ بیہوش طاری رہی۔ ہوش آیا تو منظر پھر بدل چکا تھا۔ میں کمرہ عدالت میں کھڑا ہوا تھا اور جج صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے نفرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ ان سب کے چہروں پر بھی نفرت کے آثار تھے۔ پھر جج صاحب کی آواز ابھری۔

”آرڈر آرڈر آرڈر ملزم سکندر شاہ ولد سمندر شاہ تمہارے بارے میں تفتیش مکمل ہو چکی ہے۔ تم ایک ایسے متعصب مسلمان کے بیٹے ہو جو تعویذ گنڈوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے دل میں ہندوؤں کے خلاف نفرت تھی اور یہ نفرت تمہارے خون میں بھی منتقل ہو گئی۔ چنانچہ جو نبی تمہیں موقع ملا تم نے

کلکتہ میں ایک ہندو بچے کو بے دردی سے ذبح کر دیا۔ تمہیں اس جرم اور ظلم کی پاداش میں موت کی سزا دی جاتی ہے۔“ یہ کہہ کر ج صاحب نے اپنا قلم توڑ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر مجمع کے شور کرنے کی آواز آ رہی تھی اور میرا خون پانی ہو رہا تھا۔ میں یہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کافی حد تک سمجھ بھی رہا تھا۔

پھر مجھے وہاں سے باہر نکالا گیا۔ پولیس بے قابو مجمع کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجمع نے مجھے دیکھتے ہی مجھ پر پتھر اُڑا شروع کر دیا۔ وہ طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے۔ ان میں سے ایک لیڈر ٹائپ کا آدمی کہہ رہا تھا کہ اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ہم خود اسے اس وحشیانہ جرم کی سزا دیں گے۔ طرح طرح کی باتیں سننے کو مل رہی تھیں اور پولیس بے قابو مجمع کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے پولیس کی دوسری گاڑی میں بٹھا کر جیل پہنچا دیا گیا اور پھر ایک کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ دوسری کوٹھری تھی جس میں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے تھے۔ اب میں بالکل ہی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ مجھے موت کی سزا دی گئی تھی۔

اور اب میری موت کے لمحے قریب آتے جا رہے تھے۔ ساری رات میں کال کوٹھری میں بیٹھا جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ میری تقدیر میں یہ ہی موت لکھی ہوئی تھی۔ دل شدید کنگھٹاؤ کا شکار تھا۔ آخر کار رات گزر گئی۔ صبح ساڑھے چھ بجے مجھے کال کوٹھری سے نکالا گیا اور پھانسی گھاٹ تک لے جایا جانے لگا۔ ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ پھانسی گھاٹ سامنے نظر آنے لگا تو میرا دل بالکل ہی ڈوبتا چلا گیا اور میں نے بے اختیار کہا۔

”شاستری! مجھے تمہاری ضروری ہے۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کیلئے تیار ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتا شاستری جی..... میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں کالی داس ہوں۔ میں سکندر شاہ نہیں ہوں۔“ میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں ایک دم سے پیچھے ہٹا جا رہا ہوں۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے جو حیران کن منظر تھا وہ یہ تھا کہ جس طرح سے چند لمحے پہلے وہ لوگ مجھے لے کر جا رہے تھے وہ اسی طرح مجھے لے کر جا رہے تھے۔ جبکہ میں ان سے کافی فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے میرے ہم شکل کو پھانسی گھاٹ تک پہنچا دیا گیا اور میں خود یہ سارا تماشا دیکھنے کیلئے آزاد ہو گیا۔ میرے ہم شکل کو پھانسی کے تختے تک لے جایا گیا اور پھر اس کے منہ پر ایک کپڑا چڑھا دیا گیا اور جلا دے گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ کر دیا۔ اس کے بعد تختہ ہٹا دیا گیا اور میرا ہم شکل پھانسی کے پھندے میں ترپنے لگا۔ اس کا جسم بری طرح اچھل کود پھا رہا تھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔

اگر میں عین وقت پر شاستری کو نہ پکار لیتا تو اس وقت میرا جسم پھانسی کے پھندے پر ترپ اور ہڑک رہا ہوتا۔ یہ بھیاں تک منظر مجھ سے نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”شاستری جی! مجھے یہاں سے ہٹا لیا جائے۔“ اور منظر پھر بدل گیا اور اس بار پھر میں نے خود اپنے آپ کو اسی گھر اسی کوٹھری میں پایا جہاں میں نے تھوڑا سا وقت گزارا تھا۔ شاستری میرے سامنے اسی اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ایک پیالہ پکڑا ہوا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔

”لو..... سو دم رس پی لو تمہاری حالت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس بار میں نے تعرض نہیں کیا تھا۔ وہ مشروب پیتے ہوئے آخری بار میری طبیعت خراب ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ میرے مکمل طور پر اندر اتر گیا تو اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں واقعی دنیا کا سب سے طاقتور آدمی ہوں۔ مجھے اپنے سارے بدن سے توانائی بھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور شاستری مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”کیا نام ہے تمہارا.....؟“

”کالی داس!“ میرے منہ سے آواز نکلی اور شاستری آنکھیں بند کر کے گردن ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

”کالی کے داس! اگر تم چاہے ہو کہ تمہیں کالی کے ورثہ ہوں اور اس کا وردان ملے تو تمہیں ایک چھوٹا سا جاپ کرنا ہوگا۔ یہ جاپ تمہارے من کی شانتی کے لئے بہت ضروری ہے۔ کیا تم اس کیلئے تیار ہو؟“ اب تو ہر بات پر گردن ہلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی آماجگی کا اظہار کر دیا تو اس نے کہا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ میں عام آدمیوں کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا اور وہ خاصا لمبا فاصلہ پیدل طے کر کے ایک ایسی جگہ آیا جہاں ایک چھوٹی سی عمارت نظر آ رہی تھی۔ یہ عمارت بالکل ٹوٹی پھوٹی سی تھی اور اس کا رنگ بالکل کالا محسوس ہو رہا تھا۔

”یہ کالی کا گھر ہے اور تمہیں اسی گھر میں وہ جاپ کرنا ہوگا۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ تمہارا آخری امتحان ہے۔ کالی داس بننے کے سلسلے میں تمہیں کچھ ہدایت دے رہا ہوں۔ جاپ کے بیچ تمہیں کچھ ایسی باتیں نظر آئیں گی جو خطرناک ہوں گی مگر ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمہارے پتا جی گنڈے تعویذوں کا کام کرتے تھے اور انہوں نے بہت سی رحوں کو تمہارے آگے پیچھے کھڑا کر دیا تھا کہ تمہاری حفاظت کریں۔ وہ رحوں نہیں چاہتیں کہ تم سکندر شاہ سے کالی داس بن جاؤ۔ اس لئے وہ تمہیں ڈرانے اور روکنے کی کوشش کریں گی۔ بس اس بات کا خیال رکھنا کہ ان کے پھیر میں نہ آؤ۔ ورنہ پھر کہیں کے نہ رہو گے۔ میری کچھ چیزیں ہیں تمہارے کھانے پینے کیلئے۔“

چنانچہ میں نے اس کی ہر بات تسلیم کر لی۔ مگر میرے دل میں ایک غلط سی تھی۔ میں اپنا ذہن بار بار جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے میرا ماضی یاد نہ آئے، لیکن وہ لمحے بار بار یاد آ جاتے تھے، ج میری زندگی کے سنہرے لمحے تھے۔ عیش و آرام کی زندگی جو کھانے پینے میں بسر ہو رہی تھی۔ بہر حال شاستری چلا گیا اور میں اس کا بتایا ہوا جاپ کرنے لگا۔ پہلا دن گزر گیا، لیکن دوسری رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ کھنڈر میں ایک خوبصورت سادرخت تھا۔ جس پر عام طور سے چڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میر نے دن کی روشنی میں ان حسین چڑیوں کو دیکھا تھا۔ بالکل ہی الگ لگتی تھیں۔ تب میں نے دیکھا کہ درخت کے اوپری شاخ سے ایک سانپ اتر رہا ہے۔ میں جاپ کر رہا تھا، لیکن کالے ناگ کو دیکھ کر نجانے کیوں میرے دل کو ایک خوف کا احساس ہوا۔ اگر یہ اتر کر میرے پاس آ جائے تو میں کیہ کروں۔ میں نے دل میں سوچا اور اس احساس کے ساتھ خاموش ہو گیا کہ شاستری نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہو تو اپنی جگہ مت چھوڑنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سانپ مجھ تک نہ پہنچے لیکن میری نگاہیں سانپ پر جمی رہیں۔ سانپ آہستہ آہستہ نیچے اتر آیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک گھونسلے کے پاس رک گیا۔ پھر میں نے سانپ کو اپنا چمن گھونسلے میں داخل کرتے ہوئے دیکھا اور کچھ لمحوں بعد جو منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس نے میرا دل تڑپا دیا۔ وہ رنگین اور حسین چڑیا سانپ کے منہ میں دبی ہوئی پھڑ پھڑا رہی تھی اور سانپ اسے منہ میں دہائے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

چڑیا بڑی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی اور میرا دل سینے سے نکلا پڑ رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ سانپ کو کسی طرح ہلاک کر کے اس چڑیا کو آزاد کرادوں، لیکن شاستری کے الفاظ بھی میرے ذہن میں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ چڑیا کو نگل گیا اور پھر اس نے دوبارہ چمن اندر ڈالا اور دوسری چڑیا نکال لی۔ اسے بھی ہلاک کرنے کے بعد سانپ نے اوپر کی جانب رخ کیا اور درختوں کی شاخوں میں گم ہو گیا۔ حسین چڑیوں کا گھونسلہ خالی ہو گیا تھا۔ میرے دل کو شدید دکھ کا احساس تھا۔ کتنے سکون کی زندگی گزار رہی تھیں وہ لیکن اب ان کا وجود مٹ گیا تھا۔ ایک دشمن انہیں کھا گیا تھا۔

سانپ اپنی جگہ سے غائب ہونے کے بعد پھر نظر نہیں آیا اور پھر میں نے بمشکل تمام اپنا ذہن جاپ کی طرف مبذول کر دیا۔ یہاں تک کہ چاند نے سراپا ہوا اور میں نے جاپ ختم کر کے اپنی جگہ کی راہ لی۔ مگر میرے کانوں میں چیز یوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسی طرح مجھے جاپ کرتے ہوئے پانچواں دن آ گیا۔ اس دوران عجیب و غریب حالات پیش آئے تھے۔ ویسے جاپ کرنے کے وقت کے لئے میں نے ایک ڈنڈا اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر سانپ میری طرف آئے تو میں درخت کی چھاؤں کے نیچے ہی نمٹ سکوں۔ موذی کا کیا بھروسہ کب کہاں سے نکل آئے؟

بہر حال میں انتظار کر رہا تھا اور میرے جاپ کا پانچواں دن چل رہا تھا۔ یہ دودن اور باقی رہ گئے تھے۔ موسم اس وقت کافی خوشگوار تھا اور آسمان پر ستارے چاند بار بار ان بادلوں کی اوٹ میں مہمپ جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ رات گزرتی چلی گئی اور پھر بادل چھٹ گئے۔ اب چاند پوری آب و تاب کے ساتھ نکل آیا تھا اور فضا میں چاروں طرف روشنی پھیل گئی تھی۔ میرا جاپ جاری تھا کہ کہیں سے ایک بلی میرے سامنے میاؤں میاؤں کرتی ہوئی آ گئی۔ وہ درختوں کی چھاؤں کے اس طرف میری جانب رخ کر کے بیٹھ گئی۔

میں چند لمحوں کے لئے رک گیا اور بلی کو دیکھنے لگا، جو نجانے مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ وہ کئی بار منہ سے میاؤں میاؤں کی آوازیں نکالنے لگی اور اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھ سے مخاطب ہو۔ بڑی خوبصورت بلی تھی۔ جسے دیکھ کر مسکراتا رہا۔ میں اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ لیکن پھر وہ خوفناک لہجہ آ گیا جس نے میری روح تک کولرزا دیا۔

اسی سامنے والے درخت سے جس پر میں کبھی چڑیوں کا گھونسلہ دیکھتا تھا اور اب وہ گھونسلہ دیوانہ دیکھ کر میرے دل کو دکھ ہوتا تھا۔ اچانک ہی ایک قد آور بے نے چھلانگ لگائی۔ کالے رنگ کا یہ بلا بڑی لمبی چھلانگ بھر کر بلی پر آکودا تھا۔ بلی اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگ گئی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ بلا عام جسامت سے کہیں زیادہ تھا اور کافی موٹا تازہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بلی پر چھپا مارا اور اس کی گردن اپنے دانتوں میں دبوج لی۔ میرے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ میں نے ڈنڈے کو مٹھی میں پکڑ لیا۔ ایک لمحے کیلئے میرا دل چاہا کہ کھڑا ہو جاؤں اور اس خوبصورت بلی کو بچاؤں۔ جواب بے کے جڑوں میں دبی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ زمین پر اچھا ناصا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ بلا اس بلی کو بھنجوڑ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بلی خون میں نہا گئی۔

بے نے اس کی ٹانگیں چبا ڈالیں اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کے پورے بدن کو چٹ کر گیا۔ انا کو اس نے تروڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا اور اب زمین پر خون کے چھینٹوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کالے بے کا منہ خون سے رنگین ہو گیا تھا اور اس کی جسامت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ بلی کو ہضم کرنے کے بعد وہ لمبی زبان نکال کر اپنے منہ پر لگا خون چاٹنے لگا۔ تبھی اس کی گول گول رفاک آنکھیں میری جانب اٹھ گئیں اور وہ اس طرح ٹھٹھک کر رک گیا جیسے اس نے پہلی بار مجھے دیکھا ہو۔

نجانے یوں میرے بدن میں سرد لرہیں دوڑنے لگیں۔ بے کی آنکھوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے فکار کو تاک رہا ہو۔ پھر وہ دبے قدموں میری جانب بڑھنے لگا اور میرے اوسان خطا ہو

گئے۔ یہ کجنت بلا آخر کیا چاہتا ہے؟ میں نے سوچا۔ بلا آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا اور میں ڈنڈا ہاتھ میں سنبالے اٹھتا جا رہا تھا۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا تو ظاہر ہے مجھے اس سے جنگ کرنا پڑے گی۔

پھر بلا درخت کی چھاؤں میں اس حصار کے قریب آ گیا۔ جس سے باہر نکلنے کیلئے مجھے منع کر دیا گیا تھا اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس سے مقابلہ کروں، لیکن اس وقت بھوکے میں نے اپنے ہوش و ہواس نہیں کھوئے تھے اور یہ سوچ رہا تھا کہ بلا اگر اندر آ گیا تو اس سے کمر طرح جنگ کروں گا، لیکن بلا اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس طرح مجھے تاکتا رہا جیسے موقع ملے تو مجھے بھی بلی کی طرح جبر پھاڑ کر چٹ کر جائے گا۔ بلی کو جس انداز میں اس نے چبا ڈالا تھا۔ وہ اب بھوکے میرے ذہن پر نقش تھا اور میرا بدن اسے دیکھ کر ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ بلا تقریباً دو یا تین منٹ تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ چاند نکل آیا ہے اور اب مجھے بھی اپنا جاپ ختم کر لے چاہئے۔ ویسے بھی اب صرف چند بار کی بات رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بیٹھ گیا، لیکن ڈنڈا میرے اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا جاپ پورا کیا اور چپے ہی میرے جاپ کا آخری شبد ختم ہوا میں ڈنڈا لے کر اس بلے کے پیچھے دوڑا۔ اس نے ایک لمبا چھلانگ لگائی اور بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ میرے اندر پھر وہی قوتیں ابھر آئی تھیں جو میں۔ سوم رس پینے کے بعد محسوس کی تھیں۔ جاپ کے دوران البتہ مجھے خوف محسوس ہوتا تھا، لیکن جاپ کے بعد میں بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ میں دیر تک وہاں کھڑا رہا اور اس نئے کوڈ ڈرے سے بجاتا رہا کہ آکجنہ نیچے تو آ میں تجھے دیکھ لوں۔ بلے پر میرا غصہ بہت شدید تھا اور یہ درخت۔ اس نحوست کی جڑ پر کجنت ساری بلائیں رہتی تھیں۔ وہ سانپ اور بلا۔

لیکن اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بلا درخت کی شاخوں میں گم ہو گیا ہو۔ میں کافی دیر تک درخت کے تنے پر ڈنڈے برساتا رہا، لیکن بلے نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا اور نہ ہی اس کی آنکھیں کہیں چمک رہی تھیں، جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں درخت پر چڑھ کر اسے تلاش کروں، لیکن پھر میں نے اپنی اس دلیری کو سینے میں دبا لیا۔ کیا فائدہ کسی اور مصیبت میں پہنچاؤں وہاں سانپ بھی ہے اور اس کے بعد میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

لیکن میں نے سوچا تھا کہ بلا اگر نظر آ گیا تو میں اسے ماروں کا ضرور۔ اچانک ہی مجھے۔ عقب میں سرسراہٹیں محسوس ہوئیں اور میں نے پلٹ کر دیکھا اور ایک بار پھر میرے روٹنے لگنے لگے گئے تھے۔ انسان اپنی دہشت اور اپنے خوف پر بڑی مشکل سے قابو پاتا ہے۔ بلا آہستہ آہستہ میرے

بہ چلا آ رہا تھا اور مجھ سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں نے حلق سے ایک دھاڑ نکالی اور پلٹ بلے کی جانب دوڑا، لیکن میرے پلٹنے ہی وہ پھر بھاگ گیا تھا۔ میں نے کچھ دور تک اس کا پیچھا کیا، لیکن وہ کجنت بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے سوچا لعنت ہے اس پر اب مجھے اپنی رہائش پر پہنچ جانا چاہئے۔

چنانچہ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس پلٹا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو گیا۔

وہی تنہائی، وہی پریشان کن خیالات، یہی بات تو یہ ہے کہ میری تمام شخصیت ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ میری رہائش گاہ سنان پڑی ہوئی تھی۔ اب تو یوں لگتا تھا جیسے اس دنیا میں میرے لئے کچھ بھی رہ گیا ہو۔



یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ایک طرح سے دنیا سے کٹ کر ہی رہ گیا تھا۔ باہر کی زندگی کے رے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ جو جاپ مجھے بتایا گیا تھا وہ میں نے پورا کر لیا تھا اور نجانے کیوں کر ہاتھ آیا تھا۔ اس کا خود بھی مجھے اندازہ نہیں تھا۔ یہ بات مجھے آج بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ میرا نام سکندر ناہ ہے اور میرے باپ کا نام سمندر شاہ تھا۔ میں باقاعدہ ایک گھریلو نوجوان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں باپ کے لاڈ پیار نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ والد صاحب کا کام بھی کچھ عجیب سا تھا، لیکن بہر حال انہوں نے ایک اچھی زندگی گزاری تھی اور مجھے اپنے ماضی کے بارے میں اچھی طرح یاد تھا۔

بات کہاں سے گزری تھی اندازہ صحیح نہیں ہو پا رہا تھا۔ چلیں والد صاحب کو ایک طرح سے ان کے جموں علوم کی سزا ملی۔ حالانکہ وہ مجھے بھی اسی طرح کا تعویذ گنڈے والا عالم بنانا چاہتے تھے۔ یہ در بات تھی کہ میری فطرت میں یہ سب کچھ نہیں تھا، لیکن پھر بھی ایک مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ رشتے ناتے اور قرب و جوار کے لوگ بھی مسلمان ہی تھے۔ پھر مجھ پر یہ عتاب کیوں نازل ہوا تھا؟ غور کرنے سے اپنی غلطی نظر نہیں آتی تھی۔ بس یہ کہنا چاہئے کہ وقت نے فٹ ہال بنا دیا تھا۔ چاروں طرف سے لاتیں پڑ رہی تھیں۔ وہ شخص جسے میری جگہ دی گئی تھی۔ پچھارہ پتہ نہیں کس عذاب میں گرفتار ہوگا۔

معا میرا دل چاہا کہ مجھے اس کے بارے میں معلوم ہو جو میرا ہمشکل تھا۔ یہ بات اخبارات سے پتہ چل سکتی تھی، لیکن اخبار مجھ تک کہاں سے پہنچتے۔ کیا کروں؟ کیا نہ کروں طبیعت میں ایک ایسی بے چینی سی پیدا ہو گئی کہ میں اپنے آپ سے ہی جھنجھلا گیا۔ میں نے سوچا کہ زندگی کی انتہا موت تو

ہوتی ہی ہے۔ باہر کی دنیا میں کھل کر اپنے آپ کو تلاش کروں۔ کلکتہ میں میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ عورت جادوگر تھی۔ پتہ نہیں چلے گا کہ کالی تھی یا پھر اس کا کوئی جھوٹا روپ۔ لیکن اس نے مجھے تباہ کر دیا تھا۔ کیوں؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال کالہ دیر تک یہ سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔

پھر گھر سے باہر نکل آیا۔ بڑی عجیب سی جگہ تھی۔ جہاں شاستری نے مجھے رکھا تھا۔ دور دور تک ویرانہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اب یہاں رکنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں بس بے اختیاری کے انداز میں چلتا رہا اور منزل کا کوئی تعین نہیں تھا۔ لیکن کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈھلان نظر آئے اور اڑ ڈھلانوں کے اختتام پر آبادی سرسبز و شاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے اور ان کے پس منظر میں اونچے نیچے مکان نظر آ رہے تھے جو معمولی نہیں تھے۔ گویا کوئی باقاعدہ شہری آبادی تھی۔

میں نہجانے کن سوچوں میں غرق ہوتا چلا جا رہا تھا اور پھر ایک درخت کے پاس پہنچ گیا۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ میں چونکہ کافی پیدل چل کر آیا تھا اس لئے ہلکا سا تھکن سی ہو گئی تھی۔ درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا کہ اچانک ایک طرف نگاہ پڑ گئی اور میں چونک پڑا۔ کلام پاک کا ایک پٹا ہوا ورق تھا جو تھوڑے فاصلے پر پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس پر مقدس آیت لکھ ہوئی تھی۔ بے اختیار دل میں احترام کا جذبہ ابھرا۔ کہیں سے یہ ورق اڑ کر یہاں تک آ گیا ہے۔ جلدی سے آگے بڑھا اور جبکہ اس ورق کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن اچانک ہی مجھے یوں اچھٹے میرے ہاتھوں میں آگ لگ گئی ہو۔

اتنی شدید تپش اور جلن تھی کہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسی وقت ہوا کا ایک جھولکا آیا اور کلام مقدس کا وہ ورق ہوا میں اڑ گیا۔ میرے ہاتھوں میں اب بھی شدید جلن تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے لوہے کا تپتا ہوا ٹکڑا چھو لیا ہو۔ میں کرب کے عالم میں اپنے ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑا اور مقدس آیت کا وہ ورق ہوا میں اڑ کر کہیں سے کہیں چلا گیا تھا۔ یہ انہونی تھی ناقابل فہم نہجانے! کیوں ہوا تھا؟ مجھے تو یوں لگا جیسے میں اس مقدس آیت کو چھونے کے قابل نہ رہا ہوں۔ ابھی میں ہی سوچ رہا تھا کہ عقب سے قدموں کی سی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو چونک کر شاستری اسی طرف آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر مذہم سی مسکراہٹ تھی۔

”آؤ..... کالی داس..... آؤ.....“

”شاستری! میرا نام کالی داس نہیں ہے۔“ میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا تو وہ چونک کر

دیکھنے لگا۔

”اب بھی نہیں ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شاستری حیرانی سے بولا۔

”میرا نام سکندر شاہ ہے سمجھے.....؟“

”نہیں سکندر شاہ! اب تم سکندر شاہ کہاں سے آئے؟ کالی کے داس ہو تم سمجھے۔ آؤ..... بیوقوفی کی باتیں نہ کرو جو کچھ مل گیا ہے اس سے گردن نہ موڑو۔ آگے تمہیں کیا ملتا ہے اس بارے میں سوچو آؤ..... میرے ساتھ آؤ.....“

میں بے اختیار اس کے ساتھ چل پڑا اور پھر وہ جس گھر کے احاطے میں داخل ہوا وہ دور سے دیکھنے ہی سے شاعرانہ نظر آ رہا تھا۔ بڑا سا لکڑی کا پھانک لگا ہوا تھا۔ اس کے آگے انتہائی خوبصورت باغیچہ پھیلا ہوا تھا۔ طرح طرح کے درخت موجود تھے اس میں۔ درمیان میں ایک روش تھی جو ایک گھر کی عمارت پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ شاستری مجھے اس سے اندر لے گیا۔

اندر مجھے سب سے پہلے کچھ لڑکیاں نظر آئیں جو اچھی شکل و صورت کی مالک تھیں۔ یوں لگا جیسے وہ میرا انتظار کر رہی ہوں۔ شاستری نے کہا۔

”ہالو! مہاراج کالی داس آ گئے ہیں۔ ان کی سیوا کرو۔ میں چلتا ہوں۔“ لڑکیاں میرے قریب آ گئیں اور انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ جھلاہٹ آہستہ آہستہ رفع ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ حراج کی یہی غرابی میرا خانہ خراب کیے ہوئے تھی اور ایک دم مجھے احساس ہوا تھا کہ اگر یہ غرابی میرے اندر نہ ہوتی تو میں اس خوبصورت بلا کے چکر میں نہ پھنستا جو بعد میں ہندوؤں کی کالی دیوی ثابت ہوئی تھی۔ لڑکیاں مجھے لئے ہوئے اندر داخل ہو گئیں۔ باہر سے یہ عمارت کچھ خاص نظر نہیں آتی تھی لیکن اندر سے اس کا حسن دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک بہت ہی خوبصورت کمرے میں مجھے لے جایا گیا اور میرے ارد گرد دھمکی ہوئی لڑکیاں مجھ سے ہنسی مذاق کرنے لگیں۔

”کالی داس مہاراج! اشان کر لیجئے۔ ہم نے آپ کیلئے خوشبودار ہاتھ تیار کر دیا ہے۔“

”مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔“

”لو..... کپڑے تو بدلیں گے ناں آپ.....؟“ ایک شوخ و شنگ لڑکی بولی۔

”ضرورت تو نہیں ہے۔“

”ہمیں تو ہے۔“ اس نے کہا اور تمام لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ ان کے قلابی اور نفرتی تہمتے بڑے بھلے

لگ رہے تھے۔ بہر حال میں نے غسل کیا لباس بھی تبدیل کیا اور صحیح معنوں میں اپنے آپ کو کچھ ہلکا ہلکا محسوس کرنے لگا۔

پھر ان لوگوں نے مجھے کھانے پینے کی کچھ چیزیں پیش کیں۔ خالص ہندو اسٹائل کی تھیں۔



رہی تھی۔ جو مجھے پسند نہیں آ رہی تھی۔ اتنی خوبصورت لڑکی اگر اس طرح بد بودار ہو تو ذہن تو خراب ہوتا ہی ہوتا ہے۔ لیکن میں نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ کہنے لگی۔

”تمام شکایتیں دل سے نکال دو۔ اب تم کالی داس بن چکے ہو۔ حماقت کے تمام نام ذہن سے دور کر دو۔ تمہیں ایک بہت ہی اہم مشن پر کام کرنا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تمہیں میری ایک ایسی دشمن کے خلاف کام کرنا ہے جو صدیوں سے میری دشمنی کا شکار چلی آ رہی ہے۔ یا پھر مجھے شکار بنانے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ کبھی وہ مجھ پر بھاری پڑ جاتی ہے اور کبھی میں اس پر۔“

”مگر تم تو بہت بڑی اوتار ہو۔ دلو تا ہو۔ ان لوگوں کی۔“

”کن لوگوں کی تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”میرا مطلب ہے اپنے سامنے والوں کی۔“

”وہی تو اس کے لئے حسد اور جلن کی بات ہے۔ وہ میرا یہ سہاؤ پسند نہیں کرتی۔“

”تو میں کیا کروں.....؟“

”ایسی بے دردی کی بات مت کرو۔ تمہیں وہ کچھ ملے والا ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اپنے مزاج کو بھول گئے جو تم سکندر تھے تو ساری حسن کی کائنات کے بادشاہ بننا چاہتے تھے اور یہاں بھی تمہیں وہی سب کچھ ملا ہے۔ جس کے تم خواہشمند ہو۔“

”میں مانتا ہوں لیکن یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ میرا تعلق ایک مسلمان گھرانے سے ہے اور میں

بچپن ہی سے اور..... وہ..... وہ..... اچانک ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بات کرنے سے روک دیا۔ اس کے انداز میں ایک نفرت، ایک کراہت سی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”بمقامت ماننا اگر ایک بات کہوں۔ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں سنسار میں۔ کچھ لوگ وہ

ہوتے ہیں جو کچھ نہیں ہوتے، مگر اپنے آپ کو کچھ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے پتا جی شری سمندر

شاہ پراسرار علوم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ پرانت الٹے سیدھے جاپ چلے کرتے رہا

کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بھی پھیڑا تھا اور میرے جسم میں سولہ برہمے اتار دیئے تھے۔

اگر اکیس برہمے اتار دیتے تو میں شدید زخمی ہو جاتی۔ یہ جادو منتروں کا کھیل ہے جسے تم نہیں جانتے۔

تم نے تو اپنا جیون دوسری ہی طرح بتایا ہے۔ پرست کالی اور مرنت کالی کا کھیل صدیوں پرانا ہے۔

اگر اس کھیل کو پھیڑا جائے تو پھر وہی باتیں ہوتی ہیں۔ دونوں میں سے ایک جیتا ہے۔ میرے تو

بہت سے داس ہیں اور بہت سی داسیاں ہیں جو میرے لئے کام کرتی ہیں۔

اگر ایک کو نقصان پہنچا تو دوسری موجود اگر ایک ختم ہوا تو دوسرا موجود۔ پردہ جو میرے خلاف

میرے محسوسات سب ٹھیک تھے۔ جان رہا تھا کہ جس ماحول میں آیا ہوں وہ میرا اپنا ماحول نہیں ہے اور نہ ہی میرے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے، لیکن بات وہی تھی اچھا لگ رہا تھا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ بے تکلفی سے ہنستا بولتا رہا۔ پھل بھی کھائے، جو چیزیں کھانے پینے کی دی تھیں وہ بھی کھائی تھیں۔

پھر رات ہو گئی۔ رات کو انہوں نے ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں قص و سرود کی محفل جمائی۔ لڑکیاں قص کر رہی تھیں اور میں ان کے درمیان راجندر بنا ہوا بیٹھا تھا۔ نگاہیں ایک طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میری نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں اور جو میں نے دیکھا، وہ ناقابل یقین تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو کلکتہ میں مجھے کالی کی حیثیت سے ملی تھی، لیکن اس وقت وہ ایک انتہائی قیمتی لباس میں لمبوس اور پہلے سے کہیں زیادہ دلکش نظر آ رہی تھی۔

میں اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ دوسری لڑکیاں اٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگیں اور اس کے بعد کمرے کے مختلف دروازوں سے باہر نکل گئیں۔ کالی میرے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی جو پہلی بار مجھے مسود کرنے کا باعث بنی تھی۔

”ہیلو..... پہچان گئے مجھے.....؟“

”ہاں کیوں نہیں..... میں تو سمجھا تھا کہ اس وقت تم مجھے نہیں پہچانو گی۔“

”کیوں..... ایسا کیوں سمجھتے تھے تم.....؟“

”بس میرے دل میں یہی خیال تھا۔“

”ٹھیک تو ہوتا.....؟“

”جس مشکل میں تم نے مجھے پھنسا دیا تھا۔ اس کے بعد ٹھیک ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا

ہے۔“

”کالی داس!“

”تم بھی مجھے کالی داس کہو گی۔“

”تو پھر کیا کہوں؟“

”سکندر!.....“ میں نے جواب دیا اور اس کا منہ بگڑ گیا

”کیوں تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ میں نے اس بات کا کوئی فوری جواب نہیں دیا۔

”اچھا تو لگ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میرے مزاج کے مطابق تھا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی

تھی۔ لیکن تمام تر خوبصورتی اور حسین لباس کے باوجود اس کے بدن سے مدہم مدہم سی ناگوار بو اٹھ

جادوؤں نے اور میرے کالے جادو کا تو ذکر کرتے ہیں اگر صحیح طور پر اپنا کام نہیں کر پاتے تو پھر میری بھی مجبوری ہوتی ہے کہ ان کا ستیا ناس کروں۔ اس پھیر میں مت پڑو۔ تمہیں جو کچھ مل رہا ہے وہ برا نہیں ہے۔ وہ تمہارے کام آنے والی چیز ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم کالے سنسار کے راستے پر چل پڑے ہو اور اب بیچ میں کھڑے ہو۔ میں نے تمہیں بلوان بنا دیا ہے۔ کھستی دی ہے کہ تم ہاتھیوں سے لڑ سکتے ہو۔ یہ کھتی اودھار کی کھتی ہے۔ پر تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔ شاستری میرا داس ہے۔ میرے ہی کہنے پر تمہیں بچا کر لایا ہے اور ہم نے تمہارے لئے ایک منٹ کی بلی دی ہے۔ وہ جو تمہارا ہمشکل ہے۔

موت کی سزا پا چکا ہے تمہاری جگہ۔ کچھ دن کے بعد اسے چھانی دے دی جائے گی۔ یہ کام صرف تمہیں بچانے کیلئے کیا گیا ہے کیونکہ تمہیں ایک الگ کام کرنا ہے۔ وہ پاپن صدیوں پرانی روح ہے۔ میں نے کہا نا یہ ایک لمبا کھیل ہے۔ جس کی تفصیل تمہیں آہستہ آہستہ بتا دی جائے گی۔ روپ گبنائی ہے اس کا نام اور اگر سنسار میں میرے ماننے والے زیادہ نہ ہو جاتے تو روپ گبنائی کالی دیوی کی جگہ لے لیتی اور سارے کا سارا کالا جادو اس کی ملکیت ہوتا۔ یہ لمبے کھیل ہیں جن کے بارے میں تمہیں آہستہ آہستہ ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

”اب تم آرام کرو اور میں تمہیں بالکل صحیح صلاح دے رہی ہوں۔ شاستری جو کچھ کہے وہی کرتے رہو۔ اسی میں تمہاری جیت ہے اور اسی میں تم خوش رہو گے۔ کچھ قدم آگے بڑھا کر دیکھو۔“ میں نے ایک گہری سانس لی جو کچھ وہ کہہ رہی تھی تھا تو بڑا عجیب اور پراسرار اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ زندگی میں یہ سب کچھ بھی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں جان بوجھ کر یا انجانے میں دھوکہ کھا گیا تھا۔

کالی چلی گئی، لیکن میرے ذہن میں سوچوں کا طوفان چھوڑ گئی۔ بار بار مجھے اپنا ماضی یاد آنے لگتا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس وقت جب میں کلکتہ پہنچا تھا اور اس کے بعد کالی نے مجھے کالی کے مندر کی سیر کرائی تھی۔ میرے اوپر کالی کا سحر شروع ہو گیا تھا اور پھر جب وہ مجھے اس گھناؤنی رہائش گاہ میں لائی اور اس نے مجھے وہ مشروب پیش کیا جو میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ بس تبھی سے میں کالے سحر کا شکار ہو گیا اور مجھ سے میرا ایمان چھین لیا گیا۔ جس کی زبردست مثال یہ تھی کہ میں نے کلام اللہ کے اس ورق کو چھونے کی کوشش کی تو میرے ہاتھوں میں آگ لگ گئی تھی اور ورق اڑ کر میری چٹائی سے بہت دور چلا گیا تھا۔

اس سے مجھے اپنی کالی تقدیر کا اندازہ لگایا چاہئے تھا کہ مجھ سے میرا ایمان میرا دھرم چھین چکا ہے۔ کچھ بھی تھا۔ مقدس رو میں میرے ارد گرد چکراتی تھیں اور انہوں نے میرے تحفظ کا بیڑا اٹھا لیا تھا

لیکن انسان اپنے ہاتھوں سے تباہی کے گڑھے میں گرنا چاہے تو پھر اسے کون روکے۔ میرے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔



شاستری کے بارے میں مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ بھی کالی کا پجاری ہے۔ سارا کھیل میرے علم میں آ گیا تھا۔ جب وہ مجھ سے ملا تو میں نے سر دنگا ہوں سے اسے دیکھا۔

”کیسے ہیں مہاراج کالی داس!“

”شاستری کالی نے مجھ سے ملاقات کی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ تم مجھ سے مل کر مجھے آگے کی باتیں بتاؤ گے لیکن ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔“

”اس سے پہلے میں بھی آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں مہاراج!“

”ہاں..... بولو۔“

”مہا کالی کا نام آپ اس طرح نہ لیا کریں۔ وہ ہماری اوتار ہے۔ ہم اس کے چرنوں کی دھولیں۔ ہم اس کا بڑا مان کرتے ہیں مہاراج۔ آپ بھی کالی کے داس ہیں اس لئے آپ اسے مہا کالی کہا کریں۔“

”نہیں شاستری یہی میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا تو شاستری چونک پڑا۔

”کیا.....؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں کالی داس کا نام نہیں چاہتا۔“

”ہیں.....“ وہ حیرت سے بولا۔

”ہاں.....“

”مگر کیوں مہاراج.....؟“

”میں تمہیں اس کیوں کا جواب بھی نہیں دینا چاہتا۔“

”مگر آپ کالی کے داس بن چکے ہیں۔ آپ نے اس کے سارے سہماؤ سونیکار کر لئے ہیں۔“

”میں نے تم سے جو کہا اگر وہ ممکن ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں کالی کی ایک بات بھی نہ کیلئے تیار نہیں ہوں۔“ شاستری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے گردن اٹھا کر کہا۔

”یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر ایک بات ہم بھی کہے دیتے ہیں آپ سے مہاراج!“

”ہاں بولو.....“

”آپ کو سکندر شاہ کے نام سے تو کبھی پکارا نہیں جاسکتا۔ ساری بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔“

شاستری نے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن کالی داس کے نام سے بھی نہیں پکارو۔“

”تو پھر مہاراج.....؟“

”بچ کا کوئی نام رکھ لو۔“

”بچ کا کوئی نام..... بتائیے آپ کیا نام رکھا جائے؟“

”کوئی بھی نام..... چاہے وہ ہندو ہے مجھے اعتراض نہیں ہے مگر میں کالی داس کے نام سے

نہیں پکارا جانا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر ہم آپ کو راج ہنس کہہ لیتے ہیں۔“

”میں نے کہا نا کچھ بھی کہہ دو اس کے علاوہ۔“

”ٹھیک ہے۔ مہاراج۔ آج سے آپ کو راج ہنس ہی کہا جائے گا کیونکہ اس میں بھی کالی کے

رنگ جھلکتے ہیں اور آپ کا مان بڑھ جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے اب مجھے بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی مہاراج! آپ کو تھوڑے دن تک یہاں الگ الگ تربیت دی جائے گی اور اس کے بعد

آپ کو رانا ہریش کھرجی کے پاس جانا ہوگا۔ جن کے ماتا پتا راجہ تھے لیکن انگریز سرکار نے ان سے

ان کی راجدھانی چھین لی اور ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ راجہ کا خطاب بھی چھین لیا گیا ان سے۔ چنانچہ

رانا ہریش کھرجی اب رانا ہریش کھرجی کہلاتے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کو اتنا بتایا جا سکتا ہے

جے تلک جی! کہ وہ بڑے دل والے ہیں۔ بہت اچھے مزاج کے مالک ہنسنے بولنے والے اور سب

سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ خطرناک جانوروں کے شکار کے رسیا ہیں۔ شیر چیتے ہاتھی رینگے بس یوں

سمجھ لیجئے کہ ان سے ان کی دشمنی ہے۔ رانا ہریش کھرجی لمبے لمبے شکار پر جاتے رہتے ہیں۔ انہیں

شکاریوں کی بڑی پہچان ہے اور وہ شکاریوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ آپ کو ایک بڑے شکاری کی

حیثیت سے ان کے پاس جانا ہوگا۔ ہم کالی کے چکارے کام لے کر جے تلک مہاراج کا نام روشن

کر دیں گے اور جے تلک جی! رانا ہریش کھرجی کے پاس ایک ماہر شکاری کی حیثیت سے جائیں

گے۔

اور پھر ان کے ساتھ جو کچھ ہوگا۔ وہ آگے کی کہانی ہوگی۔ مجھے ایک دم دلچسپی کا احساس ہوا

تھا۔ ویسے تو ہر طرح کے شوق اور ہر طرح کی خواہشیں میرے دل میں تھیں لیکن کبھی کبھی کچھ خواہشیں

میرے دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ میں پراسرار جنگلوں میں جاؤں اور وہاں جاکر خطرناک

جانوروں کا شکار رکھلیوں درجنوں بار یہ خیال میرے دل میں میں ابھرا تھا، لیکن ظاہر ہے جس ماحول میں رہ رہا تھا۔ وہاں باقی تو سب کچھ مل جانے کے امکانات تھے، لیکن ہر خواہش پوری ہونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور بالکل اچانک ہی یہ انوکھی بات میرے علم میں آئی تھی تو مجھے اس سے ایک دلچسپی کا احساس ہوا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ٹھیک ہے شاستری! میرا نام بھی ٹھیک ہے۔ میں اس نام سے رانا ہریش کھرجی کے پاس

جاؤں گا، لیکن کیا میرے وہاں جانے کی کوئی گنجائش ہے۔“

”اس کا سارا انتظام ہم خود کریں گے مہاراج!“

”ٹھیک ہے۔“

”اس کے علاوہ یہ بھی نہیں وہاں پر آپ کو راج جوتی جی بھی ملیں گی۔“

”یہ کون ہے.....؟“

”وہ تو آپ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوگا مہاراج۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کا من اسی سے لگے گا

اور پھر جیسا کہ مہاراجی نے آپ سے کہا ہے کہ آپ کو ان کی دشمن روپ بستانی کے لئے کام کرنا ہوگا تو

اس کام کا آغاز رانا کھرجی کی حویلی ہی سے ہوگا۔“

”عجیب کہانی ہے۔“

”اور بڑی ہی سندر۔“ شاستری بھدے انداز میں مسکرایا اور میں نے بڑے خیال انداز میں گردن

ہلا دی۔

شاستری کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں مزہ آیا تھا، پھر میں نے شاستری سے کہا۔

”اچھا تو پھر اب مجھے کیا کرنا ہے؟“

”مہاراج تھوڑی سی کاری گری سیکھنی ہے آپ کو۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔

یہ کاریگری بھی خوب تھی۔ بہت سے لوگ اس عمارت میں آگئے تھے اور انہوں نے میری

تربیت شروع کر دی تھی۔ مجھے عمدہ قسم کی بندوقوں سے نشانہ بازی سکھائی جا رہی تھی اور مجھے یوں لگتا

تھا جیسے میرے اندر کی صلاحیتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہوں یا پھر کچھ پراسرار قوتیں میری مدد کر رہی

ہوں۔ میں نے بہترین نشانہ بازی سیکھ لی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی مجھے جسمانی مشق بھی کرائی جا رہی

تھی۔ وہ جاپ جو میں نے شاستری کے کہنے پر کیا تھا اور جو انتہائی خوفناک تھا، اس نے میری جسمانی

قوتوں کو خوب بڑھا دیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی باتیں بھی ہوئیں جو نہ بتانا زیادہ بہتر رہے گا۔ مختصر

یوں کہوں کہ وہاں موجود لڑکیوں کا جو گرد پ تھا۔ اس نے نجانے مجھ پر کیا کیا رنگ آزمانے شروع کر دیئے۔

کبھی مجھے دودھ اور چندن ملے پانی سے نہلایا جاتا۔ کبھی طرح طرح کی جڑی بوٹیاں میرے چہرے پر لپ کی جاتیں۔ یہ لپ جسم کے بہت سے حصوں پر کیا جاتا تھا اور جب کبھی میں آئینہ دیکھتا تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ مجھے صرف راج ہنس کا نام ہی نہیں دیا گیا تھا بلکہ راج ہنس بنانے کی کوشش بھی کی جا رہی تھی اور اس سلسلے میں وہ لوگ پوری طرح کامیاب ہو رہے تھے۔ غرض یہ کہ اب اپنی تعریف میں کیا کروں۔ اب تو سچی بات یہ ہے کہ خود اپنا نام بھی بھول گیا تھا اور جب مجھے راج ہنس کہہ کر پکارا جاتا تو میرے دل میں خوشی کی ایک لہر پھوٹ اٹھتی۔

البتہ اس دوران وہ حسین لڑکی جس نے اپنا نام کالی بتایا تھا اور جو کسی بھی طرح اس بھیا نک روپ پر پورا نہیں اترتی تھی، لیکن اس نے جو تجربے مجھے کرائے تھے وہ آج بھی میرے دل میں شدید خوف کا باعث بنے ہوئے تھے۔ وہ میرے پاس بالکل نہیں آئی تھی۔ مجھے بھی اس کی ضرورت یا طلب محسوس نہیں ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں میرا ماضی میرے سامنے منہ کھول کر آکھڑا ہوتا۔ ماں باپ، بہن سب یاد آتے اور میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ بچپن انسانی زندگی کا سب سے قیمتی اور ناقابل فراموش دور ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی اچھی یا غلط حرکت بھی انسان کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ محسوس ہوتی ہے۔ قبرستانوں میں بابا کے کہنے پر چلے وطنوں کی مشق کے بجائے فلمی گانے سننا اور اس کے بعد پراسرار وجودوں کی ہم نشینی، خوبصورت واقعات جو ناقابل فراموش ہوتے تھے۔ یہ سب یاد آتے تو اپنا نام بھی یاد آ جاتا اور میں یہ سوچتا کہ میرے لئے وہ دور زیادہ خوبصورت تھا یا یہ دور زیادہ خوبصورت ہے۔ ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہی رہتے، لیکن پھر میری اپنی ناقص سوچ اس میں سے موجودہ وقت کے پلڑے کو زیادہ جھکا دیتی تھی۔ غرض یہ کہ یہ سارے عمل جاری رہے۔ شاستری کبھی کبھی مجھ سے آکر ملتا رہتا تھا۔ اس نے کہا۔

”یہ بات میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ رانا ہریش کھرچی ایک جنوبی قسم کا شکاری ہے۔ عام طور سے وہ ہندوستان بھر کے جنگلوں میں شکار کھیلتا پھرتا ہے اور یہ بات شاید تمہارے علم میں نہ ہو کہ ہندوستان کے جنگل کسی بھی طرح افریقہ یا دوسری دنیا کے جنگلوں سے کم نہیں ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ہمارے ہاں خاص طور سے ہمالیہ کی ترائی میں بکھرے ہوئے جنگل دنیا کے خوفناک ترین جنگلوں سے زیادہ خوفناک ہیں۔ تو تمہیں میں رانا ہریش کھرچی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ رانا ہریش کھرچی ایک نامور شکاری ہے۔

لیکن ان دنوں شکاریوں کی دنیا میں راج ہنس کا پراسرار نام پوری طرح گردش کر رہا ہے۔

”راج ہنس.....؟“

”ہاں.....“

”مگر آپ نے میرا نام تو راج ہنس ہی رکھا ہے۔ شاستری جی!“

”تو میں اور کس نام کی بات کر رہا ہوں؟“

”اوہو..... آپ کا مطلب ہے کہ.....؟“

”ہاں..... اخبارات اور شکاریوں کے مختلف ٹولوں میں راج ہنس کے شکار کی کہانیاں دور دور

تک بکھری ہوئی ہیں۔ شاید تم نے اس کا نام سنا ہو۔ اس کا نام تھا جم کاربٹ۔“

”نہیں میں نے نہیں سنا۔“

”ایک انگریز شکاری ہے اور بہت مشہور ہے، لیکن راج ہنس اس وقت جم کاربٹ پر بھی سبقت

لے چکا ہے۔ کیا سمجھو؟ تمہارے نشانہ بازی کے کمالات میں دیکھ چکا ہوں۔ تم ایک دلیر اور بہادر

انسان بھی ہو۔ بے شک تم پر یہ محنت کی گئی ہے، لیکن جانتے ہو کہ کتنے پر.....؟“

”نہیں سمجھاؤ اس سمجھاتے رہا کرو مجھے شاستری۔“ میں نے پڑعرب لہجے میں کہا۔

”کالی دیوی کے کہنے پر۔ وہ جو تمہیں اپنے خاص ساتھیوں میں شامل کر چکی ہے۔“

”اوہ..... تم ایک بات جانتے ہو شاستری میں وہ سب کچھ کر رہا ہوں جو تم کہہ رہے ہو اور بغیر

پونچھ کر رہا ہوں، لیکن مجھے یہ پونچھنے کا حق حاصل ہے کہ کالی دیوی آخر مجھ پر اس قدر مہربان کیوں

ہو گئی ہے؟“

”دیکھو بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کسی کو اپنا سب کچھ ماننے کے باوجود اسے بتا

نہیں سکتا اور پھر یہ دیوی دیوتا اور اوتار ان کے کام بالکل خفیہ ہوتے ہیں۔ البتہ جتنی میری معلومات

ہے اتنا میں تمہیں بتائے دے رہا ہوں۔ کالی دیوی کی ایک بدترین دشمن روپ گبتالی ہے اور تمہیں

روپ گبتالی کے خلاف ہی تیار کیا جا رہا ہے۔“

”کمال کی بات ہے جسے میں نے عالم تصور میں بھی سمجھی نہیں دیکھا۔ جس کے بارے میں میں

کچھ نہیں جانتا، مجھے اس کے خلاف کام کرنا ہے۔ کمال کی بات نہیں ہے کیا یہ.....؟“

”یہ ہی تو مزے کی بات ہے راج ہنس کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ تمہارے بھی علم سے باہر ہے

اور میرے بھی علم سے باہر ہے۔ لیکن مہا کالی جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ بس تم یہ دیکھو کہ سنسار

میں تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ لو گے اور اسے پالو گے تو پھر ایک آدھ بات کو اگر

دماغ کے اندر چمپا کر رکھا جائے تو کوئی بری بات نہیں ہوگی۔“

”ہوں باتیں تو تم خوب بتا لیتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اب کب مجھے کیا کرنا ہے؟“

”ہاں آج میرا تمہارے پاس آنا اسی مقصد کے تحت ہے۔“ شاستری نے کہا اور میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ شاستری کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔

”تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر تمہیں شکار کے لئے کسی جنگل میں اکیلا چھوڑ دیا جائے تو کیا پورے بھروسے کے ساتھ شکار کر سکتے ہو؟“

”ہاں..... یقیناً..... میں نے خوفزدہ ہونا نہیں سیکھا۔“

”گھوڑے کی سواری کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“

”یہ بات تم ان ٹرینروں سے پوچھ سکتے ہو جنہوں نے مجھے گھڑ سواری کی مشق کرائی ہے۔“

”باگاکا کہنا ہے کہ تم قدرتی گھڑ سوار ہو اور گھوڑا تمہارے پیروں کے نیچے آکر اس طرح سیدھا ہو جاتا ہے کہ یقین نہ آئے۔“

”شاید ایسا ہی ہے۔“

”لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں..... یقین کر لو گے؟“

”ہاں کیوں نہیں شاستری۔“

”یہ سب کالی کا چستکار ہے۔ وہ ہر چیز کو تمہارے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہ ایسے ہی نہیں ہے۔ تم نے جاپ میں اپنا دل جس طرح پتھر کا بنایا ہے وہی تمہارے کام آ رہا ہے۔ ورنہ اچھے اچھے وہ جاپ مکمل نہیں کر پاتے کیونکہ وہ صرف دل کیلئے ہے اور اب اس کے بعد تمہارے سامنے اگر کوئی بڑی سے بڑی خونخوار بلا آ جائے تو تم ڈر نہیں سکتے..... ڈر نہیں سکتے۔“

”ایک سوال اور کروں میں تم سے.....؟“

”کر لو..... کر لو..... اگر جواب دینے کی بات ہوئی تو بھلا شاستری کی کیا اہمیت ہے کہ تمہیں

جواب نہ دے۔“

”آخر یہ روپ گجپالی کون ہے؟ کالی دیوی تو ہندو دھرم میں بڑی طاقت کی مالک سمجھی جاتی ہے۔ یہ روپ گجپالی کا کیا کھیل ہے؟“ جواب میں شاستری نے گردن جھکا لی اور بولا۔

”اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میرے پاس ہاں بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ سسے خود تمہیں روپ گجپالی کی کہانی سنائے گا۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گیا۔ کئی ایسے سوالات کا جواب شاستری اس طرح

دیتا تھا اور وہ سوال تشنہ رہ جاتے تھے۔ اچھا مجھے بھی کوئی دیوانگی نہیں تھی۔ زندگی میری پسند اور میرے مطلب کے مطابق گزر رہی تھی۔ اس لئے بہت زیادہ الجھنوں کا شکار ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

شاستری یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب کسی بھی دن میری روانگی متوقع ہے۔ وہ تو چلا گیا لیکن وہ لوگ جو میری تربیت کر رہے تھے بڑی محنت کے ساتھ مجھے ہندوستان میں بکھرے ہوئے ان جنگلوں کے بارے میں تفصیلات بتانے لگے جو ہندوستان کے نائی گرائی جنگل تھے۔ ویسے بھی وہ مجھے جنگلوں کے بارے میں مزید بتا رہے تھے اور وہاں کی خصوصیات سے آگاہ کر رہے تھے۔ میں نے ان تمام باتوں کو ذہن نشین کر لیا تھا کیونکہ جس طرح مجھے شاستری نے بتایا تھا کہ ہریش کھرجی! جنگلوں کا رسیا ہے اور مجھے اسے اپنے قبضے میں کرنا ہے اور اسے قبضے میں کرنے کا ایک ہی بہتر طریقہ یہ تھا کہ میں اس کی پسند کا انسان بن جاؤں اور پھر جو کچھ شاستری نے شروع کیا تھا۔ وہ بھی قابل غور تھا۔

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ سوائے اس کے کہ کالی دیوی کا روپ گجپالی سے مقابلہ تھا اور روپ گجپالی کسی بھی شکل میں رانا ہریش کھرجی کے پاس موجود تھی۔ مجھے رانا ہریش کھرجی کے پاس اپنے لئے جگہ بنانی تھی۔ یہ تھا سارا کھیل! پھر میں نے آخری عمل کیا۔ یعنی رانا ہریش کھرجی کے بارے میں ایک بار پھر شاستری سے سوالات کیے کہ وہاں کون کون ہے؟ کیا کیا ہے؟ وہ تقریباً خاصی تفصیل مجھے بتا چکا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا مجھے کہ وہاں روپ وتی جو اس کی بہن ہے بہت بڑی حیثیت رکھتی ہے اور رانا ہریش کھرجی اپنی بہن کو بہت چاہتا ہے۔ خیر یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔ وہ رانا ہریش کھرجی کا معاملہ تھا۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا۔

آخر کار شاستری نے مجھے بتایا کہ اب مجھے روانہ ہو جانا ہے اور اس کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ جنگلوں میں شکار کے دوران ہی مجھے ہریش کھرجی سے متعارف ہونا ہے اور اس وقت ہریش کھرجی کا سری کے جنگلوں میں شکار کھیل رہا ہے۔ کاسری کے بارے میں مجھے تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ ایک پہاڑی جنگل تھا اور وہاں ہر طرح کے درندے پائے جاتے تھے۔ میرے ساتھ دو شکاری کر دیئے گئے تھے۔ جنہیں ایک ریاست کا حکمران بنایا گیا تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ جب بھی اگر میری ملاقات ہریش کھرجی سے ہو تو میں اسے یہی بتاؤں کہ یہ دونوں ریاست کے رئیس مجھے شکار میں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ یہاں سے مجھے اگر میں چاہوں تو ہریش کھرجی کے ساتھ ہو جانا ہے۔

کاسری کے جنگلوں میں روانہ ہونے کیلئے دو جھپوں کا تعین کیا گیا۔ پہاڑی علاقوں میں یہ جنگل کافی وسعت میں بکھرا ہوا تھا اور اس کے بارے میں بھی میری یادداشت میں بہت کچھ محفوظ تھا۔

تک کہ رات ہو گئی۔ اس وقت تاحد نگاہ رات کی تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ قرب و جوار میں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کا یہ سلسلہ دور دور تک بکھرا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے لاتعداد انسان رات کی تاریکی میں سر جھکائے گھنٹوں کے بل بیٹھے ہوئے کسی دشمن کی تاک میں ہوں۔ چٹانوں کے درمیان جھاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ جن میں کبھی کبھی سرسراہٹیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ہم نے جہاں قیام کیا تھا وہاں آگ لگا دی تھی تاکہ حشرات الارض یا درندے یہاں کا رخ نہ کریں۔

رات کافی دیر تک ہم اس آگ کے قریب بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میرے دونوں ساتھی بہت کم کھوتے یا پھر وہ مجھ سے کافی حد تک خوفزدہ بھی تھے۔ پھر آسمان پر گہرے بادل چھانے لگے اور مناظر دھندلے سے ہو گئے۔ کسی بھی لمحے بارش ہو سکتی تھی۔ میں اس سفر سے ابھی تک بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ساری رات اور پھر سارا دن بارش نہیں ہوئی حالانکہ بادل اس قدر گہرے چھائے ہوئے تھے کہ اندازہ ہوتا تھا کہ بارش کسی وقت بھی آسمان سے پھسل سکتی ہے، لیکن بارش ایک بوند بھی نہ برسی۔

اب تک ان جنگلات کے مناظر اور یہاں کے ماحول نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا تھا اور میں بے حد خوش تھا، لیکن اب یہ جاننے کے بعد کہ یہاں سے ہمارا عمل شروع ہو گا۔ میں ایک دم محتاط ہو گیا تھا۔ ویسے اپنے اندر کا جائزہ لیتا تو اب یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جس کام کیلئے مجھے منتخب کیا گیا ہے میں اسے بخوشی سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ جنگل کے مناظر اور خوش آنے والے واقعات بڑے سنسنی خیز تھے اور اکثر رات کی تنہائیوں میں جب میں ان واقعات پر غور کرتا تو ایک عجیب سی بات پر فہمی آ جاتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ پہلے جب میرے والد زندہ تھے اور میں ان کے ساتھ وقت گزار رہا تھا تو مجھے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ پراسرار روحیں میرے ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں اور انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے اور اب جب حالات بدلے تھے اور ایک طرح سے مجھ سے میرا ایمان بھی چھین گیا تھا تو میں گزری ارواحوں کے نرے میں آ گیا تھا۔ خاص طور پر کالی دیوی میری حفاظت کر رہی تھی۔ کئی بار اس کا تجزیہ ہو چکا تھا اور میرے اندر ایک اعتماد سا جاگ اٹھا تھا کہ جنگل کا یہ خوفناک ماحول مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ہم کاسری کے جنگلات میں رانا ہریش مکرجی کو تلاش کر رہے تھے۔ اسے وسیع و عریض جنگلات میں کسی ایک شخص کا مل جانا بھی ایک مزاحیہ بات تھی۔

لیکن اس رات قیام کے دوران ہم نے گولی چلنے کی آواز سنی تو ایک دم چوک پڑے۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک نے جس کا نام بہاری لعل تھا، مجھ سے کہا۔

”یوں لگتا ہے نس مہاراج! کہ شاید ہم اپنی منزل کے قریب آ گئے ہیں۔ رانا ہریش یہیں آس

میرے پاس بہت ہی اعلیٰ قسم کی رائفل موجود تھی جسے میں بڑی عمدگی سے استعمال کر سکتا تھا اور اس سے میں نے نشانوں کے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔ جن سے شاستری خود بھی متاثر ہوا تھا۔ بہر حال اس طرح سفر کرتے ہوئے ہم ایک بستی تک پہنچے۔ یہ ان آبادیوں کی آخری بستی تھی اور یہاں ہمارے لئے عمدہ قسم کے گھوڑوں کا بندوبست تھا۔ یہ گھوڑے کس طرح فراہم کئے گئے یہ تو نہیں معلوم ہوا، لیکن ان میں جو گھوڑا مجھے پسند آیا وہ براؤن رنگ کا بہت ہی خوبصورت گھوڑا تھا اور اس کی پشت پر بیٹھ کر سفر کا لطف آ سکتا تھا۔ سامان وغیرہ بھی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ وہ دو آدمی جنہیں ان کی اوقات سے بڑھ کر حیثیت دی گئی تھی میرے ساتھ تھے اور بظاہر وہ جو کچھ بھی بنے ہوئے تھے، لیکن میرے سامنے ہمیشہ سر جھکاتے تھے۔

یہاں سے شاستری ہم سے جدا ہو گیا اور ہم آگے کے سفر کی تیاری کرنے لگے۔ کچھ وقت کے بعد آخر کار ہم کاسری کے ابتدائی سرے سے اندر داخل ہو گئے۔ اس جنگل کے بارے میں مجھے کافی تفصیلات فراہم کر دی گئی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی حسین قسم کے مناظر نے ہمارا استقبال کیا۔ اس وقت ہم نے ایک بلندی جگہ اپنا کیمپ لگایا ہوا تھا کہ ہمیں پہلی بار بھاگ دوڑ سنائی دی اور ہم تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے جنگل کی زندگی کا پہلا حسین منظر دیکھا۔ ایک تیندوا نل گائے کا تعاقب کر رہا تھا اور نل گائے اپنی جان بچانے کیلئے بہت تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ تیندوے نے تھوڑی ہی دیر کے بعد نل گائے پر چھپنا مارا، لیکن نل گائے اسے پکڑ دے کر جھاڑیوں میں گھس گئی اور اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

مجھے یہ منظر بہت ہی خوبصورت لگا تھا۔ بہر حال پہلے سفر کے بعد ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ گھوڑے بہت ہی شاندار تھے اور ان پر سفر بہت ہی دلچسپ لگ رہا تھا۔ ہم قرب و جوار کے مناظر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ تقریباً آج کا یہ سفر سارا دن جاری رہا۔ ہمارے دائیں سمت خوبصورت پہاڑی سلسلے دور دور تک چلے گئے تھے، جن کے دامن میں پہاڑی غمخوروں کے قافلے گھنٹیاں بجاتے نیچے اتر رہے تھے اور پہاڑیوں کے دامن میں بہتے ہوئے دریا کے پانی سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔ ایسے کئی قافلے ہم نے جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ شام کے وقت ہم ایک پہاڑی گاؤں میں پہنچ گئے جہاں چھوٹے چھوٹے مندر بنے ہوئے تھے۔ اطراف میں بکھرے ہوئے سناٹے ہولناک مناظر پیش کر رہے تھے۔ رات ایک مندر کے پاس گزارنے کے بعد صبح کو ہم نے پھر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے سے گزر کر ایک گہری وادی میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ندی گزرتی ہوئی کافی تیز رفتار ہو جاتی تھی اور اس کا شور بھی بے پناہ تھا۔ یہاں

ہے اور وہاں سے شیر کے شکار کی تیاری ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں بھی مستعد ہو گیا اور ہم نے ایک درخت کے پیچھے پناہ لی لیکن ہمیں یہاں آئے ہوئے کوئی ایک گھنٹہ گزرا تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے والے درخت سے ایک شخص نیچے اتر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں راکفل تھی اور غالباً اس نے زمین پر آ کر شکار کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن میری آنکھوں نے اس کے کچھ لمبے گز پیچھے اس خوفناک لمبے شیر کو بھی دیکھ لیا تھا جو بالکل زمین سے چپکا ہوا اس کی گھات میں آگے بڑھ رہا تھا۔

میرے خون کی روانی ایک دم تیز ہو گئی۔ بڑا دلچسپ کھیل ہو رہا تھا یہ تو۔ وہ شخص بالکل مخالف سمت میں جا رہا تھا جبکہ شیر خود اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ تو شکاری کے شکار ہونے والی بات تھی۔ شیر کا اور اس کا فیصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ بہاری لعل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”مہاراج! ہوشیار..... وہ ہریش مکھرجی ہی ہے اور اس وقت اس کا جیون موت کی ٹوک پر رکھا ہوا ہے۔“ ابھی بہاری لعل نے اپنا جملہ ختم ہی کیا تھا کہ شیر خوفناک انداز میں دھاڑا اور اس نے خوب لمبی رفتار لگائی۔ وہ فضا میں بلند ہوا ہی تھا کہ اچانک میری راکفل چل گئی۔ قسم کھا کہ میں نے اس میں میری کسی کوشش کو دخل نہیں تھا۔ بس مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پکڑ کر اوپر کیے ہوں اور میری راکفل کو چلا دیا ہو۔ ایک دو تین تین گولیاں یہاں چلی تھیں اور شیر جو لمبی چھلانگ لگا کر اس شخص پر جو شاید خود شیر کی تلاش میں آگے بڑھ رہا تھا، پہنچ چکا تھا کہ میری گولیوں کا شکار ہو گیا۔ وہ صرف دو یا تین فٹ کے فاصلے پر رانا ہریش مکھرجی کے پاس گرا تھا اور زمین پر لوٹ رہا تھا۔

رانا ہریش مکھرجی! یاد وہ جو بھی شخص تھا۔ پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔ غالباً اس کے اعصاب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ فوراً ہی چاروں طرف سے تیز روشنیوں نے اس منظر کا احاطہ کر لیا اور پھر ہفت سے لوگ دوڑ پڑے۔ ان کی تعداد دس یا گیارہ تھی۔ وہ رانا ہریش مکھرجی کے پاس پہنچ گئے۔ ہاری لعل نے یہ تصدیق کی تھی کہ وہ ہریش مکھرجی ہی ہے اور میں نے بھی اس کی بات مان لی تھی۔

پھر رانا ہریش مکھرجی کو ہوش آ گیا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے ہلکے پوچھنے لگا۔ غالباً وہ پوچھ رہا تھا کہ گولی کس نے چلائی۔ کسی نے بھی اعتراف نہیں کیا۔ تو میں آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ چل کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جبکہ کر شیر کو دیکھا جواب دم توڑ رہا تھا۔ گولیاں بڑی کارگر رہی تھیں۔ صرف ایک لمبے لاتا خیر ہو جاتی تو شیر نے رانا مکھرجی کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہوتا۔

وہاں جتنے افراد تھے سب کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ رانا ہریش مکھرجی بھی پھٹی پھٹی

پاس ہو سکتا ہے۔“

”یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم.....؟“ کیا ان سارے جنگلوں میں رانا ہریش مکھرجی ہی شکار کھیل سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ گولی کسی اور شکاری نے چلائی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شکاری کا معاملہ ہی نہ ہو۔“

”میں معلوم کرتا ہوں۔“ اس شخص نے کہا اور معلومات کرنے کیلئے چلا گیا۔ پھر کوئی آدمی گھٹنے کے بعد آ کر اس نے بتایا۔ ”مہاراج! ان تھوڑے ہی فاصلے پر گہرائیاں ہیں اور ان گہرائیوں میں خیمے لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف گھٹے جنگل ہیں اور وہاں شاید شیر کو گھیرا گیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ہاں کھلاتا ہے مہاراج رات کی تاریکی میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ ہانکے والوں کی آوازیں سنیں گے۔“ بہاری لعل مجھے ہانکے کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔ شیر اگر کہیں نظر آ جاتا ہے یا کوئی اور جنگلی جانور تو اسے چاروں طرف سے گھیرا جاتا ہے اور ایک موقع پر لا کر اس پر گولی چلائی جاتی ہے۔ بہاری لعل نے بتایا کہ وہ رانا ہریش مکھرجی ہی ہے۔“

”تو پھر اب.....؟“

”اچھا تو یہ ہو گا مہاراج کے ہم بھی آگے چلیں اور اس کے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ جائیں۔“

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا اور اس کے بعد میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ پیدل ہی ان جنگلات کی طرف چل پڑا۔ گھوڑوں کو ہم نے یہیں آزاد چھوڑ دیا تھا، کیونکہ بہر حال ان کی زندگی بھی خطرے میں تھی۔ ہم ان کو درختوں سے بائیں کر ان کی جان نہیں لینا چاہتے تھے کہ بندھے ہوئے گھوڑوں پر اگر کوئی درندہ حملہ کر دے تو وہ بھاگ کر اپنی جان بھی نہ بچا سکیں۔ میرے دونوں ساتھی بھی پراسرار قوتوں کے مالک تھے۔ ظاہر ہے کالی دیوی کے حکم پر انہیں میرے ساتھ کیا گیا تھا۔ یقیناً ان کے پاس بھی بہت کچھ ہو گا اور اس کا تجربہ مجھے راستے میں ہوتا بھی رہا تھا۔ یہ دونوں دو بڑے شکاریوں کی حیثیت سے میرے ساتھ تھے لیکن میرے غلاموں کی طرح میرا ساتھ دیتے تھے۔ جہاں انسانوں کی موجودگی کا قہور اٹھوڑا احساس ہوتا تھا۔ ہانکے والوں نے شیر کو اپنے پیچھے گھیر رکھا تھا۔

میرے دوسرے ساتھی نے کہا۔ ”مہاراج! ہوشیار رہیں راکفل سنبھالے رکھیں۔“ میری نگاہیں دور دور تک کا جائزہ لے رہی تھیں اور میں نے بخوبی یہ دیکھ لیا تھا کہ ایک درخت پر چھاند باندھا گیا

آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ میری رائفل کی جانب اٹھی۔ ایک شکاری فوراً پہچان سکا ہے کہ کون سی رائفل سے کتنی دیر پہلے گولی چلائی گئی ہے۔ میری رائفل کو دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت شیر جس رائفل کی گولیوں کا شکار ہوا ہے وہ یہ ہی رائفل ہے۔ اس کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اس وقت آپ میرے لئے زندگی کے فرشتے ثابت ہو۔“ ایک شکاری بھلا کیوں نہیں جان سکتا کہ وہ کن حالات کا شکار ہو گیا تھا اور موت اس سے کتنی دیر رہ گئی تھی۔ کسی کا شکریہ ادا کر دینا اور وہ بھی دو الفاظ میں بڑی آسان اور سادہ سی بات ہے لیکن کہنے جو کچھ کیا ہوتا ہے اسے اس کا صحیح مقام دینا بھی ایک بڑا ہی مشکل کام ہے۔ میں آپ کا بے شکریہ گزار ہوں کہ آپ نے اس سے میرا جیون بچایا۔ اس سے بڑا احسان اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے وہی الفاظ ادا کرنے تھے جو اس وقت ادا کیے جاسکتے تھے۔“

”اور مجھے خوشی ہے کہ میں ایک بہادر شکاری کے بروقت کام آ گیا۔ میرا نام راج ہنس ہے میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور نہ صرف رانا ہریش کھر جی بلکہ اس کے ساتھ تمام لوگ حیرت سے اچھل پڑے۔“

یہ بات میرے علم میں تھی کہ شاستری نے منصوبے کے مطابق میرا نام ایک بڑے اور شکاری کی حیثیت سے دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ یہ سب کچھ بڑی ذمہ داری کے ساتھ ہو رہا تھا۔ آ کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔

”راج ہنس!“ ادھر رانا ہریش کھر جی! میرا ہاتھ چھوڑ کر میری طرف لپکا اور دوسرے لمبے نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

”تو آپ ہیں راج ہنس! ہونا ہی چاہئے تھا۔ آپ کے سوا بھلا کون ہو سکتا تھا جو اس طرح جیون بچا لیتا۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ ہمیں ملے۔“ منصوبے کے مطابق ہی میرے دونوں ساتھیوں نے کہا۔

”اب تم یہاں اپنی تعریفیں کراتے رہو گے یا واپس بھی چلو گے۔ اپنا کارنامہ سرانجام دو۔ تم چلو۔“ دونوں ہی کا لہجہ بہت خراب تھا۔ یہ سب منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ رانا ہریش کھر نے چونک کر انہیں دیکھا اور بولا۔

”یہ کون ہیں.....؟“

”ہم جو کوئی بھی ہیں رانا جی آپ کا جیون بچ گیا۔ بس اب آپ اپنا راستہ ناپیں۔“

”بھائی میں تو شکریہ ادا کر رہا ہوں اور آپ لوگ ہیں کون.....؟“

”میں بتاتا ہوں رانا صاحب!“ میں ابھی شکاری دنیا میں نیا آیا ہوں۔ شوق بچپن کی عمر سے ہی رہا ہے۔ میرے ہاتھی بھی ایک ماہر شکاری تھے۔ ان کے ہی جنگلوں میں بھٹکتا پھرا ہوں مگر ہم غریب لوگ تھے۔ غربت کی وجہ سے کوئی بڑا نام نہیں کما سکے بس راجہ مہاراجاؤں کے ہاں نوکریاں ہی کرتے رہے۔ میں بھی ان لوگوں کی چاکری کرتا ہوں۔“

”کہانیاں ختم ہو جائیں تو واپس آ جانا ہم چلتے ہیں۔“ میرے دونوں ساتھیوں نے کہا اور واپس کیلئے مڑ گئے۔ رانا ہریش کھر جی افسوس بھری نگاہوں سے مجھے اور انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”یہ تو اتنا چار ہے۔ اتنا بڑا نام..... میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ راج ہنس جی کوئی بہت بڑے جاگیردار ہوں گے اور اب جب وہ شکاری دنیا میں لٹکے ہیں تو انہوں نے اپنے کارنامے دکھائے ہیں۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ ایک چھوٹا سا کام کر لیا ہے آپ چاہیں تو مجھے اپنا جیون بچانے کیلئے سو بچاس روپے دے سکتے ہیں۔ ضرورت نہیں ہے مجھے پر میری اوقات یہ ہی ہے۔“

”ہرے رام ہرے رام ہرے رام! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ اگر ایک بات کہوں میں آپ سے تو اسے آپ جھوٹ سمجھیں گے۔“

”نہیں مہاراج! کہئے آپ کیا بات ہے؟“

”کتنا بڑا پر پوار ہے آپ کا؟“ رانا ہریش کھر جی نے سوال کیا۔

”جتنا بڑا آپ کے سامنے کھڑا ہے۔“

”مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ ہری رام چندر جی جو میرے ساتھ تھے اور پردھان سنگھ جی، دونوں آپس میں چاہئے تائے کے بیٹے ہیں۔ بس انہیں کے ساتھ رہتا ہوں۔ کھانا کپڑا دے دیتے ہیں۔ تھوڑی سی تنخواہ دے دیتے ہیں۔“

”میں معافی چاہتا ہوں ہنس راج جی! میں نے اپنا تعارف تو آپ سے کرایا ہی نہیں۔ میرا نام ہریش کھر جی ہے۔ جا سیری میں میری جائیداد ہے۔ وہیں رہتا ہوں۔ شکار کا بہت شوقین ہوں۔ آپ اگر چاہو تو اسی سے انہیں چھوڑ دو۔ میں آپ کو آپ کا صحیح مقام دوں گا۔“ میں نے گہری نگاہوں سے رانا ہریش کھر جی کو دیکھا۔ پھر بولا۔



”میں بھی ایک بات کہوں گا۔ آپ جھوٹ تو نہیں سمجھیں گے۔“

”بالکل نہیں آپ کہیں۔“

”آج ہی میں نے دل میں فیصلہ کیا تھا کہ یہ چند دن ان کے ساتھ بتالوں اس کے بعد ان کو نوکری چھوڑ دوں گا۔ بہت ہی بد دماغ لوگ ہیں۔ ان کا کام خود کرتے ہیں۔ الزام مجھ پر لگا دیتے ہیں۔ ایک بھی کار تو س ضائع ہو جائے تو سو باتیں سننے کو ملتی ہیں۔“

”ارے تو لعنت بھیجے آپ ان پر اور چلے میرے ساتھ ابھی اور اسی سے کیا سامان ہے اا

کہاں..... آپ کا.....؟“

”کچھ بھی نہیں ہے۔“

”ہوتا بھی تو بھی میں آپ سے یہ ہی کہتا کہ چھوڑ دیجئے انہیں آپ۔ ابھی چلیں میر۔

ساتھ۔“ میں نے خاموشی سے گردن جھکا دی۔

حالانکہ ایسے کام اتنی جلدی سے نہیں ہو جاتے۔ دوسرے کوشہ بھی ہو سکتا ہے لیکن رانا ہریش کھرچی جس طرح مجھ سے متاثر ہوا تھا کہ فوراً ہی مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا اور میں نے بھی سوچا کہ بہت زیادہ وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان دونوں کو تو میرے ساتھ لے لے لگا گیا تھا کہ میں جس طرح بھی ممکن ہو سکے رانا کھرچی کا قرب حاصل کر لوں بلکہ یہ کہا جائے غلط نہیں ہو گا کہ اس علاقے میں ہم آئے ہی اس لئے تھے۔ ساری معلومات شاستری نے کر لی تھیں کہ رانا کھرچی ان دنوں کہاں شکار کھیل رہا ہے اور اس کے بعد مجھے ان لوگوں کے ساتھ یہاں؟ گیا تھا۔

بہر حال میں نے رانا ہریش کھرچی کے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور وہ لوگ مجھے نے اپنے کیمپ کی جانب چل پڑے۔

+++

جام سری سرسبز و شاداب شہر تھا۔ ہر طرف درخت لہلہا رہے تھے۔ پتہ یہ چلا کہ یہ شہر رانا ہریش کھرچی کے پرکھوں نے آباد کیا تھا اور اس کے بعد سے یہ بہت خوبصورت چلا آ رہا تھا۔ اس کے گرد ب دریا بہتا تھا جو اسے شاداب کرتا تھا۔ ہریش کھرچی کی حویلی بھی خوبصورت درختوں میں گھری لی تھی۔ اندر اور باہر سے انتہائی شاندار تھی۔ بہت ہی اعلیٰ درجے کا مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے جا کر رانا ہریش کھرچی کی رہائشی عمارت تھی۔ بالکل راجاؤں کے سے ٹھاٹھ پاٹ تھے۔ مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا۔

چونکہ میں نے ہریش کھرچی کی زندگی بچائی تھی جس کا تذکرہ خاص خاص لوگوں سے بھی کیا گیا۔ چنانچہ میری بڑی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ میں بہر حال یہاں پہنچ گیا تھا۔ جہاں شاستری مجھے پہچانا ہوا تھا۔ ایک نام لیا تھا۔ اس نے وہ تھا ”روپ گبتالی“۔ یہ روپ گبتالی کیا چیز تھی؟ اس کے بارے میں ابھی تک تو کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ ہاں اتنا پتہ چلا تھا کہ ہندوؤں کی بہت ہی مقدس دیوی کالی کی موجد کالی سے ”روپ گبتالی“ کی دشمنی چل رہی تھی۔ اس کا مقصد ہے کہ روپ گبتالی بھی کوئی ولی شخصیت نہیں ہوگی۔ لیکن اس حویلی سے اس کا کیا تعلق ہے؟ یہ تو اب بعد میں ہی پتہ چلنے والا۔ یہاں مجھے ہر طرح کی سہولتیں حاصل تھیں۔ میں مہمان خانے میں رہ رہا تھا۔ مہمان خانوں کے اچھے تھے لیکن اس وقت تبہا میں ہی اس مہمان خانے میں شامل تھا۔

غالباً تیسرا دن تھا۔ جب دو خادما میں میرے پاس آئیں اور ان میں سے ایک نے کہا۔

”آپ کو راج ورتی جی بلایا رہی ہیں۔“

”کون.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”راج ورتی؟“ راج ورتی کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات جو مجھے حاصل ہوئی تھیں۔ رانا کھرچی کی بہن تھی۔ بس اس سے زیادہ اس کے بارے میں اور کچھ نہیں معلوم تھا لیکن اس نے کیوں بلایا ہے؟ میں نے خادماؤں سے کہا۔

”آپ کو یقین ہے کہ راج وٹی جی نے مجھے ہی بلایا ہے؟“ خادماؤں نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بولیں۔

”اس میں یقین نہ ہونے کی کیا بات ہے؟“ میں خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑا۔ پہلی بار اندرونی عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن دل میں یہ خیال بھی تھا کہ کہیں یہ بات رانا ہریش کھرچ کے مزاج کے خلاف نہ ہو۔ عام طور سے باہر کے لوگوں کو اندرونی حصوں میں نہیں بلایا جاتا، لیکن بہر حال میں مجبور تھا۔ ملازمائیں جو بڑے خوب صورت لباس پہنے ہوئے تھیں۔ مجھے لئے ہوئے اندرونی حصے میں پہنچیں اور انہوں نے مجھے بہت ہی عالیشان ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا وسیع و عریض ڈرائنگ روم کریم اور سنہری کمر کے فرنیچر اور پردوں کے ساتھ خوبصورتی سے سجا ہوا تھا ملازماؤں نے کہا۔

”آپ یہاں بیٹھ کر انتظار کیجئے ہم کماری جی کو جا کر اطلاع دیئے دیتے ہیں۔“ کماری جی راجوٹی جی کو ہی کہا جاتا ہوگا۔ ویسے میں نے زندگی میں راجاؤں مہاراجاؤں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کے بارے میں صرف سنا ہی تھا۔ میں تو ایک معمولی سے گھرانے کا آدمی تھا۔ اگر وہ صاحب میرے لئے اس رقم کی عنایت نہ کر جاتے تو شاید اس وقت بڑی معمولی سی نوکری کر رہا ہوں لیکن وہ رقم کافی عرصے تک میرا ساتھ دے چکی تھی اور اب بھی ایک اچھی خاصی تعداد ایک ایسی محفوظ تھی جہاں اگر جا کر میں اسے حاصل کرتا تو وہ مجھے بآسانی مل سکتی تھی۔ بہر حال میں انتظار رہا۔ دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور اس کے بعد مجھے شدید غصہ آنے لگا یہ کیا بیوقوفی ہے۔ مجھے یہاں لا کر بٹھا دیا اور اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ پتہ نہیں رانا کھرچ کی کم ہے؟ میں نے غصے میں سوچا کہ اب مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہئے، لیکن میں اٹھنے کا ارادہ کرتا تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر جو شخصیت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر ساری کوفت دو گئی۔ مجھے تو یہ احساس تھا کہ ہو سکتا ہے یہ کماری راجوٹی جی کوئی عمر رسیدہ سنجیدہ سی خاتون ہوں انہوں نے مجھے ہو سکتا ہے روپ گیمانی کے سلسلے ہی میں بلایا ہو، لیکن جو شخصیت اندر داخل ہوئی وہ تو عمر اور شوخ آنکھوں والی ایک حسینہ تھی۔ جس کا قیامت خیز حسن ایسا تھا کہ ایک لمحے کیلئے تو کھوپڑی ہی پھرا گئی تھی۔ میں نے زندگی میں اتنی خوبصورت اور دل فریب لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں پلک جھپکاتا بھول گیا اور اسے گھورتا رہا۔ راجوٹی کی عمر بمشکل بیس سال ہوگی اور اگرچہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ ایک ہندوستانی شہزادی ہے تو میں اسے کوئی غیر ملکی لڑکی تصور کرتا۔ اس کے بالکل سنہرے اور بے حد لمبے تھے۔ خاص طور سے سر پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں کسی

اطرح گہری اور نیلی تھیں اور ان میں لگی ہوئی کاجل کی لکیریں تیر کی طرح دونوں سمت پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا مگر قیمتی تھا۔ اس کا قد دراز تھا اور وہ اتنے باوقار اور شاہانہ انداز میں ٹری ہوئی تھی کہ میرے لئے اس پر زیادہ دیر نگاہیں جمائے رہنا ممکن نہ رہا۔ پھر جب اس کی سرخ ریلے ہونٹوں کی جنبش ہوئی تو میں جیسے خواب سے چونک اٹھا۔ اس کی مترنم آواز نے کمرے میں ایسا ہوا طعم توڑ دیا۔

”کیا تم دماغی توازن کھو چکے ہو.....؟“ انداز میں ایک حکمت لیکن خوبصورتی تھی۔

”جی.....“ میں حیران ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم کوئی نچلے درجے کے انسان ہو۔ تمہیں گفتگو کے آداب بھی نہیں ہے۔“ کماری راجوٹی کی آواز پھر ابھری۔

”جی، جی..... مم..... مم میں.....“ میرے منہ سے نکلا اور اس کے ہونٹوں پر ایک دل فریب لراہٹ پھیل گئی۔

”ذرا اپنی آواز پر غور کرو جی، جی، مم، مم میں۔“ یہ تو بکروں جیسی آواز ہے۔ ویسے تمہارے سے میں میں نے جو سنا ہے وہ تو تم نظر نہیں آئے۔“

اچانک ہی میں نے اپنے آپ کو سنبالا۔ میرا چہرہ غالباً سرخ ہو گیا تھا۔ باقی ساری باتیں اپنی لیکن ایک نوعمر خوبصورت لڑکی میری توہین کر رہی ہے۔ میں خاموش رہا۔ وہ بڑی حکمت کے ساتھ ام افغانی ہوئی آگے بڑھی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور مدغم سی راہٹ جیسے وہ روکے ہوئے تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے وہ میری بدعوا سی پر لطف لے رہی ہے۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے میرے بھائی رانا ہریش کھرچ کی جان بچائی ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ تم ایک ماہر شکاری ہو اور تمہاری دھوم جگہ جگہ مچی ہوئی ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اب تم اسے ساتھ ہی رہا کر دو گے۔ کیا کہتے ہو اس بارے میں؟“ میں نے اب اپنے آپ کو سنبال لیا جتنی توہین ہو گئی تھی اتنی ہی کافی تھی۔ میں نے اب بھی خاموشی اختیار کی۔

”کیا تم خاموش رہنے کیلئے ہمارے پاس آئے ہو؟“

”آپ ہی بتائیے کہ آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے؟“ پہلی بار میری آواز ابھری اور اتنی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ ہوئی ناں بات۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تمہیں غصہ دلانا چاہتے تھے۔ ہمیں جی، جی، میں

اور میاؤں میاؤں والے لوگ پسند نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ انسانوں سے انسانوں ہی کی طرح باتیں کریں۔ اب تمہارے لہجے میں جو غصہ پیدا ہوا ہے وہ ہمیں بہت پسند آیا ہے۔ تمہاری آواز بھی بہت اچھی ہے اور تمہاری شخصیت بھی بہت خوبصورت، غصے میں تمہارے رخسار سرخ ہو گئے تھے اور ہمیں اس طرح کے سرخ چہرے والے نوجوان بہت پسند آتے ہیں۔ بات ہی مختلف ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کی۔

”بھٹو..... بیٹھے کیوں نہیں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ ہم نے تمہیں مہمانوں کی طرح بلایا ہے اور ویسے ہی تم ہمارے محسن ہو۔“ میں ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گیا اور پھر میں نے کہا۔

”دیکھئے بات اصل میں یہ ہے کہ آپ نے ساری باتیں تقریباً سچ ہی کہی ہیں۔ میں ایک ملحد سطح کا انسان ہوں۔ اس سے پہلے میں کبھی اتنی شاندار حویلی میں نہیں گیا۔ اس سے پہلے میں اتنے شاندار لوگوں سے گفتگو نہیں کی اور سچی بات کہوں کہ اس سے پہلے میں نے کبھی اتنی خوبصورت لڑکی سے بات نہیں کی۔ جسے دیکھتے ہی انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔“ یہ آخری جملے میں۔ ہوش و حواس کے عالم میں کہے تھے اور دل ہی دل میں گھکھکھاتے ہوئے اپنی محافظ روحوں سے درخواست کی تھی کہ اگر میری شامت آ رہی ہے تو مجھے اس سے بچائیں، لیکن میں نے اس کے سر ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی اور وہ بولی۔

”اچھا جناب! اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ایک دم ہوش آ گیا ہے اور اب آپ ہمیں بیوقوفانے پر تہل گئے ہیں۔“

”نہیں کماری جی! میں نے کون سی بات میں آپ کو بیوقوف بنایا ہے؟“

”ویسے ہم آپ سے ایک بات کہیں آپ کا نام ہنس راج ہے نا؟“

”جی جی جی۔“

”صرف جی کہیں جی، جی کیا ہوتا ہے؟“ وہ بولی۔

”جی میرا نام ہنس راج ہے۔“

”ہنس راج جی! ہمیں کسی بہت اچھے دوست کی ضرورت ہے۔ ہم نے ایک بات بہت غلط کر دی ہے۔ جس کیلئے ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا تھا نا کہ آپ غلطی سے آدھے ہیں۔ آپ نے اس بات کو خاص طور سے محسوس کیا۔ چونکہ اپنے الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔“

”نہیں محترمہ! سچ تو جی ہی ہے اور سچ سے گریز ممکن نہیں ہے۔ بہر حال یہ آپ کی بڑائی ہے آپ نے کسی وجہ سے مجھے طلب کیا۔“ اچانک ہی اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے

کسی قدر روٹھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

”ٹھیک ہے طر کیے جائیے آپ۔ میں نے تو ایک طرح سے معذرت کر لی ہے۔ اب آپ مجھے معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ بہر حال آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے ان کی کا جیون بچایا۔ اس کیلئے میں آپ کی ابھاری ہوں۔“

میں نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”بات وہی آ جاتی ہے کماری جی! کہ میں آپ کے سامنے بڑی معمولی سی شخصیت کا مالک ہوں اور میری مجال نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے دلی تلخ بات کہہ سکوں۔ آپ مجھے حکم دیجئے کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“

”دوستی کیلئے“ کہہ چکی ہوں کہ مجھے ایک اچھے ساتھی اور ایک اچھے دوست کی ضرورت ہے۔“

”اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو آپ رانا جی سے بات کریں۔ میرے لئے جو حکم ان کا دگا میں اسے سرانجام دوں گا۔“

”کرلوں گی، کرلوں گی، کرلوں گی۔ میں خوش نہیں ہوئی آپ سے چلتی ہوں۔“ اس نے کہا رنجیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ کچھ عجیب سی شخصیت تھی اس کی۔ میں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کجنت اتنی حسین تھی کہ انسان کا دل اس کے ہاتھوں سے نکل جائے۔ وہ انہوں سے اوچل ہو گئی تو میں جبر جبری لے کر اٹھ گیا۔ اب اتنا معزز انسان بھی نہیں تھا کہ آرام سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا۔ بہر حال اٹھا اور خود بھی آکر مہمان خانے میں بیٹھ گیا۔ پھر اس کے بعد پورا دن کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو قابل ذکر ہوئی۔ شاستری یا اس کے کسی حواری نے بھی اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا اور جب تنہائی ہوئی تو سوچوں کے دائرے اتنے وسیع ہو جاتے کہ ہرے لئے صورتحال کو سنبھالنا مشکل ہوتا۔ رات کا کھانا بھی مجھے مہمان خانے ہی میں دیا گیا اور یہ پچھائی تھا، کیونکہ بہر حال اب تک جو صورتحال تھی وہ کسی بھی طور پریشان کن نہیں تھی۔ شاستری کے ان بھی مجھے بھائی ترکاری دی جاتی تھی۔ یہاں بھی وہی ہوتا لیکن نجانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بھن کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر رات ہو گئی۔ حویلی میں سناٹا چھا گیا۔

میں بھی آرام کرنے کیلئے اپنے بستر پر لیٹ گیا اور وقت گزرتا رہا۔ نئی جگہ تھی اس لئے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ پھر گزرے ہوئے واقعات جس طرح انسانی ذہن پر مسلط ہو جاتے ہیں وہ میرے ذہن پر بھی مسلط ہو گئے۔ سب کچھ ہو گیا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ بہن کی تو خیر شادی ہی ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ خود بخود راستے سے ہٹ گئی تھی۔ لیکن میں اپنی ان دوست روحوں کو نہیں بھول سکتا تھا ان کے ساتھ گزرنے والے پر لطف لمحات میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔

اس روشن دان کی طرف اٹھ گئیں جو ہوا اور روشنی کیلئے بنایا گیا تھا۔ کھٹکا اسی روشندان میں ہوا تھا اور اس روشندان میں جو کچھ نظر آیا تھا۔ اس نے ایک لمحے کیلئے میرے بدن میں خون نمود کر دیا۔ نجانے کیا شے تھی۔ اگر وہ بلی تھی تو اتنا بڑا چہرہ میں نے کبھی کسی بلی کا نہیں دیکھا تھا۔ بہت بڑا چہرہ تھا، جو روشندان کے طول و عرض میں سایا ہوا تھا اور اس چہرے میں دو آنکھیں دو جلتے ہوئے بلب جن کار تک نیلا تھا اور جن میں دوسرے پتلیاں سیدھی کھڑی نظر آ رہی تھیں۔

یہ آنکھیں میرا ہی جائزہ لے رہی تھیں۔ میرے بدن میں سرد لہریں دوڑتی رہیں۔ کوئی شیر تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً وہ بلی ہی تھی۔ ویسے بھی رانا ہریش کھرچی شکاری ضرور تھے لیکن مجھے بالکل علم نہیں ہو سکا تھا کہ انہوں نے اپنی اس حویلی میں کوئی شیر بھی پالا ہوا ہے اور پھر بلی اور شیر کے چہرے جو ایک فرق ہوتا ہے وہ بہر حال نمایاں تھا۔ میں پھر بلی لگا ہوں سے روشندان سے جھانکتی ہوئی ان آنکھوں کو دیکھتا رہا، جو مجھ پر سحر طاری کر رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی وہ چہرہ روشندان سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے کا جسم چہرے کی نسبت کافی چھوٹا تھا اور اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی پراسرار بلی ہی ہے۔ روشن دان سے وہ ایک کارنس پر کودی اور مکمل طور پر میری نگاہوں میں آ گئی۔

میرے ہاتھ پاؤں جیسے بے جان ہو گئے تھے۔ میں انہیں ہلانے کے باوجود نہیں ہلا سکتا تھا۔ بلی کارنس سے نیچے کودی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا، لیکن نہ تو میرے منہ سے کوئی آواز نکل سکتی تھی نہ میں ”ہش ہش“ کر کے اسے بھگا سکتا تھا۔ بلی آگے بڑھی اور میری مسہری زور سے ہلی۔ وہ گدے پر چڑھ گئی تھی۔

آہ..... میں اب کیا کروں۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے میرے پاؤں سونگھے۔ ایک پاؤں پھر دوسرا پاؤں اور وہاں سے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کو سونگھنے لگی اور پھر وہ میرے سینے پر چڑھ گئی۔ ”اف.....“ اس کا وزن کچھ بھی نہیں تھا اور وہ دبے قدموں میرے چہرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس وقت کی بے بسی کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ میرا بدن بے جان تھا اور میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ بلی مجھے سونگھتی رہی اور پھر اچانک ہی چوکنی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسی وقت ایک اور بلی اسی روشندان سے نمودار ہوئی اور براہ راست اس بلی پر کود پڑی۔

پہلی بلی ایک دم جھکاؤی دے کر مسہری سے نیچے اتری لیکن دوسری بلی اس سے زیادہ تیز اور تندرست تھی۔ اس نے ایک لمحہ نہ دیا اور پہلی بلی پر حملہ آور ہو گئی اور اس کے بعد دونوں آپس میں گھٹ گئیں۔ ان کے حلق سے بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں اور انہوں نے ایک دوسرے کی گردنیں

مجھے وہ حسین دن یاد آتے رہتے تھے۔ جب میں ان کے درمیان ہوتا تھا اور آپ لوگ تصور کریں کہ اگر کسی کی رگوں سے دوستی ہو تو وہ کیا سوچے زندگی کے حسین ترین لمحات تھے وہ بلکہ اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر تھوڑی سی عقل ہوتی تو میں ان رگوں کی دوستی سے نجانے کیا کیا فائدے اٹھا سکتا۔ قبلہ سمندر شاہ تو بس چلے وظیفوں ہی میں لگے رہا کرتے تھے، لیکن میں ان رگوں سے دوستی کر کے اپنے آپ کو بہت بڑا عالم ثابت کر سکتا تھا۔ جس کی معاون اور دوست رگوں میں اسے کیا حاصل نہیں ہو سکتا؟

بہر حال اب تو عجیب و غریب جال میں پھنس گیا تھا۔ کالی دیوی نے نجانے کیا کیا چکر چلا کر اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اس کے بعد پے در پے ایسے واقعات ہو رہے تھے جو آج تک میری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ کبھی کبھی ان واقعات کا ایک دوسرے سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تو بہت سے راز مشکف ہوتے تھے۔ مثلاً میرے والد ایک کچے عامل تھے جنہیں شاید کوئی علم نہیں آتا تھا، لیکن شاید روزی کمانے کیلئے وہ اگلے سیدھے چلے وظیفے کرتے رہتے تھے اور آخر کار ایک جن کو قبضے میں کرنے کے چکر میں وہ خود ایک جن کے قبضے میں آ گئے اور ہمارا کر یا کرم ہو گیا۔ پھر اس کے بعد میرے اپنے شوق کی تکمیل کیلئے گھر سے نکلا اور کلکتہ پہنچ گیا اور وہاں میری ملاقات فوراً ہی کالی دیوی سے ہو گئی۔

وہ پہلے مجھے کالی کے مندر میں لے گئی اور اس کے بعد مجھے وہ سوم رس پلا کر جس کے بارے میں بعد میں یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ خون ہے اور پتہ نہیں اس میں اور کیا کیا غلطیتیں شامل ہوں گی۔ اس سے میرا مذہب چھین لیا۔ ایک گندے جسم کو بھلا پاک رگوں کیسے قبول کر سکتی ہیں۔ وہ گندگی کالی دہا کے ذریعے میرے وجود میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کا اس سے بڑا ثبوت بھلا اور کون سا ہو سکتا تھا؟ کلام مقدس کا وہ پھنا ہوا ورق جسے میں نے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تھی، اڑ کر مجھ سے دور چلا گیا میرے ہاتھوں میں آگ لگ گئی۔ یہ مجھ پر میری اصلیت کا اظہار تھا اور اب اسی چکر میں نجانے کہاں سے کہاں تک میں یہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ جا پ بھی جو مجھے بتائے گئے تھے۔ یقیناً مجھ سے میرا اچھیننے کا باعث بنے تھے۔

میں بستر پر لیٹا اپنی سوچوں میں گم تھا کہ نجانے کہاں سے نیند کی دیوی میری پلکوں میں ہو گئی اور میری پلکیں ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔ سوتے میں پتہ نہیں کتنی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی کھٹکے سے آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن کھٹکا دوبارہ ہوا اور میری نگاہیں دروازے پر

تھی کہ روشندان تک پہنچنے کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہاں اس سے کچھ فاصلے پر ایک درخت ضرور تھا۔ جس کی شاخیں اس روشندان تک پہنچتی تھیں، لیکن بالکل اس سے ملی ہوئی نہیں تھیں۔ ان شاخوں سے روشندان کا فاصلہ بھی کوئی پانچ یا چھ گز کا تھا۔ یہاں سے ملی نے اگر لمبی چھلانگ لگائی ہوگی تو ہر حال یہ ایک بڑی بات تھی، لیکن سوال یہ تھا کہ وہ ملی آخر کیا چیز تھی؟ اور کیا چاہتی تھی؟ لیکن یہ اندازہ تھوڑی دیر کے بعد ہو گیا تھا کہ کوئی بات کسی بھی طور سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ملی واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ روشندان کو بند کرنے کا تو کوئی ذریعہ نہیں تھا، البتہ دو تین گھنٹے تک میں یہ سوچتا رہا تھا کہ کہیں ان دونوں میں سے کوئی ملی دوبارہ روشندان میں نمودار نہ ہو۔ کئی بار مجھے یوں وہم سا ہوا جیسے کہ دو آنکھیں مجھے گھور رہی ہوں لیکن یہ صرف میرا وہم ہی تھا۔ اس کے بعد میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا اور آخر کار نیند آ ہی گئی۔



دوسرے دن جاگا تو طبیعت بھیجی بھیجی سی تھی۔ پورا بدن تھکا تھکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے رات بھر مشقت کی ہو۔ ایسا ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن گزرے ہوئے واقعات ایک دم ذہن میں آ گئے تھے۔ بلیوں کی آمد ان کی لڑائی، دونوں ایک دوسرے کی بدترین دشمن لگ رہی تھیں۔ بہت دیر تک میں کچھ سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر اس کے بعد میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میرے منہ سے آواز نکلی۔

”واہ..... میرے محترم والد صاحب! یا رکوئی ڈھنگ کا کام کرتے تو میں بھی کوئی ڈھنگ کا انسان ہوتا۔ تعویذ گنڈوں کی کمائی سے پرورش کی اور اس کے بعد ایسا پراسراریت کے جال میں پھنسا یا کہ آج تک مزے ہی مزے ہیں۔ اچھا خیر بھی جو کچھ ہے ٹھیک ہے البتہ اس وقت بڑی بری ہوئی تھی جب زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ بظاہر تو یوں لگ رہا تھا جیسے بچنے کی کوئی امید ہی نہ ہو۔ مزائے موت ہی ہو جاتی اور اس کے بعد یہ بھی ظاہر تھا کہ ہندو بدترین دشمن ہو گئے تھے اور ایک طرح سے ان کی دشمنی بجا بھی تھی۔ کسی بھی چکر میں آ کر کیا ہو لیکن بہر حال میں نے اس ہندو بچے کو ذبح کر دیا تھا۔ بڑی بے دردی کے ساتھ۔“

باہر کچھ نسوانی قہقہوں کی آواز سنائی دی تو بہر حال خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ محل میں بہت ساری باعیاں بھی تھیں۔ یا بالفاظ دیگر کوشی میں ملازما تیں بھی تھیں۔ وہی ہنستی ہوئی گزری ہوں گی۔ باز نہ رہا گیا اپنی جگہ سے اٹھا دروازہ کھولا اور ذرا سی جھری کر کے باہر جھانکا۔ جو کوئی تھا گزر گیا تھا۔ میں نے دروازہ دوبارہ بند کیا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ البتہ ذرا طبیعت سیر کر کے نہایا تھا۔

دبوجنے کی کوشش جاری رکھی تھیں۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ جنگ دیکھتا رہا۔ دونوں بلیاں انتہائی خونخوار انداز میں ایک دوسرے کو ہینموڑ رہی تھیں اور میں بدستور انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ ایسی خوفناک لڑائی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بلیاں ایک دوسرے کو ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھیں اور دوسری بلی پہلی بلی پر حادی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی بلی بھاگنے کی کوشش میں تھی۔ چنانچہ اس نے پاؤں دبائے اور ایک لمبی چھلانگ لگا کر کانس پر چڑھ گئی۔ پھر وہاں سے روشندان کی طرف جبکہ دوسری بلی نے اس بار بھی زبردست جسمانی قوت کا مظاہرہ کیا تھا اور نیچے سے براہ راست روشندان پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ روشندان کے سرے پکڑنے میں ناکام ہوئی، لیکن نیچے کرتے ہی وہ پھر تڑپا اور اس نے بھی کانس پر چھلانگ لگائی۔ پھر یہاں سے روشندان پر اور روشندان سے دوسری طرف کوئی جیسے ہی بلی لگا ہوں سے اوجھل ہوئی میرے بدن میں جیسے جان آ گئی۔ میں پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ پھر میں نے تیز روشنی جلائی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا، لیکن بے سود ہاں زمین پر خون کے چند قطرے ضرور نظر آ رہے تھے۔ دونوں بلیاں لڑ رہی اس انداز میں رہی تھیں کہ زخمی ہو گئی تھیں۔ مگر یہ چکر کیا تھا؟ ایک بات جو میرے دل میں بار بار آ رہی تھی اور وہ یہ بات تھی کہ وہ بلیاں نہیں تھیں۔ ویسے تو میری زندگی ہی پراسرار واقعات کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی، لیکن یہ واقعہ بہت بھیانک تھا۔

پہلی بلی کون تھی اور مجھے کیوں سوگھ رہی تھی اور کیا چاہتی تھی وہ؟ اور پھر دوسری حملہ آور بلی اپنے طور پر بہت سی قیاس آرائیاں کر سکتا تھا، لیکن حقیقت تو اللہ ہی جانتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کرنا کیا چاہئے۔ کیا اسی کمرے میں سوتا رہوں یا پھر کمرے سے نکل کر باہر کا چکر لگا آؤں۔ اب اتنا بھی بے حس نہیں تھا کہ آرام سے کمرے میں بیٹھ جاتا۔

مجھے کمرے سے باہر نکلنا تھا اور باہر جا کر دیکھنا تھا کہ صورتحال کیا ہے؟ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ تاحہ نگاہ پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حویلی میں تمام ہی لوگ سوچکے تھے۔ بہت دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اپنے کمرے کے عقب تک جانے کیلئے مجھے کافی لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا، لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ باہر کسی بلی کی لاش تو نہیں پڑی ہوئی ہے۔ یہ بھی اندازہ تھا کہ حویلی میں یقیناً رات کے چوکیدار بھی ہوں گے۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں اس سے یہ ہی کہوں گا کہ کمرے کے اندر طبیعت میں گھٹن ہو رہی تھی چنانچہ تھوڑی سی سیر کیلئے باہر نکل آیا تھا۔ یہ سوچ کر میں باہر نکلا اور لمبا چکر لگا کر آخر کار اپنے کمرے کے عقب میں پہنچ گیا۔

یہاں پہنچ کر میں نے اس روشن دان کو دیکھا جس سے بلی اندر آئی تھی۔ یہ بھی ایک دلچسپ

ہاں پچیس کرسیاں لگی ہوئی تھیں، لیکن وہاں صرف دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک رانا ہریش کھرجی اور دوسری ایک سنگ مرمر کی منوڑی، میری نگاہ ایک لمحے کیلئے اس کی جانب اٹھی اور اس کے بعد جیسے انکار کر رہ گئی۔ اتنے حسین نقوش اتنا خوبصورت چہرہ صحیح معنوں میں مغلیہ حسن کا شاہکار معلوم ہوتی تھی۔

قد و قامت کا اندازہ بیٹھے ہوئے ہونے کی وجہ سے نہیں ہو رہا تھا، لیکن جسم بہت تندرست تھا اور جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا تھا وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی انتہائی خوبصورت آنکھیں، لیکن ان آنکھوں کی پتلیاں بالکل سیدھی تھیں۔ ایک لمحے کے اندر کسی پر اسرار بات کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ میں نے پلکیں جھپکائیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔

ہریش کھرجی نے مسکرا کر گردن خم کی اور مجھ سے بولا۔

”آؤ..... آگے تو آؤ.....“ میں ایک دم شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ کسی کو اس طرح گھورنا بہت ہی بری بات تھی، لیکن اب کیا کرتا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے نزدیک پہنچ گیا تو ہریش کھرجی نے کہا۔

”بیٹھو.....“ میں جھجک کر اسے دیکھنے لگا تو اس نے کہا۔ ”بیٹھو.....“

”جی شکریہ۔ ویسے مجھے اپنے مرتبے کا احساس ہے۔“

”ابھی تم ہمارے مہمان ہو بعد میں تمہاری اجازت کے ساتھ ہم تمہیں اپنے ساتھیوں میں شامل کریں گے۔ ہم ملازم کسی کو نہیں کہتے اور پھر ایک ایسے ماہر شکاری کو جس نے ہماری جان بھی بچائی ہو ملازم کہنا بد اخلاقی ہے۔“

”جی.....“ میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ میری نگاہ اس عورت کی جانب نہیں اٹھ رہی تھی۔ رانا ہریش کھرجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دو شتمہارا نہیں ہے۔ یہ ہماری بیگم روپ گجپاتی ہیں اور صحیح معنوں میں ان کا روپ گجپاتی ہی ہے۔ انہیں ایک نگاہ جو بھی دیکھتا ہے اسی طرح پتھر اکر رہ جاتا ہے۔ تم پر اگر یہ کیفیت طاری ہوئی تو ہمیں برا نہیں لگا، بلکہ ہم تو یہ سوچ کر ہمیشہ فخر کرتے ہیں کہ ایسی سندرتا ہمارے حصے میں آئی ہے۔“

”معافی چاہتا ہوں۔“ میری نگاہیں واقعی رانی جی پر جم گئی تھیں۔

”کوئی بات نہیں ہے۔ تم انہیں دوبارہ دیکھ سکتے ہو۔“ ہریش کھرجی نے کہا اور تہنید لگایا، لیکن میری نگاہیں ایک بار پھر روپ گجپاتی کی طرف اٹھ گئی تھیں اور میرے ذہن میں چھنا کے ہو رہے تھے۔ ”تو یہ ہے روپ گجپاتی جس کے لئے مجھے اس حویلی میں بھیجا گیا ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

تب میں نے اسے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ گردن اور داہنے

لباس بھی تبدیل کر لیا تھا۔ باہر نکلا ہی تھا کہ پھر وہی نسوانی ہنسی سنائی دی۔

یہ وہی نہیں تھا۔ اس بار دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اور دونو جوان لڑکیوں نے اندر جھانکا تھا۔

”آئیے.....“ میں نے کہا۔

”نہیں مہاراج! بڑے مہاراج نے کہا ہے کہ جا کر دیکھیں کہ آپ جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر آپ جاگ رہے ہوں تو تھوڑی دیر کے بعد بڑے مہاراج کے پاس ناشتا کیلئے ناشتے کے کمرے میں آ جائیے۔“

”رانا صاحب نے کہا ہے؟“

”ہاں.....“

”وہ خود کہاں ہیں.....؟“

”ابھی تو اپنے کمرے ہی میں ہیں۔“

”ٹھیک ہے جب وہ ناشتے کے کمرے میں پہنچ جائیں تو مجھے خبر کر دینا میں آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے مہاراج!“ ایک لڑکی نے ادب سے کہا اور اس کے بعد واپس چلی گئی۔ مگر خاموشی سے اس طرح دیکھتا رہا تھا۔

پھر میں نے اس روشندان کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے گردن ہلانے لگا۔ میرے ذہن میں وہ دونوں آنکھیں ابھر آئیں جو غیر انسانی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی لیکن خوفناک، سیدم کھڑی ہوئی پتلی ان آنکھوں کو دیکھ کر ہی انسان کے اندر دہشت کی لکچھی دوڑ جائے۔

بہر حال یہ باتیں سوچنا ہوا میں دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ ماضی پر غور کر رہا تھا وہ بھی غور کر رہا تھا کہ اب آگے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔ شاستری نے مجھے کالی دیوی کے ایما پر یہاں بھیجا تھا۔ پہلے تو یہ بات ہی مضحکہ خیز تھی کہ میں کالی دیوی کا داس بن چکا تھا۔ ایک مسلمان گھراں میں پیدا ہوا۔ زندگی مسلمان بن کر ہی گزری۔ عید، بقرہ عید کی نمازیں بھی پڑھتا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ نمازیں والد صاحب کی وجہ سے زیادہ باقاعدگی سے پڑھ لیتا تھا۔ ورنہ وہی اپنا دل آتشا تھا اور یہ صنم آتشانی ہی جان کا عذاب بن گئی تھی۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد بلاوا آ گیا اور میرا ملازمہ کے ساتھ اٹھ کر اس کمرے کی جانب چل پڑا۔ جہاں رانا ہریش کھرجی ناشتے پر میرا منتظر تھا۔ کچھ راہداریاں طے کرنے کے بعد میں اس کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔

ملازمہ نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھل گیا۔ پھر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ بہت ہی وسیع کمرہ تھا۔ اس کے درمیان میں بہت ہی خوبصورت شیشے کی میز تھی۔ جس میں کوٹا

جڑے پر ٹیپ لگی ہوئی تھی، لیکن آنکھیں وہی تھیں پہلی بلی والی جسے میں نے روشندان میں دیکھا تھا اور بعد میں اس کی جھڑپ بڑے خوشخوار انداز میں ہوئی تھی۔ تو کیا یہ زخم اور کیا یہ عورت وہی بلی ہے۔ یہ سوچ ایک لمحے کیلئے میرے ذہن میں ابھری تھی، لیکن اپنے آپ کو سنبھالنا ضروری تھا۔ رانا ہریش کھرجی نے کہا۔

”یہ سوتے میں چلنے کی عادی ہیں۔ یہ وہ بیماری ہے جس کا کوئی علاج آج تک نہیں ہو سکا۔ بہت سے حادثے پیش آچکے ہیں۔ رات کو اٹھ کر کہیں چل پڑی تھیں ایک کھڑکی سے ٹکرائیں جس میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ شیشہ چور چور ہو گیا اور یہ کئی جگہ سے زخمی ہو گئیں۔“ رانا ہریش کھرجی نے میری توجہ پر غور کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر میں جھل ہو گیا۔ میں نے خاموشی سے گردن جھکا دی تھی، لیکن اب یہ بات میرے ذہن میں جڑ پکڑ چکی تھی کہ رات کو بلی کی شکل میں نظر آنے والی یہ ہی عورت تھی اور وہ دوسری بلی کون ہو سکتی ہے؟

پھر میرے ذہن میں راجوتی آئی۔ راجوتی بھی ایسا ہی پراسرار کردار تھی۔ رات کو جس انداز میں دونوں میں خوشخوار جنگ ہوئی تھی اور جس طرح دونوں نے ایک دوسرے کو بھنبھوڑا تھا اس سے تو یہ ہی اندازہ ہوتا تھا کہ راجوتی بھی اتنی ہی زخمی ہوگی جتنی روپ گجانی نظر آ رہی تھی۔

زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ رانا ہریش کھرجی نے کہا۔ ”اصل میں تمہیں رانی جی سے طواغ ضروری تھا۔ میں نے تمہارے بارے میں انہیں پوری تفصیل بتائی ہے۔ ہم لوگ ایک پروگرام بنا رہے ہیں۔ تمہیں یہ بات بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ میرا بہترین مشغلہ شکار ہے۔ میں دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف جنگلوں اور صحراؤں میں مہم جوئی کر چکا ہوں۔ اس بار بھی ہمارا ارادہ ہالیوڈ کی ترائیوں میں ان پراسرار علاقوں میں جانے کا ہے جہاں انسانی قدم بہت کم پہنچے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم ان علاقوں میں دور تک جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک پورا منصوبہ ہے جس پر ہم تم سے بعد میں باتیں کریں گے۔ تو یہ سمجھ لو کہ رانی روپ گجانی کا ایک ماضی ہے اور وہ ماضی کی تلاش میں ان علاقوں تک جانا چاہتی ہیں کیونکہ معاملہ سیر و شکار کا ہے اور وہ بھی جانتی ہیں کہ میں شکار کا رسیا ہوں اس لئے تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری موجودگی ہمارے ساتھ ہمارے لئے بہت دلچسپی کا باعث ہوگی۔ جب میں نے رانی روپ گجانی سے تمہارا تذکرہ کیا اور تمہاری تفصیل بتائی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ تم تو بہترین انعام کے قابل ہو اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ضرور تمہیں کوئی ایسا انعام دیں گی جو ان کی حیثیت کے مطابق اور تمہارے شایان شان ہو۔ ایسا انعام کہ جس سے لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ ایک پتی درخت اپنے پتی کا جیون بچانے والے کیلئے کتنا کچھ کرتی ہے۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو تو میں تمہیں پورے پروگرام سے آگاہ کروں گا۔ ہمیں راستوں کے رستے بھی بتانے ہیں اور اس کے بعد ہمیں ایک پراسرار مہم سرانجام دینی ہے۔ رانی صاحبہ سے تمہاری اکثر ملاقاتیں ہوں گی۔ میں تو صرف خوشخوار درختوں کا دشمن ہوں۔ اب یہ کس کس کی دشمن ہیں یہ خود بتا سکتی ہیں۔“

رانی کے منہ سے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اتنی دیر میں ملازمتیں آگئیں۔ انہوں نے میز پر ناشتہ لگانا شروع کر دیا۔

ظاہر ہے ایک اتنے بڑے جاگیردار کیلئے ناشتہ لگایا جا رہا تھا۔ پوری میز بھردی گئی۔ تین افراد کیلئے کم از کم تیس افراد کا ناشتہ تھا۔ رانا ہریش کھرجی نے کہا۔

”اور اب تمہاری دیر کیلئے یہ بات بھول جاؤ کہ ہمارا تمہارا کیا ناتا ہے اور کھانے میں جت ہاؤ۔“ میں نے تکلف نہیں کیا تھا۔ ناشتے کے بعد اچانک ہی روپ گجانی کھڑی ہو گئی۔

”میں چلتی ہوں رانا جی! ذرا آرام کروں گی۔ زخموں میں تکلیف ہو رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں بھی چلتا ہوں۔“ رانا ہریش کھرجی بھی کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

”تم آرام کرو راج فہم جیسے کہ میں نے تم سے کہا کہ ہم بہت جلد تمہیں اپنے پروگرام کے ارے میں بتائیں گے اور تم سے یہ بھی پوچھیں گے کہ تم ہمارے ساتھ خوشی سے چلنے کیلئے تیار ہو یا نہیں۔ تم ہمارے دوست ہو اور ہم تمہاری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کریں گے۔“

”میں نے بھی آپ کو اپنے بارے میں بتا دیا تھا رانا ہریش کھرجی کہ میں اس سنسار میں اکیلا ہوں اور اچھے لوگوں کا ساتھ میری سب سے بڑی دلچسپی ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں بھی لاشی سے آپ کے ساتھ رہنے پر تیار ہوں۔“

”جب تم ہمارے ساتھ رہ کر خوش ہی رہو گے۔ ہماری حویلی بہت بڑی ہے اور ہم نے اسے خوبصورتی سے سجایا ہے۔ جاؤ تم اس کا نظارہ کرو۔“ رانا ہریش کھرجی نے کہا اور میں نے گردن خم کر دی۔ پھر ان دونوں کے باہر نکلنے سے پہلے ہی میں باہر نکل آیا۔ لیکن میرے ذہن پر ایک عجیب سا مار طاری تھا۔ میری حسن پرست فطرت نجانے آنے والے لمحات میں کیا کیا گل کھلانے والی تھی۔ اب میرے ذہن میں رانی روپ گجانی ہی تھی اور اس کا ایک ایک نقش اس کے سحر میں گرفتار کیے لئے تھا۔ کتنی حسین ہے کجنت سنگ مرمر کی صورت ہی معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ کھڑی ہوئی تھی تو میں نے اس کے سراپے پر غور کیا تھا۔

ایسا ہی لگتا تھا جیسے سنگ مرمر کی کوئی مورتی ہو اور اسے انسانی شکل میں تراش دیا گیا ہو۔ بعد

میں وہاں سے آگے بڑھا اور اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں رانا ہریش کھر جی کے الفاظ آ رہے تھے۔ کسی مہم جوئی کا تذکرہ کر رہا تھا وہ جو ہمالیہ کی ترائیوں میں کی جانے والی تھی۔ میرے لئے بھی سب کچھ اجنبی اور نیا نسا تھا۔ ٹھیک ہے شکار کی تربیت دی گئی تھی اور یہ کام شاستری نے کرایا تھا۔ لیکن میں نے بہت سی جگہیں نہیں گھومیں تھیں۔ بس ایسے ہی تھوڑا سا وقت گزار لیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ نیا کھیل کیا ہوتا ہے۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن میں راجوٹی آ گئی۔ مجھے یہ تو یقین تھا کہ پہلی ملی روپ گبتالی ہی ہے۔ روپ گبتالی کے بارے میں کالی دیوی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی رقیب اور دشمن ہے۔ روپ گبتالی ہی کی وجہ سے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ اب آنے والے وقت میں مجھے کالی دیوی کی طرف سے کیا ہدایات ملتی ہیں یوں تو مجھے بعد ہی میں معلوم ہو سکے گا، لیکن مجھے پروا نہیں تھی۔ اب جو کچھ بھی ہوا ہے وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد زندگی کون کون سے راستے متعین کرتی ہے۔ راجوٹی کا خیال آتی ہی میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی تلاش میں چل پڑا۔

اب کسی سے راجوٹی کے بارے میں پوچھنا تو غلطی بات تھی۔ میں مشکوک ہو سکتا تھا، لیکن میں حویلی دیکھنے کے بہانے ایک ایک علاقے میں گھومتا پھرا اور پھر ایک علاقے میں مجھے راجوٹی نظر آ گئی۔ وہ ایک بہت ہی خوبصورت کمرے سے باہر نکلی تھی۔ میں اس وقت اسی راہ داری میں تھا، جس راہ داری میں وہ کمرہ کمرہ واقع تھا اور اس کا رخ میری ہی جانب تھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رکی اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

”اب تم ہمیں اچھے لگنے لگنے ہو۔ یقین کرو اب سے کچھ دیر پہلے ہم تمہارے بارے ہی میں سوچ رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح ہم تم سے کہیں کہ تم ہم سے آ کر ملو۔ تم سے بات کرنا ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔“

”یہ تو تمہارے جی کی بڑائی ہے ورنہ میں تو گھر کا ایک ملازم ہوں۔“

”مگر لوگ تو کہتے ہیں کہ تم ملازم نہیں ہو بلکہ مہمان ہو۔“

”اصل میں رانا ہریش کھر جی بہت بڑے دل والے ہیں اور اپنے جاننے والوں کے ساتھ بڑے احسان کا سلوک کرتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا کام کیا تھا میں نے ظاہر ہے میں بھی شکاری ہوں شیران پر لپک رہا تھا کہ میں نے اس پر گولی چلا دی اور وہ مر گیا۔“

”اور تم کہتے ہو کہ یہ چھوٹا سا کام ہے؟“

”میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہ ہی کرتا۔“

”نہیں کرتا۔ ہم سے بحث کرو گے۔“ راجوٹی بھی تھوڑی سی کھسکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

’لوں نے حسن ایسا پایا تھا کہ اگر کسی کو آگے بڑھ کر کاٹ بھی لیں تو کوئی زخم تک نہ سہلا سکے اور پھر اس تو تھا ہی حسن پرست۔ اچانک ہی کاٹنے کے خیال سے مجھے رات کی دوسری ملی یاد آ گئی اور میں نے راجوٹی کو غور سے دیکھا۔ مگر اس کا چہرہ بے داغ تھا۔ اس پر کوئی نشان نہیں تھا جبکہ روپ گبتالی ابھی خاصی زخمی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ رات کو اس پر حملہ آور ہونے والی دوسری ملی راجوٹی نہیں تھی۔

میرا ذہن ادھر سے صاف ہو گیا اور اسی لمحے مجھے پھر ایک خیال آیا کہ کیا وہ خود کالی دیوی ہو سکتی ہے۔

”کس سوچ میں ڈوب گئے ہو؟ حالانکہ دن کا وقت ہے مگر ہماری اس حویلی کے پچھلے حصے میں ایک اتنی خوبصورت جگہ بنی ہوئی ہے کہ دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔ آؤ ہمارے ساتھ۔“

”جو آ گیا کماری جی کی۔“ میں نے کہا اور وہ مڑ کر واپس چل پڑی۔ میں نے اس کے قدموں سے قدم ملا دیئے تھے اور اس کے پیچھے پر ادب انداز میں چل رہا تھا، لیکن میری نگاہیں اس کا طواف کر رہی تھیں۔ کھیتوں نے حسن کے وہ خزانے پائے تھے کہ انسان کا ذہنی توازن ہی خراب ہو جائے۔ میں اسے دیکھتے ہوئے چل رہا۔ آگے جا کے راہ داری دوسری سمت مڑ گئی تھی۔ یہ حویلی کا پچھلا حصہ تھا۔ ایک جگہ سے کچھ میڑھیاں نیچے اترتی تھیں اور اس طرف کا منظر واقعی ایسا تھا، جیسا راجوٹاری نے کہا تھا۔ ادھر بہت ہی حسین قسم کے پتوں والے درخت پھیلے ہوئے تھے اور انہوں نے اس طرح ایک سائبان بنایا ہوا تھا کہ اس کے نیچے ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھی۔ سائبان کے چاروں طرف بہت ہی حسین پھولوں کے تختے لگے ہوئے تھے اور ان سے بھینی بھینی خوشبو فضا میں نشر ہو رہی تھی۔ اس کے نیچے سفید رنگ کی بہت ہی خوبصورت کرسیاں بنی ہوئی تھیں جو ہنس کی صورت تھیں۔ اچانک ہی راجوٹاری مسکرائی اور بولی۔

”تمہارا نام راج ہنس ہے نا؟“

”جی.....“

”دیکھو ہم نے کتنے راج ہنس جمع کر رکھے ہیں۔“ اس نے سفید رنگ کی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہاں واقعی اور اب ان میں ایک کا اضافہ اور ہو چکا ہے۔“



”ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے کہا اور فس پڑی پھر بولی۔ ”بیٹھو۔“

”یہ ادب کے خلاف ہوگا۔“

”دیکھو ہمیں اچھا لگتا ہے کہ کوئی ہمارا احترام کرے پر ہر وقت یہ اچھا نہیں لگتا۔ اس وقت ہم سے بیٹھنے کیلئے کہہ رہے ہیں اس لئے ہمارے حکم کی تعمیل کے لئے بیٹھ جاؤ۔“ میں مسکرا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھنے لگی بہت دیر تک دیکھتی رہی اور پھر آنکھیں بند کر کے مسکراتی ہوئی بولی۔

”تم بہت سندر ہو من چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھا ہی جاتا رہے۔ ویسے ہمارے بارے میں کم جانتے ہو؟“

”آپ راجکمار جی ہیں۔ مہاراج رانا ہریش کمر جی کی بہن۔“

”ہاں..... سب یہ ہی کہتے ہیں لیکن ہم اپنے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ بہت الگ ہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

”ہماری کوئی ماں اور باپ نہیں ہے۔ ہم ایک درخت میں اگے تھے۔“

”جی.....؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مذاق کر رہی ہے۔

”تم یقین نہیں کرو گے لیکن یہ سچ ہے۔ ہم درخت میں اگے تھے پھر وہیں پلے بڑھے اور پھر جب ہمارا وزن زیادہ ہو گیا تو زمین پر گر پڑے رانا صاحب ہمیں اٹھا کر لے آئے تھے اور انہوں نے ہمیں اپنی بہن بنا لیا۔ بس یہ ہے ہماری کہانی۔“ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار مجھے یوں لگا تھا جیسے اس کا دماغی توازن ٹھیک نہ ہو۔

لیکن بہر حال مجھے یہ اندازہ لگنا تھا کہ رات جو دو بلیاں آپس میں لڑی تھیں ان میں سے ایک یہ تو نہیں تھی اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ نہیں ہے۔

+++

پورا دن گزر گیا رانا ہریش کمر جی نے اس کے بعد مجھے کھانے وغیرہ یا شام کی چائے وغیرہ پر طلب نہیں کیا تھا۔ یہ چیزیں مجھے مہمان خانے ہی میں ملی تھیں۔ رات ہو گئی اور میں انتظار کرنے لگا کہ آج بھی کہیں بلیوں والا کھیل دوبارہ نہ شروع ہو جائے۔ کھیل شروع ہوا لیکن بلیوں والا نہیں تھا۔ کوئی ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا کہ میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں پوری طرح جاگ رہا تھا اور سوچوں میں گم تھا۔ دستک سن کر میں چومک پڑا اور میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ دستک دوبارہ سنائی دی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ میں نے کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ کالی دیوی تھی لیکن بالکل عام اور سادہ سے لباس میں جیسے لباس لڑکیاں پہنا کرتی تھیں۔

”بیچھے ہو مجھے اندر نہیں آنے دو گے۔“ اس نے مجھے حیران کھڑے ہوئے دیکھ کر کہا اور میں ہلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ”تمہیں یقین نہیں ہوگا کہ میں آئی ہوں۔“

”ہاں تم یہاں۔ ارے ارے..... یہ..... یہ یہ تمہارے چہرے پر زخم کیسے ہیں؟“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کھڑے ہی کھڑے سارے سوالات پوچھ لو گے یا اندر بھی آنے دو گے۔“

”آؤ..... آؤ۔“ میں نے کہا۔

”دروازہ بند کر دو۔“

”کرتا ہوں۔“ میں نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ کالی بے شک اس وقت زخمی تھی لیکن بہت ہی دلکش لگ رہی تھی۔

+++

”یہ کہ شاید اب بہت سے تک میں تمہیں نزل سکوں، تمہیں ساری تفصیل بتا دی گئی ہے۔ روپ گجنا لی میری دشمن ہے اور وہ مجھے نچا دکھانا چاہتی ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی کو بچانا چاہتی ہے جو مجھے نقصان پہنچانے کے درپہ ہے۔ اور اگر وہ ہستی بچ گئی تو مجھے روپوش ہونا پڑے گا۔ ورنہ وہ میرا سارا بھرم ختم کر دے گی۔ وہ بہت بڑی جادوگرنی ہے اور روپ گجنا لی اس کی داس، روپ گجنا لی کو اس کی منزل تک جانے سے روکنا تمہارے ذمہ داری ہوگی اور تمہیں یہ ہی کام کرنا ہے۔“

”وہ کہاں جانا چاہتی ہے؟“

”میں نے کہاناں میں نے جو تمہیں بتانا تھا بتا دیا۔ باقی تمہیں سے بتائے گا۔“

”ایک بات کا جواب تم اور دے دو مجھے۔“

”ہاں، بولو۔“

”اس ساری کارروائی میں مجھے اصل میں کیا کرنا ہوگا۔ اور مجھے اس کا صلہ کیا ملے گا۔“

”اگر تم صحیح معنوں میں اپنے کام کو سرانجام دے سکتے تو میں اپنا وردان دوں گی۔ تم مہان پرش

بن جاؤ گے، ایک بہت بڑے اوتار کالی کے اوتار سنسار تمہاری پوجا کرے گا۔ تمہارے چرلوں میں

سنسار کی دولت ڈیر ہو جائے گی، جو تم چاہو گے تمہیں حاصل ہو جائے گا۔ اتنی بڑی ہستی حاصل

کرنے کیلئے تمہیں ایک لمبا سفر طے کرنا پڑے گا اور جب یہ لمبا سفر طے ہو جائے گا تو تم، ایک اتا بڑا

کام سرانجام دو گے جو سنسار کے بڑے بڑے رشی اور مٹی نہیں دے سکتے، سمجھ رہے ہوں ناں تم؟“

”ایک اور بات کا جواب دو گی مجھے کالی؟“

”پوچھو۔“

”کیا تمہیں یہ بات معلوم تھی، اس وقت جب میں کلکتہ میں داخل ہوا تھا۔“

”کیا بات؟“

”یہ کہ میں مسلمان ہوں۔“ میرے اس سوال پر کالی خاموش ہو گئی۔ بہت دیر تک وہ خاموش

ہی پھر اس نے بھاری لہجہ میں کہا۔

”ہاں، مجھے معلوم تھا۔“

”جب تمہیں یہ معلوم تھا کہ میں تمہارے دھرم سے نہیں ہوں، تو پھر تم نے مجھ سے میرا دین

پینے کی کوشش کیوں کی، مجھے غلاظتیں پلا کر مجھ سے میرا ایمان چھین لیا اور ان راستوں پر لگا دیا

یوں؟“

”اس لئے کہ تم مسلمان تھے۔“

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور میری مسہری پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”آؤ۔ بیوقوف آدمی بنو۔“ وہ بولی اور میں اس کے برابر مسہری پر جا بیٹھا۔ ”تمہارے یہ

زخم؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں پچھلی رات ہی لگے ہیں۔“ وہ بولی۔

”پچھلی رات؟“

”انجان بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو۔ میری لڑائی ہوئی تھی ناں رات کو؟“

”اوہ۔ مائی گاڈ! اس کا مطلب ہے کہ وہ دوسری ملی تم تھیں۔“

”ہاں، وہ تمہیں سوگھ رہی تھی، جانتے ہو کیوں؟“

”میں نہیں جانتا۔“

”وہ تمہارے بدن میں خوشبو تلاش کر رہی تھی۔“

”وہ میرے بدن میں تمہاری خوشبو؟“

”ہاں۔“

”وہ کیسے اور کیوں؟“

”بس وہ دیکھنا چاہتا تھی کہ میں نے کوئی رات تمہارے ساتھ گزاری ہے یا نہیں۔ میرا مطلب

ہے ایک عورت کی طرح۔“

”اوہ، یہ بات ہے مگر اسے اس بات کی تشویش کیوں تھی؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے جو ابھی تمہیں نہیں سنائی جاسکتی۔“

”مگر روپ گجنا لی ملی کیسے بن گئی؟“

”یہ تمہیں سے بتائے گا۔“

”پھر اس وقت تم کیا بتانے آئی ہو۔“

”مطلب۔“

”میں جو کام تم سے لینا چاہتی ہوں۔ وہ کسی اور دھرم کا آدمی نہیں کر سکتا تھا۔ تم سے تمہارا دھرم چھین کر تم سے وہ کام کرانا میرے لئے بہت ضروری تھا۔“ کالی نے جواب دیا اور عجیب بات یہ ہے کہ مجھے دکھ کا احساس ہوا۔ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن ایمان چلے جانے کا بہت افسوس تھا۔

”اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

جو کچھ ہو رہا ہے، ایک منصوبے سے ہو رہا ہے۔ ہریش مگر جی تجھ سے بہت متاثر ہے۔ یہی میں چاہتی تھی۔

”تو پھر؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ تیری بہت عزت کرتا ہے، لیکن میں تجھے بتا چکی ہوں کہ روپ گجالی تیرے لئے بہت خطرناک ہو سکتی ہے۔ میرا نام اسی سے مقابلہ ہے اور میں ہر حالت میں اسے وہ نہیں کرنے دوں گی جو وہ چاہتی ہے۔ تجھے ساری تفصیلات ابھی نہیں بتلائی جا سکتیں لیکن اتنا ضرور جان لے کہ تیرا کام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور تو بہت بڑا درجہ پانے والوں میں سے ہے لیکن اس لمحے جب تو میرا مقصد پورا کر دے گا۔ ویسے تو ساری دنیا میں میرے چیلے بکھرے ہوئے ہیں۔ میں اپنی جادوئی قوتوں سے بڑے بڑوں کو مٹا سکتی ہوں لیکن ہر کام کسی نہ کسی کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ تیرے لئے میں نے جو کام رکھا ہے وہ یہ ہی ہے کہ تو روپ گجالی کا خاتمہ کر دے اور جب تو روپ گجالی کا خاتمہ کر دے گا تو دیکھے گا کہ سنسار میں تجھے کتنی عزت حاصل ہوتی ہے، وہ بن جائے گا تو جو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں کہ تیرا پتا یہ ہی سب کچھ کرتا تھا۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکا جب کہ تو اس سنسار میں تو بہت سی کامیابیاں سیٹھے گا۔“

”میں کیا کروں گا کیا نہیں کروں گا۔ تو ان باتوں کو چھوڑ مجھے بتا مجھے کیا کرنا ہے؟“

”بس جو کچھ تجھے بتایا جا رہا ہے وہ کرتا رہ۔ یہاں خاص طور پر جیسا کہ میں نے تجھے بتایا کہ تجھے بھیجا گیا ہے۔ اب یہاں اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا وہ سب ترتیب کے مطابق ہوگا۔ جہاں کہہ میری مداخلت کی ضرورت پیش آئے گی تو چننا مت کرنا میں تجھ سے زیادہ دور نہیں ہوں گی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں صرف تم لوگوں کے اشاروں پر ناپتا رہوں۔“

”اس میں کیا ہے بالک، اسی میں کلیاں ہے۔“ کالی نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ہاں وہ اچانک ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس جگہ دیکھتا رہا۔ جہاں کالی کم ہو گئی تھی۔ یہ سچ بات ہے کہ ماضی سے میرا رشتہ کسی طور نہیں ٹوٹ رہا تھا

میں میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا لیکن جو کچھ ہو گیا تھا، جو ہو رہا تھا اس پر غور کرتا تو یہ اندازہ ہوتا کہ خود میں نے ابھی کچھ نہیں کیا ہے بلکہ وقت میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔

پھر وقت گزرتا رہا، دو تین دن گزر گئے تھے، اس واقعے کو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو قابل اہم ہوئی۔ راجو جی بھی میرے سامنے نہیں آئی تھی لیکن غالباً یہ چوتھی رات تھی کہ اچانک ہی ایک اہم اندرا آئی اور میرے سامنے جھک کر بولی۔

”نہس راج مہاراج آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے، کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کون.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”آپ ہم سے یہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔“

”عجیب ہو تم مجھے بلانے آئی ہو، کسی کا سندیس لائی ہو مگر یہ نہیں بتا رہی ہیں کہ وہ کون ہے۔“

”اے یہ سندیس ہے۔“

”وہ روپ گجالی جی ہیں۔ اس حویلی کی مالک، مہاراج ہریش مکر جی کی دھرم بھتی۔“ میں ایک اچھل گیا۔

روپ گجالی کی طرف سے مجھے یہ پہلی مرتبہ یہ دعوت ملی تھی اور میں تھوڑا سا حیران بھی تھا۔ اہل حال جانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میں اس ملازمہ کے ساتھ باہر نکل آیا اور وہ میری راہنمائی کرنے لگا۔ خاصا لمبا فاصلہ طے کیا تھا۔ حویلی کا یہ حصہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ملازمہ مجھے پیچ در راستوں سے گزارتی ہوئی ایک بڑے سے کمرے میں پہنچی۔ وہاں رک کر اس نے کوئی کل دہائی تو دیا اور اپنی جگہ سے سرک گئی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیاں تھیں اور ان کے نیچے روشنی ہو رہی تھی۔

غالباً یہ کوئی عظیم الشان تہ خانہ تھا۔ تیرہ سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد میں ایک بہت بڑے ہال پہنچ گیا۔ میرے دل میں بہت بڑے بڑے خیالات آرہے تھے۔ پہنچ گیا چکر ہے۔ کسی بڑی ہمت میں نہ پھنس جاؤں۔ بڑی مشکل ہو جائے گی۔ بہر حال اب آپھنسا تھا تو کیا کر سکتا تھا میں۔ میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ اچانک ہی میں اچھل پڑا۔ میں نے ہال کی دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے انسانی ڈھانچوں کو دیکھا۔ جن کی تعداد کافی تھی۔

اسی وقت ایک تیز سرسراہٹ ہوئی اور میرے پیچھے تہ خانے میں آنے والا راستہ ایک دم بند ہو گیا۔ ایک دیوار نے اسے کور کر لیا تھا۔ میرے ذہن میں بس یہی بات آ رہی تھی کہ میں پھنس گیا۔

”کون ہوتا؟“ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ روپ گبتائی اگر یہ تم ہی ہو تو میرے سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں لیکن کچھ نہ ہوا اور مجھ پر نیم غشی طاری ہونے لگی پھر اس کے بعد مجھے کوئی اٹھ نہیں رہا تھا۔

نجانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا تھا۔ گلے میں عجیب سی دھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ پورا بدن لٹھ رہا تھا۔ کافی دیر میں اسی عالم میں پڑا رہا لیکن پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر اچانک ہی اک پڑا کیونکہ ان خوفناک ڈھانچوں کا خیال ایک لمحے میں ذہن میں آیا تھا۔ میری نگاہیں اطراف کا انزہ لینے لگیں اور پھر یہ دیکھ کر میں چونک پڑا کہ وہ ڈھانچے اب اس کمرے میں نہیں تھے بلکہ یہ کوئی رہی جگہ تھی۔ یہ بھی ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا۔ جس کی چھت بہت اونچی تھی۔ کمرے کی دیواروں میں لائیں روشن تھیں لیکن ان کے بن کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان ہی نہیں تھا۔ البتہ سامنے کی سمت ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو یقیناً باہر سے بند ہوگا۔

تمام واقعات میرے ذہن میں آتے گئے میں نے سوچا کہ پتہ نہیں ہریش کھری کو میرے رے میں علم ہے یا نہیں۔ یا پھر کالی۔ ایک لمحے کیلئے مجھے کالی کے الفاظ یاد آئے کہ تم جہاں اور جس مہیت کا بھی شکار ہو گے میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گی۔

تو کیا میں اسے اس وقت پکاروں لیکن نجانے کیوں دل نے یہ بات تسلیم نہیں کی کہ میں اسے والدوں۔ اپنے طور پر ہی جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ دیکھ رہا تھا۔ بہر حال کافی دیر ہو گئی پھر میں نے اپنی لہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ دروازہ بند ہے لیکن، دروازہ چھو کر دیکھا۔ میرے اندازے کے مطابق دروازہ اندر سے بند ہی تھا۔ میں واپس پلٹا۔ میرے ہوش و حواس جاگ گئے تھے اور ایک ایک چیز کا میں اچھی طرح جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک میری نظر ایک عجیب سی شے پر پڑی۔ یہ ایک دیوار میں نصب کوئی مجسمہ تھا لیکن کافی لمبی پر اور بہت زیادہ غور کرنے پر ہی نظر آتا تھا۔ اس مجسمے سے تھوڑی دور ایک اور مجسمہ تھا۔ جو غالباً پلارنگ کا تھا۔ میں نے چاروں دیواروں کو غور سے دیکھا۔ یہ دس مجسمے تھے۔ عجیب و غریب شکل کے ال اور پھر بہت زیادہ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے صاف نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔ میں واپس اپنی لہ آ کر بیٹھ گیا۔ اب انتظار کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا تھا۔ پھر میری نظر ایک دیوار کی جانب اٹھ گئی ایک پھر میرے بدن کے روٹکے کھڑے ہونے لگے۔ دیوار پر لگے ہوئے مجسموں میں سے دو کی طرف سرکنے لگے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ چاروں مجسمے ایک ہی قطار میں لگے ہوئے لیکن اب معاملہ بالکل ہی الگ تھا۔ پھر میں نے دوسری دیواروں کو دیکھا اور میرے بدن کی

بری طرح پھنس گیا۔ ویسے روپ گبتائی کے نام پر مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ ان ڈھانچوں کو دیکھ کر میرے روٹکے کھڑے ہو گئے تھے۔ آخر یہ ڈھانچے یہاں کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ اور پھر ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ روپ گبتا کہیں بھی موجود نہیں تھی۔

میں اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور میں نے اس دیوار پر کھڑے ہو کر دیکھا جس کی دوسری طرف سے میں یہاں تک آیا تھا۔ اب کچھ ملے یا نہ ملے۔ یہاں سے نکل بھاگنا بہت ضروری ہے۔ دل چیخ کر یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ کوئی مصیبت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ دیوار میں آدراوازہ نہیں تھا۔ میں نے دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر دروازہ تلاش کیا۔ پھر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اب تو میرے حلق سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایک طرح سے میں چیخ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی ہنسی کی آواز سنائی دی اور میں چونک کر پلٹا۔ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ دروازہ شاید یہاں ہے۔ یہ دیکھ کر مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی کہ ہنسنے والا ان ڈھانچوں میں سے ایک تھا۔ وہ منہ کھول کر لیا تھا۔

کسی ڈھانچے کو میں نے پہلی مرتبہ ہنسنے ہوئے دیکھا تھا۔ میری ہنسی بندھ گئی اور خوف سے دیوار سے لگ گیا۔ ڈھانچہ ہنس رہا تھا اور پھر دوسرے ڈھانچے نے بھی ہنسا شروع کر دیا اور پھر کے بعد دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے سارے ڈھانچے ہنسنے لگے۔ ان کے ہنسنے کی آوازیں! سے ہال نما کمرے کی دیواروں سے ٹکرائی کر گونج رہی تھیں اور خوف سے میرا خون خشک ہوا تھا۔ میں نے حلق پھاڑ کر چیخنے ہوئے کہا۔

”کون ہے..... کون ہے.....؟“ یہ مجھے جانے دو، مجھے جادو۔“ لیکن میری آواز سننے والی نہیں تھا۔ میں پاگلوں کی طرح چاروں طرف بھاگ رہا تھا اور ڈھانچے مسلسل ہنس رہے تھے اچانک وہ خاموش ہو گئے اور سناٹا چیتنے لگا۔ پھر نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں د بھرتی جا رہی ہے۔ سفید سفید دھند، گہرا گاڑھا دھواں آہستہ آہستہ پورے کمرے میں پھیلتا جا رہا تھا اور میرا خوف سے دم نکلا جا رہا تھا۔ جیسے کسی نے میری گردن پکڑ لی ہو اور اسے دبا رہا ہو۔ آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان نظروں کو آنے والے ہاتھوں کو کی کوشش کی لیکن گردن بے شک کسی نے پکڑی ہوئی تھی۔ البتہ وہ کلائیاں موجود نہیں تھیں۔ پھر دماغ پکڑنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔ میں نے ایک

پچھلے دور کی پوری قوت صرف کی اور چیخ کر کہا۔

لرزشیں تیز ہو گئیں پھر باقی دیواروں پر لگے ہوئے مجھے بھی اپنی جگہ سے نیچے اتر آئے تھے۔

عجب سی طرز کے مجھے اب بھی اتنی بلندی پر تھے کہ بہت زیادہ صاف نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اب ان کی ترتیب ضرور خراب ہو گئی تھی۔ یہ سارے مجھے دیواروں سے نیچے کی طرف پھسلنے لگے اور اتنے نیچے آ گئے کہ میں باسانی انہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک مجھے کاسرگائے کی طرح کا تھا۔ بقیہ دھڑانسانی شکل میں تھا۔ اس کا رنگ بھی کالا تھا اور وہ بڑا خوفناک لگ رہا تھا۔ ایک مجھے پیلے رنگ کا تھا۔ اس کا دھڑ بھی انسان کا تھا اور چہرے کی جگہ چھتے کا سر تراشا ہوا تھا۔ جس میں سے اس کے دانت بگڑ جھانک رہے تھے۔

پھر ایک طرف کی دیوار پر لگے ہوئے مجھوں نے حرکت کی اور ان کی جگہ آپس میں تبدیل ہو گئی اور پھر سب سے آپس میں جگہیں بدلنا شروع کر دیں۔ وہ باسانی دیواروں پر پھسل رہے تھے اور میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ آپ خود تصور کریں کہ پھر کے مجھے جنش میں ہوں اور ایک انسان اکیلا ہو تو اسے کیا احساس ہو سکتا ہے۔ میری نگاہیں ان مجھوں کا جائزہ لے رہی تھیں اب مجھے اپنی آنکھوں پر اٹا بالکل شبہ نہیں تھا۔ مجھے بار بار جگہیں تبدیل کر رہے تھے۔ اچانک ہی اس نیم تاریک کمرے میں روشا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی دیواروں پر سرسرائیں ابھری اور تمام مجھے دیواروں پر دوڑنے لگے۔ یوں گاتھا جیسے وہ جاندار ہوں اور کسی کو دیکھ کر اپنی جگہوں سے دوڑ پڑے ہوں۔

پھر وہ اس جگہ جا پہنچے جس جگہ میں نے انہیں پہلے دیکھا تھا۔ ابھی میں حیرت سے ان مجھوں کی حرکت دیکھ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور چار افراد اندر داخل ہو گئے۔ لیکن اس طرح کہ انہوں نے اپنے شانوں پر تابوت اٹھایا ہوا تھا۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے وہ تابوت نیچے رکھ دیا اور اس کے بعد اسی طرح واپس مڑ گئے۔ میں حیرانی سے تابوت کو دیکھ رہا تھا لیکن میری ہمت نہیں پڑی کہ تابوت کے پاس پہنچ جاؤں۔ اچانک ہی تابوت کے اندر کچھ جنش ہوئی اور مجھے یوں لگا جیسے تابوت کے اندر لیٹا ہوا جسم اٹھ رہا ہو۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تابوت میں اٹھ کر بیٹھنے والے اس جسم دیکھا اور میرا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ روپ گیمالی ہی تھی۔ ایک خوبصورت لباس میں ملبوس اس چہرہ اس وقت بھی متمہار رہا تھا اور بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

پھر وہ تابوت سے باہر نکل آئی۔ کجخت بے انتہا حسین تھی، میں اسے دیکھتا رہا۔ اچانک ہی افراد اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں کرسیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ جو انہوں نے درمیان میں رکھ دیں اور پھر اسی طرح سر جھکائے ہوئے واپس چلے گئے۔

”بیٹھو، نہیں راج، بیٹھ جاؤ۔“ روپ گیمالی نے کہا اور خود میرے سامنے والی دوسری کرسی پر

گئی۔ میں نے بشکل اپنے آپ کو کنٹرول کیا تھا اور اس کے بعد میں بھی اس سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

”مجھے معاف کرنا میں نے تمہیں بلایا تھا لیکن اسی وقت ہریشن کھر جی نے مجھے طلب کر لیا اور مجھے آنے میں کچھ دقت ہو گئی، لیکن میں نے تمہارے لئے کھیل کود کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ تم نے یقیناً اس سے مزہ لیا ہوگا۔“

دل تو چاہا کہ ماں بہن کی گالیاں شروع کر دوں۔ کیا دلچسپ کھیل شروع کیا تھا اس نے کہ میری جان ہی نکال لی تھی۔ میں سردنگا ہوں سے اسے دیکھتا رہا تو وہ بولی۔

”اپنا ذہن مت خراب کرو۔ یہ عام مناظر دکھانے سے میری خواہش یہ تھی کہ تم تھوڑا سا مجھ سے متعارف ہو جاؤ۔ میں کوئی عام اور معمولی عورت نہیں ہوں، ایک بہت بڑا مقام ہے میرا، اور ایک بہت بڑی مشکل کا شکار ہو کر میں تمہیں یہاں نظر آ رہی ہوں جب کہ یہ میری منزل نہیں ہے۔“

”جی۔“

”میں تم سے جو کہہ رہی ہوں وہ سمجھ میں آ رہا ہے تمہاری۔“ اپنے ذہن کو غصے کا شکار مت کرو بلکہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو۔ تم کالی کے داس ہو۔ حالانکہ تم ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو۔ کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ تمہیں اپنے جال میں کیوں پھنسانا چاہتی ہے۔“

”میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں مہارانی جی۔ اس لئے کوئی ایسا جملہ کہنے سے گریز کروں گا۔ جو آپ کی شان کے خلاف ہو۔“

”تھوڑی دیر کیلئے مجھے دوستانہ انداز میں دیکھو اور جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں۔ اسے سنو، تم بہتر ہو گا کہ اپنی منزل تلاش کرو۔ اور ہمارے بیچ مت آؤ۔ یہ تمہارے حق میں بہتر رہے گا اور اگر تم اس سے باز نہ آئے تو کھو جاؤ گے۔ ایسے کھو جاؤ گے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”دھمکیوں کے علاوہ آپ کے پاس کچھ اور ہے میرے لیے۔“ آخر کار میں نے زبان کھول ہی دی۔

”ہاں بہت کچھ ہے۔ ہنس راج ہم نہیں جانتے کہ تم اپنے دل میں کیا سوچتے ہو ہمارے لئے۔ لیکن ہمارا مسئلہ بہت معمبیر ہے۔ کالی نہیں چاہتی کہ میں اپنا مقصد حاصل کروں، ڈرتی ہے وہ اٹھ سے۔ حالانکہ وہ بہت بڑی جادوگرنی ہے، بڑا نام ہے اس کا جب کہ مجھے کوئی بھی نہیں جانتا اور میں چاہتی بھی نہیں ہوں کہ کوئی مجھے جانے۔ اس کا خیال غلط ہے، میرے بارے میں۔ وہ سوچتی ہے کہ شاید میں اس کی جگہ لینا چاہتی ہوں۔ آہ کاش کوئی اسے یہ بتا دے کہ مجھے اس کی جگہ سے کوئی

”ٹھیک ہے۔ روپ گبنالی جی میں دیکھوں گا کہ رانا ہریش کھر جی مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“  
نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تم سے ملتی رہوں گی۔ یہ تو میں نے تم سے اپنا تعارف کرایا ہے لیکن اس کے بعد میری تم سے باقاعدہ ملاقات ہوگی۔ اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ اس کے بعد میری ہسی..... پہلے کی نسبت بہت آسان ہوئی تھی اور میں اپنی رہائش گاہ یعنی رانا ہریش کھر جی کے اس ہان خانے میں پہنچ گیا تھا جو میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔



بڑی عجیب و غریب صورتحال چل رہی تھی اور اس وقت میں یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ دو فناک قوتوں کے درمیان فٹ بال بن گیا تھا۔ دونوں مجھے ٹھوکریں لگا رہی تھیں اور اپنے اپنے بال سٹ میں ڈالنا چاہتی تھیں۔ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ روپ گبنالی نے بھی اپنا مقصد اصرے سامنے بیان کر دیا تھا، جہاں تک کالی کا معاملہ تھا تو اس نے تو مجھ سے سب کچھ چھین کر یہ کچھ لیا تھا۔ جب کہ روپ گبنالی اس بات پر افسوس کا اظہار کر رہی تھی کہ مجھ سے میرا ایمان چھین گیا ہے۔ ابھی تک میرے دل میں یہ شک باقی تھی اور تو جو کچھ ہوا ہے سو ہوا ہی ہے لیکن یہ غلط ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے بچنے کا کیا طریقہ اختیار کروں۔

بہر حال وقت گزرتا رہا۔ پھر اس وقت رات کے غالباً تین بجے تھے جب کسی نے میرا پاؤں لاکر بلایا اور میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو سامنے کالی کھڑی ہوئی تھی۔ بڑی زور کا غصہ آیا تھے مجھے اور اُسے گھورنے لگا۔

”نہیں..... مجبوری ہے۔ مجبوری ہے..... مجبوری ہے۔ تمہارے لئے میں کتنے خطرے مول لے رہی ہوں، تم نہیں جانتے۔ میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں تمہارے پاس آئی ہوں۔ دشمن لی کچھاڑ میں داخل ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نجانے کیسے کیسے منتروں کو خود پر لپیٹ کر میں یہاں مل آئی ہوں۔ براہ کرم شانت ہو جاؤ، مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس نے تمہیں بلایا تھا اور اس کے بعد اصرے ہارے میں تمہیں خوب بھڑکایا تھا لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں نے تمہارا جیون بچایا ہے۔ رنہ یہاں ہندوستان میں تم اتنی مشکلات میں پڑ چکے تھے کہ اگر میں تمہاری سہائیدہ نہ کرتی تو اب تک نہیں سزائے موت ہو چکی ہوتی۔“

”دیکھو کالی دیوی! میں جانتا ہوں کہ مجھ سے میرا ایمان چھین گیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ میری ہمت کرنے والی روحیں اب مجھ سے نفرت کرتی ہیں لیکن جہاں تک تمہاری ان دھمکیوں کا تعلق ہے تو

دلچسپی نہیں ہے، میں اپنا مقصد چاہتی ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”صرف اتنا کہ تم اپنی راہ الگ تلاش کرو۔ ان ہنگاموں سے دور ہٹ جاؤ، ورنہ تم شکار ہو جاؤ گے۔ نہ اس کے لئے نہ میرے لئے کوئی مشکل کام ہے کہ میں تمہیں ختم کر دوں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی۔“

”مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو مہارانی جی۔“ میں نے بے وقوفی سے کہا۔

”یہ ہی کہ تم کالی سے ہٹ کر میرے لئے کام کرو۔ ایک چھوٹا سا کام۔“

”خوب، تو آپ کیلئے بھی کام کرنا پڑے گا مجھے۔“

”پڑے گا نہیں، مجبوری کی بات نہیں ہے، میں تعاون چاہتی ہوں۔“

”کام کیا ہے؟“

”کام کا آغاز اس طرح ہو جائے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیا سمجھے۔“

ٹھیک ہے، جب آغاز ہو جائے گا تو میں دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔“

”بس خیال رکھنا کہ اگر وہ تمہیں میرے خلاف کسی کام کیلئے آمادہ کرے تو تم اس سے گریز

کرنا۔“

”اور اگر مہاراج ہریش کھر جی مجھ سے کچھ کہیں۔“

”وہ تم سے وہی کہیں گے جو میں چاہتی ہوں، رانا میرا بھتیجہ ہے اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ

ایک خاص مقصد کے تحت میں نے اس سے بیاہ کیا ہے۔“

”مگر بابا مجھے کچھ پتا بھی تو چلے کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ ٹھیک ہے میں کالی کے لئے نہیں تمہارا

لئے کام کرتا ہوں لیکن وہ کام کیا ہے اور اس سے مجھے کیا نفع و نقصان ہوگا۔“

”تم جانتے ہو کہ کالی نے تم سے اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے تمہارا دھرم چھینا ہے، اس نے گا۔

کا پیشاب ملا ہوا خون تمہیں پلا کر تم سے تمہارا ایمان چھین لیا ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ وہ تم سے

کتنی خالص ہے۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی اور کچھ ہوتا یا نہ ہوتا، تم سے تمہارا ایمان نہ چھینتی۔“ اس میں

کوئی شک نہیں کہ روپ گبنالی کے ان الفاظ نے مجھے متاثر کیا تھا جو ہوتا تھا۔ وہ ناشائستگی اور نادار

میں ہو گیا تھا لیکن جو ہو گیا تھا وہ میرے لئے بڑا درد زد تھا اور میں اس سے کسی طرح خوش نہیں تھا

میں کوئی بھی ایسی طاقت نہیں چاہتا تھا جو اپنے دین ایمان کو کھونے کے بعد مجھے ملے۔ میں ایسی کوا

طاقت بالکل نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”آپ جیسا پسند کریں۔“

”بس تم ان کا یہ کام کر کے واپس آ جاؤ۔ تم ہم شکار کا پروگرام بنالیں گے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جم کاربٹ جی بھی ان دنوں ساؤتھ بھان کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کیلئے آرہے ہیں۔ بیلا کھیون کا اتنا ان کا پسندیدہ علاقہ ہے اور یہ سچ ہے کہ بیلا کھیون کے جنگلات میں اتنے درندے ہیں کہ دنیا کے کسی ایک جنگل میں اتنے نہ ہوں۔“

”جی۔“

”تو جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ روپ گجانی جب تم سے کام لینا چاہتی ہیں۔ چار آدمی ہمارے ساتھ ہوں گے اور کام کی نوعیت کا تمہیں اسی طرح پتہ چلے گا۔ جب تم وہاں پہنچ جاؤ گے۔ سکتا ہے کہ ہم بھی تمہیں وہیں ساؤتھ بھان میں ملیں کیونکہ اس سے آگے بیلا کھیون کے جنگلات ما۔ جن میں ایسی ایسی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں جنہیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔“

”تو مجھے ساؤتھ بھان روانہ ہونا ہے۔“

”ہاں۔“

”لیکن کام کیا ہے؟“ اب روپ گجانی بولی۔

”ساؤتھ بھان میں ہمارے دو آدمی تمہاری نگرانی کریں گے۔ جب تم ایک مخصوص جگہ پہنچ جاؤ تو تمہیں خود پتہ چل جائے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ تم ہماری بات مانتے ہو۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جیسا آپ حکم کریں گے میں کروں گا۔“ میں نے جواب

”بس تو تیاریاں کی جارہی ہیں۔ تمہیں روانہ ہونا ہے۔“

”میں تیار ہوں۔“

اس کے بعد میں وہاں سے واپس آ گیا اور سوچنے لگا کہ نبھانے ساؤتھ بھان کا علاقہ کیسا ہو۔ ا کروں اور کیا نہ کروں۔ ذہن میں تھوڑی سی بات اور آ رہی تھی۔ وہ یہ کہ کیوں نہ کہیں کم ہو جاؤں، لی ایسا کم نام گوشہ اپنالوں جہاں کوئی مجھے تلاش نہ کر سکے، یہ اتنا مشکل کام تو نہیں ہے لیکن کجنت نے گویا میرے پیٹ کے اندر اپنی جگہ بنالی تھی کیونکہ اسی دن شاستری مہمان خانے میں پہنچ گیا

میں تمہیں صرف ایک بات بتا دوں۔ مجھے یچن ہی سے یہ سکھایا گیا ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا مڑا چکنا پڑے گا اور یہ بات میرے دل میں موجود ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہوں زیادہ سے زیادہ تم میرا کیا باز کستی ہو۔ صرف اتنی ہی بات کہ میں مر جاؤں گا۔ مرنا تو ہر شخص کو ہے۔ چنانچہ تم مجھے بے کار دھمکیاں نہ دیا کرو۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو، میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہی بلکہ جب تم میرے کام کی تکمیل کرو گے تو دیکھو گے کہ تم کتنی مہمان آتما بن چکے ہو۔ میں تمہیں جادو کا وردان دوں گی، ایسا انعام دوں گا کہ تمہیں کہ تم جیون بھراس پر فخر کرو گے کہ تم نے میرا ساتھ دیا۔ سمجھ رہے ہونا پیری بات۔ بہت کم لوگ تمہیں میرے پاس سے لیکن اس کیلئے تمہیں محنت کرنا ہوگی۔“

”اب کیا کرنا ہے، مجھے یہ بتاؤ؟“

”ابھی تھوڑا سہ لگے گا۔ اب جب اس نے تمہیں اپنے کام کیلئے آمادہ کیا ہے تو پھر اس سے تھوڑا سا تعاون کرو اور دیکھو کہ وہ تم سے کیا چاہتی ہے۔ میں تم سے بس یہ ہی کہنے آئی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے کہنے پر مسلسل عمل کر رہا ہوں۔ اب بھی تمہارے کہنے پر ہی عمل کروں گا۔“ میں نے ہنسی سے کہا۔

”چلتی ہوں۔“ وہ بولی اور وہاں سے نکل گئی۔ پھر دو یا تین دن بڑے پرسکون گزرے تھے۔ رانا ہریش کھر جی نے چوتھے دن مجھے طلب کر لیا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا تو روپ گجانی بگو ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ رانا ہریش کھر جی نے کہا۔

”معاف کرنا ہنس راج تمہارے ساتھ تو میری ملاقاتیں ہی نہیں ہوئی۔ بس ایسا معروف تھا کہ مل نہیں سکا تم سے، لیکن مجھے بس ایک بات بتاؤ، یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔“

”نہیں رانا صاحب میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ یہاں آپ نے میرے لئے بڑے آرام بندوبست کر دیا ہے حالانکہ میں اپنے آپ کو ایک نوکر کی حیثیت سے سمجھتا ہوں۔“

”کبھی بھی مت سمجھنا۔ ہمیں نوکروں کی نہیں انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر تم جیسا بھاء شکاری نوکر رکھا ہی نہیں جاسکتا۔“

”آپ نے ابھی تک مجھ سے کوئی کام تو لیا ہی نہیں ہے۔“

”اسی لئے تو بلایا ہے تمہیں۔ ہماری یہ مہارانی روپ گجانی تم سے کوئی کام لینا چاہتی ہیں اور تمہیں کسی خاص مقصد کیلئے روانہ کرنا ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ ہمارے دشمن تمہارا پیچھا کریں گے ان سے ذرا ہوشیار رہنا۔“

”جے مہا کالی۔ آپ کے چرنوں میں حاضر ہوا ہوں مہاراج صرف ایک چیتاؤنی دینے کیلئے۔“ میں نے گہری نگاہوں سے شاستری کو دیکھا تو وہ بولا۔

”آپ جو سوچ رہے ہیں ناں مہاراج، وہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ پورے سنسار میں کہیں بھی غائب نہیں ہو سکتے۔ بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے آپ۔“

”اوہو۔ تو تمہیں میرے اندر کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔“

”وہ جو ہمارے نقصان کی باتیں ہوں اور ہم تمہیں یہ بھی بتانے آئے ہیں کہ جہاں جا رہے ہو۔ وہاں تمہارا جانا بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بعد اس سے آگے کا سفر شروع ہوتا ہے اور یہ سہ

وہی ہے جس میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔“

”لعنت ہے تمہاری شکل پر۔ ہر کام تمہاری مرضی اور پسند کے مطابق ہی ہو جاتا ہے اور مجھے

اس کا نہایت افسوس ہے۔“ میں نے جواب دیا اور شاستری بڑے مکروہ انداز میں ہنسنے لگا۔ اس کے

بعد اس نے دونوں ہاتھوں جوڑ کر ماتھے پر لگائے اور بولا۔

”جے مہا کالی، چلتے ہیں۔ آپ کو یہی بتانے کیلئے آئے تھے۔ باقی رات جاگتے ہوئے و

گزاری۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب جب کہ میں مصیبت میں گرفتار ہو ہی گیا ہوں تو اسے فرا

مشکل ہے۔ بہتر یہ ہی ہے کہ ان لوگوں کی مرضی کے مطابق ہی کام کرتا رہوں اور یہ میرا آخری فیصلہ

تھا۔

پھر میری زندگی کی مشکلات کا سفر شروع ہو گیا۔ مجھے کچھ ہدایات دی گئیں اور اس کے بعد ا

چار افراد کو میرے ساتھ کر دیا گیا۔ مجھے ایک کافی لمبا سفر طے کرنا پڑا اور میں خاموشی سے ان ت

راستوں کو دیکھتا رہا۔ جہاں سے گزر کر مجھے ساؤتھ بھان کے علاقے میں لایا گیا تھا۔ ساؤتھ بھان ا

علاقہ ہمالیہ کی ترانیوں میں ایک پراسرار علاقہ تھا۔ میں دریا کے کنارے پہنچ گیا لیکن اس وقت ش

کے سائے چاروں طرف پھیلنے لگے تھے اور ہم لوگوں نے دریا کے کنارے قیام کیا تھا کہ رات ک

تاریکی میں کچھ پراسرار افراد نے ہم پر حملہ کر دیا پھر گولیاں چلیں اور میرے ساتھ آنے والے چار و

آدی کہیں ہلاک ہو گئے۔ میں ان گولیوں سے بچنے کیلئے دریا میں کود گیا اور تیزی سے تیرتا ہ

دوسرے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔

میری سر توڑ کوشش تھی کہ میں دریا کے کنارے پہنچ جاؤں مگر دریا کی لہریں بہت تیز تھیں ا

ہوں لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی سیلاب آ گیا ہو۔ میری سر توڑ کوشش کے باوجود دریا کی طوفانی لہروں

نے مجھے دوسرے کنارے پر نہ جانے دیا اور میں دریا کے عین درمیان آ کر سامنے کی طرف بہنے لگا۔

دریا کی خوفناک لہریں مجھے طوفانی رفتار سے آگے بڑھائے لے جا رہی تھیں۔ میں بھرپور طریقے سے

ہاتھ مار رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

رات کا خوفناک اندھیرا فضاء پر مسلط تھا اور مجھے دریا کی دھندلی لہروں کے سوار کچھ نہیں دکھائی

دے رہا تھا۔ دریا کا پاٹ آگے جا کر کافی چوڑا ہو گیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر

ستارے چمک رہے تھے اور اب ان کی پھمکی پھمکی روشنی میں مجھے دریا کا نیالہ پاٹ نظر آنے لگا تھا۔

دور کنارے پر کھٹے جنگلوں کی سیاہ لکیر پھیلتی جا رہی تھی۔ بہر حال میں اپنے طور پر سر توڑ کوشش کرتا رہا۔

لہریں چٹان بن کر میرے راستے میں حائل ہو رہی تھیں اور میں خود کو دریا کی لہروں کے رحم و کرم پر

محسوس کر رہا تھا۔ اتنا لمبا سفر طے ہو گیا تھا اور میری ساری جدوجہد بے مقصد ہی ثابت ہو رہی تھی۔

آخر کار یہ ہی سوچا میں نے کہ اب اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دوں۔ کنارے

کی طرف تیرنے کی کوشش اس طرح بیکار ہو رہی تھی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ غرض یہ کہ میری

آنکھیں بند ہو گئیں اور مجھ پر جیسے بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ کچھ یاد نہیں رہا کہ کتنا وقت گزرا۔ کوئی

ہات ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نیند کے عالم میں دریا کے ساتھ ساتھ بہتا جا رہا تھا کہ اچانک نیند

کا اثر غائب ہو گیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور جو تبدیلی میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ جہاں دریا کا

ہاؤنڈ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے علاوہ جو ایک خوفناک صورتحال لگا ہوں میں آ رہی تھی۔ وہ یہ تھی

کہ مجھے دریا میں بہتے ہوئے بڑا نامعلوم وقت گزرا تھا۔ کیونکہ اس وقت شام کے جھپٹے نیچے اتر رہے

تھے۔ میرے دونوں جانب پہاڑی سلسلے دور نگاہ تک پھیلے چلے گئے تھے۔ سورج ان پہاڑیوں کے

پچھے مغرب کی جانب چھپ گیا تھا۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر گنجان جنگل ہی جنگل تھے۔ جن پر سرمئی رنگ

کی دھند اتر رہی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے نیچے پتھر بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں دریا کا پاٹ

ایسی اونچا تھا اور مجھے یہاں کھڑے ہو کر چلنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی لیکن بہر حال میں دونوں

تھوں پیروں کے بل پتھروں پر چلنے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد میں کنارے پر پہنچ گیا۔

کنارے پر بھی دریائی گھاس اگی ہوئی تھی ان میں مینڈک اور جھینگر بول رہے تھے۔ دریا سے

ہر ٹکڑے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بہر حال لباس وغیرہ کی بھی جو حالت ہو رہی تھی وہ بتانے کے قابل

میں ہے۔ قد آدم گھاس میں سے باہر آیا تو دیکھا کہ میرے سامنے سیاہی مائل جھوٹی پہاڑیاں

ریک بکھری ہوئی ہیں۔ یہ ایک بہت ہی خوفناک جنگل تھا۔ جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے



تھے۔ جن پر عبورے رنگ کی کائی جی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کون سی جگہ تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ دریا کے بہاؤ پر جس طرح بہتا رہا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت فاصلہ طے کر لیا ہے۔

ساری رات اور تقریباً سارا دن اور ایک بار پھر رات جھپتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس خیال سے پہاڑیوں کی طرف چلنا شروع کر دیا کہ شاید کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں اپنے تھکے ہوئے وجود کو پناہ دے سکوں۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا۔ درختوں پر پرندوں کا شور زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں ایک جنگل سے نکل کر پہاڑی کے دامن میں آ گیا۔ اس پہاڑی کے ڈھلان پر دائیں بائیں اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے اور پھر میری نگاہوں نے اس عمارت کو دیکھا۔ جس کا طرز تعمیر مندروں جیسا تھا۔ عمارت کی دیواریں ایک طرف کو جھکی ہوئی تھیں۔

گھاس میں چمپا ہوا بڑے بڑے پتھروں کا زینہ اوپر کی عمارت تک چلا جا رہا تھا۔ جسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی قدیم مندر کی عمارت ہی ہے۔ میں نے درختوں کے بیچ سے نظر آنے والے آسمان کو دیکھا۔ وہاں سیاہ بادل اڑے چلے جا رہے تھے۔ ایک دو باران بادلوں میں بجلی کی چمک بھی لہراتی نظر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی سی گڑ گڑاہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ بارش کی آمد آمد کے آثار تھے اور ایسے وقت میں وہ ٹوٹا پھوٹا کھنڈر نما مندر میرے لئے سایہ رحمت کہا جاسکتا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو بارش میں درختوں کے نیچے رات گزارنی پڑتی۔ دریا کے سفر کے دوران میرے جسم میں جگہ جگہ خراشیں بھی آ گئیں تھیں۔ جن میں اب ہلکی ہلکی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت یہ مندر میرے لیے بہت ہی بڑی رحمت تھی۔ میں گھاس میں پتھروں کے زینے پر سے گزرتا ہوا آخر کار مندر کے دروازے پر آ گیا۔

مندر کا دروازہ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک طرف جھکا ہوا تھا اور خاصا چھوٹا تھا۔ دروازے کا ایک پت اس طرح اپنی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا کہ اندر جانے کا راستہ خود بخود دین گیا تھا۔ مندر کی حالت بے پناہ خستہ تھی۔ لگتا تھا کہ قدیم ترین عرصے سے یہاں کسی انسان کے قدم نہ آئے ہوں۔ ویسے بھی جس دیواریں میں یہ مندر واقع تھا وہاں بھلا انسان کہاں سے آئے۔ بادلوں میں بجلی کی چمک پھر نمودار ہوئی اور ہلکی سی گرج سنائی دی۔ پھر اس کے بعد ایک دم سے موٹی موٹی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ میں پہلے ہی بیگیا ہوا تھا۔ بھینکنے سے مجھے کوئی فرق تو نہیں پڑتا تھا لیکن پھر بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں ابھی بیگلوں۔ ایک عجیب سی تسکن اور ایک اداسی جو میری فطرت میں رچ گئی تھی۔

میں مندر کے پت میں سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر اندر چلا گیا۔ پہلے تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر

پھر بلی دیواروں کا خاکہ سا ابھرنے لگا۔ یہ ایک نیچی چھت والا کمرہ تھا۔ پتھر ہی سے دیواریں بنائی گئی تھیں۔ فرش پر بے پناہ پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اب اس وقت اس مندر کا جائزہ لینے کی سکت نہیں تھی۔ میں تو یہاں آرام کرنے آیا تھا۔ چنانچہ میں دروازے کے سوراخ کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

رات کا اندھیرا باہر جنگل میں پھیل گیا تھا۔ موٹی موٹی بوندوں نے آخر کار موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی۔ جنگلوں میں موسلا دھار بارش کی آواز ایسی ہوتی ہے کہ اس کے سوا کچھ سنائی نہ دے۔ حالانکہ موسلا دھار بارش کی آواز بڑی دلکش ہوتی ہے لیکن یہ بھی وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ میں نے اپنا سرد دیوار کے ساتھ لگا لیا تھا اور اب اس غنودگی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا جو دریا کے وسط میں پہنچ کر مجھ پر طاری ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے میں بے خبری کے عالم میں بہتا ہوا اس گم نام ملائے میں پہنچ گیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی چلی گئی، بارش ایک ہی رفتار سے جاری تھی۔ مندر کے اس طرف دروازے کے سوراخ میں سوائے تاریک جنگل کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے خیال میں اُدی رات گزر چکی تھی اور پھر آہستہ آہستہ تیز رفتار بارش کی آواز کم ہوتی چلی گئی۔ نیند میری آنکھوں سے کافی دور تھی کیونکہ ایک رات اور تقریباً پورا ہی دن بے ہوشی کے عالم میں گزرا تھا اور شاید اسی بے ہوشی نے نیند کی کسر بھی پوری کر دی تھی پھر شاید رات کا تیسرا پہر ہو گا کہ مجھے اس دیران کمرے میں جہاں اس دیران کمرے میں جہاں دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ بیروں کی آہٹ سنائی دی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ننگے پیروں سے چل پھر رہا ہو، میری آنکھیں بے اختیار کھل گئیں۔

یہاں کا جو عالم تھا۔ اس میں اس کا تو کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کوئی ذی روح یہاں باہر کون ہو سکتا ہے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مگر مجھے کمرے میں کچھ لڑ نہیں آیا تھا۔ ہر طرف چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے لیکن پاؤں کی آہٹ کی آوازیں اب لی آ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے قریب سے گزر کر سامنے والی دیوار کی طرف جا رہا ہے۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ دیران جگہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں بدروجوں کا بئیرا ہے۔ ویسے قدیم ہندوستان کے دیران مندروں میں بدروجوں کے ٹھکانے ہی ہوا کرتے ہیں لیکن مجھ پر ماکا زیادہ خوف نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ پہلے ہی مجھ پر دو بدروجوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور ان سے ہر ایک میری حفاظت کیلئے کمر بستہ ہے۔

لیکن ابک بات میں جو خاص آپ کو بتاؤں کہ انتہائی برے حالات میں بھی میں نے ایک بار

بھی کالی کو نہیں پکارا تھا۔ جس نے مجھ سے ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا تھا اور جو کبھی تھی کہ تم جہاں کہیں بھی ہو۔ میں تم سے زیادہ دور نہیں رہوں گی۔ اسے پکارنے کو میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میرے والد صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے یہ ہی کہا تھا کہ بیٹا کتنا ہی مشکل وقت تم پر کیوں نہ پڑے خدا کے سوا کسی اور سے مدد نہیں مانگنا اور یہ بات میں نے اپنی گرہ میں باندھ لی تھی۔ جب کہ مجھ سے میرا دین، دھرم، ایمان سب کچھ چمن چکا تھا۔ تب بھی خدا کے سوا کسی کو نہیں پکار سکتا تھا اور جب بھی میں خدا کا نام لینے کی کوشش کرتا، میری زبان جیسے اینٹھنے لگتی اور اس کی وجہ مجھے معلوم تھی۔

کالی بتا چکی تھی کہ اس نے سب سے پہلے مجھے غلامتیں کھلا کر میرا ایمان جھینا ہے۔ بہر حال سوچنا ضرور تھا۔ اس وقت بھی میں یہ ہی سوچ رہا تھا کہ یہ بدروح کس کی ہے اور کس لئے یہاں آئی ہے۔ میں نے بیروں کی آہٹوں پر کان لگا گئے۔ اب کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر یہ ساری آوازیں غائب ہو گئیں اور وہی گہرا گھمبیر سا ناٹا طاری ہو گیا۔ اتنا تو اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ مندر میں جو آوازیں سنائی دی ہیں وہ یقیناً بدروحوں کی آوازیں ہیں لیکن وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھیں کیونکہ بہر حال کالی نے اپنا حصار میرے گرد قائم کر رکھا ہے اور محترمہ روپ گینالی بھی میری محافظہ بن گئی تھیں کیونکہ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ انہیں بھی میری ضرورت ہے۔ میں نے دیوار کے ساتھ دوبارہ اپنا سر لگا لیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں بے چینی سے صبح کا انتظار کر رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ صبح ہوتو سوچوں کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اچانک مجھے پھر ایک آواز سنائی دی اور میرے خیالات اور تصورات کا سلسلہ ٹوٹ گیا لیکن یہ کوئی انسانی آواز نہیں تھی بلکہ یوں لگتا تھا جیسے کسی دھات پر کوئی وزنی چیز بجاتی گئی ہو۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر مجھے سرگوشی میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

ان میں عورتوں کی آوازیں بھی تھیں اور مردوں کی آوازیں بھی۔ وہ باتیں کر رہے تھے لیکن ان کی آوازیں اتنی مدھم اور سرگوشیوں میں تھیں کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا ایک بار پھر بدروحوں نے میرے ارد گرد احاطہ کیا ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اندازے کے مطابق اندھے کمرے میں اس طرف بڑھا جس طرف میرے خیال کے مطابق کچھ پر اسرار مردوں اور عورتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے پاؤں میں پتھر لی زمین آگئی اور میں۔ دیوار کے ساتھ کان لگا دیا۔ آوازیں اس دیوار کے پیچھے ہی سے آ رہی تھیں۔ میں نے دیوار کو ہاتھ

سے ٹٹولنا شروع کیا کہ شاید وہاں کوئی خفیہ دروازہ ہو مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر اچانک ہی ایک عجیب بات ہوئی کہ میں نے جونہی دیواروں سے کان ہٹایا، آوازیں میرے پیچھے سے آنے لگیں، پھر اس کے بعد سارا کمرہ آوازوں سے بھر گیا۔ میں نے سوچا کہ اس بک بک جھک جھک سے پتہ ہی چاہیے۔

خواخواہ کسی مشکل یا الجھن میں نہ پھنس جاؤں۔ میں نے دوسرے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو میرے آگے جیسے ایک دیواری آگئی۔ جو مجھے نظر تو نہیں آتی تھی مگر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک مضبوط دیوار ہے۔ میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے وہ غیبی دیوار آگے سے ہٹ گئی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر نکلنے لگا تو وہاں بھی ایسی ہی مضبوط دیوار میرے مانے حائل ہو گئی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ کیا یہ سب کچھ میرے ساتھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ماتھے ہو رہا ہے۔ مگر ان بدروحوں کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں ابھی یہ ہی سوچ رہا تھا کہ ہانک ہی ہانک روؤں کی جھنکار اور رقص کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور میں ناچ کر رہ گیا۔ باقاعدہ رقص کیا جا رہا تھا۔ نسوانی اور مردانہ قہقہوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ یہ رقص کرتی ہوئی پرائیں، یاد رکھیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں انھوں کی طرح ان آوازوں کو سننا رہا۔

رقص کافی دیر تک کیا جاتا رہا تھا۔ پھر اسکے درمیان ایک نسوانی آواز نے کوئی عجیب و غریب لہجہ بھی تھوڑی دیر کیلئے گایا۔ یہ لہجی لے اور آواز بڑی درد انگیز تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی رو ہا ہو۔ اس گانے کے ساتھ ہی رقص کی تال بھی مدھم ہو گئی تھی۔ میں خاموش دیوار کے ساتھ لگ کر یہ ادا نظر نہ آنے والا پراسرار کھیل سن رہا تھا۔ یہ رقص و سرود اور نسوانی آوازوں کے تقریقی قہقہے آخری ایک جاری رہے۔ پھر دروازے کے سوراخ سے صبح کی روشنی اندر آنے لگی۔ تو یہ آوازیں بھی غائب ہو گئیں۔

میرے لئے یہ ایک بہت ہی عجیب تجربہ تھا۔ نہ مجھے رات کو کوئی خوف محسوس ہوا تھا اور نہ میں بے چارہ ہوا تھا۔ بس میں نے ویسے ہی اس بک بک سے دور ہو جانے کی کوشش کی تھی مگر میرے تے میں کوئی طلسمی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ ابھی تک میں یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس طلسمی دیوار نے مجھے لے لئے روکا ہے۔ ظاہر ہے یہ حرکت بھی بدروحوں نے ہی کی ہوگی۔ مگر اس سے ان کا مقصد کیا

بہر حال صبح ہو چکی تھی اور اب مجھے ان معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ اٹھ کر سوراخ میں نکل کر باہر جانے لگا تو اچانک ہی میری نظر دروازے کی جانب پتھر کے قریب

آسان ابھی تک ایر آلود تھا۔ بارش رکی ہوئی تھی، میڑھیوں کے بڑے بڑے پتھروں کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس رات کی موسلا دھار بارش کے بعد گیلی ہو رہی تھی۔ میرا پاؤں پتھر پر جمی ہوئی کانٹی پر سے پھسلا تو میں نے ایک جھاڑی کو پکڑ لیا۔ جھاڑی میں کانٹے تھے۔ ہاتھ ڈالنے سے وہ لمبے لمبے کانٹے میری ہتھیلی پر لگے تو مجھے درد کا احساس ہوا۔ میں وہیں پتھر کی طرح سن ہو کر رہ گیا۔

پتہ نہیں یہ کیا ہوا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ میری ہتھیلی میں جہاں دو کانٹے لگے تھے وہاں سے سرخ سرخ خون رس رہا تھا۔ نجانے کیا عجیب سی کیفیت تھی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلی میں سے رستے ہوئے خون کو غور سے دیکھنے لگا۔ کانٹوں کا زخم ابھی بھی درد کر رہا تھا۔ میں نے ہتھیلی کا خون اپنی قمیض سے صاف کیا اور میڑھیوں کے اوپر ویران مندر پر نگاہ ڈالی۔ دن کی ایر آلود روشنی میں مندر ایک آستینی کھنڈر کی طرح خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک کچھ دچتر رہا پھر واپس مندر کی جانب پلٹ پڑا۔

لیکن ابھی میں زینہ چڑھ کر اوپر کے پہلو والے درخت کے پاس آیا ہی تھا کہ ایک بار پھر مجھے ب جھٹکا لگا۔ سانپ کا بت جسے میں نے وہاں رکھ دیا تھا۔ اب وہاں نہیں تھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ درخت کی شاخوں پر نگاہ ڈالی لیکن سانپ کا مجسمہ کہیں بھی نہیں تھا۔ یہ کیسے غائب ہو گیا۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک ہی مندر کے اندر سے انہی ہتھکروؤں کی آواز سنائی دی۔ اس بار ہتھکروؤں کے ساتھ ڈھولک کی ہلکی ہلکی تھاپ بھی گونج رہی تھی۔ میں پھرتی سے آگے بڑھا اور مندر میں داخل ہو گیا۔ جس اندھیرے ویران کمرے میں میں نے رات گزاری تھی وہ اسی طرح ویران اور تاریک تھا۔ رضاء میں پراسرار ہتھکروؤں اور ڈھولک کی تھاپ کی دھیمی دھیمی آواز گونج رہی تھی۔ میں مشرقی ار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

ہتھکروؤں کی آواز اس دیوار کے پیچھے سے آرہی تھیں۔ پھر میں نے غور سے دیکھا تو مجھے نے میں پڑا ہوا ایک لمبا بھاری پردہ نظر آیا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ یہ

پڑے ہوئے کانسی کے ایک چھوٹے سے بت پر پڑی یہ پھن اٹھائے ہوئے سانپ کا بت تھا۔ یہ بہت چھوٹا سا تھا۔ ایک لمبے تک میں نے سوچا اور پھر اسے اٹھا کر باہر روشنی میں لے آیا۔ سانپ آنکھوں کی جگہ سیاہ پتھر کے دو ننھے سے نقطے لگے ہوئے تھے جو روشنی میں چمک رہے تھے۔ یہ چھوٹا کانسی کا سانپ پھن اٹھائے ہوئے تھا لیکن ایک اور خوفناک احساس نے ایک لمحے کیلئے مجھے لرزادیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سانپ کے بت کا جسم بہت ہی خفیف طور پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آہ آہستہ ہلتا ہے۔ یہ واقعہ دو یا چار لمحوں کا ہوتا تھا اور مجھے باقاعدہ اس کے کانسی کے جسم کی دھیمی دھمک اپنے ہاتھ پر محسوس ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ خوفناک چیز کیا ہے۔ ایک لمحے کیلئے مجھے خیال آیا اس بت کا میرے ہاتھ پر ہونا ایک غیر مناسب بات ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اس کو ایک درخت کے تنے کے پاس ہی رکھ دیا۔ جس کی شاخوں میں سے ابھی تک بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ میں چلنے لگا تو ایک نظر سانپ کے بت پر ڈالی۔ میں ٹھٹک سا گیا اور یوں لگا جیسے سانپ نے پھن ڈرا گھما کر میری طرف دیکھا ہو۔

آہ۔ کیا یہ سب کچھ وہم ہے یا پھر میں اس طلسم کدے میں پھنس گیا ہوں۔ آخر کار میں نے ا تمام چیزوں پر لعنت بھیجی اور ویران مندر کی میڑھیاں اترنے لگا۔



”چاہتی تو یہی ہوں کہ زبردستی نہ کروں لیکن اگر تم نے میرے ساتھ چلنے میں کوئی پس و پیش کی  
میر مجھے زبردستی بھی کرنی پڑے گی۔“ میں نے ایک لمحے کیلئے کچھ سوچا۔ رقا صہ مجھے گھور رہی تھی۔  
مے فیصلہ کیا کہ مجھے کم از کم صورتحال معلوم کرنے کے لئے اس کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔  
ایسا لگا جیسے اس نے میرے اندر کی بات سمجھ لی ہو۔ وہ واپس مڑی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل

اس کمرے سے نکلنے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک مندر کے ٹوٹے پھولے حصے سے گزرتی رہی  
بھر ایک کٹھڑی کے اندھیرے کونے میں رک گئی۔ یہاں ایک تاریک راستہ زمین کے اندر جاتا  
۔ بڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہم اس راستے سے نیچے اترنے لگے وہ چمن چمن کرتی ہوئے آگے بڑھ  
تھی۔ زینے سے نیچے اترے تو ایک طرف سے روشنی آ رہی تھی۔ روشنی جس جگہ سے آ رہی تھی وہاں  
۔ غار کا دہانہ بھی نظر آ رہا تھا۔ غار میں ایک جگہ دیوار پر مشعل جل رہی تھی۔ آگے ایک کھلی جگہ آ  
۔ جہاں دو مشعلیں روشن تھیں اور ان کی روشنی میں جو کچھ دیکھا کہ انتہائی سنسنی خیز تھا۔  
غار کے پھوں و بیچ ایک مرگ چھالہ بھی ہوئی تھی اور اس پر ایک انتہائی مکروہ صورت کا آدمی  
لی پالتی مارے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے وہی سانپ کا مجسمہ تھا۔ خوفناک عورت نے مجھے  
لے کھینچا اور بولی۔

”میں بلیدان لے آئی ہوں مہاراج۔“ اس کے ان الفاظ پر خوفناک آنکھوں والے نے اپنی  
آنکھوں سے گھور کر مجھے دیکھا اور سانپ کے مجسمے کو فضا میں بلند کر کے بولا۔

”جے سپورنا۔ جے پران بھگوت۔“ اور اسی وقت سانپ کے مجسمے کی سیاہ آنکھوں میں سے  
نی کی کرنیں نکل کر عورت پر پڑیں اور عورت ایک دم ہنس پڑی۔ یہ سب کچھ عقل و دانش سے پرے  
وہ ہوتا تھا۔ عورت رقص کرتی رہی اور پھر ایک دیوار کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ دیوار  
اس طرح غائب ہو گئی کہ اس کا نام و نشان بھی نہ رہا۔

مرگ چھالہ پر بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ غار کی چھت کی طرف  
ہا اور اس کے حلق سے ایک لرزا دہنے والی چیخ کی آواز نکلی۔ اس نے دوبارہ چیخ ماری اور دروازے  
تاریکی میں سے دو لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے اپنے برہنہ جسموں پر سانپ لپیٹے ہوئے تھے  
انہیں دیکھ کر بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ خوفناک صورت والا آدمی آگے بڑھا اور اس نے  
ن لڑکیوں کے بال پکڑ لیے اور پھر انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح گھسیٹنے لگا۔ میری طرف رخ کر کے  
ولا۔

پردہ رات کو وہاں نہیں تھا۔ گھنگروؤں کی آواز اسی پردے کے پیچھے سے بلند ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا  
شخصیت کو یاد کیا۔ میں کون سا صحیح انسان تھا۔ نجانے کیسے کیسے الٹے سیدھے جا پ کر کے اپنا سب کچھ  
ہی تباہ و برباد کر لیا تھا۔ اب اور کیا تباہی ہوگی۔ میں نے دانت کچکچا کر پردے کو ایک طرف کھسکا  
اور پھر ایک دم چونک پڑا۔ دیوار پر مشعل روشن تھی۔ نیچی چھت والی تنگ کٹھڑی کے فرش کے درمیان  
میں کالے ناگ کا ایک اور مجسمہ رکھا ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک عورت جس نے ایک عجیب وغریب  
قسم کا لباس پہنا ہوا تھا۔ رقص کر رہی تھی، اس کے پورے بدن کا رنگ بھی عجیب تھا۔

یہ زندہ تھی اور اس پر اسرار مندر میں میں نے پہلا زندہ وجود دیکھا تھا۔ عورت بہت ہی پر اسر  
تھی۔ ہلک اس کے بدن کے نقوش حسین ترین تھے لیکن اس کا رنگ عام انسانوں کے رنگ۔  
بالکل مختلف تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کی گردن میں بھی ایک سانپ چمن پھیلائے جم  
رہا تھا۔ میرے بدن میں سردی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ میں اس منظر کو دیکھ کر ششدر سا رہ گیا۔  
ضرور کوئی بدروح تھی۔ میں نے ایک لمحے تک سوچا اور پھر وہاں سے پلٹنے کی کوشش کی تو مجھے پور  
جیسے میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے ہوں اور میں اپنی جگہ سے کوشش کے باوجود بھی ایک قدم  
چل سکتا۔

اس وقت پر اسرار آئینی رقا صہ نے اپنا رقص روک کر پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مشعل  
روشنی میں اس کی کیسری رنگ کی آنکھیں انگاروں کی طرح دکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن میں  
سانپ بھی دھیمی دھیمی پھنکاریں مار رہا تھا۔ میں بت بنا کھڑا اس آئینی رقا صہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ام  
ہی وہ میری جانب پلٹی اور اس نے کہا۔

”ہنس راج..... اب تمہارا نام ہنس راج ہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم کون ہو اور کہاں  
آئے ہو اور میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو۔ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو  
لیکن اس کے لئے جلدی نہ کرو۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ نجانے کہاں سے میرے اندر اتنی قوت پیدا ہو گئی کہ میں  
سے باقاعدہ مخاطب ہو گیا۔ وہ غور سے میرا چہرہ دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

”کیا تم میرے ساتھ آنا پسند کرو گے؟“

”کہاں جانا چاہتی ہو؟“

”یہ ابھی نہیں بتاؤں گی۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا۔“

”زبردستی؟“ میں نے ہمت کر کے سوال کیا۔

اں ہوا تھا۔ بھوک بھی کیا چیز ہوتی ہے، انسان اپنی اصلیت ہی بھول جاتا ہے، پیٹ بھر گیا تو میرا لگ ہی صحیح طریقے سے کام کرنے لگا اور میں نے سوچا کہ کیا ہریش کھر جی نے جان بوجھ کر مجھے مصیبت میں پھنسا یا ہے۔ یہ سب کچھ تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال یہ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن میری مصیبت اپنی جگہ۔ اچانک ہی مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے زور زور سے کہا۔

”کالی تو نے اپنے مقصد کیلئے میری زندگی کو زخم بنا دیا ہے۔ میں جن مصیبتوں میں گرفتار ہوں صرف تیری وجہ سے ہیں اور تو خاموشی سے میری مشکلوں کو دیکھ رہی ہے۔ پھر کیا فائدہ تیرے پتھر مارنے کا۔ بہتر تو یہ ہے کہ میں خود روپ گبتالی کو ساری تفصیلات بتا دوں اور اس سے کہوں کہ کالی اٹھ تیرے پاس کوئی نقصان پہنچانے کے لئے بھیجا ہے۔ یہ ساری باتیں جو کچھ بھی ہیں میں نہیں اں گا اور اسے سب کچھ بتا دوں گا میں تیرے جال سے لٹکنا چاہتا ہوں۔

اچانک ہی کچھ ہوا۔ ایک تیز روشنی اس غار میں پھیل گئی۔ جہاں میں اس وقت موجود تھا اور پھر لے کالی کو دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں چلتی ہوئی میرے سامنے آگئی اور پھر اس نے مجھے غور دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

”گھبرا گئے۔“

”اس کا مقصد ہے کہ تم یہاں آسکتی تھیں اور تو نے مجھے جان بوجھ کر ان مشکلات میں گرفتار کیا

”پاکل مت بنو بس راج۔ تم جتنی تکلیفیں اٹھا رہے ہو ناں، یہ کچھ بھی نہیں ہوں گی، اس شکتی کے جو تمہیں ملنے والی ہے۔ یہ مشکلیں تو تمہاری تقدیر میں لکھی ہوئی تھیں، اب کیا چاہتے ہو۔“

”یہ بھی میں ہی تجھے بتاؤں۔“ میں نے کہا۔

”یہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں ایک غلط راستے پر ڈال دیا ہے لیکن خیر بات نہیں ہے۔ چلو آؤ۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“ اس نے کہا اور واپسی کیلئے مڑ گئی، میں چند سوچتا رہا۔ اس کے بعد میں کالی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جو کچھ میں نے دیکھا۔ وہ میرے لئے یقین تھا۔ لیکن جو کچھ تھا نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ ہر دیوار سے گزرتی چلی جا رہی تھی اور کوئی ما کے راستے میں رکاوٹ نہیں تھی۔

بہر حال وہ چلتی رہی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس طرح ہم کوٹھڑی سے باہر آ گئے۔ ما کوئی مشعل نہیں جل رہی تھی۔ ہم غار کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے تاکہ ہم کافی دور نکل آئے اور پھر کالی نے کہا۔

”چلے آؤ۔“ نجانے کیا ہوا کہ میرے قدم خود بخود اس کے پیچھے اٹھ گئے۔ سامنے کے نگہ دروازے میں پتھر کی تین سیڑھیاں اتر کر ایک عجیب و غریب غار آ گیا۔ اس کی پتھر کی چھت کا اونچی تھی اور تھوڑے فاصلے پر دیوار پر بنے ہوئے سیاہ ستونوں میں مشعلیں لگی ہوئی تھیں۔ ان کی روشنی میں مجھے غار کی دیواروں پر دونوں طرف حیرت انگیز صورتیں نظر آئیں۔ یہ صورتیں اور بت دیو کے پتھر کھود کر بنائی گئی تھیں۔ میں ان کے درمیان آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا چل رہا تھا۔ غار میں لوہان کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اسی قسم کا ایک اور غار شروع ہو گیا۔ اس غار دیواروں پر بھی بت اور ان کے ہمایاںک منظر بنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد ہم تیسرے غار میں داخل ہو گئے اور اس غار کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یہ جیسے ایک ڈراؤنے خواب کے اندر سفر کر رہا تھا۔ سانپوں والی لڑکیاں مجھے تیسرے غار کے اس عجیب مقام پر لے گئیں جہاں مجھے ایک گول دیواروں والی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور اس کے بعد وہ واپس چلی گئیں اور میں اکیلا رہ گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اچکا چراغ دیوار کے طاق میں جل رہا ہے۔ کوٹھڑی کی دیوار میں ایک جگہ چوکور سوراخ بنا ہوا تھا۔ اس اندر تنگ سی جگہ تھی۔ جہاں مٹی کے برتن میں پانی رکھا تھا۔ یہ شاید منہ ہاتھ دھونے کیلئے تھا۔ ایک گندے پانی کی ٹکاسی کیلئے باہر جاتی تھی۔ میں حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ سب کیا کیا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے منصوبے کے تحت یہاں بھیجا تھا۔

بہر حال یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس کے بعد کیا گا۔ ہریش کھر جی نے مجھے ساؤتھ بھان بھیجا تھا اور بتایا تھا کہ وہ ہیلہ کیوں کے جنگلات میں شکار کرے گا لیکن یہاں تو خود میرا ہی شکار ہو گیا تھا۔ آخر یہاں تک مجھے کیسے لے آیا گیا۔ میں نے جھنجھلا سوچا کہ اس مصیبت سے بچنے کیلئے کیا کیا جاسکتا ہے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ دیوار میں ایک جگہ تنگ سا دروازہ نمودار ہو گیا اور ایک عورت اندر داخل ہو گئی۔ اس ہاتھ میں ایک تھالی تھی۔ تھالی ایک جگہ زمین پر رکھ کر اس نے کہا کہ اس میں اس تھالی کو اٹھا لوں۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی ہدایت پر عمل کروں یا نہ کروں۔

پھر میں نے تھالی میں دیکھا اس میں ابلے ہوئے چاول اور زرد رنگ کے کیلے پڑے ہوئے تھے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں تو شدید بھوکا ہوں اور جب بھوک اس طرح حد سے گزر جائے تو ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں لیکن کافی کچھ کرنے کے بجائے میں پہلے پیٹ کا دوزخ بھرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں جو کچھ بھی تھا میں نے اسے کھا لیا، بہت سکون

”دیوار کے پتھروں میں صرف اتنی جگہ ہے کہ اس میں سے صرف ایک انسان گزر سکے ذرا احتیاط سے آگے جانا ہوگا۔“ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ غرض یہ کہ ہم آگے بڑھے اور آخر کار ہم نے وہ موت کی خطرناک سرنگ عبور کر لی۔ مجھے پانی بننے کی آوازیں سنائی رہی تھیں۔ کالی نے بتایا کہ آگے ایک ندی ہے جو پہاڑی کے نیچے گہرائی میں بہتی دریا کے دور کنارے پر نکل جاتی تھی۔ یہ ہی وہ ندی تھی جس کی آواز میں نے پہلی بار اپنی کال کوٹھری میں سنی اس نے بتایا کہ یہ دریا اس کوٹھری کے اوپر سے بہہ رہا ہے۔ یہاں پانی کے قطرے بارش کی موٹی بوندوں کی طرح ٹپک رہے تھے۔

ہم اندھیرے ہی میں یہ دلدلی سرنگ عبور کرتے ہوئے زمین کے نیچے نیچے بننے والی ایک پر آگئے۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس کا پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال یہاں سے آگے بڑھنا کھلی ہوئی جگہ نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔

”یہاں سے آگے تمہاری اپنی کہانی شروع ہوگی۔ میں چلتی ہوں۔“  
تم کہہ رہے تھے ناں کہ میں نے تمہیں مشکل میں پھنسا دیا۔ اب تم کسی مشکل کا شکار نہیں یہاں انتظار کرو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ اسی طرف نکل آئیں۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں کہ روپ بگٹا ہریش کھمبھری اپنی منزل کی جانب چل پڑے ہیں۔“

”کالی مجھے ایک بات اور بتا دو۔“

”ہاں، پوچھو، ابھی تو میں تمہارے پاس ہوں۔“

”آخر یہ مصیبت ختم کہاں ہوگی؟“

”نہیں یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی کیونکہ اسی میں ساری مشکلوں کا راز پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ تمہیں بتا چکی ہوں کہ روپ بگٹا میرا مقام لینا چاہتی ہے اور اس کیلئے وہ یہ ساری جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر یہ کہانی اگر تمہارے علم میں آگئی تو تم وہ جدوجہد جاری نہیں رکھ سکتے جو تمہارے لئے بہت ضروری ہے اور جو تمہیں امر فکٹی دے گی۔“

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ دل ہی دل میں میں نے اس امر فکٹی کو ایک سی گالی دی تھی۔ جس نے خود میری اپنی ساری فکٹی چھین لی تھی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ بہر تھوڑی دور آگے بڑھا تھا کہ کالی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں تہمتہ لگاؤں، باپ کا مذاق اڑاتا تھا۔ ابا بے چارے ہمیشہ اسی تنگ دود میں گھرے تھے کہ میں تعویذ کا کاروبار سیکھ لوں اور اس کے بعد آرام سے وقت گزاروں۔ میں نے ان کا بہت مذاق اڑایا

میں مجھے ان ساری مشکلوں کا شکار ہونا پڑا تھا۔ ایک دو منٹ تو وہیں کھڑا سوچتا رہا اور پھر وہاں آگے بڑھ گیا۔

نجانے کتنا فاصلہ اسی طرح طے کیا تھا۔ کالی نے بتایا کہ ہریش کھمبھری اپنے شکار کی مہم پر چل پڑا۔ ظاہر ہے ان لوگوں نے مجھے اسی جگہ پہنچنے کیلئے کہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے ساتھی حادثے اور ہو گئے تھے لیکن بہر حال ان لوگوں کو آنا اسی طرف تھا اور پھر میں جن پر اسرار مصیبتوں میں گھرا

ادھ بھی میری مددگار رہی ہو سکتی ہیں۔

بہر حال میں چلا جا رہا تھا کہ بہت دور سے مجھے کچھ لوگ نظر آئے اور میں حیران رہ گیا۔ نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں، چند ہی افراد تھے اور پھر بالکل پیدل۔ کچھ بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ چنانچہ میں حیرت فطری سے ان کی جانب چل پڑا۔ تب میں نے بزرگ کو دیکھا وہ بہت اچھی شکل و صورت کے مالک تھے۔ چہرہ بھی نورانی تھا۔ میں ان کے پیچھے گیا۔ میں نے ان کے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔

”بیٹے، جو کچھ مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ سے مانگو، کسی انسان کے پاؤں پکڑنے سے کبھی کچھ نہیں

”آپ نے ٹھیک فرمایا لیکن میں بڑی مشکلوں کا شکار ہوں۔“

”میں جانتا ہوں بیٹے کہ تم کن مشکلوں کا شکار ہو لیکن تم نے ایک بڑی اصول چیز کھودی ہے۔“  
”مجھ پر بار نہیں ملتی۔“ ان کے ان الفاظ پر میرے دل میں ان کی اور زیادہ عزت و قدر بڑھ

نے لیا۔

”بابا صاحب! اگر آپ میرے بارے میں جانتے ہیں تو خدا را میری مدد کیجئے اور میری کھوئی ہوئی چیزیں واپس دلادی جائے۔“ بزرگ گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر انہوں نے کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولے۔

”بیٹا! اگر یہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی قوت بحال کرا کر یہاں سے لرتے لیکن تم ایسی مصیبتوں میں پھنس گئے ہو کہ ہمارے بس میں بھی نہیں رہا ہے یہ سب کچھ۔“  
”دم کا شکار ہو اور تمہارے اوپر نجانے کون کون سی گندی روجوں نے سایہ کیا ہوا ہے۔“

”تو پھر مجھے ایک بات بتائیے محترم بزرگ! میں نادانستگی میں اس گندی میں پھنسا ہوں، کیا

رگی میں اسی میں پھنسا رہوں گا۔“

نہیں بیٹے! ناامیدی گناہ ہے۔ دنیا میں کوئی جادو ایسا نہیں جس کا کوئی تو نہیں، تمہارے اوپر

بے بصورت ملا ہوا تھا۔ میری بات سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلایا اور بولا۔

”بیٹھ جاؤ۔ ہم ابھی معلوم کرتے ہیں کہ ہمارا دوست ہم سے کیا خدمت لینا چاہتا ہے۔“ میں سادھو کے سامنے چٹان پر بیٹھ گیا۔ سادھو نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بائیں جانب سیاہ رنگ کا ایک منزل رکھا ہوا تھا۔ چند لمحات کیلئے وہ آنکھیں بند کئے ساتھ رہا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اولا۔

”تمہارے بزرگ ہمارے دوست ہیں۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سادھو اپنی لال، لال آنکھیں کھولے ہوئے چاندنی رات کی ساکت فضاؤں میں گھورتا رہا۔ پھر کچھ وقت گزر گیا اور اس نے اپنے پاس رکھے ہوئے منزل سے ایک کیل اور کچھ پتھر نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔ ”یہ چیزیں پہنے پاس رکھو۔ یہاں سے آگے بڑھو گے تو سات کوس کے فاصلے پر تمہیں ایک پہاڑی گاؤں نظر آئے گا۔ اس گاؤں کے باہر ایک شمشان بھوی ہے۔ جہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں تم ان پھپ کر بیٹھ جانا جب وہ لوگ وہاں کسی مردے کو جلانے کے لئے آئیں تو تم آگ کے آگے یہ راہ اور اس مردے کی شکل کو دیکھنا اگر اس مردے کی شکل میں تمہیں کوئی جانور نظر آئے تو تم اس کے لئے انتظار کرنا۔“

جب مردے کے رشتے دار اس کی چتا کو جلا کر چلے جائیں تو اس کے پاؤں کی طرف آکر لیٹیں یہ ایک کیل ٹھوک دینا۔ اس وقت بہت سی بلائیں تمہیں ڈرانے کے لئے نمودار ہوں گی، مگر ناگہم۔ وہ تمہارے قریب نہیں آسکیں گی۔ اگر تم ڈر گئے تو یاد رکھو، زندہ نہیں بچو گے۔ جب تم پوری زمین میں گاڑ دو گے تو ساری بلائیں چلتی چلائی غائب ہو جائیں گے اور پھر ایک چھوٹے سے قد والا ہوتا تمہارے قریب آکر کھڑا ہو جائے گا وہ تمہیں اشارے سے اپنے پیچھے آنے کیلئے کہے گا اور وہ تمہیں اس جگہ لے جائے گا جہاں تم ہر طرح کی بلاؤں سے آزاد ہو جاؤ گے۔ کیا سمجھ رہی کرنا تمہیں۔“

اس کے بعد سادھو نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے گیان دھیان میں مشغول ہو گیا۔ میں نے ل اور پتھر سنبھال کر رکھ لیے اور پھر واپس چڑھائی چڑھ کر دریا کے کنارے آکر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ لے کیوں میرے دل کو اس بات کا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ سادھو نے جو کہا ہے وہ میرے کام آئے ہو سکتا ہے کہ میں کالی ہی نہیں بلکہ روپ گجانی کے سحر سے بھی آزاد ہو جاؤں۔ بہر حال یہاں میں طرح باغی ہو گیا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میری یہ کوشش مجھے کالی کے اثر سے آزاد کرادے تو

جو مصیبتیں نازل ہوئی ہیں، ان کا بھی توڑ موجود ہے مگر وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ البتہ ہم تمہاری کر سکتے ہیں۔ یہاں سے سیدھے چلے جاؤ۔ بہت فاصلہ طے کر لو گے تو تمہیں ایک بہتا ہوا دریا گا۔ دریا کے پرانے گھاٹ پر دریا کی طرف چٹانوں میں ایک انوکھا غار ہے۔ غار میں ایک انوکھی ہے۔ اس میں ایک چٹا دھاری سادھو جو پورن پاشی کی رات کو ادھر آتا ہے اور گھما کے باہر چٹان چبوترے پر بیٹھ کر عبادت کرتا ہے اس کے پاس جاؤ، عبادت سے فارغ ہو جائے تو اس سے کہنا مہاراج ایک غریب الوطن نے آپ کو سلام بھیجا ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری مدد کرے۔ بس اس سے آگے نہ مجھ سے کچھ پوچھنا اور نہ میں بتا سکتا ہوں۔“

یہاں سے بائیں سمت آگے بڑھو اور چلتے چلے جاؤ۔ بہر حال یہ سفر میرے لئے بالکل آ تھا۔ یہاں سے کالی اور روپ گجانی اور باقی ان تمام لوگوں کے منصوبے کی نفی ہوتی تھی۔ جنہوں مجھ پر اپنا اثر قائم کر رکھا تھا۔ بہر حال نجانے کتنا وقت گزرا، میں اسی سمت سفر کرتا رہا۔ رات کو کب جگہ پڑے پڑے گزار دیتا، درختوں پر کسی جگہ جو پھل وغیرہ نظر آتے تو انہیں کھا لیتا، ورنہ بھوکا ہی کا سفر کرتا یہاں تک کہ وہ دریا جس کی مجھے تفصیل بتائی گئی تھی۔ میرے سامنے آ گیا۔ میں صبح کے کنارے کنارے پرانے گھاٹ پر پہنچا تو دور دور پر پہاڑی کی چٹان پر مجھے ایک غار نظر آیا۔

بہر حال اب مجھے پورن پاشی کی رات کا انتظار کرنا تھا۔



آخر کار پورن پاشی کی رات آگئی جب چاند کا دوسرا پہر ہوا تو میں چراغوں کی روشنی میں بڑھتا ہوا دریا کے کنارے آ گیا۔ چاندنی ہر طرف چمکی ہوئی تھی۔ ہواؤں میں طرح طرح کے پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ دریا کی سطح چاندنی میں دودھیا ہو رہی تھی۔ آخر کار میں پرانے پہنچ گیا۔ اور پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ چاندنی رات میں صاف نظر آ رہا تھا۔ چڑھائی دشوار گزرتی لیکن بالآخر میں اس چٹان کے پہلو میں پہنچ گیا جہاں مجھے سادھو نظر آ رہا تھا۔ وہ گہ سامنے چٹان سے باہر نکلے ہوئے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔

میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ سادھو عبادت کر رہا تھا۔ آدمی رات کے بعد جا کر سادھو کے جسم حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور پھر کچھ پڑھنے سکھمیر آواز میں بولا۔

”کون جو حتم۔ اور یہاں کیا لینے آئے ہو۔“ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا اور پھر بڑے بزرگ کا پیغام اسے دیا۔ سادھو کے جسم پر ایک لنگوٹ، واڈھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے

آوازیں بھی شامل ہو گئیں اور وہاں بھیا یک چیخوں کا کھرام مچ گیا۔ میں نے پیچھے ضرب لگائی تو چتا کے انگاروں میں سے ہیبت ناک ڈراؤ نے پیکر نکل کر میرے ارد گرد گردش کرنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے ترشول تھے اور وہ انہیں میری طرف بڑھا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان سے مجھے مار ڈالنا چاہتے ہوں۔ ان کے چہرے انگاروں کی طرح لال اور زبانیں شعلوں کی طرح لہرا رہی تھیں خوف سے میری جان نکل گئی تھی لیکن میں زور زور سے ضربیں لگائے جا رہا تھا۔ کجنت زمین سخت تھی اور کیل آہستہ آہستہ زمین میں دھنس رہی تھی۔ جب کیل زمین کے برابر ہو گئی تو اچانک وہ ساری آوازیں خاموش ہو گئیں اور اتنا ہیبت ناک سناٹا چھا گیا کہ سانسوں کی آوازیں تک صاف سنائی دیں پھر مجھے اپنے عقب میں سرسراہٹ سنائی دی اور میں نے ایک دم گردن گھما کر دیکھا لیکن جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ اس نے مجھے ساکت کر دیا تھا۔

میرے پیچھے کالی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں آگ بر ساری تھیں۔ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ پھر نفرت سے ہونٹ سکڑ کر بولی۔

”غدار کی ہے، مجھ سے تم نے ہنس راج۔ غدار کی ہے، میں تو تمہیں اتنا کچھ سمجھا چکی تھی، کیا سمجھتے ہو تم۔ کیا اس سنسار میں مجھ سے بڑا جادوگر اور کوئی ہے۔ تم نے جو کوششیں کیں ان سے کم از کم مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم دل سے میرے ساتھ نہیں ہو۔ جب کہ میں نے تمہیں امر شتی دینے کا وعدہ کیا ہے اور جب تمہیں امر شتی مل گئی تو تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہیں کیا مل جائے گا۔

”بھاڑ میں جائے تمہاری امر شتی اور بھاڑ میں جاؤ تم۔ میں ایک مسلمان کا بیٹا ہوں اور مسلمان ہی رہنا چاہتا ہوں۔“

”دیکھو! مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے۔ محبت تو نہیں کہہ سکتی اس لئے کہ میرے سینے میں وہ دل ہی نہیں ہے۔ جس میں کسی کیلئے محبت ہو لیکن یہ تو میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ میرے جال سے لکھنا تمہارے لئے آسان نہیں ہوگا۔ جو کوششیں کر رہے ہو۔ ان میں سے تمہیں کامیابی ملنا ناممکن ہے۔ سمجھ لو۔ بالکل ناممکن۔ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اس غدار سے سمجھ؟“ کچھ بھی نہیں، کالی کی آوازیں جیسے سانپ پھنکار رہے تھے۔

”دیکھو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ایک مسلمان کا بیٹا ہوں۔ بے شک مجھ سے میرا ایمان چھینا جا چکا ہے لیکن میرے دل میں آج بھی یہ حسرت ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے مجھے میرا دین دھرم واپس مل جائے۔“ جواب میں کالی کا قہقہہ فضاء میں گونج اٹھا۔ اس نے کہا۔

”اور میں اس سنسار میں نجانے کب سے جگہ بنائے ہوئے ہوں جس پر میرا ہاتھ پڑ جائے،

اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں امر شتی حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کیا مل جاتا یہ امر شتی حاصل کر کے۔

بہر حال میں کوششوں میں مصروف رہا۔ اور پھر اس جگہ پہنچ گیا جس کی مجھے نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہات تھا۔ جہاں کچے کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ گاؤں کے باہر ایک جگہ پتھر کی چار دیواری تھی۔ یہاں کچھ ہندو لوگ ایک جگہ چبوترے پر بکھری ہوئی راکھ میں سے ہڈیوں کی دھول نکال نکال کر پیتل کی گاگر میں ڈال رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ رات کو یہاں کوئی مردہ جلا یا گیا ہے۔ اسے میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب میں کسی دوسرے مردے کی اترتی کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر کے ہو کچھ لوگ ماتم کرتے ہوئے ایک اترتی کو لے کر شمشان بھوی میں داخل ہوئے۔ چبوترے پر لکڑیاں لگا کر مردے کی اترتی کو لاش سمیت اس پر رکھ دیا گیا۔ میں ایک طرف کھڑے ہو کر وہ نظارہ کرنے لگا اور مردے کی شکل کی طرف دیکھا۔ مردے کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ انسانی شکل ہی تھی اس طرح میں نے شمشان بھوی میں چار دن گزار دیئے۔ پانچویں روز ایک اترتی آئی۔ چتا پہلے سا تیار تھی۔ یہ ایک امیر ہندو کی لاش تھی۔

رشتے دار بھی اور چندن بھی لائے تھے۔ میں نے موقع پا کر اس مردے کے چہرے کو دیکھا حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس مردے کی شکل انسان کے بجائے لومڑی کی ہوئی تھی اور پھر جب میں نے دوبارہ اسے دیکھا تو اترتی پر مردہ لینا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے ہا میری مطلوبہ چیز ہے۔ پھر میں درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اترتی چتا پر رکھ دی گئی تھی۔ ساتھ آئے ہو۔ لوگ اشلوک پڑھ رہے تھے۔ پھر اترتی کو اس کے رشتے داروں نے آگ دکھادی۔ خالص سگی لے فنا آگ پکڑ لی۔ اور چتا دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ جب چتا انگاروں کا ڈھیر بن گئی تو شام کے سائے لڑا پر اترنا شروع ہو گئے۔ میت کے عزیز و اقارب ٹھنڈی چتا سے بھول چننے کے بعد روتے ہوئے وا چلے گئے۔ جب شمشان بھوی میں مہیب سناٹا چھا گیا تو میں درختوں سے نکل کر چتا کی طرف بڑھا چبوترے پر چتا کے انگارے دھک رہے تھے اور ان میں سے تیش ابھر رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں لوہے کی کیل اور دوسرے ہاتھ میں ایک پتھر تھا۔ میں چتا کے پاؤں کی طرف ہو کر زہر بیٹھ گیا۔ کیل کی نوک زمیں پر رکھی اور اس پر پہلی ہی ضرب لگائی تھی کہ زمین ایک بھیا یک چنچے اٹھی۔ پتھر میرے ہاتھ سے چھٹ گیا اور میں مارے دہشت کے سمٹ گیا۔ مجھے سادھو کی بات یاد کہ اس نے کہا تھا کہ اگر تم ڈر گئے تو جان سے ہاتھ دھوئے پڑیں گے۔ کیل تھوڑی سی ٹھک چکی چیخوں کی آوازیں مسلسل آنے لگی تھیں۔ میں نے دوسری ضرب لگائی تو چیخوں کی آوازیں میں د



اسے میرا اس بننا ہی پڑتا ہے۔ بے شک تمہارے ذریعے روپ گنجائی کو ناکام بنانا چاہتی تھی لیکن اب جب تم کالی کو آزمانے پر تلے ہوئے ہو تو جاؤ۔ کالی کو بھی آزما لو اور اپنے آپ کو بھی۔“ اس نے کہا اور اچانک ہی وہ غائب ہو گئی۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں ایک مشکل میں پھنس چکا ہوں لیکن میرے دل میں ایک اور خیال بھی تھا۔ وہ یہ کہ جو انسان اپنی خوشی سے اپنا دین دھرم نہیں چھوڑتا اور کالی تو میں اسے اپنے جال میں جکڑ کر اس سے اس کا ایمان جھین لیتی ہیں۔ تب بھی کہیں نہ کہیں سے اس کی مدد ہوتی ہے اور آخر کار وہ اپنی منزل پا جاتا ہے ہاں، وہ شخص جو جان بوجھ کر کالے علم سے متاثر ہو کر دھن دولت حاصل کرنے کیلئے خود اپنا ایمان بیچتا ہے۔ اسے پھر آسانی سے اس کا ایمان واپس نہیں ملتا اور میں انہیں میں سے تھا۔ میری تو پاک روحوں سے دوستی تھی۔ جو ہر جگہ میری مدد کرتی تھیں لیکن مجھ پر کچھ ایسا غلبہ ہوا تھا کہ میں آج تک مشکل میں گرفتار تھا۔

ایک اندازہ مجھے ہو چکا تھا کہ بزرگ نے مجھے جس سادھو کے پاس بھیجا ہے وہ سادھو کالی کا مقابلہ نہیں کر سکا اور ناکام رہا ہے اور اب میں لاوارث ہوں، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں سادھو بھان کے علاقے میں تھا۔ بیلا کیوں تک پہنچنے کا راستہ میرے سامنے تھا لیکن یہاں آ کر میں ہلک گیا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔

بہر حال یہاں سے تو چلنا ہی تھا۔ ان علاقوں کے بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ البتہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ بدھ مت کے ماننے والوں کا علاقہ تھا۔ شمالیہ کی ترائیوں میں بہت سارے جگئے اور خانقاہیں بنی ہوئی تھیں۔ جنہیں میں نے یہاں تک کہ سفر کے دوران دیکھا تھا۔ روپ گنجائی یا ہریش مکھرجی نے مجھے ایک پراسرار سفر کیلئے روانہ کیا تھا اور اپنے چار آدمیوں کے ساتھ یہاں بھیج دیا تھا۔ لیکن اب ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ اب تو جو کچھ بھی کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا اور اب تک میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے، وہ بڑے ہی سنسنی خیز تھے۔

بہر حال میں وہاں سے چل پڑا، کسی منزل کا تعین نہیں تھا۔ بس چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ بلندی پر سے مجھے ڈھلان نظر آئے۔ ان ڈھلانوں میں کچے کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ جن راستوں سے میں گزر کر آیا تھا۔ وہ جنگلی راستے تھے اور درختوں اور گھاس وغیرہ کے سوا مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ایسا احساس ہوتا تھا جیسے یہاں درندے ہوں، ایک دو جگہ یہاں جانوروں کے سرمبی نظر آئے تھے۔ کہیں ایسے سوکے ہوئے بنجر پڑے ہوئے تھے جن کے بارے میں صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ انسانی ہڈیوں کے بنجر ہیں یا کچھ اور۔ ہستی بہر حال

یہاں سے کافی دور تھی اور ان ڈھلانوں پر بھی جنگل ہی بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ لمحوں کیلئے سوچا اور اس کے بعد قدم ان ڈھلانوں کے جنگل کی طرف بڑھا دیے۔ لیکن ڈھلانوں کے آخری سرے پر مجھے کچھ نظر آیا۔ یہ انسانی جسم کی تحریک تھی۔ جنگل سرسبز اور ہری بھری شاداب وادیوں سے گزر رہے تھے۔ بہر حال جو کچھ مجھے نظر آیا تھا میں نے اسی کی طرف قدم بڑھا دیئے اور میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا، وہ ایک انسان ہی تھا لیکن اس کے قریب جو کچھ بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میں بری طرح زروس ہو گیا۔ یہ آدمی انسانی لاش تھی۔ باقی آدھا بدن غائب تھا اور جو شخص وہاں متحرک تھا۔ وہ لمبے چوڑے بدن کا سانولی رنگت کا ایک آدمی تھا۔ وہ اس لاش کے قریب بری طرح افسردہ بیٹھا تھا۔

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک پڑا اور اس کے بعد اس نے مجھے تعجب سے دیکھا اور بولا۔

”کدھر سے آ رہے ہو بابو جی؟“

”اس طرف سے“

”اکیلے ہو۔“

”ہاں۔“

”تمہارے پاس تو بندوق وغیرہ بھی نہیں ہے، شکاری ہو کیا؟“

”ہاں۔“

”اور بغیر بندوق کے ادھر گھس آئے ہو، اور اب تک زندہ ہو۔“

”کیا یہاں درندے ہیں؟“

”اتنا بھی نہیں معلوم تمہیں۔ یہ تو درندوں کا مسکن ہے بابو جی۔“

”تم کون ہو؟“

”ہری لعل۔“

”ہری لعل یہ لاش کس کی ہے؟“

”میرے مالک جے رام کی۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“

”دیکھ نہیں رہے، کیا ہوا ہے اسے۔ شیر اس کا آدھا بدن کھا گیا ہے۔“

”ارے، ارے، مگر تم؟“

”ہم ہستی جا رہے تھے بابو جی۔ ہمارے مالک جے رام جی، اسی ہستی کے رہنے والے ہیں،

نوح میں نوکری کرتے تھے، چھٹیوں پر آئے تھے کہ یہاں جنگل میں گھر گئے، دھوکے میں مارے گئے،

”ہاں..... باہو جی، لاگو ہو رہا ہے انسانی خون کا۔“ ہری لعل نے جواب دیا۔  
 ”میرا خیال ہے آؤ میرے ساتھ بستی چلو دیکھیں گے کہ کیا کہا جاسکتا ہے۔“  
 ”باہو جی! آپ جاؤ۔ آپ ایک کام کرو شکاری تو ہونا۔ آپ؟“  
 ”ہاں۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”تو باہو جی ہمارے مالک کی یہ بندوق اور کارتوسوں کی پٹنی آپ لے لو یہ جنگل بہت خطرناک ہیں۔ ہمیں پہلے بھی معلوم تھا لیکن اتنے بھی نہیں کہ ہمیں یہ نقصان پہنچا دیں۔“  
 ”چلو پھر اٹھو۔“

”نہیں باہو جی ایسا نہ کرو۔ ہمیں مت لے جاؤ۔ ہم بستی میں جانے کی ہمت نہیں کر پارہے۔  
 ویسے بھی تم یہ ڈھلان دیکھ رہے ہونا۔ لگتا ہے بستی بہت فریب ہے مگر اب اتنی قریب بھی نہیں ہے۔  
 دیکھو..... ہری لعل اس طرح بزدلی دکھانا اچھی بات نہیں ہے۔“  
 ”ارے تو کیا کریں، مالک کے خون کے انتقام لے لیتے تو پھر جانے کو دل بھی چاہتا۔ کم از کم یہ تو  
 کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اپنے مالک کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔“ میں کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔  
 ”چلو پھر تھوڑا سا اور آگے چلتے ہیں۔“  
 ”پھر کیا کریں گے باہو جی؟“

”ہستی میں اس وقت داخل ہوں گے جب تمہارے مالک بچے رام جی کی موت کا بدلہ لے  
 لیں۔“ میرے الفاظ پر ہری لعل کا چہرہ کل اٹھا۔

”یہ ہوئی ناں۔ یاروں والی بات باہو جی! معاف کرنا ہم تمہارے داسی ہیں ویسے بھی مالک کی  
 دھمی کھائی ہوئی لاش کو چھوڑ کر بھاگ جانا بزدلی ہے۔ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اس لاش کے پاس ہی۔  
 ن شیر کی لاشیں بھی موجود ہو۔ جس نے ہمارے مالک کو کھایا ہے۔“

”ٹھیک ہے، آؤ۔ کوئی مناسب جگہ تلاش کریں“ اور اس کے بعد میں ہری لعل کے ساتھ آگے  
 بڑھا گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ایسی جگہ نظر آگئی۔ یہ ایک نامعلوم درخت تھا، جو انتہائی مضبوط اور  
 ٹیلا ہوا تھا۔ یہاں چنان تو نہیں بنایا جاسکتا تھا لیکن درخت کی شاخیں اتنی چوڑی چوڑی تھیں کہ آرام  
 سے ان پر وقت گزارا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے اسی جگہ کو اپنا مسکن بنانے کا فیصلہ کر لیا اور درخت پر  
 بٹھ گئے۔

وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ ہری لعل کے چہرے پر اس کے احساس کے  
 نئے لرزاں تھے۔ میں بھی طرح طرح کے خیالوں میں گم تھا۔ ذرا سی آہٹ ہوتی تو میرے جسم میں

ورنہ ان جیسا جدید ارتو کوئی ہے بھی نہیں۔“

”تم کہاں تھے اس وقت؟“

”پانی کی تلاش میں نکلے تھے باہو جی کیونکہ ہم دودن کے پیاسے تھے۔“

”اوہو..... پھر پانی ملا؟“

”ہستی جانا پڑتا باہو جی۔ بستی کے سوا یہاں کہیں پانی نہیں ہے، مگر بستی کتنی دور ہے۔ تمہیں خود  
 بھی اندازہ ہو گیا ہے۔ ہمارے مالک بستی نہیں گئے تو اب ہم بستی جا کر کیا کریں گے۔ ہم بھی انتظار  
 کر رہے ہیں کہ شیر آئے اور ہمیں کھا جائے۔“  
 ”نہیں ہری لعل..... زندگی بڑی قیمتی چیز ہے۔ اب ایسا بھی نہیں۔“ ہری لعل کی آنکھوں سے  
 آنسو بہنے لگے۔

تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کے تنے سے ایک بہت ہی شاندار کارتوسوں کی پٹنی رکھی ہوئی  
 تھی۔ ہری لعل نے اسے دیکھ کر کہا۔

”یہ ہمارے مالک کی بندوق ہے۔ صاحب جی!“

”اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے، ہری لعل۔“

”ہماری ہمت نہیں پڑ رہی۔ باہو جی کہ یہ راستہ طے کر کے بستی جائیں اور بچے رام جی کے گھر  
 والوں کو خبر دیں کہ اب بچے رام جی کبھی گھر واپس نہیں آئیں گے۔“ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ بڑا  
 وفادار آدمی تھا۔ اپنے مالک کی موت کا سوگ منا رہا تھا۔  
 ”ہری لعل تم خود کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”ارے باہو جی بچپن سے بچے رام جی کے ساتھ پلے پڑھے۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہیں کے رہنے  
 والے ہیں ہم بھی۔ ساری عمر ان کا نمک کھایا اور جب وہ فوج میں گئے تو ہم بھی ان کے ساتھ چل  
 پڑے تاکہ ان کی سیوا کرتے رہیں۔“

”تم بہت اچھے انسان ہو ہری لعل لیکن اب اس کے علاوہ کیا کیا جاسکتا ہے کہ ہری لعل جی  
 کے گھر والوں کو اطلاع دیں۔ ورنہ وہ بے چارے انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے۔“  
 ہری لعل جی، بدستور آنسو بہاتا رہا، پھر میں نے کہا۔ ”دیکھو! یہ جگہ خطرناک ہے کہیں ایسا نہ ہو  
 کہ شیر تم پر بھی حملہ آور ہو جائے۔“

”مرنا تو چاہتے ہیں ہم باہو جی۔ پر ابھی تک سراود بارہ نہیں آیا۔“

”تم نے اسے دیکھا ہے؟“

سنسنی کی لہر دوڑ جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں زندگی کے ایک انوکھے دور سے گزر رہا تھا۔ میرے اپنے گرد بے شمار دشمن پھیلے ہوئے تھے۔ جن میں کالی صفحے اول میں تھی۔ بہر حال ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ اچانک ہی گیلڈروں کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یکا یک سناٹا چھا گیا، جیسے جہاں تمام کائنات کو سانپ نے ڈس لیا ہو۔ دس بارہ سانپز دوڑتے ہوئے آئے اور ہمارے اس درخت کے قریب ہی چوڑیاں بھرتے ہوئے غائب ہو گئے۔

یہ انداز مجھے تو ہو گیا تھا کہ شیر آرہا ہے۔ ہری لعل نے سرکشی میں کہا۔

”بابو جی! پہلا فار مجھے کرنے دیں۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک سناٹے میں ہڈیاں چٹختے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر ایک دم ٹاریج روشن ہوئی اور ہری لعل کی رائفل نے شعلہ اگل دیا۔ گولی شیر کی پیشانی توڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ شیر بے رام جی کی لاش کے اگلے حصے پر گرا۔

پھر ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے بڑی اونچی چھلانگ لگائی۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ ہم سے چند ہی فٹ نیچے رہ گیا تھا۔ وہ درخت سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ اور اسی وقت ہری لعل نے دوبارہ فار کیا اور گولی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ شیر پھر کودا اور پھر وہیں تھوڑا سا ٹپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہری لعل غضب کا نشانہ باز ہے۔ ظاہر ہے فوج میں رہ چکا تھا۔ اس کے حلق سے خوشی کا نعرہ نکلا اور وہ جوش و غضب میں درخت سے نیچے کود گیا۔ کسی قسم کے خوف کا احساس کیے بغیر وہ شیر کے پاس پہنچا اور اس کے بعد اسے ٹھوکر مارنے لگا۔ پھر اس نے شیر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بابو جی! ایک بات کہیں آپ سے؟“

”کہو، کیا بات ہے؟“

”بابو جی، یہ وہ شیر نہیں ہے، جس نے ہمارے بے رام جی مہاراج کو مارا تھا۔“

”شیر کو تم کیسے پہچان سکتے ہو؟“

”پہچان تو سکتے ہیں بابو جی، پر ٹھیک ہے چھوڑیں، اب جو بھگوان کی اچھا۔“ اس نے کہا اور

بولتا ”صبح ہوتے ہی ہم یہاں سے چل پڑیں گے۔“

انداز مجھے بھی ہو گیا تھا کہ یہ جنگل درندوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہری لعل بتا رہا تھا کہ یہ شیر وہ نہیں ہے لیکن اب اس شیر کی تلاش بھی تو ایک مشکل کام تھا۔ صبح ہونے میں تھوڑا ہی وقت تھا کہ انسانوں کا ایک گروہ ڈھلان کی طرف آتا نظر آیا۔ یہ سامنے والی آبادی کے لوگ تھے۔ وہ پریشانی سے زبر

دیکھتے ہوئے آرہے تھے۔ ہم لوگ نیچے اتر گئے۔ آنے والے شیر اور بے رام کی لاش کے پاس پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے ہمیں دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر ہمارے سامنے جھک گئے۔

”مہاراج کی بے ایہ کیا ہوا؟“ ہری لعل نے رندے ہوئے لہجے میں انہیں ساری تفصیل بتائی تو ان میں سے ایک نے کہا۔

”بستی میں بھی ایک درگھنہ ہو گئی ہے مہاراج۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”ندیا لعل کی شادی کو صرف دس دن ہوئے تھے۔ آدم خور پگھٹ سے اس کی دھرم پتی کو اٹھا لے گیا۔“

”کیا؟“

”ہاں اس سے پہلے بھی چار انسان اس کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔“

”پگھٹ سے اٹھا لیا گیا۔ کیا کسی نے اسے دیکھا تھا۔“

”ہاں مہاراج شیر، پہاڑ پر پگھٹ کے قریب اترتا ہے اور کسی نہ کسی انسان کو شکار کر کے غائب ہوتا ہے۔“

”یہ بے رام جی کی لاش ہے، تم لوگ اسے اٹھا کر لے جاؤ اور اس کا کرایا کرم کر دو، ہم ندیا لعل کی دھرم پتی کو تلاش کرتے ہیں۔“ میں نے کہا اور ہری لعل خوشی سے اچھل پڑا۔

”آپ کے چروں میں آنکھیں رگڑنے کو من چاہتا ہے۔ مہاراج آپ پہ نہیں کون ہیں۔ پر ہمارے لئے کتنا سوچ رہے ہیں۔“

”پگھٹ کا راستہ بتاؤ؟“ میں نے ان لوگوں میں سے ایک کو کہا۔

”ہم ساتھ چلیں مہاراج؟“

”نہیں بس تم راستہ بتا دو۔ میں اور ہری لعل جا رہے ہیں۔“ میں نے جواب فری سے کہا۔ اصل ماضی تو اب میرے ذہن سے محو ہوتا جا رہا تھا۔ میں حال میں جن الجھنوں کا شکار ہو گیا تھا ان سے ات حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ میں نے ساری امہ آرائیاں قبول کر لی تھیں۔ میں خود کو دھوکہ دینے کا خواہش مند تھا۔ بہر حال ہری لعل بھی ایک مار آدمی تھا۔ مجھے ایک ایسے ساتھی مل جانے سے بڑی خوشی ہوئی تھی اور آخر کار میں ہری لعل کے لوطا قاتل آدم خور کی تلاش میں چل پڑا۔

لگتے اور اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد آسمان سے بوندیں پھسل پڑیں گی اور ایسا ہی ہوا۔ اول شروع ہوئی اور اس کے بعد تیز ہوتی چلی گئی۔ ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے ایک گھنٹے درخت لے چھپے پناہ لی تھی۔ لیکن کتنا ہی گھنا درخت ہوتا بارش کی رفتار جو کچھ بھی تھی اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا لاکہ یہ درخت اسے روک بھی نہیں سکتا اور ایسا ہی ہوا۔ ہم خوب اچھی طرح بھیک گئے تھے۔

کوئی اڑحائی یا تین گھنٹے کے بعد بارش بند ہوئی۔ گرد و غبار دھل کر درختوں پر بہا آ گئی۔ فانات غائب ہو چکے تھے، یہ ہماری مہم کا ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ بہر حال ہم پر بھی لگن طاری تھی۔ دل لعل بھی دھن کا پکا تھا۔ ہم پھر گھنے جنگل میں آدم خور کو تلاش کرنے میں لگ گئے۔ اچانک ہی ہری لڑک گیا۔ دس بارہ فٹ کے فاصل پر سانپوں کا ایک جوڑا نظر آیا تھا لیکن اس کے بعد ایک اور لہپ منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک نیلا اس جوڑے پر حملہ آور ہوا۔ دونوں ماہوں نے پھن اٹھا کر نیولے کو ڈسنے کی کوشش کی لیکن وہ جس قدر پھرتیلا تھا۔ اسے دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔ بلکہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ جوڑو کرائے کے ماہر نجانے کون کون سے جانوروں کی نقل کرتے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی نے نیولے کی نقل بھی کی ہے۔ جو اپنے آپ کو دو دو سانپوں سے پھرتی سے ادا رہا تھا اور سانپوں کی ایک نہیں چل پاری تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ ان پر حملے بھی کر رہا تھا۔ بڑی ہی پر لطف جنگ تھی۔ سانپ زمین پر مار مار کر تھک چکے تھے لیکن نیلا تازہ دم اور پرسکون تھا۔ اس کے جسم میں واقعی بلا کی پھرتی تھی۔ ان سانپ اپنی آگ میں چپ کر مل کھاتے ہوئے نیولے کی طرف تیزی سے پھرتے اور اپنا پھن ان پر مار مار کر بڑھتا ہوا جاتے، ہم پھر کے بت کی طرح پلک بچکائے بغیر اس سنسنی خیز جنگ، لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک قریب کے ایک جھنڈ سے سبھی سبھی انسانی آوازیں ابھریں۔

”پکڑی گئی ناں، حرام زادی!“ یہ جیسے کہہ کر اس نے ایک لڑکی کو جھنڈ سے باہر نکال لیا۔ لڑکی ابھی سی سانسے آ گئی۔ میں نے بھی اسے حیرت سے دیکھا۔ ”ادھر وہ نوجوان بھی جو میری گرفت تھا۔ اب ہوش میں آ گیا تھا۔

”کون ہوتا؟“ اور یہ سب کیا ہے۔ یہ لڑکا کون ہے۔ جواب دو ورنہ ہاتھ پاؤں توڑ کر یہیں ڈال گا اور شیر تمہیں چٹ کر جائے گا اور وہ یہیں آس پاس ہی موجود ہے۔“ میرے ان الفاظ پر لڑکی لڑجھکے لگی اور ہم پر ایک دلکش انکشاف ہوا۔

”یہ میرے گاؤں کا لڑکا ہے، اس کا نام کشمن ہے اور میرا نام خلعتہ ہماری بچپن کی دوستی پر ہمارے ماما پتے ہمارا لگن نہیں کیا اور آخری میری شادی کر دی مگر میں نے طے کر لیا تھا کہ

پتہ نہیں کیوں میرے دل میں خوشی کا احساس جاگ رہا تھا۔ ماضی تو اب ذہن کے پردوں پیچھے جا چھپا تھا اور یہ یاد کرتے ہی عجیب سی کیفیت ہو جاتی تھی کہ میں کیا تھا اور کیا بن گیا تھا۔ کالی روپ بگالی اپنے اپنے مقصد کے لئے مجھے استعمال کرنا چاہتی تھیں مگر میں ان دونوں میں سے کس کا شکار نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا تھا اپنی مرضی سے ہی کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال ہم پہا چڑھے اور پگھٹ کے دوسری طرف اتر گئے۔ وہاں گاؤں کے لوگ موجود تھے۔ یہاں بھی نئی سننے کو ملی، پتہ یہ چلا کہ صبح کو شیر نے اس دہن کو اٹھایا تھا اور اب دوپہر کے وقت ایک اور نوجوان دھاڑے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ہم نے غور سے دیکھا تو شیر کے بچے اور خون کے نشانات دور تک دکھائی دے رہے تھے۔

چنانچہ ہم نشانات کے ساتھ ساتھ چل پڑے، جو پہاڑ کے نیچے دائیں طرف گئے جنگل داخل ہو رہے تھے۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی اچانک ہمیں احساس ہوا کہ آدم خور چند گھنٹوں وقفے سے دوسرے آدمی کا شکار نہیں کر سکتا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک ہی ہری لعل کی آواز اب ”ایک بات بتاؤں آپ کو مہاراج؟“

”کیا؟“

”میری بات ہے پر ہمارے من میں آئی ہے کیا کریں؟“

”بات تو بتاؤ؟“

”ندیا لعل کی دھرم پتی کو شیر اٹھا کر لے گیا ہے یا وہ خود کہیں بھاگ گئی ہے؟“ میں نے

نگاہوں سے ہری لعل کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

”کیا یہ ممکن ہے ہری لعل؟“

”ہو سکتا ہے مہاراج! سنسار کے بارے میں کیا کہا جائے۔“ میں نے کوئی جواب نہیں د

لوگ مسلسل چاروں طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دوپہر دھل چکی تھی۔ آسمان پر باد



”وہ کیسے؟“

”بس مہاراج جنگلوں کی کہانی جنگلوں میں رہنے والے ہی جانتے ہیں ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اور اس کے بعد میں نے بھی اس آواز کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور اس سخت مہم پر آگے بڑھتا رہا۔ بیلاکھیوں کے بارے میں میری معلومات تو بالکل ہی صفر تھی جو چار آدمی میرے ساتھ آئے تھے اور جو میری راہنمائی کرنے والے تھے جہنم واصل ہو گئے تھے اگر ہری لعل بھی نہ ملتا تو اس جنگل میں تو میری جان ہی نکل جاتی، ڈراؤنا جنگل تھا اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ خدا جانے کتنی لمبی رات تھی۔ وقت گزرتا چلا گیا اور خدا خدا کر کے ہم اس جنگل سے تھوڑی سی مکھی جگہ پر نکلے تو سامنے ایک پیڑ اور بھیا نک آواز کے ساتھ ایک ندی نے راستہ روک لیا۔

ہم ندی کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ ندی کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ اگر اس کی لہروں میں ہاتھی بھی کھڑے رہنے کی جرأت کرتا تو وہ تنکے کی طرح بہہ جاتا۔

اچانک کچھلی راتوں کا چاند نمودار ہوا۔ تو پورا جنگل روشنی میں نہا گیا۔ صبح ہونے میں بہت زیادہ دیر نہیں تھی۔ چاندنی اور صبح کی روشنی ملی جلی جنگل کے ماحول پر اثر انداز ہو رہی تھی اور جانور آہستہ آہستہ جاگتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کچھ بیت ناک چیتیں ہمارے سر پر سے گزر جاتیں۔ یہ جانوروں کی آوازیں ہی تھیں، ہماری نگاہیں ندی پر بھی پڑ رہی تھیں اور اچانک ہی ہم نے ندی کے تیز پانی میں کچھ انسانی لاشوں کو بہتے ہوئے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاشیں تیزی سے آگے نکل گئیں۔

اس کے بعد ایک گیڈر بہتا ہوا آیا لیکن پانی کی لہروں نے اسے کناروں پر پہنچا دیا اور وہ ڈھال سا ہو کر بالکل ہمارے سامنے گر پڑا لیکن ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جنگل کا بھیا نک حصہ اب اپنا روپ بدل چکا تھا۔ پھر ایک زرد رنگ کا اڑدھا لہروں میں لپٹا ہوا نظر آیا اور پلک جھپکتے میں تیز پانی کی لہروں میں جکڑا آگے نکل گیا۔ کچھ دور چلے تو دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا اور ہری لعل یوں بول پڑا۔

”کوئی گاؤں آگیا ہے مہاراج۔“

”ہاں چلو آگے دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو گاؤں ہی کی تلاش ہے۔“ میں نے کہا۔

تھوڑی دور اور چلے تو ہمیں گاؤں کے کچے کچے مکانات نظر آنے لگے، کچھ لوگ ندی کے کنارے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔“ میں نے کہا۔

”ہم شکاری ہیں بھائی! اور آدم خور کے تعاقب میں پہاڑوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھر

”سنی آپ نے یہ جج مہاراج؟“

”ہاں۔“

”وہ یقیناً آدم خور نے کسی انسان کا شکار کیا ہے۔“

”یہ تو بڑی خوفناک بات ہے۔“

”مہاراج ہم اس کا پیچھا کریں گے۔“ ہری لعل نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں نے گردن

ہلا دی۔

طویل اور ہولناک تاریک جنگل سے نکلتا مشکل ہو رہا تھا۔ انسانی آواز کے ختم ہوتے ہی ہم ایک عجیب سی ہیبت طاری ہو گئی۔ پھر ایک ڈراؤنی اور پراسرار آواز اندھیرے جنگ میں گونجی یوں لگا جیسے کچھ انسان جانوروں کی آوازیں نکال رہے ہوں۔“

”یہ آوازیں سن رہے ہو ہری لعل؟“

”ہاں، مہاراج آپ کیا کہتے ہیں اس کے بارے میں؟“

”جنگلوں سے مجھے زیادہ واقفیت نہیں ہے ہری لعل۔“

”مہاراج یہ جنگل کے باسیوں کی آوازیں ہیں۔“

”جنگل کے پاس؟“

”میں دھرم کا ہندو ہوں، نبوت پریتوں پر دشاوش رکھتا ہوں۔ یہ یقیناً بھوتوں کی آوازیں ہیں۔

ہری لعل کی بات ٹھیک بھی ہو سکتی تھی اب تک میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے تھے وہ ایسے ہی تھے

کہ میں ہری لعل کی بات پر یقین کر سکتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک ہم آگے بڑھتے رہے۔ ار

خوفناک آواز کا تعاقب کرنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن اس آواز کے راز کو جاننے میں ہمیں کوئی کاملا

حاصل نہیں ہوئی۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آواز محض ڈرانے کیلئے اس جنگل پر مسلط ہے۔؟

دوہری کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔ ایک طرف تو آدم خور شیروں کا مسئلہ تھا ان سے مقابلہ کرنا تھا

دوسری طرف یہ آواز ہری لعل نے کہا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ مہاراج؟“

”ہری لعل میں اسی آواز کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”کوئی دھوکہ بھی ہو سکتا ہے مہاراج؟“

”دھوکہ؟“

”ہاں۔“

”ہاں ہری لعل۔“

”تھکن تو نہیں ہے؟“

”یار..... ساری تھکن اتر گئی ہے۔“

”مہاراج! ان لوگوں کی باتیں میں سن رہا ہوں یہ ہمیں کوئی بہت بڑا شکاری سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہیں کہ اب ہم ان کی مدد کریں گے۔“

”ہری لعل..... کیا کہتے ہو تم؟“

”بھگوان کی سوگند۔ میرا بس چلے تو میں ایک منٹ میں ان آدم خوروں کو ہلاک کر دوں۔ یہ

بڑے دہی ہیں اور بہت دلوں سے ان آدم خوروں کا شکار بن رہے ہیں۔“ میں نے ایک گہری

سالی اور جھونپڑے کی چھت کی جانب دیکھنے لگا۔ ماضی انسان کبھی نہیں بھولتا اور ماضی انسان کو

لے کیا کیا کچھ یاد دلاتا رہتا ہے۔ کیا زندگی تھی اور کیا بن گئی۔ ماں باپ تھے، مگر ہاتھ، کس طرح

ہو گیا اور اس کے بعد مجھ پر کیا ہمتی۔ کیسے کیسے زندگی کے راستے بنتے چلے گئے۔ نجانے کیسے

دل میں پھنسا اور اس کے بعد یہاں تک پہنچ گیا۔ کالی دیوی بھی ذہن میں آئی لیکن میں نے

اسے اسے ذہن میں جھٹک دیا، اگر ان کم بختوں سے نجات مل جائے تو پھر تو بات ہی کیا ہے۔

انہوں سے مراد میری روپ گنجالی اور کالی دیوی تھی۔ جب ہم جاگے اور ان لوگوں کو یہ احساس ہوا

کہ ہم جاگ گئے ہیں تو پانچ چھ افراد ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہماری جھونپڑی کے باہر موڑھے

لگوایا مینٹنگ کیلئے جگہ بنا دی گئی تھی۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

”میرا نام ستیا لعل ہے مہاراج میں گاؤں کا کھیا ہوں۔“

”ہاں..... ستیا لعل ہمارے لائق خدمت بتاؤ۔“

”مہاراج آپ کے پاس بندوقیں ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ آپ شکاری ہیں۔ مہاراج ان

انے تو ہمارا جیون نشت کر ڈالا ہے۔ کسی کو اپنے جیون کا بھروسہ ہی نہیں رہ گیا۔ ابھی تھوڑے

ہر ایک پہاڑی کے ٹیلے کے نیچے ہمارے ایک آدمی کی آدمی کھائی ہوئی لاش پڑی ہے۔ ہم نے

ماتیک کام کیا ہے۔ مہاراج کہ وہاں ایک چھان تیار کروادی ہے کیونکہ آپ کو پتہ ہے کہ شیر

ہوئی لاش کے پاس ضرور آتا ہے۔“

”ٹھیک۔ میرا خیال ہے ہم چھان پر جائیں گے۔“

”شام کے کھانے کے بعد مہاراج“ ستیا لعل نے کہا اور ہم لوگ منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر فارغ ہو

مارے سامنے کھانا لگوا دیا گیا۔ سروس کا ساگ، کبھی کی روٹی، اوپر سے کھن۔ لیکن اس وقت

رہے ہیں۔“

”جی مہاراج ہم کشتی لاتے ہیں تم وہیں کھڑے ہو جاؤ۔ بہاؤ بہت تیز ہے اور ندی بہت گہری

ہے۔ آپ آسانی سے ندی پار نہیں کر سکو گے۔“ دیہاتیوں کا لہجہ بڑا محبت بھرا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر

کے بعد ہم نے دیکھا کہ دوسرے کنارے پر کچھ دیہاتی ایک کشتی کا ندھوں پر لا دے آ رہے ہیں۔ کشتی

زیادہ بڑی نہیں تھی۔ دو دیہاتیوں نے اسے پانی میں ڈالا اور اس کے بعد اسے اس کنارے کی طرف

بہانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کنارے پر پہنچ گئے اور ہم نے کشتی کے ذریعے ندی پار کر لی۔

گاؤں والے آہستہ آہستہ کناروں پر جمع ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نیچے اترے تو انہوں نے بڑی خوشی

سے ہمارا استقبال کیا۔

”اور پھر ہمیں لے کر چل پڑے وہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آدم خور

ان کے دو آدمی ہضم کر چکا ہے۔ رات کے وقت ایک بندہ قریب کے گاؤں سے آ رہا تھا کہ آدم خور

نے اسے پکڑ لیا۔ ہمارے آدمی اس کی تلاش میں گئے ہیں۔ وہ لاش تلاش کر کے ہی آئیں گے۔ آپ

اگر چاہیں مہاراج تو آرام کریں ہم آپ کو جگہ بتائے دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو یہ اندازہ ہوا تھا کہ شاید

ہم شکاری ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہم آدم خوروں سے انہیں نجات دلا دیں۔ چنانچہ وہ ہماری بڑی آؤ

بھگت کر رہے تھے اور آخر کار وہ ہمیں ایک ایسے گھر میں لے گئے جو خالی تھا۔ یہاں انہوں نے جلدی

جلدی چار پائوں اور بستروں کا انتظام کیا اور ہم لیٹ گئے۔ ہری لعل نے کہا۔

”کیا کہتے ہیں ہنس راج مہاراج۔“

”میرا خیال ہے کہ رات بھر جو ہم نے جنگل گردی کی ہے اس کے بعد نیند بڑے مزے کی

آئے گی۔“

”ٹھیک ہے پھر سونے کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد ہم بستروں پر لیٹ گئے۔ لیکن ابھی

زیادہ دیر نہیں لیٹے تھے کہ دیہاتی گرم دودھ اور ہاجرے کی روٹیاں لے آئے، جن پر کافی مقدار میں

کھن رکھا ہوا تھا۔ یہ تازہ کھن تھا جو شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دودھ سے نکالا گیا ہو گا۔ گرم گرم

دودھ اور کھن کے ساتھ ہاجرے کی روٹی نے وہ مزہ دیا تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا اور پھر نیند ایسے آئی

کہ گھوڑے بچ کر سونے کا محاورہ بھی پیچھے رہ جائے۔ شام تک سوتے رہے تھے۔ شام کو جب جاگے تو

بہت سی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان لوگوں کی مہمان نوازی کا ہم دونوں ہی کو اعتراف تھا۔ ہری لعل کی

آواز سنائی دی۔

”جاگ گئے ہنس جی مہاراج؟“

”نہیں، نشانہ نہیں چوکا۔ دونوں گولیاں اس کے بدن کے پرچے اڑاتی ہوئی نکل گئی ہیں۔ تم یقین سے کہہ رہے ہو۔ ہری لعل؟“

”جی مہاراج۔“ ہری لعل کا لہجہ بڑا سنگین سا تھا۔

”تو پھر کیا کہتے ہو؟“

”آئیے مہاراج۔“ ہری لعل اتنے اعتماد بھرے انداز میں بولا کہ مجھے شرم آگئی۔ وہ ایک معمولی سا انسان ہوتے ہوئے کس قدر پر اعتماد تھا۔ ہم دونوں نیچے اتر گئے اور نیچے اتر کر جو پہلی چیز ہمیں نظر آئی، وہ خون تھا۔ یقیناً یہ خون شیر کے بدن سے نکلا تھا اور اس کے دھبے آگے بڑھتے چلے گئے تھے۔ خون کے بڑے بڑے دھبوں نے ہماری راہنمائی کی اور ہم گئے جگہ کی طرف بڑھنے لگے۔ ہمارا ساتھی جو اسی گاؤں کا باشندہ تھا۔ گھبرا رہا تھا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

”مہاراج وہ پلٹ سکتا ہے اور پھر میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ شیر ایک نہیں دو ہیں۔“

”کوئی بات نہیں آ جاؤ۔“

”نہیں مہاراج شام چاہتا ہوں۔ مجھے شام کر دیں، میرے تو پاؤں بھی ٹھیک سے نہیں اٹھ رہے۔ میں واپس گاؤں جا رہا ہوں۔“

”تیری مرضی ہے جیسے تو پسند کرے۔“ میں نے کہا اور وہ واپسی کیلئے مڑ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے قدم کانپ رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس کا اس طرح اکیلے جانا مناسب نہیں ہے اور میرا یہ خیال درست ہی ثابت ہوا۔ بہر حال ہم لوگ خون کے دھبوں کا تعاقب کرتے رہے اور یہ دھبے آگے با کر جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ ہر طرف قد آدم جھاڑیوں کا راج تھا۔ ہوا درختوں سے سنسناتا لڑا آگے بڑھ رہی تھی۔ بڑی عجیب و غریب آوازیں فضا میں بکھری ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ ہم کافی پر تک شیر کو تلاش کرتے رہے۔ ہری لعل کمال کا انسان تھا۔ وہ بالکل نہیں ڈر رہا تھا جب کہ مجھے اس سے اس بہادری کی امید نہیں تھی۔ ہم صبح تک زخمی آدم خور کا تعاقب کرتے رہے اور اسے تلاش کرتے رہے لیکن پھر روشنی ہو گئی اور پھر ہری لعل نے کہا۔

”نکل گیا حرامی، واپس چلیے مہاراج۔“ آخر کار ہم واپس پلٹ پڑے، کافی فاصلے طے کیا، وں سے کافی فاصلے پر ہم نے بہت سے لوگوں کو جمع دیکھا اور ہری لعل بولا۔

”تو وہی ہوا جو ہم نے سوچا تھا۔“

”کیا؟“ میں نے سوچا تھا۔

”آئیے مہاراج۔“ ہم آگے بڑھے اور ان لوگوں کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں پر اسی آدمی کی

ہمیں ذرا محتاط رہنا تھا کیونکہ اس کے بعد ہمارا کام ہی دوسرا تھا۔ پھر اس کے بعد ہم چان کی طرح چل پڑے۔ گاؤں کے ایک شخص کو راہنمائی کیلئے ہمارے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ ستیا لعل نے کہا۔ مہار آپ جتنا نہ کریں ہم لوگ بھی زیادہ دور نہیں ہوں گے آپ سے؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا اور ہم درخت پر چڑھ کر چان پر جا بیٹھے۔ اندھیرا ج سے پھیلتا جا رہا تھا۔ ایک پیٹہ درخت کی حیثیت سے میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا تھا اور لعل بھی تقریباً میرے ہی جیسا تھا۔ اس نے بے رام کو چھوڑ دیا تھا اور میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ بہر یہ سب جاری رہا اور ہم چان پر بیٹھے رہے ابھی بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہر طرف اندھیرا آ گیا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی آہٹ میرے جسم میں سنسنی بکاتی تھی۔ ہر طرف سناتا تھا۔ پھر اچانک ہی ہمیں دھڑم دھڑم کی آوازیں سنائی دیں اور ہم طرح چوک پڑے۔

”یہ کیسی آوازیں ہیں؟“

”سانہز ہیں مہاراج۔“ سانہز کا ایک غول بے حد پریشان اور گھبرائے ہوئے انداز ہمارے قریب سے گزرا اور آگے بڑھ گیا۔ جس شخص کو شیر نے کھایا تھا، اس کی ہجی کچی لاش ہمارے سامنے گڑھے میں پڑی ہوئی تھی کہ اچانک دور سے شیر کی گرج سنائی دی اور کچھ دیر کے بعد ہم شیر کو آتے ہوئے دیکھا وہ بے قدموں اسی طرف آ رہا تھا۔



شیر کو دیکھ کر ہم سنائے میں آ گئے۔ شیر آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا اور میں نے اور ہر ا نے بندوقیں سیدھی کر لی تھیں، ہم دونوں پوری طرح تیار تھے۔ شیر آہستہ آہستہ آیا اور گڑھے میں پھر اس نے آدمی کھائی ہوئی لاش منہ میں دبائی اور اسے اٹھا کر گڑھے سے باہر نکل آیا۔ اسی وقت لعل کی سرگوشی سنائی دی۔

”دیکھیں مہاراج دیکھیں۔“ اس کے ساتھ ساتھ ہی میں نے اور ہری لعل نے ایک سا فائر کر دیے۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے اور دونوں گولیاں شیر کا پیٹ پھاڑتی ہوئی نکل گئیں نے لاش کا آدھا حصہ چھوڑا اور جست مار کر چان کے نزدیک آیا، وہ درخت سے ٹکرایا اور نیچے گرا اچانک ہی یوں لگا جیسے نیچے گرتے ہی اس کا وجود غائب ہو گیا ہو۔ گاؤں کا وہ آدمی جو ہمارے تھا اور جو ستیا لعل کا نمائندہ تھا۔ کپکپاتی آواز میں بولا۔

”مائی باپ! یہ بھیا نک جانور ایسا ہی کرتا ہے، آپ کا نشانہ چوک گیا۔“



لاہنگ ثابت ہو رہا تھا۔ ایسا بھیاک جنگل میں نے زندگی میں کبھی تصور تک میں نہیں دیکھا تھا۔ میں لے راستے میں ہری لعل سے سوال کر ڈالا۔

”ہری لعل یہ بیلا کیوں ہی کا جنگل ہے ناں۔“

”جی مہاراج، ان علاقوں میں اس سے بڑا خوفناک جنگل اور کوئی نہیں ہے اور پھر یہ ہے بھی گل در جنگل۔ ایک جنگل ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم پہاڑی پر چڑھ کر دوسری ریف اتر گئے۔ اس جنگل میں کالے رنگ کے سانپ ہی سانپ تھے۔ زمین پر سانپ، درختوں پر بھی اپ ویسے سانپوں کی یہ مفت بھی ہری لعل نے ہی مجھے بتائی کہ جب تک انہیں چھیڑا نہ جائے یا پھر پاؤں تلے نہ آجائیں وہ وار نہیں کرتے، البتہ اس نے کہا۔“

”ایک بات آپ سے کہیں فس راج مہاراج۔ ہمارے من میں پہلے بھی یہ ہی بات تھی کہ ہم ملاقوں میں آنکھوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ علاقے غلط ہیں۔ پہلے بھی درندے جس طرح مٹے پھر رہے تھے۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شہر اس جنگل میں نہیں ہے اور اب آپ دیکھ ۴ ہیں کہ یہاں سانپ ہی سانپ ہیں۔ سانپوں میں شیر کا کیا کام میری مائیں تو مہاراج اس ۵ کے جنگل سے دن چھپنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہیے۔“

”ہم دونوں تیز رفتاری سے چل پڑے۔ بڑے بڑے بھیاک مناظر لگا ہوں کے سامنے آئے۔ ٹھوڑا فاصلہ طے کیا تھا شہر ہم نے اوڑھے جیسے موٹے سیاہ ناگوں کو دیکھا۔ جنہوں نے ایک چھپتے لاک کر کے کھانا شروع کیا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے اپنے ایک ایک فٹ چوڑے پھن ۶ نے اور ہماری طرف خوفناک لگا ہوں سے دیکھنے لگے۔ ان کی لمبی زبائیں باہر نکل رہی تھیں۔ لے بندوق سیدھی کر لی تو ہری لعل نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔“

”معافی چاہتا ہوں مہاراج ان پر فائر نہ کریں کیونکہ اگر شیر کہیں آس پاس ہوا تو فائر کی آواز پا ۷ اری طرف متوجہ ہو جائے گا۔ ہری لعل جس قدر تجربے کا ثابت ہو رہا تھا اب مجھے اس کا ۸ کرنا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہم خاموشی سے سانپوں اور اوڑھوں کی بادشاہت کی حدود سے باہر نکل

سامنے ایک تالاب تھا۔ وہاں نیچے اور غور سے دیکھا تو تالاب کے پانی میں بھی سیاہ رنگ کے ۹ در رہے تھے۔ خدا کی پناہ بڑا خوفناک اور ہیبت ناک جنگل تھا۔ دور دور تک کوئی جاندار نظر ہی رہا تھا۔ سوائے ان سانپوں کے لگ رہا تھا کہ یہ سانپوں کا جنگل ہے۔ اب ہم جس طرف نکل ۱۰ تھے۔ وہاں سے اب صحیح معنوں میں واپسی کا تعین بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے ہری لعل سے

لاش پڑی ہوئی تھی۔ شیر نے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہم افسوس کرنے لگے۔ سنا لعل بھی موجود تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس شخص کو بہت منع کیا تھا کہ تنہا وہ گاؤں واپس نہ جائے مگر نہیں مانا۔

کچھ لوگ رو رہے تھے۔ آخر کار انہوں نے لاش اٹھائی اور گاؤں کی طرف چل پڑے، رات بھر جا گئے تھے۔ گاؤں والے ابھی تک ہماری طرف سے بدول نہیں ہوئے تھے بلکہ سنا لعل نے کہا۔

”مہاراج ہم پتہ نہیں کتنے دنوں سے کوششیں کر رہے ہیں اور ابھی تک کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے، اس پانی شیر کا۔ پر مہاراج آپ بھی ہمت نہ ہاریں ہمیں آپ کا بڑا سہارا حاصل ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم لوگ ہمت نہیں ہاریں گے، صبح کا ناشتا کیا گیا، کوئی ایک یا دو بڑھ گئے ہم نے آرام کیا کہ ہمارے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ شیر کافی زخمی ہو گیا ہے اور کہیں نہ کہیں ہمارا اس سے ٹکراؤ ضروری ہے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہری لعل تیار ہو گیا اور ہم اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ آدم خور شیر کے بچوں کے نشاندہی کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آگے پتھریلی زمین آگئی۔ تو بچوں کے نشان ختم ہو گئے تھوڑی دور اور چلے تو خوفناک جنگل نظر آیا۔ جو پہلے جنگل سے بھی زیادہ تاریک اور ڈراؤنا تھا۔ زخمی شیر انتہائی خطرناک اور انتہائی قوت برداشت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہمارے لئے ایک سنگین مسئلہ بن چکا تھا۔ اند میرے جنگل میں آگے بڑے تو بڑا وحشیانہ منظر نظر آیا۔

پورا جنگل چھوٹی بڑی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا اور جگہ جگہ جنگلی مرغ آہیں میں لڑ رہے تھے۔ اچانک دس بارہ بھیڑیوں نے غار سے نکل کر ہم پر حملہ کیا۔ تو ہم نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں کی ہولناک آوازوں کے ساتھ دو بھیڑیے تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے، باقی غاروں میں جا چپے اور پورے جنگل پر ہیبت ناک سناٹا چھا گیا۔ اس سے کم از کم ایک بات کا اندازہ ہوتا تھا جس کی نشاندہی ہری لعل نے کی۔

”مہاراج، اگر آدم خور شیر اس جنگل میں موجود ہے تو دوسرے جانور اس طرح آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ زخمی شیر اس جنگل میں کم از کم نہیں ہے۔ آپ کو شاید یہ بات معلوم نہیں کہ جنگل کے بادشاہ کی موجودگی میں چڑیا تک خوفزدہ رہتی ہے۔“ میں نے پر خیال انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ شیر شدید زخمی تھا۔ خدا جانے کدھر نکل گیا۔ اس کا تعاقب ہمارے لئے بڑا مہنگا ثابت ہو رہا تھا لیکن بہر حال میں جس کیفیت کا شکار تھا۔ اس کے بارے میں ہری لعل کو بھی معلوم نہیں تھا۔ میرے دل میں تو بس ایک ہی خیال تھا کہ کاش میں ان دونوں چڑیوں کی گرفت سے باہر نکل جاؤں۔ جنہوں نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ جنگل میں شیر کا تعاقب ہمارے لئے

کہا۔

”ہری لعل اگر ہم گاؤں واپس جانا چاہیں تو کیا آسانی سے اسی گاؤں واپس پہنچ سکتے ہیں؟“  
 ”کچھ نہیں کہا جاسکتا مہاراج۔ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اورو۔ وہ دیکھئے۔ وہ کیا ہے۔ اس  
 ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک پہاڑی کے دامن میں ہمیں ایک کالا سا بڑا سا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ  
 آگے بڑھ کر دیکھا تو وہ ایک تاریک سرنگ محسوس ہوئی۔ اس سرنگ میں بھی بڑے بڑے سا  
 ریگ رہے تھے۔ دور ہی سے اندازہ ہو رہا تھا۔

”نہیں مہاراج یہ ہمارے لئے نہیں ہے۔“ اور وہاں سے رخ کو تبدیل کر لیا۔ آگے بڑا۔  
 ادھر ادھر پہاڑیاں نظر آئیں ہم ایک پہاڑی پر چڑھے وہاں بھی بہت سارے خوشوار سانپ  
 چڑھے فرمستیاں کر رہے تھے ان زہریلی بلاؤں سے بچتے بچاتے ہم بائیں طرف سنگلاخ چٹانوں  
 اتر گئے۔ نیچے اترے تو آگے ندی آگئی۔ ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اور ایک مقام پر ندی  
 کر کے ناک کی سیدھ میں چل پڑے۔ کوئی دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمیں کچھ انسان نظر آ۔  
 غالباً کوئی اور چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن یہ وہ گاؤں نہیں تھا۔ جہاں ہم واپس جانا چاہتے تھے۔ تھوڑا  
 چل کر پرانے مکان نظر آنے لگے۔ جمو پڑے بنے ہوئے تھے۔ یہ کوئی خاص قبیلہ تھا۔ جو ناگو  
 پجاری تھا۔ ہری لعل ان علاقوں کی ساری زبانیں جانتا تھا لیکن یہ زبانیں میں نے بھی کافی حد  
 سیکھ لی تھیں یا پھر کچھ پر اسرار قوتوں نے خود بخود یہ زبانیں میرے ذہن میں داخل کر دی تھیں۔  
 لعل نے ان سے کہا۔

”کیا کر رہے ہیں، آپ لوگ اور آپ کے اس گاؤں کا کیا نام ہے؟“

”بھولی۔ مہاراج بھولی۔“

”کتنی آبادی ہے، آپ کے اس گاؤں کی؟“

”پتہ نہیں مہاراج۔ بہت سے لوگ ہیں یہاں پر آپ کدھر سے آرہے ہو؟“

”سامنے کے جنگل سے؟“

”سامنے کے جنگل سے؟“

”ہاں؟“

”نہیں مہاراج اس طرف سے نہ کوئی آسکتا ہے اور نہ کوئی اس طرح جاسکتا ہے۔“

”کیوں؟“

”وہ دیوی، اور دیوتاؤں کا دیس ہے۔“

”دیوی، دیوتا۔“

”ہاں۔“

”مگر یہاں تو سانپ ہی سانپ بھرے ہوئے ہیں۔“

”وہی تو ہم کہہ رہے ہیں وہ ناگ دیوتاؤں کا دیس ہے۔ کوئی بھی ان خوفناک دیوی دیوتاؤں  
 کے زرخے سے جیتا نہیں آسکتا۔ وہ امر ہیں اور ان کی گرفت سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟“

”ہم یقین نہیں کر سکتے مہاراج۔ اگر آپ لوگ زندہ ہو تو بڑی عجیب بات ہے۔“ وہ لوگ  
 کا زیادہ عقیدت مند تھے دیوی دیوتاؤں کے ہم نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں پانی کا عجیب سا شور  
 ا۔ اس شور کے بارے میں پتہ چلا کہ پہاڑ کے پیچھے ایک بہت ہی تیز رفتار ندی ہے۔ جس کی  
 لٹاک لہریں پہاڑ سے ٹکراتی ہوئی گزرتی ہیں۔ یہ اسی کا شور ہے ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

”مہاراج اگر ہاتھی بھی ان لہروں میں پھنس جائے تو نیچے کی طرح بہتا ہوا غائب ہو جاتا ہے  
 یہ ریت کے پہاڑ نمائیل پہاڑوں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ باتیں ہو  
 ائیں کہ سورج مغرب میں پہاڑوں کے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہونے لگا۔ شفق کی خونی سرخی  
 بے پھرے پہاڑوں پر لہو کی طرح پھیلی تو بے حد خوبصورت اور حسین مناظر سے طبیعت میں خوشی اور  
 بے کی لہر دوڑ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد گھپ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ گاؤں والوں نے ہمیں پیش کش کی ہم رات  
 بسر کر سکتے ہیں۔ یہاں شیروں وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ انہوں نے بھی حسب استطاعت  
 نے پینے کی چیزیں ہمیں دیں۔ جن میں پھل اور دودھ کی بہتات تھی۔ رات وہیں بسر کی، صبح ہم  
 پہ چڑھے اور قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دوسری طرف اتر گئے۔ آگے وہی  
 بیڑا تانے بہہ رہی تھی اور واقعی اس کی تیز لہروں میں چو پائیوں کی لاشیں بجلی کی رو کی طرح گزر  
 لیں۔ اب ہم ناگوں کا علاقہ اور آدم خور شیروں کو بھول چکے تھے۔ ہم اپنی منزل سے ہٹ گئے  
 اب نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وقت ہمیں کہاں سے کہاں لے جائے۔ میں نے ایک بار آنکھیں بند  
 ، حالات کا تجزیہ کیا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں مشکل میں ہوں کہ  
 میں کہاں ایک کامل انسان جو ماں باپ کے کندھے پر بیٹھ کر زندگی گزارنے کا عادی تھا اور  
 اس وقت ہنس راج جو ایک مشکل میں پھنس کر اپنا دین ایمان بھی کھو بیٹھا تھا۔ جس کا اسے  
 کھ تھا لیکن اب وہ مشکلات سے گزر رہا تھا۔

نجانے کیوں میرے دل میں ایک خیال آیا۔ ہو سکتا ہے کہ جن مشکلات سے میں گزر رہا تھا یہ میرا امتحان ہو، جو برائی میرے اندر پیدا ہو چکی ہے یا جو غلطی سے میرے وجود میں اتر چکی ہے ان مشکلات سے گزرنے کے بعد میرا قصور معاف ہو جائے۔ اس خیال نے آنکھوں میں نمی پھیلا دی تھی۔

ہری لعل بھی خاموشی سے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ تو مجھے باقاعدہ ایک ہندو ہی سمجھتا تھا۔ ہم لوگ ضرورت پڑنے پر شکار کر لیا کرتے تھے۔ ہری لعل کو اس بات پر بھی تعجب تھا کہ وہ دوسری شخصیت تھی لیکن میں بھی گوشت خور تھا۔ ان تمام خیالات میں ڈوبے ہوئے ہم محتاط انداز میں نڈی کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ہیبت ناک نڈی کا قصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نڈی بڑی ہیبت ناک اور پراسرار آواز کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ پانی کا شور مارتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

اس شور نے ہمارے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ہماری زبانیں ایک طرح سے ہو چکی تھیں۔ بس بدن متحرک تھا۔ آگے بڑھے تو تین اذخوں پر سوار کچھ لوگ جاتے ہوئے نظر آئے۔ لوگ اپنی منزل پر جا رہے تھے ہمیں دیکھ کر انہوں نے گردنیں ہلائیں۔ میں نے نڈی پار کر کے راستہ پوچھا۔ تو ایک شخص نے مجھے بتایا کہ آگے چل کر نڈی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ وہیں کشتیوں کا پل ہے اس سے نڈی پار کی جاتی ہے۔ ہری لعل بولا۔

”یہ بڑی بات ہے مہاراج کہ ہمیں جھوٹی آبا دیاں مل رہی ہیں، اپنی اصل منزل سے بہت دور نکل آئے ہیں۔“ آخر کار ہمیں کشتیوں کا پل نظر آیا اور ہم نے یہ خوفناک جگہ بھی عبور کر لی۔ دوسری طرف پہنچے تو سامنے بھاریوں کے جمونپڑے نظر آئے لیکن ساتھ ہی کسی جگہ کے درختوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم اس طرف پہنچے تو لوگوں کا ایک مجمع نظر آیا جو ایک دائرہ شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے، کیا ہو گیا بھائی؟“ بمشکل ہم نے ایک شخص کو بات چیت کرنے پر رضامند اس نے روتے روتے بتایا کہ بستی کے دونوں جوان لڑکے رات کو پاڑے کے باہر سو رہے تھے کہ زخمی آڈخور نے ان دونوں پر حملہ کیا اور دونوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ان کی آدمی کھائی ہوئی لاشیں ہوئی ہیں۔“ ایک ڈرے سہے ہوئے بھاریے جو قریب جمونپڑے میں چھپا یہ دہشت ناک منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں دیکھی باتیں بتائیں۔

”مہاراج وہ آڈخور بڑا خونخوار ہو رہا تھا اور وہ بہت زیادہ زخمی تھا۔ اس کے پیٹ سے سا

خون بہہ رہا تھا۔“ ہری لعل کے حلق سے خوشی کی ایک آواز نکل گئی۔ جیسے اس نے چھپا لیا۔ وہ شخص حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

”ہم اسی آڈخور کی تلاش میں ادھر آئے ہیں۔ بھائی اگر تم لوگ ہم سے تعاون کرو تو ہم اسے ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔“

بھاریوں کے کھیلانے کہا۔

”ہم تم سے کیا تعاون کریں مہاراج؟“

”جن لوگوں پر حملہ کر کے اس نے ہلاک کر دیا ہے اور ان کی لاشیں کھائی ہیں ان میں سے ایک اس کو جگہ چھوڑ دو جہاں انہیں ہلاک کیا گیا ہے کیونکہ شیر آدمی کھائی گئی لاش کے پاس ضرور آتا ہے۔ وہ لوگ تیار ہو گئے تھے۔ خاص طور پر کھیلانے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا اور ایک بار پھر ہم پر امید ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے لاش اس ڈیرے پر ڈلوائی، جہاں شیر نے ان پر حملہ کر کے ان میں سے دونوں کو ہلاک کر دیا تھا لیکن ہمیں ایک لاش کی ضرورت تھی۔ ہم نے لاش کی سامنے ایک درخت پر جگہ بنائی اور وہاں بیٹھ گئے۔ بھاریے اپنے اپنے جمونپڑوں میں جا چھپے تھے اور دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اب یہ عام بات تو نہیں تھی کہ وہ آسانی سے شیر کا انتظار کرتے اور سو جاتے۔

سورج غروب ہوا اور پھر پہلی تاریخوں کا چاند نمودار ہو گیا۔ دور دور کا علاقہ دو دھیرا روشنی میں نہا گیا تھا۔ ہم دم سادھے انتظار کرتے رہے۔ ہماری بندوقیں تیار تھیں۔ اچانک ہی گیدڑوں کی آوازیں اور مردوں کی کوہو کوہو نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور پھر سارے ماموں کو ساپ سونگھ گیا۔ ایک دھاڑ لگئی اور آڈخور آتا دکھائی دیا۔ ہمارے اعصاب تن گئے تھے۔ شیر آتا دکھائی دیا اور ہم اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب ایسی شناسائی بھی نہیں تھی اس سے کہ ہم اس کو پہچان لیتے۔ ہم یہ نئے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا یہ وہی زخمی شیر ہے جو ہماری گولیوں کا شکار ہوا تھا۔ بہر حال یہ تو مشکل کام تھا کہ ہم اسے پہچان لیتے۔

شیر آہستہ آہستہ زخمی بھاریے کی آدمی لاش کی طرف بڑھا اور دم ہلا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر اُس کو سونگھا، اس کا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا اور ہمیں اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی زخمی شیر ہے یا کوئی حالانکہ گولیوں کے دوہرے زخم تھے۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ کجخت درندہ نہیں بلکہ کوئی ت یا مافوق الفطرت مخلوق ہے۔ دو گولیاں کھانے کے بعد وہ اسی جگہ دھج کے ساتھ زندہ تھا۔ بہر طور ہم سادھے ہوئے تھے اور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک ہی کسی چھٹی کے تحت شیر نے لاشوری طور پر درخت کی سمت دیکھا۔ ہماری رائفلوں سے دو شعلے نکلے۔ وہ

لہ نے وہاں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں اور ہری لعل تھوڑی دیر کے بعد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے جب کہ ہمارا نیا ساتھی خوف مارے ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ ابھی ہمیں سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک ہی مائی جیٹوں نے ہر بڑا کراٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ہری لعل نے اس شخص کو دیکھا اس کی حالت بری طرح اب ہو رہی تھی۔ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

”اب کیا ہوا۔ کیا مصیبت نازل ہو گئی تم پر؟“

”مائی باپ..... مائی باپ..... ابھی ابھی آدھوڑ یہاں سے ہو کر گیا ہے۔ وہ نالے کے دوسرے مارے پر کھڑا ہمیں گھورتا رہا تھا۔ اور اس کے بعد مجھے کس وقت نکل گیا۔“

”وہ کنارے پر کھڑا تمہیں گھمڑا رہا تھا اور تمہاری آواز بھی بند تھی۔“

”بس مہاراج ہماری آواز نکل نہیں سکی۔“ میں نے مسکرا کر ہری لعل کو دیکھا اور کہا۔

”اسے کہتے ہیں نادان دوست۔ اس نے تو ہمیں مروا ہی دیا تھا اس کا مطلب ہے کہ آدھوڑا گر کر تا تو ہمیں آسانی سے سوتے میں شکار کر لیتا۔“

”اب کیا کریں مائی باپ۔“

”جیسا کہ یہ کہہ رہا ہے ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔“ میں نے بے خوفی سے کہا۔ اب میں بے خوف سے بے خوف ہو گیا تھا۔ بہر حال ہری لعل تو میرے ساتھ ہر کام کیلئے تیار رہتا تھا۔ ہم کا خطرہ مول لے کر شیر کے تعاقب میں چل پڑے۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ شیر کی لگرن سے فضا لرز گئی۔ اچانک آدھوڑ گھنے جنگل سے نکلا اور اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہم دونوں م سے چوکنے ہو گئے تھے۔ دور سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ شیر کی نگاہوں میں انتقام کی آگ تلگ ہے اور وہ ہم پر چھپٹے کیلئے تیار ہے۔ ہم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایک ساتھ فائر داغ دیئے۔

لمحے بھر کیلئے اس نے اپنا جسم تولہ اور زمین پر گر پڑا۔ گولیاں اس کے بدن میں گئی تھیں مگر واقعی نہ جان اور دلیر جانور ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ شیر ہے یا کوئی چھلاوہ۔ ہم نے نشانہ لیا لیکن فائر کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ شیر ایک بار پھر ایک لمبی چھلانگ لگا کر گھنے ل غائب ہو گیا۔ عجیب موڈی اور ظالم سے پالا پڑا تھا۔ ہم ان پہاڑوں اور گھنے جنگلوں سے اٹھے۔ روزانہ لمبے لمبے سفر طے کرنے پڑ رہے تھے۔ بہر حال شیر کو چھوڑنا اب میرے بس کی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ پھر ہم تاریک جنگل میں داخل ہو گئے۔

بات ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ زخمی درندہ بہت چوکنا اور ظالم ہوتا ہے۔ آسمان پر گھٹا

زمین پر گرا اور پلک جھپکتے میں اس نے ایک لمبی زقند لگائی اور ہمارے درخت کے پاس سے گزرتا ہوا ایک بار پھر ہماری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

”خدا کی پناہ، خدا کی پناہ، خدا کی پناہ۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اگر یہ الفاظ میرے منہ سے نکل جاتے تو یقینی طور پر ہری لعل چوٹ اٹھتا۔

لیکن اب ہمیں ضائع کرنے کے لئے ایک موقع بھی نہیں تھا۔ اب اس وقت خطرہ مول لئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چنانچہ ہم درخت سے نیچے اتر آئے۔ اس بار ہم پوری ذمہ داری اور ہمت کے ساتھ شیر کا تعاقب کر رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ قریب ہی کسی کی جان لیوا جیٹوں سے پہاڑ گونج اٹھے۔ ساتھ ہی شیر کی غراہٹ سے پورا علاقہ لرز گیا۔ ہم تیزی سے آوازوں کی سمت بڑھے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہستی کی طرف سے ایک شخص بھاگتا ہوا اسی سمت نظر آیا۔ وہ قریب پہنچا اور دوسرے ہی لمحے دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

”ہری لعل حیران ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر بے ہوش شخص کو دیکھا۔ پھر اسے اٹھا کر کندھا پر ڈالا اور تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر اسے زمین پر لٹا کر ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ میں بندوڑ لئے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا کہ شیر کہیں آس پاس ہو اور ہم پر حملہ آور ہو تو میں اس پر گوا چلاؤں، بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ ادھر ہری لعل اس شخص کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑا مشکل سے وہ ہوش میں آیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور زبان تنگ ہو گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ اس کا سامنا ابھی ابھی آدھوڑ سے ہوا تھا اور بڑی مشکل سے اس سے جان بچانے کا کام اب ہوا ہے۔ وہ شخص انتہائی خوفزدہ تھا۔“

”مم..... مہاراج..... وہ ڈنڈی ہے، وہ خوفناک درندہ ہو رہا ہے۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔“

”تم جاؤ! بھاگ جاؤ، کہاں جانا ہے تمہیں؟“

”بھاگوں گا نہیں مہاراج آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ جب تک وہ پانی مر نہیں جائے گا؛

بھی آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔“ اس شخص پر ایک دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔ ”ہری لعل نے یہ دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔

”اب سنبالیں مہاراج۔“

”ہاں، کوشش کرتا ہوں، اتنے چالاک اور مکار آدھوڑ کی تلاش رات کے اندھیرے میں کرنا کی خوراک بننے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہم نے شیر کا پیچھا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور اسی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں ہم محفوظ رہ سکیں۔ ایک نالے کے نزدیک ایک اونچی چٹان نظر آ

چھائی ہوئی تھی اور تاریک جنگل اس وقت بالکل تاریک پڑا ہوا تھا۔ درخت بھوتوں کی طرح تاجور تھے۔ اچانک ہمیں پھر شیر کی غراہٹ سنائی دی۔ میں فوراً فائر کیلئے تیار ہو گیا لیکن غراہٹ کچھ عجیب تھی۔ تھوڑی دیر تک ہم انتظار کرتے رہے، ہلکی ہلکی پھر پھر کی آوازیں سنائی دیں اور یہ اندازہ ہوا شاید درندہ دم توڑ رہا ہے اور چند لحظات کے بعد وہ ہماری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ زمین پر گمہ رہا تھا اور شاید اب اس میں اپنے قدموں پر چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہم نے دو فائر اور کیے اور سخت جان عیار آڈخور کی لاش ہمارے سامنے پڑی ہوئی تھی۔

ہم اس کے قریب پہنچے اور یہ اطمینان کر لیا کہ وہ واقعی ختم ہو گیا ہے تو ہماری خوشیوں کا اٹھکانہ نہ رہا۔ پھر اس کے بعد انتہائی لمبا سفر طے کر کے گاؤں واپسی ہوئی تھی اور شیر کی ہلاکت کی سن کر گاؤں والے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ہمیں کندھوں پر اٹھا لیا۔ ہم نے وہاں سے وا کی اجازت مانگی لیکن گاؤں والوں نے کہا کہ نہیں مہاراج۔ آپ نے ہم لوگوں پر جتنا بڑا احسان ہے ہم ایسے تو آپ کو نہیں جانے دیں گے چنانچہ ہمیں وہاں رکنا پڑا۔

گاؤں والے واقعی شیر کی موت کا بہت بڑا جشن منارہے تھے۔ پہلی بار گاؤں کو دیکھنے کا موقع، گاؤں کی حسین کنیائیں ہماری خوب خاطر مدارت کرنے لگیں، گاؤں والوں کے عقائد کچھ عجیب تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کس کے پجاری ہیں۔ ایسے ہی سیر کیلئے نکل گئے تھے۔ ہری لعل اس را میرے ساتھ نہیں تھا۔ میں آگے بڑھتا رہا اور پھر مجھے ایک ٹوٹی پھوٹی کالے رنگ کی عمارت نظر آا نجانے کیوں میرے قدم اس عمارت کی جانب اٹھ گئے۔ میں آگے بڑھا، مندر نما عمارت تھی۔ بہہ بھدی، ایک بات میں نے محسوس کی کہ میرے قدم خود بخود اس عمارت میں داخل ہوئے ہیں، ورنہ داخل ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اور پھر میں سمجھ گیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ جب میں عمار میں داخل ہوا تو وہاں میں نے کسی کو کھڑے ہوئے پایا۔ جب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھا عادی ہوئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی زندہ وجود نہیں ہے، بلکہ ایک مجسمہ ہے، کالی کا مجسمہ۔

کالی کا بھیا تک چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا۔ جیسے وہ شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو اور میرا خیال بالکل درست لکھا، میرا وہم تھا۔ نہ کچھ اور کالی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ مسکرائے اور پھر مدہم لہجے میں بولی۔

”کہو، خوب سیریں ہو رہی ہیں، شکار ہو رہے ہیں، مزے آرہے ہیں، پوجا کر رہے اپنی؟“

”تم؟“

”ہاں کیوں، تمہیں حیرت ہوئی ہے، اس گاؤں کے لوگ میرے پجاری ہیں اور یہ اعزاز میں نے تمہیں دلویا ہے، ورنہ اس آڈخور کو شکار کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔“

”آہ..... تو کیا تم بدستور میرا پیچھا کر رہی ہو۔“

”ہاں..... تمہیں دیکھ رہی ہوں کہ تم کیا کیا کھیل رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا تم اتنی آسانی سے ہم سے دور جاسکتے ہو۔“

”آہ..... مجھے لگ رہا ہے کہ تم میری زندگی کے آخری سانس تک مجھ پر مسلط رہو گی۔“

”بالکل ٹھیک لگ رہا ہے اور دوسری بات میں تم سے ایک اور کہوں۔ تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو۔“

”لغت ہے تم پر اور اس کے بعد مجھ پر۔“ میں نے کہا۔ کالی ہنس پڑی اور پھر بولی۔

”اہنا مسلمان پن نہیں چھوڑو گے۔ یہ لغت ملامت تمہارے دین و دھرم کی چیزیں ہیں، میرے دھرم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، اچھا اب یوں کرو کہ اس گاؤں سے نکلو اور یہ جو مصیبت تم نے اپنے سر لگائی ہے نا، اسے یہیں چھوڑ دو۔“

”کون سی مصیبت؟“

”یہ ہی ہری لعل۔ رات کی تاریکی تم اسے ہستی ہی میں چھوڑ کر مشرقی سمت نکل جاؤ اور دیکھو۔ میں تمہیں ایک بات کہوں، اس وقت جو کچھ تم کر رہے ہو۔ یہاں تک تو یہ اس لئے ٹھیک ہے کہ میں تمہاری حفاظت کر رہی ہوں لیکن آگے چل کر تمہیں کسی نہ کسی جگہ روپ گبنالی کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ اس وقت اگر تم نے اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی کوشش کی تو تمہیں نقصان بھی ہو سکتا ہے اور جو کچھ تم چاہتے ہو، وہ اتنا آسان نہیں ہے۔ بس مجھے تم سے یہ ہی الفاظ کہنے تھے۔ میں نے غصیلی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے کوئی وزنی چیز مل جائے تو اس مجسمے کو چکنا چور کر دوں لیکن ایسی کوئی چیز نہیں ملی، کالی کا مجسمہ اب پتھر کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔

میں اس چھوٹی سی مندر نما عمارت سے باہر نکل آیا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود کشی ہی کر لوں۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید مجھے موقع ہی مل گیا ہے اور اب میں ان چکروں سے نکل جاؤں گا لیکن میری تقدیر کے چکر ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ آہ..... کیا کروں..... کیا نہ کروں، میں نے باقی کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس کے بعد میں نے ایک کوشش کی وہ یہ کہ ہری لعل کو یہاں چھوڑ کر یہاں سے دور نکل جاؤں اور اسی رات تقریباً میں نے وہ گاؤں چھوڑ دیا۔

ہری لعل سو رہا تھا حالانکہ وہ ایک اچھا آدمی تھا اور اس کے تجربے سے میں نے کافی فائدہ اٹھا لیا

کوئی باقاعدہ کیمپنگ تھی، خیمے نظر آرہے تھے اور ان خیموں کے درمیان دھواں اٹھ رہا تھا۔ گویا مہم جوؤں کی کوئی ٹولی تھی، جو ہمالیہ کے دامن میں ان پر اسرار جنگلوں اور پر اسرار حالات میں کسی مہم جوئی کیلئے نکل تھی۔

غور سے دیکھا، تو عمدہ قسم کی گاڑیاں بھی نظر آئیں اور یہ یقین پختہ ہو گیا کہ صورتحال ایسی ہی ہے، ایک لمحے تک سوچتا رہا اور اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آگے بڑھ کر ان لوگوں سے ملاقات کروں، دیکھوں تو سہی کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں، کالی ل چکی تھی اور کبکھٹ مطمئن تھی کہ میں اس کے راستے پر ہی کام کر رہا ہوں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ اس کے اس طرح مل جانے سے اور اطمینان سے میرا بڑا دل دکھا تھا۔

میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید میں ان کے جنگل سے نکل آیا ہوں لیکن اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ غرض یہ ہے کہ آخری فیصلہ کیا اور اس کے بعد ان لوگوں کی جانب چل پڑا، لمبا فاصلہ تھا لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے اندازہ ہو گیا، کہ ان لوگوں نے مجھے دور سے دیکھ لیا ہے اور ایک جگہ آ کر جمع ہو گئے ہیں۔ پھر اچانک ہی زور سے ہاتھ ہلائے جانے لگے اور یہ دیکھ کر میرا کلیجہ مزید خون ہو گیا کہ جو شخص زور زور سے ہلاتھ ہلاتھ رہا تھا۔ وہ رانا ہریش کھر جی تھا۔

آہ..... سب کچھ وہی، اب تک جھک ماری ہے میں نے، بلاوجہ وقت ضائع کرتا رہا ہوں، یہ پر اسرار کھیل تو بڑی کامیابی سے جاری ہے۔ آہستہ آہستہ میں ان کے قریب پہنچتا جا رہا تھا اور جب بالکل قریب پہنچا تو اندازہ ہو گیا کہ یہ رانا ہریش کھر جی ہی کی ٹولی ہے لیکن اس قدر شان و شوکت، میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی، رانا ہریش کھر جی! نے بالکل یہ بات نہیں بتائی تھی کہ جب وہ فکار پر نکلتا ہے، تو اس قدر عظیم الشان لشکر اس کے ساتھ ہوتا ہے، ٹولی میں بہت سی لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں، ان میں راجوتی بھی تھی، جو عجیب و غریب نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، دوسری لڑکیاں بھی ندوستانی ہی تھیں، لیکن ایک سے ایک خوبصورت۔ اس کے علاوہ جو افراد نظر آرہے تھے۔ ان میں بھی

تھا لیکن اب میں ہر چیز سے توجہ ہٹا لینا چاہتا تھا۔ گاؤں کی کسی آبادی کو چھوڑ کر میں بے مکان آگے بڑھتا رہا۔ میرے دل میں تھا کہ میں اتنی دور نکل جاؤں کہ مجھے کوئی تلاش نہ کر سکے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ رات کا بقیہ حصہ، دوسرا دن، رومری رات اور تیسرے دن تک میں رکے بغیر سفر کرتا رہا تھا۔ جنگل بہت بھیانک تھا اور جگہ جگہ مجھے خوفناک واقعات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن میرے دل میں نجانے کیوں ایک عجیب سی لگن لگی ہوئی تھی اور میں چلا جا رہا تھا۔

ہری لسل کا ساتھ جتنے عرصے رہا تھا وہ بڑا اچھا تھا۔ کم از کم ایک سے دو افراد اچھے ہوتے ہیں لیکن کالی کے کہنے پر میں نے ہری لسل کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ کالی مجھ سے کیا چاہتی ہے، یہ بات مکمل طور پر ابھی میرے ذہن تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور پھر روپ گبنائی کچھ ایسے انوکھے کردار میں میرے وجود سے چٹ گئی تھی، جن کے بارے میں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مجھے ان سے نفرت تھی۔ مگر میں ان سے اس نفرت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ کرتا بھی تو کس سے کرتا، آخر کار جنگل ختم ہو گیا۔

ساؤتھ بھان تو پیچھے رہ گیا تھا۔ ہری لسل نے بتایا تھا کہ بیلا کیوں کا علاقہ جاری ہے، پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان کو چھو رہی تھیں اور صبح طور پر اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ آگے کیا ہے، ہاں البتہ ایک بات کا تو مجھے بھی دلی افسوس تھا۔ وہ یہ کہ جب مجھے کالی سے تعاون نہیں کرنا تھا تو آخر میں نے ہری لسل کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا، کیا سوچے گا بے چارہ، کس انداز میں سوچے گا، یہ بات مجھے اکثر تکلیف کا شکار کر دیتی تھی۔

مزید یہ کہ اس ماحول سے طبیعت سخت اکتا گئی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر کار میں کیوں جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں، نہ شکاری تھا نہ مہم جو، ایک بے مقصد زندگی ہو گئی تھی میری۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ خودکشی کر لوں، کیا فائدہ اس طرح جینے سے جو کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کرنا پڑ رہا ہے۔ غلطی تو بے شک ہوئی تھی کہ حسن پرستی کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا، مگر کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ غلطی تنہا مجھ سے ہی نہیں ہوئی تھی، اس میں میرے ماں، باپ بھی پوری طرح ملوث تھے اور اگر وہ مجھے کسی ڈھنگ کی راہ پر لگاتے تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا اور میں بھی ایک سکون آمیز زندگی بسر کر رہا ہوتا۔

غرض یہ کہ انہی سوچوں میں وقت گزر رہا تھا کہ ایک رات ایسے ہی بس ایک بے نکی جگہ قیام پذیر تھا اور اکتاہٹ کا شکار تھا۔ علاقہ ذرا عجیب سا تھا۔ جنگل بھی تھے اور میدان بھی، بس یہ سمجھ لیا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ ایک ملی جلی جگہ تھی لیکن وہاں جو کچھ میں نے دیکھا، اسے دیکھ کر میں چونک پڑا تھا۔

کئی شاندار شخصیتیں تھیں۔

پھر ان کے ساتھ ساز و سامان لینڈ کروزر اور ٹریلر اور باسکٹ وین وغیرہ۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شکار پر نکلنے والی کوئی ٹولی اس طرح کے ساز و سامان سے آراستہ ہوگی۔ رانا ہریش مکھرجی ان کو میرے بارے میں کچھ بتا رہا تھا اور وہ سب میری طرف دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے خاص طور سے دیکھا کہ ان لوگوں میں روپ گجالی بھی ہے۔ راجوٹی تو نظر آئی تھی لیکن روپ گجالی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بہت ہی اعلیٰ قسم کے خیمے لگے ہوئے تھے، جنہیں خیموں کے بجائے ایک چھوٹا موٹا گھر کہنا مناسب ہوگا۔

ہریش مکھرجی مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے بڑے پرتپاک انداز میں مجھ سے معافہ کیا۔

”میں تمہارے بارے میں ان سب کو بتا چکا ہوں، اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ تم بہت جلد ہمارے پاس آنے والے ہو، تمہارا نام اتنا مشہور ہو چکا ہے ایک شکاری کی حیثیت سے کہ یہ سب پہلے ہی تم سے واقف تھے اور اب تمہیں دور ہی سے دیکھ کر بہت خوش ہو رہے ہیں۔ یقیناً تم تھکے ہوئے ہو گے، کیونکہ تمہارا ہوا اور پیدل ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے آرام کرو، ہمارا یہ کمپ عارضی ہے لیکن اب ہم آرام سے یہاں سے آگے بڑھیں گے۔ تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ جب تک کہ تم اپنے طور پر مطمئن نہیں ہو جاتے ہو، ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔“ یوگان ادھر آؤ۔“ اس نے کسی کو آواز دی۔

یہ بھونٹانی خدوخال کا ایک لمبا چوڑا جوان تھا۔ جس کی شخصیت میں کوئی ایسی خاص بات ضرور تھی، جو متاثر کرتی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر میرے قریب پہنچا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر کے گردن جھکائی۔

”میرا نام یوگان ہے، باس! میں نسلًا مشکول ہوں، مگر میری ماں ہندوستانی تھی، یہ میرا مکمل

تعارف ہے۔“

”یوگان اس وقت تعارف کے بجائے ان کے آرام کا بندوبست کرو، ان کا تعارف تو باقاعدگی

سے کرایا جائے گا۔“

”آئیے باس۔“ یوگان نے کہا اور میرے آگے آگے چل پڑا، وہ رہی خیمے نما چھوہلداری جس کا

میں آپ سے تذکرہ کر چکا ہوں، میری آرام گاہ بتائی گئی۔

چھوہلداری میں داخل ہو کر، اسے دیکھتے ہی دل خوش ہو گیا، یہ تو اچھا خاص گیٹ ہاؤس بتایا گیا

تھا۔ بہت اعلیٰ قسم کا فولڈنگ بستر، اور اس کے علاوہ ضرورت کی بہت سی چیزیں۔“

”اب آپ یہ بتائیے باس! کہ اگر آپ بھوکے ہیں تو میں پہلے کھانے کا بندوبست کروں۔“

”یوگان مائی فرینڈ! بہتر ہے مجھے کھانے کیلئے مل جائے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔ اور وہ قدم آگے بڑھا پھر سرسراتی آواز میں بولا۔

”مائی فرینڈ..... آپ نے مجھے دوست کہا باس!“

”ہاں۔ اور تم بھی مجھے باس مت کہو۔“

”میں جو کچھ کہتا ہوں، مجھے کہنے دو۔ میں تمہیں سچ بتاؤں باس، بعض لوگ ایک نگاہ میں کسی کو پسند آ جاتے ہیں۔ میں نے تو تمہارے بارے میں سن کر ہی تمہیں پسند کر لیا تھا اور اب جب نے تمہیں دیکھا ہے، تو مجھے اپنے آپ پر فخر ہو رہا ہے کہ اگر کسی شخص کے بارے میں کوئی اندازہ ہو تو میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا، معافی چاہتا ہوں۔ زیادہ باتیں کرنے کا عادی ہوں، لیکن سب کچھ اُن ابھی آپ کیلئے کھانا لاتا ہوں۔ یوگان نے جو کچھ میرے سامنے پیش کیا، وہ بھی اعلیٰ درجے کا مادہ دیر نہیں لگی تھی لیکن بہت ہی اعلیٰ قسم کے سینڈویچ کافی اور کچھ پھل میرے سامنے لا کر رکھے تھے۔

”یار اس کو دوست کہتے ہیں۔“

”ٹھیک یو باس، آپ کو پسند آئے، میری خواہش اسی میں ہے، جو بھی ضرورت ہو آپ یوگان روے لیجئے۔ یہیں سے بیٹھ کر آواز لگائیں گے تو میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا، کیونکہ میری بہت تیز ہے۔“ میں مسکرا دیا اور اس کے بعد کھانے پینے میں مصروف ہو گیا۔ آنکھیں بو جھل اری تھیں۔ چنانچہ جیسے ہی کافی کا آخری گھونٹ ختم کیا، پلکیں جڑنے لگیں اور اس کے بعد جو لینا تو شام کو پانچ بجے ہی آنکھ کھلی تھی، ماحول پر جھپٹا اترتا چلا رہا تھا لیکن کھانے کیلئے جو کچھ لاتے تھے، اس کے بعد جس پر مشقت سفر سے چھٹکارہ ملا تھا۔ اس نے ایک دم ساری تھکن دور کر

لی یوگان نے ہی چھوہلداری کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکا تھا اور ایک دم پردہ اٹھا کر اندر آ گیا تھا۔ آپ نے مجھے دوست کہا ہے، باس اس لیے آپ کو تھوڑی سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے

مثلاً۔“

اب آپ نے دیکھا نہیں کہ میں کس طرح پردہ اٹھا کر اندر آ گیا ہوں۔“

اوه..... چلو ٹھیک ہے، اتنی دقتی مجھے بہت پسند ہے۔“

اس چائے کا ناٹم ہو گیا ہے اور سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں، جیسے ہی آپ باہر نکلیں گے،

چائے کے برتن لگ جائیں گے۔“

”ارے، ارے مجھے اتنی حیثیت کیسے دے دی گئی۔“

”بڑی ٹھیک حیثیت دی گئی ہے، آپ منہ ہاتھ دھو لیجئے، لباس وغیرہ تو آپ کا کوئی دوسرا ہو گا لیکن رانا ہریش کھرچی نے کہا ہے کہ آپ کے سائز کے کپڑوں کا بندوبست کر دیا جائے، یہ داری بھی خود میرے اوپر ہی لگا دی گئی ہے۔“ یوگان نے کہا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں جس جگہ پہنچا، وہ بے مثال تھی۔ خیموں کے درمیان کی جگہ، گئی اور یہاں بڑی آرام دہ فولڈنگ کرسیاں اور فولڈنگ چیزیں لگی ہوئی تھیں، ویسے بھی میں نے یہاں ساز و سامان دیکھا تھا۔ وہ اس قدر بے مثال تھا کہ میں تو خوابوں میں بھی نہیں سوچ سکتا! بہر حال مختلف آوازوں میں میرا استقبال کیا گیا اور اس وقت سب سے بڑی بات یہ بھی کہ وہ گجناٹی بھی اس محفل میں تھی۔ وہ اگر نہ ہوتی، تو مجھے بڑا تعجب ہوتا، لیکن بہر حال میں نے سب کچھ کر لیا تھا۔

چائے کے برتن لگائے جانے لگے، گلتا ہی نہیں تھا کہ اس طرح ہم لوگ کہیں باہر نکلے ہو ہوں گے، دولت کے کھیل نرالے ہی ہوتے ہیں، رانا ہریش کھرچی نے زبردست انتظامات کیے اور یہ اجنبی لوگ یقینی طور پر یہ ان ہم جوڑوں میں شامل تھے، جو رانا کے ساتھ شکار پر نکلتے ہوں گے نے ایک شاندار شخصیت سے تعارف کرایا، جولبی چوڑی اور بہترین جسامت کی مالک تھی۔

”یہ نواب سلامت بیگ ہیں، میرے ساتھی۔ سیروسیاحت کے رسیا، لمبی چوڑی زمینوں مالک، اور یہ رائے پردیپ سنگھ ہیں۔ ریاست گوڑہ کے سب سے بڑے جاگیردار، یہ ان کی کا ہیں، یہ جینا ہے، رائے ہردیپ سنگھ کی بیٹی، اس کی ماں فرخ تھی، لیکن جینا اپنے آپ کو ہندوستانی کر خشی محسوس کرتی ہے۔“

”جی۔“ میں نے گردن خم کر کے کہا اور پھر دوسرے لوگوں کا بھی مجھ سے تعارف کرایا! لگا۔ راجوتی بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھ رہی تھی، مجھے حیرت تھی کیونکہ اس سے پہلے میرا راجوتی کوئی اتنا گہرا رابطہ نہیں رہا تھا، لیکن اس وقت اس کا انداز یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ دوسروں پر یہ غلام چاہتی ہو کہ میرے اور اس کے درمیان بہت زیادہ انڈر سٹینڈنگ ہے، میں نے سب کو ہاتھ پر نام کیا تھا، چونکہ مجھے یہ بات یاد تھی کہ میں ہنس راج ہوں، اس کے بعد چائے شروع ہو گئی اور دیر تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے، رات کا کھانا بھی اسی طرح شاندار طریقے سے کھایا گیا، بہت ملازم ساتھ تھے، جن کا تعلق زیادہ تر بھوٹان سے تھا۔

یہ بھوٹانی نو جوان بڑے مستعد اور ہر طرح سے چاک و چوبند تھے، اور بھاگ بھاگ کر سارے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے شاندار حصار بنا لیا تھا۔ علاقے کے بارے میں مجھے زیادہ اندازہ تو نہیں تھا لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ ان علاقوں میں اچھے خاصے درندے موجود ہیں۔ یقینی طور پر رانا ہریش کھرچی نے ہر طرح کے انتظامات کیے ہوں گے، رات کو رانا ہریش کھرچی نے مجھے اپنے خیمے میں بلوا لیا، اس وقت روپ گجناٹی بھی ساتھ ہی موجود تھی اور کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی، اس نے میری جانب توجہ نہیں دی لیکن رانا ہریش کھرچی نے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

”ہنس راج ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تم ہر طرح سے اب ہمارے ساتھیوں میں سے ہی ہو اور کسی بھی طرح کوئی الگ انسان نہیں ہو۔ میں تمہیں یہ بتانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ شکار میری بہترین دلچسپی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم دھنپنے بھی تلاش کرتے ہیں، تبت اور اس کے بے شمار علاقوں میں بدھ مت کے آثار بھی ہیں، اور یہاں ایسی ایسی عظیم الشان خانقاہیں موجود ہیں، جہاں بدھوں کے اعلیٰ پائے کے مجسمے جو ہیرے جواہرات سے سجے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہی سونے کے بت پر اس علاقے میں اکثر ہم جوڑوں کو دستیاب ہو جاتے ہیں۔

اور ہم تنہا ہی نہیں، کبھی کبھی بے شمار ٹولیاں ان کی تلاش میں نکلتی ہیں، ہمیں ہو سکتا ہے اپنے سفر کے دوران ایسی بہت سی ٹولیوں سے سابقہ پڑے، ہنس راج ہمیں معاف کرنا، تم ایک ماہر شکاری کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ہو، تم نے اس وقت بھی ان لوگوں کے بارے میں بتایا تھا کہ تم ان کے لئے زموں جیسی حیثیت رکھتے ہو لیکن تم ہمارے ہاں ملازم نہیں ہو، بلکہ ہمارے ایک ساتھی ہو۔ اگر اس میں ہمیں کوئی خزانہ دستیاب ہوا، تو اس میں سے تمہیں تمہارا بہترین حصہ دیا جائے گا۔ یہ پورا روپ جس میں نواب سلامت بیگ رائے، ہردیپ سنگھ، ایرس وغیرہ موجود ہیں، سب کے سب ان کے خواہشمند ہیں۔ اب مجھے ایک بات کا جواب دو کہ کیا تم خوشی کے ساتھ ہماری قربت پسند و گئے۔“

”جی رانا صاحب! میں آپ ہی کے اشارے پر اس علاقے میں آیا تھا اور اس وقت سے اب بے شمار حالات کا شکار رہا ہوں۔“

”اتفاق کی بات ہے کہ تمہارے بارے میں ہمیں ساری تفصیلات ملتی رہی ہیں، ان چاروں کی کی خبر بھی ہمیں کچھ وقت کے بعد ہی مل گئی تھی۔“

”جی۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے رانا ہریش کھرچی کو دیکھا۔

”ہاں، ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ تم تمہارا گئے ہو۔“



۱۷ میں یہ ہی سب کچھ لکھا گیا ہے تو ٹھیک ہے یہ ہی سہی۔ پھر رات کے کسی حصے میں نیند آگئی تھی۔ دوسری صبح وہی شاعر رانا ثنا اور اس کے بعد رواں کی تیاریاں۔ بھوٹانی ملازموں نے اس طرح ۱۸ اتار کر نوٹڈ کئے تھے، کہ انسان حیران رہ جائے۔ وہ اپنے کام میں بڑے ماہر معلوم ہوتے تھے۔ ۱۹ لی چیزیں ٹریلر اور باسکٹ ویکوں میں لاد لی گئی تھیں۔ بھوٹانی جوان ہی گاڑیاں ڈرائیو کر رہے ۲۰ ان کے بارے میں ہی رانا ہریش کھرجی نے بتایا تھا کہ وہ بہترین ٹرینڈ ہیں اور راستوں سے ۲۱ واقف ہیں، ابھی تک میرا کسی لڑکی سے کوئی باقاعدہ تعارف نہیں ہوا تھا۔ بس راجو جی تھی، جو ۲۲ لمبوس ہو رہا تھا کہ میرے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے بھی بڑی لینڈ کروزر میں ہی سوار ۲۳ لایا گیا تھا اور میں آرام سے سفر کر رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ بھی ہیلہ کیون کا ہی علاقہ تھا یا کوئی اور جگہ ہمارا ۲۴ بڑے آرام سے جاری تھا اور ہم اس عظیم الشان علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔ دور دور تک ۲۵ ایمان اور بھرپور پہاڑی علاقہ نظر آ رہا تھا۔ تاحدنگاہ پتھر پٹی زمین بہت دور تک چلی گئی تھی۔ ۲۶ اور تقریباً دوپہر تک سفر کرنے کے بعد ہمیں درختوں کی سیاہی نظر آئی تھی اور وہ بھی ایک بلند ۲۷ ہے ہماری اس لینڈ کروزر میں نواب سلامت بیگ اور ان کی لڑکیاں، رانا ہریش کھرجی، روپ ۲۸ میں اور راجو جی تھی۔ باقی لوگ دوسری گاڑیوں میں تھے۔ راجو جی بالکل خاموش تھی، یہ سفر ۲۹ اقاعدہ کیا جاتا رہا، کھانے پینے کیلئے بھی بس ہلکی پھلکی چیزیں دے دی گئی تھیں، شام کو چھ بجے ۳۰ چھپ گیا اور اندھیرا کسی سیلاب کی طرح بڑھتا نظر آیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ماحول کو نگل لیا اور ہر چیز تاریک ہو گئی۔ تب ڈرائیوروں نے گاڑیوں ۱۷ ہاں جلا لیں، نارنج جلا لیں۔ مزید کچھ دیر تک سفر جاری رہا۔ اس کے بعد بیٹھوں کی آوازیں ۱۸ لیں۔ جس کا مطلب تھا کہ رک جایا جائے، گاڑیاں رک گئیں اور رائے ہر دیپ سنگھ آگے والی ۱۹ سے اتر کر ہماری لینڈ کروزر کے قریب آ گیا۔

کیا خیال ہے، ابھی اور آگے چلنا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

نہیں یا رتھک گئے۔“ رانا ہریش کھرجی نے کہا۔

ملاقات بھی بہت اچھا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ جگہ پسند کی ہے۔“

الکل، بالکل۔“ رانا ہریش کھرجی نے کہا۔

ما صاف شہری جگہ تھی، پرسکون اور درختوں سے خاصی دور۔ اس کے علاوہ جو رات ہو گئی ۱۷ میں زیادہ آگے بڑھنا مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ رانا ہریش کھرجی نے منظوری دے دی۔ تمام ۱۸ ان پر متفق تھے۔ پھر بھوٹانی ملازموں کو ہدایت کی گئی اور وہ نیچے اتر گئے۔ سارے کام

”لیکن کیسے رانا صاحب۔“ میں نے شدید حیرت سے پوچھا، تو رانا کی نظریں بے اختیار روپ ۱۷ گنٹالی کی طرف اٹھ گئیں، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”بس بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، مجھے یہ بتاؤ کہ ۱۸ تمہیں ہماری تلاش تھی؟“

”آپ نے کہا تھا مجھ سے، آپ کو یاد نہیں ہے کہ میں ساؤتھ بھان کی طرف جاؤں اور اگر ۱۷ کے بعد ہیلہ کیون کے جنگلات میں داخل ہونے کی کوشش کروں، میں اسی میں مصروف تھا کہ آپ ۱۸ مجھے مل گئے۔“

”دیری گڈ..... دیری گڈ۔“ اچانک ہی روپ گنٹالی نے کتاب بند کر دی اور مسکراتی نگاہوں ۱۷ سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”اب آرام کرو، کل صبح ہم یہاں سے روانگی کا بندوبست کریں گے۔“ ۱۷ اس کی یہ مداخلت بڑی عجیب سی تھی، رانا ہریش کھرجی نے بھی چونک کر دیکھا۔ تو وہ مسکرا کر ۱۸ بولی۔

”اب سوؤ گے کہ نہیں، مجھے شدید نیند آ رہی ہے، اس لئے میں نے یہ بات کہی ہے، پریشان ۱۷ ہو۔“

”ہاں، ہاں، بالکل، بالکل، اوکے، ہنس راج اب تم سب کچھ سمجھ چکے ہو، اس لئے مزید کسی ۱۷ کی ضرورت نہیں رہی۔“ میں رانا ہریش کھرجی کے خیال سے باہر نکل آیا۔



جو خیمہ میرے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ میں اسی میں آ کر لیٹ گیا۔ دن میں چونکہ کافی وقت ۱۷ چکا تھا۔ اس لئے رات کو بہت دیر تک جاگتا رہا، دماغ میں سوچیں ہی سوچیں تھیں۔ کہانی نیا رنگ ۱۸ اختیار کر گئی تھی، پہلے یہ کہانی یوں تھی کہ کالی نے مجھے اپنے راستے پر لگایا اور مجھ سے میرا ایمان چھین ۱۹ لیا۔ پتہ نہیں کیا کیا غلطیاں کھلا کر اور اس کے بعد اس نے مجھے استعمال کرتے ہوئے اپنے ایک ڈنر ۱۷ روپ گنٹالی کے پاس بھیجا، جس کا نچانہ زندگی کا کیا مقصد تھا۔ پھر رانا ہریش کھرجی نے ہم جوتی کا ۱۸ تیاریاں کیں اور مجھے ایک شکاری کا درجہ دے کر اپنے ساتھ لے چلے، اب پتہ چلا کہ انہیں کسی خزاں ۱۷ کی تلاش ہے۔

بہر حال میری اپنی کوششیں تو ناکام رہی تھیں، میرے اندر جو غلطیوں کا زہر اتر چکا تھا۔ ۱۷ مجھے ان لوگوں کے چنگل میں پھنسے رہنے پر مجبور کرنا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ اسی کا شکار تھے، اب اگر میرا

بڑے سسٹم سے کئے جا رہے تھے۔ بھوثانی ملازموں نے صرف تین خیمے لگائے تھے، یہ تینوں بڑے احتیاط سے لگائے گئے تھے، ورنہ ٹرائل ہی اتنے بڑے تھے کہ سب لوگ ان میں آرام کر سکتے۔ ضروری سامان اتارا گیا، اس میں دوسرے ملازموں نے بھی بھوثانی نوجوانوں کی مدد کی۔ سب سے پہلے تمام لوگوں کیلئے کافی تیار کرائی گئی۔ پھر کھانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب مجھے لطف آ رہا تھا۔ اس طرح کے سفر ویسے بھی پر لطف ہوتے ہیں، پھر کچی بات یہ ہے کہ نہ آگے نہ پیچھے پگا۔ میرا تھا کون، جس کیلئے میں تڑپتا اور ترستا۔ یہ تو اچھی خاصی کہنی مل گئی تھی، ذرا سی غلطی تھی، اگر ہری لعل کو بھی ساتھ لے لیا جاتا، تو میری اتنی حیثیت ضرور تھی کہ اس پر کوئی اعتراض نہ ہری لعل میرا بہترین دوست اور ساتھی تھا۔ بے شک یوگان اب وہ جگہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لگا صلاحیتیں شاید یوگان میں نہیں تھیں، جو ہری لعل میں تھیں، خیر جو ہونا تھا وہ اب ہو ہی چکا تھا۔ کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ سناٹا لیکن انتظامات معمولاً تھے۔ سرج لائیں روشن کی گئیں جو ٹرائلوں اور دوسری جگہوں پر نصب تھیں اور اس کے بعد ٹن ا گیا تو ہر طرف دو دھیا روشنی پھیل گئی۔

میں ششدر رہ گیا تھا۔ میں نے بے اختیار کہہ ڈالا۔

”کیا اتنی چیز روشنی سے ہمارے ساتھ لایا ہوا روشنی کا سسٹم ختم نہیں ہو جائے گا۔“

”نہیں میری جان ٹرائلوں میں جنریٹر نصب ہیں۔ روشنی ان جنریٹروں سے ہی ہو رہی

اور ہر طرح کے انتظامات موجود ہیں۔“

”ویری گڈ..... ویری گڈ۔“ رائے ہر دیپ سنگھ غالباً میرے اور ہریش مکھرجی کے

ہونے والی باتیں سن رہا تھا۔ عقب سے بول پڑا۔

”کہوئیں راج مرہ نہیں آ رہا۔ اس سفر میں ہمارے پاس ہر طرح کا آرام موجود ہے اور

ہر طرح کی ذمہ داری مسٹرائس نے اپنے سر لی ہے۔ یہ زبردست انسان ہیں۔ بظاہر تمہیں کچھ

نہیں آئیں گے۔ ابھی رائے ہر دیپ سنگھ یہی الفاظ کہہ رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے منہ

لہریں ابھریں اور میں پھر اچھل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ موسیقی کی آواز کہاں سے آئی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ٹرائلوں سے آ رہی ہے۔“

”زبردست۔“

”ٹھیک.....“ میں مسکرا دیا۔

واقعی جنگل میں مشکل ہو گیا تھا۔ لڑکیاں اور نوجوان ایک جگہ جمع ہو گئے اور آپس میں خوب اچھی انہیں بولنے لگے، خوب تالیاں بٹنی جانے لگیں۔ فرمائشیں ہوئیں، ریکارڈ بنجتے رہے۔ کافی تقسیم راجوٹی اس وقت مجھ سے کچھ فاصلے پر تھی اور کچھ اکھڑی سی نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی رانا ہریش کی رہائش گاہ میں میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ الگ مزاج کی لڑکی ہے۔ بہر حال مجھے کیا پروا تھی۔ کھانا تیار ہوا، کھایا گیا اور پھر آرام کی بات ہونے لگی، تمام کے تمام لوگ یہاں بھی باز نہ روٹنی کافی تھی، جگہ جگہ بساطیں بچھ گئیں اور شطرنج کھیلی جانے لگی، موسیقی بند کر دی گئی، میں اب گاڑی ہی میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اور اس پر کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا تھا، چنانچہ میں اپنی آرام کی جگہ پہنچ گیا اور نجانے کب میں الجھا الجھا سو گیا۔ کافی نیند لے چکا تھا کہ اچانک ہی کسی نے جھنجھوڑا، میں نے دیکھا کہ وہ ٹی مکھرجی تھے، ان کے پیچھے راجوٹی بھی موجود تھی، میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

”خیریت ہے رانا صاحب!“

”ہاں، ہاں، سب ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن یہ بتاؤ، یہاں سونے کی کیا ضرورت تھی۔“

”کہاں؟“

”میرا مطلب ہے اس جگہ، یہاں تو تمہیں آرام بھی نہیں مل رہا۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”یہ کوئی سونے کی جگہ ہے۔“ رانا صاحب بولے۔

”بس کوئی نہ کوئی جگہ تلاش کرنا ہی تھی۔ خیموں میں آپ لوگ موجود تھے اور رانا صاحب

رایک کا اپنا ایک مقام ہے۔“

ہلا دو جی باتیں مت کرو، تم نے کہیں محسوس کیا انہں راج کہ ہم نے تمہیں اب تک اپنے آپ

کی کم سمجھا ہے۔“

”نہیں رانا صاحب، میری بھی تو کچھ ذمے داریاں ہیں، آپ سوئی نہیں ابھی تک راجوٹی

وگئی تھی بے چاری تمہاری بات سنی تو پریشان ہو گئی کہ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، بھیا جی، کیا

بی اور اتنی شاندار شخصیت کا مالک ایسا ہے کہ اسے دوسرے کے ساتھ سلا دیا جائے۔“

”ارے، مہربانی ہے راجوٹی جی کی۔“

”ہا آ جاؤ، آ جاؤ، ویسے بھی تم ان علاقوں سے ناواقف ہو۔ ایسی تفریحات نہ کیا کرو،

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“

”تو پھر میری رائے ہے کہ کسی کو اپنا سربراہ چن لیا جائے، جو ایک تجربے کار آدمی ہو اور اس کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔“

”بہت مناسب بات ہے، لیکن اس کیلئے کسی کا انتخاب۔“

”رائے ہر دیپ سنگھ۔“ کئی آوازیں ابھریں۔

”ویری گنڈ..... گویا۔ آپ لوگ میری گردن پھنسانے پر تہل گئے۔ بابا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

”جی نہیں جناب! آپ اس پارٹی میں سب سے تجربے کار اور مناسب ترین آدمی ہیں۔“

”ہمیں آپ کے اوپر مکمل اعتماد ہے۔“

”دوستو! میری نگاہ میں ایک اور شخص ہے، آپ لوگ سن لیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں۔“

”کون.....؟“

سوال کیا گیا۔

”نواب سلامت بیگ۔ نواب سلامت بیگ کے بارے میں آپ سب جانتے ہو، ایک شاندار مہم جو اور ایک زبردست انسان۔“

”سلامت بیگ بلاشبہ سب سے زیادہ عمر رسیدہ اور سب سے زیادہ جہاندیدہ اور یہاں معاملہ کارکردگی کا نہیں، سربراہ کی بات ہے اور دوستوں سے معذرت کے ساتھ نواب سلامت سے زیادہ عمدہ آدمی اس کام کیلئے اور کوئی میری نگاہ میں نہیں ہے۔“

”میں تائید کرتا ہوں۔“ رانا ہریش کھرجی نے کہا۔

”ہم سب تائید کرتے ہیں، بلاشبہ ہم میں سے کسی کو نواب سلامت بیگ کے احکامات ماننے سے گریز نہیں ہوگا۔“

”مگر..... میری تو سنو، میں اس قائل نہیں ہوں۔“ نواب سلامت بیگ نے کہا۔

”ہم سب اس بات سے متفق ہیں، نواب صاحب۔ آپ انکار نہ کریں۔“

”مگر میری بھائیو! میں آپ لوگوں کے مشوروں کے بغیر بھلا کیا کر سکتا ہوں۔“

”ہم سب آپ کے شانہ بشانہ ہیں نواب صاحب، آپ فکر مند کیوں ہیں؟“

”تمہاری مرضی ہے۔ اگر تم یہ تماشا کرنا چاہتے ہو تو میں تیار ہوں۔ چنانچہ یہ بات طے ہو گئی اور اس کے بعد سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں، پھر تھوڑی دیر کے بعد گاڑیاں اسٹارٹ ہو کر چل پڑیں۔“

”سبھی؟“ ہمیں پتہ بھی نہیں تھی کہ تم یہاں گاڑی میں سو رہے ہو۔ راجوتی ہی نے کہا کہ کسی گاڑی دیکھو، کہیں سو تو نہیں گئے، اگر تم نہ ملتے تو میں ساری رات سو نہیں سکتا تھا۔“ رانا ہریش کھرجی نے لہجے میں بولا۔

میں مسکرا دیا، اور راجوتی اور رانا ہریش کھرجی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سناٹا ہوا تھا، سرج لاکٹیں بچھا دی گئی تھیں، چند معمولی سی روشنیاں جل رہی تھیں، ٹرالروں کی چھت پر نے ان بھونٹائیوں کو دیکھا، وہ باقاعدہ اسلحہ لیے وہاں ڈیوٹی دے رہے تھے۔

”یہ لوگ.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ان کی ڈیوٹی ہے، آدمی رات کو دوسرے جاگ جائیں گے۔“ ہریش کھرجی نے بتایا اور

نے گردن ہلا دی۔

پھر ہریش کھرجی نے ایک ٹرالر کی جانب رخ کیا تھا، خیمے کے بجائے وہ ٹرالر میں جا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ٹرالر میں بہت سے لوگ سو رہے تھے، ان میں ایرس، دولڑکیاں مویا وہیں پر راجوتی بھی لیٹ گئی۔ رانا ہریش کھرجی نے ٹرالر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا، میں بھی میں تھا، چنانچہ لیٹتے ہی سو گیا۔ پھر دوسرے دن صبح سب لوگ کافی دن چڑھے اٹھے تھے، ان انتظامات ہو رہے تھے، اور کھڑ، چڑکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

گویا سارے حالات معمول پر تھے، ناشتا وغیرہ تیار ہو گیا تھا، اور میزوں لگا دی گئیں تھیں لوگ فولڈنگ اسٹولوں پر بیٹھے ہوئے تھے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ناشتہ کینوس کی میزوں پر لگا بھونٹائی ملازم بڑی پھرتی سے کام کر رہے تھے۔ ہر دیپ سنگھ نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”یہ تو بڑے غصب کے لوگ ہیں، بالکل مشینی انسان معلوم ہوتے ہیں۔“ کسی نے کہا نہیں دیا اور سب ہی ناشتے میں مشغول ہو گئے، پھر اس کے بعد کافی کا دور چلا اور اچانک سلامت بیگ کہنے لگے۔

”یار رانا ایسے ہی تفریحاً ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔“

”کیا.....؟“

”ویسے تو ہم سب دوست ہیں، ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور کرتے، لیکن اس کے باوجود اس قسم کی مہمات میں ایک سربراہ ضروری ہوتا ہے۔ جو تمام معاملات میں سوچے، غور کرے اور تمام لوگ اس کی باتیں مانیں، کیا تم لوگ میرے رائے سے اتفاق کرتے۔“

ل۔ کانوں اور آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی، اسی وقت جینا نے میرے بازو پر بازو رکھا اور ایک دم اٹھ پڑی۔

”ایکسکیو زی مسٹرنس راج۔“

”سوری کوئی غلطی ہو گئی مجھ سے۔“

”نہیں، آپ کو تو بخار آیا ہوا ہے۔“

”بخار۔“

”جی۔“

”نہیں، میرا خیال ہے، ایسی بات نہیں ہے۔“

”دکھا لیجئے کسی کو۔ کافی گرم ہو رہا ہے، آپ کا ہاتھ۔“

”ایسے ہی ہوگا، کوئی خاص بات نہیں ہے، مس جینا۔ بہت بہت شکریہ۔“

”چلیں ٹھیک ہے، اگر آپ محسوس کر رہے ہیں تو الگ بات ہے، ورنہ ٹھیک ہے۔“ جینا خاموش

ل۔

دوپہر ہو گئی تھی اور سب کو بھوک لگ رہی تھی۔ قافلہ پوری طرح پرسکون تھا۔ اس نے آرام سے سفر کیا تھا، کسی کو جلدی نہیں تھی، چنانچہ جس شخص نے بھوک کا تذکرہ کیا۔ اسی کے کہنے پر ہال روک لی گئیں، یہ ایک ریستوران تھا اور کسی سائے کی گنجائش ہی نہیں تھی، لیکن ٹرالر بہترین تھے۔ چنانچہ دوپہر کا کھانا انہیں میں سر دیا گیا اور انہیں میں آرام کیا گیا۔ میں نے بھی دوسروں ساتھ کھانے میں حصہ لیا تھا، لیکن جینا نے شاید رانا ہریش کھرچی سے بھی بات کی تھی۔

چنانچہ انہوں نے میرے لئے صرف لیکوئڈ غذا تجویز کی، دوپہر کو دو گھنٹے کے بعد سفر روانہ ہو گیا اور ہم اسی ترتیب سے چل پڑے، سوائے اس کے کہ رانا ہریش کھرچی اور راجوٹی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران میں نے خاص طور پر محسوس کیا تھا کہ روپ گینا بہت ہی اہمیت ہے اور کسی سے مخاطب نہیں ہوتی جب کہ باقی تمام خواتین بدستور چوں چوں کرتی رہتی تھیں۔ کھانے اور دو گھنٹے کے آرام کے بعد سفر دوبارہ شروع کیا گیا تھا لیکن اس بار بھی سفر کی رفتار وہی تھی۔ پھر جب شام چمکنے لگی تو ریستوران میں بھی ختم ہو گیا اور اب ہم لمبے سرسبز درختوں کے سایے میں گزر رہے تھے۔ یہ وہی جنگل تھا، جو دور سے ایک لیکری طرح نظر آ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ گھنٹوں میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے لیکن اب کہیں جا کر یہ لگا تھا کہ جیسے جنگل میں پہنچ گئے ہستوں کی طرف سے یہ لوگ مطمئن تھے، اس لئے سفر مناسب راستے پر ہی کیا جا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بالکل نارمل رکھا تھا اور قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ یہ نئے نئے لوگ ملے تھے، کالی مجھے وارننگ دے چکی تھی، اور بتا چکی تھی کہ اس کا کام میں نے باسانی جاری کیا ہوا ہے۔ روپ گینا اس وقت ساتھ تھی۔ چنانچہ اب جو آگے لکھا ہوا ہے، وہ ہو جائے گا، اتنے سارے لوگ مل گئے تھے۔ سب کے سب نئے اور اجنبی اجنبی سے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری حسن پرست فطرت کی یہاں مکمل تسکین موجود تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑی انوکھی بات جو میں نے محسوس کی تھی، وہ یہ تھی کہ راجوٹی ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آ رہی تھی۔

گاڑیاں سفر کرتی رہیں، طویل میدان ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ قرب و جوار میں پہاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بہت سے درے نظر آ رہے تھے لیکن ان لوگوں نے ایک خاص راستہ منتخب کیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ ان کے منصوبے کے مطابق ہوگا، طویل میدان ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا، وہ جنگل جو دور سے کالی لکیر کی مانند نظر آ رہا تھا، اب صاف محسوس ہونے لگا تھا۔ ٹرالروں اور باسکٹ گاڑیوں کی وجہ سے رفتار زیادہ تیز نہیں کی جاسکتی تھی۔

چنانچہ سفر مناسب رفتار سے ہی جاری تھا۔ اس وقت نجانے کیوں راجوٹی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسی سیٹ پر دوسرے لوگ بھی تھے۔ راجوٹی کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کبھی کبھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ بہر حال مجھے اس وقت اس کا پاس بیٹھنا، اچھا لگ رہا تھا۔ ویسے بھی حسین لڑکی تھی لیکن ایک اور لڑکی بھی میری طرف بہت زیادہ متوجہ تھی، اور اس کا نام جینا تھا۔

جینا تھوڑی پیچھے بیٹھی ہوئی تھی، میں نے اس کی جانب دیکھا اور مسکرا دیا۔ جینا چونک کر مجھے دیکھنے لگی تھی۔ تب پھر میں عقبنی سیٹ پر آ گیا اور میں نے سیٹ سے ٹپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن بند آنکھوں میں تاریکی کے سوا اور کیا نظر آتا۔ ایک بار پھر میرا ذہن گاڑی کی گھون گھون سے ہم آہنگ ہو گیا۔ مٹے مٹے خاکے ابھرنے لگے، ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گاڑی ایک لمحے کے لئے رک گئی۔

”خیریت، کیا بات ہے؟“ لوگ ایک دوسرے سے سوالات کرنے لگے، لیکن گاڑی رکنے کی وجہ نہیں معلوم ہو سکی، اگلی گاڑی رک گئی تھی، اس لئے یہ بھی رک گئی۔ قرب و جوار کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ اتر کر حالات کا جائزہ لیا جائے، کالے رنگ کے رچھ آس پاس نظر آ رہے تھے، بہر حال وقت گزرتا رہا اور میں آپ ہی سے محو گفتگو رہا۔ میں نے سیٹ سے گردن نکالی تھی، نجانے کیوں نیند سی

”ریکارڈنگ بند کرادوں؟“

”ارے نہیں، نہیں دوسروں کو اپنے طور پر جینے کا حق ہے۔“

”تم یہ حق تسلیم کرتے ہو؟“ راجوتی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں؟“

”پھر کبھی کبھی دوسروں سے جینے کا حق چھیننے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟“

”جی۔“ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”ہاں۔ کیوں چھیننے ہو دوسروں کا حق۔“

”سس..... سوری، معافی چاہتی ہوں، مجھے بتائیے تو سہی میں نے کیا کیا ہے؟“

”کیا تم اپنے آپ کو کوئی انوکھی چیز سمجھتے ہو؟“

”نہیں بالکل نہیں، میں تو سچی بات یہ ہے کہ آپ کا داس ہوں۔“

”ہوں..... میرا داس۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو بتائیے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ مجھ سے کچھ ناراض

ہمراہ سی ہیں۔“

”دیکھو! میں تمہیں صرف ایک بات بتاؤں، میں جب کسی کو پسند کرتی ہوں، تو مکمل طور پر اسے

اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہوں اور یہ بات کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ تم مجھے پسند ہو۔ جب تم

ہماری جگہ کے پاس آئے تھے، تبھی مجھے اچھے لگے تھے اور میں نے دل میں سوچا تھا کہ میں تم سے دوستی

کروں، تمہارے قریب آؤں لیکن تم نے مجھے بالکل ہی ایک عام حیثیت دی اور ذرا بھی یہ احساس

میں دلایا کہ تم مجھ سے متاثر ہو۔“

”شما چاہتا ہوں، راجوتی جو آپ کو شاید یہ اندازہ نہیں ہے کہ میں ایک ملازم کی حیثیت رکھتا

ہوں، اور آپ ایک راج کمار ہیں۔“

”یہ تمہاری ذہنی فرسودگی ہے، بھائی! ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن آپ مجھے بتائیے کہ اگر بات آگے بڑھی تو میرے ساتھ کیا ہوگا۔“

”میں بات آگے نہیں بڑھنے دوں گی، تم اس وقت خاص طور پر سے جینا کے پاس جا کر بیٹھو

تھ۔ کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ اس بات سے؟“

”باپ رے باپ محترمہ یہ صرف اتفاق تھا۔“

”میں تمہیں بتائے دے رہی ہوں، کہ میں تمہارے ساتھ کسی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ کچھ

یہاں تک کہ شام ہو گئی اور چونکہ جس جگہ پر ہم تھے، وہ قیام کیلئے پسند کر لی گئی تھی۔ اس لئے نواب

سلامت بیک نے یہیں قیام کا فیصلہ کر لیا۔

بھونائی جوان اتر گئے اور اس کے بعد جلدی جلدی تیاریاں کرنے لگے۔ ان لوگوں کی بھڑک

اور مستعدی مجھے بہت پسند آئی تھی۔ منٹوں میں انہوں نے ساری تیاریاں مکمل کر لیں۔ ہریش کھرما

میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا۔

”دیکھ رہے ہو انہیں؟“

”کسے؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”انہیں جوانوں کی بات کر رہا ہوں۔“

”مجھے یہ لوگ بہت پسند ہیں۔“

”ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں کہ یہ بھونان کا کمال ہے۔ یہ چھوٹے قد کے لوگ ہو۔

ہیں لیکن میں نے جتنا مستعد انہیں دیکھا ہے، کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ میرا تجربہ ہے، بس بعض علاقہ

ایسے ہیں کہ بد نصیبی انہیں لے ڈالتی ہے، وہ کوئی خاص ترقی نہیں کر پاتے۔“

”اچھا اب یہ بتاؤ، کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ رانا ہریش کھرما نے موضوع بدل دیا۔

”رانا صاحب طبیعت خراب ہی کب تھی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس، بس گزریو نہیں ہوگی، کھانے پینے میں احتیاط کرو گے تو بدن کا چور نکل جائے گا، کچھ

راجی؟“ رانا ہریش کھرما نے پیار سے اپنی بہن کو مخاطب کیا اور وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی

”جی بھائی۔“

”راجوتی ان کا ذرا خیال رکھنا، کوئی اور چیز نہ کھالیں یہ۔“ میں ہنسنے لگا تو رانا صاحب بھی ا

گئے لیکن راجوتی کا چہرہ بدستور ساٹ رہا۔ حسب معمول موسیقی شروع ہو گئی، ہم کیا تھی، اچھی نا

پلنگ تھی۔ پسندیدہ ریکارڈ سننے جا رہے تھے، فرمائشیں ہو رہی تھیں، روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔

بھونائی نوجوانوں نے رقص کا پروگرام بنایا اور سب کے سب کچھ نہ کچھ کرنے لگے۔ میں نے ا

سنسان گوشہ اپنایا۔ خطرات کو بہر حال ذہن میں رکھنا تھا، چونکہ وہاں پر اجازت نہیں تھی کہ کوئی ا

دور نکل جائے۔ ایک درخت کے نیچے گھاس پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر گزری تھی کہ کسی کو نزدیک آ

دیکھ کر چونک پڑا، دلکش بات یہ تھی کہ راجوتی جی تھی۔ وہ میرے قریب آ گئی۔

”سورہے ہو؟“ اس کا لہجہ بہت عجیب تھا۔

”نہیں راجوتی جی، بس ہنگامے سے اکٹرا کر یہاں آ گیا تھا۔“

بھی ہو سکتا ہے، کوئی بھی بات ہو سکتی ہے، میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں۔“ عجیب وارننگ بھی، بڑا مسئلہ ہو گیا تھا۔ راجوٹی مجھے بھی پسند تھی، مگر صورتحال یہ تھی کہ میں راجوٹی کی قربت کیسے حاصل کروں اور یقینی طور پر روپ گجنا لی بھی نہیں چاہتی ہوں گی۔ روپ گجنا لی نے البتہ ابھی مجھے کوئی حیثیت نہیں دی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ میں کالی کا بھیجا ہوا آدمی ہوں، اگر اسے یہ بات معلوم ہو گئی تو کیا ہوگا؟“ وقت گزرتا رہا اور حالات معمول کے مطابق رہے لیکن پھر ایک تبدیلی رونما ہوئی، اس وقت جینا ایک وزنی باسکٹ لے کر آ رہی تھی اور اس سے چلا نہیں جا رہا تھا، میں بالکل قریب موجود تھا، میں نے وہ باسکٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس نے سر دنگا ہوں سے مجھے دیکھا اور کوئی خاص توجہ نہیں دی، پھر وقت گزرتا رہا، میں نے موقع ملتے ہی ہریش کھرچی سے کہا۔

”کیا بات ہے، ہریش کھرچی اگر ہم چھوٹے جانوروں کا شکار کرتے ہیں تو ان میں سے کسی کو اعتراض ہوگا۔“

”نواب سلامت بیک نے پٹی پڑھائی ہے شاید تمہیں۔“ رانا کھرچی مسکرا کر بولے۔

”کیا مطلب؟“

”بھئی وہ مسلمان ہیں اور گوشت کے بغیر ان کا گزارہ نہیں ہے لیکن تمہیں ہنسی آئے گی یہ سن کر ہم سب بھی گوشت خور ہیں۔“

”ارے واہ..... تو پھر..... کیا کہتے ہیں آپ؟“

”میں نے کہاں ناں، نواب سلامت بیک نے جو کچھ بھی کہا ہے، اس پر میں بھی عمل کرنے کو تیار ہوں۔“

”تو پھر میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ میں نے کہا۔

”کس سلسلے میں؟“

”نواب صاحب نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا۔“

”دیری گڈ۔ لیکن صرف ایک لمحے پہلے میں نے نواب سلامت بیک کی تلاش میں لگا ہوا دوڑا نہیں تھی، اس خیال کے تحت کہ اس سے کہوں کہ اس سفر پر نحوست کیوں طاری ہو گئی ہے۔“

”نحوست تو نہیں اچھا خاصا سفر گزر رہا ہے، ٹھیک ہے، جب تازہ خوراک دستیاب ہو سکتی ہے تو پھر محفوظ خوراک تو کسی بھی وقت استعمال کی جاسکتی ہے۔“

”یعنی شکار۔“

”ہاں، بالکل۔“ رانا ہریش کھرچی نے کہا۔

”تو پھر کیا خیال ہے، کیا ہم رائے ہر دیپ سنگھ سے بات کریں شکار کے بارے میں۔“

”اور تم دس بیس ہرن لے آؤ گے۔“ رانا ہریش کھرچی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ حکم دیں گے، تو یقیناً ایسا ہو جائیگا۔“ میں نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔ اب ظاہری

ت ہے کہ مجھے بھی اپنے طور پر تھوڑی سی شیخی مارنے کا حق تھا۔ جب وقت نے مجھے ہنس راج بنا دیا

ماہ تو پھر مجھے ہنس راج ہی رہ کر کام کرنا ہوگا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ سمندر شاہ کا بیٹا

سمندر شاہ اب سمندر رہ کہاں گیا تھا، کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا، جیسے واقعی میں ہنس راج ہی ہوں۔

انا ہریش کھرچی تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

”نہیں میری جان میں تمہیں نظر نہیں لگوانا چاہتا۔ تم میرے آئیڈیل ہو۔ ہمارے پروگرام کے

مطابق بھی تم کھل کر منظر عام پر نہیں آؤ گے۔ ہاں، ایک دو ہرن مار لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی، اور اس کے بعد میں نے یوگان سے بات چیت

لی کی، کہ آج میں اس کے ساتھ ہی رہوں گا۔ راجوٹی پر ایک اور برا نقش چھوڑنے کی یہ کوشش کرنے

کا مزہ آ رہا تھا۔ مزے کی بات اس وقت ہوئی، جب میڈم جینا بھی اس گاڑی میں آ گئیں۔ یہ اتفاق

ی تھا کہ میں یوگان کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اور اس وقت تک مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ ہمارے

اتھ کون کون ہوگا۔ شاید جینا نے بھی غور نہیں کیا تھا لیکن دور سے راجوٹی کی آنکھوں سے خارج ہوتی

ٹی چنگاریوں کی چمک یہاں تک پہنچ رہی تھی، میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

یہ تفریح کافی دلچسپ ہو گئی تھی، یوگان میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے کافی خوش تھا اور بچی

ت یہ ہے کہ یہ شخص خود مجھے بھی بہت پسند آیا تھا۔ ہم لوگ باتیں کرتے رہے، پھر یوگان ہی نے

ال کر ڈالا۔

”شکار کے بارے میں کیا خیال ہے چیف۔“

”کریں گے، ضرور کریں گے۔“

”ایک بات کہوں۔“ یوگان نے دلچسپی سے کہا۔

”ہاں، بولو۔“

”آپ کے بدن سے شکار کی بو آتی ہے۔“ یوگان نے بڑے مزے کی بات کی۔

”اچھا، شکاری کے بدن سے کوئی خاص قسم کی بو آتی ہے۔“

”ہاں، ہماری ناک بہت تیز ہوتی ہے اور میں بڑی امید سے آپ سے ایک سوال کر رہا ہوں

کہ کیا میں نے غلط کہا ہے۔“

”نہیں یوگان میں شکار کھیلتا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور مجھے یوں لگا جیسے یوگان اپنا بات صحیح ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ہی خوش ہوا ہو۔ تقریباً ایک گھنٹے تک یہ سفر جاری رہا اور اس کے بعد یوگان نے کہا۔

”میرا خیال ہے چیف یہ جگہ شکار کیلئے بہت موضوع ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ شکار ہمیں ذلیل کر رہا ہے۔“

”بالکل، بالکل، ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے اپنے اطراف میں دوڑتے بھاگتے خوبصورت جانوروں کو دیکھ کر کہا۔ یوگان نے پھر کہا۔

”اصل میں یہ وقت خوراک کی تلاش کا ہے، پھر جانور شکار کی تلاش میں نکلتا ہے اور ہر شکار اپنا شکار پالیتا ہے، جوں جوں سورج تیز ہوتا جائے گا، پیٹ بھرے جانور آرام کرنے کیلئے مناسب جگہیں تلاش کر لیں گے۔“

”بالکل ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ ہمارے پیچھے ابرس بیٹھا ہوا تھا، اور ہمارے باتیں سن رہا تھا، جب ہم خاموش ہوئے تو اس نے کہا۔

”اگر یہ بات ہے تو دوسرے لوگوں کو اطلاع دے دی جائے کہ شکار شروع کر دیتے ہیں۔“

”جی مسٹر ابرس۔ اوہو، دیکھو شاید دوسرے لوگوں نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے، اصل میں ہمارے ساتھ تجربے کار شکارچیوں کی پوری ٹیم موجود ہے، دیکھو گاڑیاں رک رہی ہیں، جگہ بھی مناسب ہے۔“

یوگان نے کہا۔

ساری گاڑیاں ایک ہی جگہ رک گئیں، انہوں نے ایک احاطہ سا بنا لیا۔ یوگان نے بھی اہل گاڑی ان کے برابر روک دی، تمام لوگ نیچے اتر رہے تھے۔

”ڈیڑی میں بھی شارٹ گن سے پرندوں کا شکار کھیلوں گی۔“ جینا نے باپ سے کہا۔

”ٹھیک ہے، بے بی! پہلے ان لوگوں کو پروگرام بنا لینے دو۔“

”اوکے ڈیڑی۔“ جینا نے کہا اور پھر وہ اپنی شارٹ گن ٹھیک کرنے لگی۔

میرے ہاتھوں میں کھلی ہو رہی تھی لیکن بہر حال صبر کرنا تھا اور دوسروں کو شکار کھیلتے دیکھنا تھا، تمام بڑوں نے مینٹنگ کی، بھلا بھوٹانی ملازموں کو شکار کھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی تھی۔ ہاں وہ شکار کو ذبح کر سکتے تھے۔ اسے پکا سکتے تھے، یہاں ایک سے ایک بڑا شکار تھا، خود رانا ہریش کھر جی شاید مجھے بھول گیا تھا۔ راجوٹی اس کے ساتھ ہی تھی، کمال کی لڑکی تھی۔ اس

لے اب بھی اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور بدستور ہشاش بشاش تھی۔

شروع شروع میں اس نے جس طرح مجھ پر اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے بعد اہا کوئی مظاہرہ اس نے نہیں کیا تھا۔ شکاری شکار کھیلنے چل پڑے ہمیں یہیں رہنا تھا۔ اچانک ہی یوگان نے کہا۔

”ایک بات کہوں چیف۔ پلیز میری بات کا برداشت ماننا، کوئی بات ناگوار گزرے تو مجھے بتا دیا کرو، تاکہ میں آئندہ وہ بات کہی نہ کہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ لوگ جس انداز میں شکار کھیلنے کیلئے کوشش کر رہے ہیں، اس انداز میں کوئی شکار لگنا مشکل ہے۔“

”کیوں یوگان؟“

”کیونکہ یہ میرا علاقہ ہے، میں یہاں کے شکار سے بھی واقفیت رکھتا ہوں، یہ لوگ یہاں شکار لہانا نہیں جانتے، اس علاقے میں شکار کھیلنے کا طریقہ دوسرا ہی ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیا، یوگان؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”جھاڑیوں کا علاقہ ہے چیف، اول تو شکار نظری مشکل سے آئے گا، جانور بھی چالاک ہوتے ہیں، وہ اپنے رنگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، شکار اگر صرف جھاڑیوں میں تلاش کیا جائے تو مل سکتا ہے، پھر پانی کے کنارے، جہاں وہ کھلا مل سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک کہہ رہے ہو یوگان، میرا خیال ہے، انہیں کوشش کر لینے دو۔ جب یہ ناکام رہے، تب دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا اور یوگان منہ میڑھا کر کے گردن ہلا کر چپ ہو گیا۔

میں تھوڑی دیر تک تو یوگان کے ساتھ ٹہلتا ہوا اس طرف چل پڑا، جہاں جینا اپنے باپ کے ساتھ جاری تھی، میرا رخ بھی اپنی طرف دیکھ کر ابرس رک گیا۔

”آؤ ایک مین کیا تمہیں بھی شکار سے دلچسپی ہے، تم شکار کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی بہت سر۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں گئے۔“ جینا نے ایک عجیب سی بات کہی۔

”معافی چاہتا ہوں مس جینا شاید میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہے، مجھے افسوس ہے۔“ میں پلٹ

نے کہا۔ لیکن جینا کامنہ بن گیا۔ شاید اس نے ایرس کی یہ بات اپنے اوپر طنز سمجھی تھی۔ اس نے کہا۔  
”نہیں، خواہ مخواہ شرمندہ ہونے سے کیا فائدہ۔“ جینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں مس جینا اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ براہ کرم ایک اور کوشش کیجئے آئیے۔“ میں نے ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا اور جینا کی پشت پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے اس کے دونوں شانے پکڑے اور اس کی پشت اپنے سینے سے لگائی اور گن ٹھیک طور پر سے اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ پھر پرندوں کی ایک ٹولی کو تاکتے ہوئے میں نے کہا۔

نال کے نیچے میرا ہاتھ رہے گا، آپ صرف نشانہ لیں اور جب میں کہوں ٹریگر دبا دیں۔“  
”اوہو..... اچھا۔“ جینا کی آواز میں کسی قدر لرزش تھی۔ غالباً میرے چوڑے سینے کا لمس اسے تاثر کر رہا تھا۔

”جہرے والے کارتوس ہیں ناں۔“

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے تو پھر ابھی درست کریں۔“

”ٹھیک ادھر، نیچے، اوکے، فار۔“ میں نے کہا اور جینا نے ٹریگر دبا دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے کئی اڑیں نیچے گر گئیں اور جینا کے حلق سے خوشی کی سریلی چیخ نکل گئی۔

”اوہ..... مائی گاڈ..... مائی گاڈ، پانچ، پانچ، ہم خوشی سے دوڑے اور ہم نے قازیں ذبح کر لیں، جینا بے پناہ خوش تھی، اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

”آپ تو بڑے ماہر نشانہ باز ہیں۔ مسٹر انس راج۔“

”لیکن قازیں تو آپ نے شکار کی ہیں مس جینا۔“

”نہیں، ایسا نہ کہیں، میرے ہاتھ میں تو صرف گن تھی۔“

”یہ تو بڑے آگے کی بات ہے کہ دوسرے کے ہاتھوں سے اتنا عمدہ نشانہ لگایا جائے“ ایرس

”اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ مسٹر راج ایک زبردست شکاری ہے۔“

”پلیز میری اس قدر تعریف نہ کریں۔“

”کیا مطلب؟“ میری نوکری جاتی رہے گی۔“

”کیوں، ایسی کیا بات ہے۔“

”بس میری درخواست ہے آپ سے۔“

”ارے نہیں، نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے اس لئے یہ بات نہیں کی تھی۔ بات پلیز۔“ جینا جلدی سے بولی اور میں رک گیا۔

”یقین کریں میں نے اس حوالے سے یہ نہیں کہا تھا۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ میڈم، شاید آپ کو میرے بارے میں تفصیل نہیں معلوم۔ میں ہریش مکھرجی کا ملازم ہوں، آپ جانتی ہیں کہ ملازم آقاؤں کی تفریحات میں مداخلت نہیں کرتے۔“  
”آپ ہمارے ساتھ آئیے، آئیے پلیز۔“ جینا ایک دم نرم ہو گئی۔

”آجاؤ، آجاؤ، لڑکے۔ اصل میں جینا کو پرندوں کے شکار سے بڑی دلچسپی ہے۔“

”آپ کیا شکار کریں گی مس جینا۔“ میں نے کہا۔

”بس جو کچھ مل جائے مجھے اس طرف کچھ قازیں نظر آئی تھیں۔“ جینا نے ایک طرف ادا

کیا۔

”آئیے، دیکھیں شاید اس طرف پانی ہو۔“ میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا ا ہمارے ساتھ چل پڑے۔ درحقیقت پہاڑی ٹیلوں کے پیچھے ایک خوشناسی جمیل پھیلی ہوئی تھی مختلف آبی پرندے یہاں نظر آرہے تھے۔ یوگان کا خیال بھی بالکل ٹھیک تھا۔ جمیل پرہم نے کئی بھی دیکھے تھے، جنہیں آسانی سے شکار کیا جاسکتا تھا، ہمیں دیکھتے ہی وہ چھپ گئے۔  
”ہائے کیسی پیاری جگہ ہے۔“ جینا نے ایک معصومانہ حیرت سے چاروں طرف دیکھتے

کہا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے شکار کیلئے بنائی گئی ہے۔“ ایرس مسکرا کر بولا۔

”میں کوشش کرتی ہوں۔“ جینا نے کہا اور گن لے کر تیار ہو گئی۔ پھر اس نے نشانہ لیا اور

دیا لیکن اس کا کوئی نشانہ نہیں تھا، پرندے اڑ گئے اور جینا کھسلائے ہوئے انداز میں مجھے اور ام دیکھنے لگی۔

”کوئی بات نہیں پھر سہی۔“ ایرس نے اس کی ہمت بڑھائی۔

”اصل میں میرا نشانہ اچھا نہیں ہے۔“

”آپ پھر کوشش کیجئے مس جینا۔“ میں نے کہا اور اس نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن

رہی۔

”نہیں بن رہا مجھ سے“ وہ شرمندہ سی ہوتی ہوئی بولی۔

”ارے نہیں کیوں نہیں بنے گا، آخر کسی نہ کسی پرندے سے تو غلطی ہو ہی جائے گی۔“



میں تھی اور اب وہ اسے میرے ہاتھ میں دینا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے سینے سے لگتے ہوئے اس کی کیفیت بدل جاتی ہے اور ادھر مسٹر ایرس تھائی کی ڈیوٹی سنبھال چکے تھے اور ہایت نفاست سے پرندے صاف کر کے رکھے جا رہے تھے، ہم اینگل بدل بدل کر شکار کھیلنے رہے، در کیا مجال ایک بھی کار تو س ضائع ہو گیا ہو۔

پرندوں کا انبار لگتا جا رہا تھا، سب کیلئے حساب لگا لیا گیا تھا، کیونکہ ضرورت سے زیادہ شکار کرنا ہر مناسب بات تھی اور صورتحال یہ تھی کہ میں اور جینا ایرس سے کافی دور ایک آڑ میں پرندوں کی لکھات میں بیٹھے تھے۔ پرندے اب ہوشیار ہو گئے تھے، اس لئے ذرا دیر لگ رہی تھی، یہاں سے ایرس نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ تب جینا نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ کا رانا ہریش کھر جی سے کوئی رشتہ نہیں ہے، مسٹر راج۔“

”نہیں، میں نے آپ سے عرض کیا ناں کہ میں ان کا صرف ملازم ہوں۔“

”لیکن شکل و صورت سے آپ ملازم نہیں معلوم ہوتے۔“

”ملازموں کی شکلیں بھی مختلف ہوتی ہیں مس جینا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بات کہوں ماسٹو تو نہیں کریں گے آپ۔“

”میرا خیال ہے، آپ کی کوئی بات ماسٹو نہیں کی جاسکتی۔“

”میں نے راجوٹی کی آنکھوں میں آپ کیلئے بہت کچھ دیکھا ہے، وہ آپ سے کافی بے تکلف

لڑاتی ہے۔“

”میرے مالک کی بہن ہے، میں اس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہوں۔“

”لیکن اس کا رکھ رکھاؤ آپ کے ساتھ نوکروں کا سا نہیں ہے۔“ جینا نے کہا اور میں نے دل

ادل میں سوچا کہ عورت کی آنکھ بھی قیامت کی آنکھ ہوتی ہے۔ ذرا سی دیر میں سب کچھ بھانپ لیتی

ہے۔ میں نے کہا۔

”یہ اس کی شرافت ہے۔ مس جینا۔“

”میں کچھ اور معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“ جینا نے کہا۔

”کیا؟“

”کیا وہ آپ سے محبت نہیں کرتی؟“ اس سوال پر میں نے چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی، اب

مقدر بے وقوف بھی نہیں رہا تھا، تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد میں بولا۔

”ہم لوگ بڑے وفادار ہوتے ہیں، اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ مالک کی بہنوں سے

”ٹھیک ہے لیکن بات عجیب ہے۔“

”آئیے، ہنس راج ایک بار پھر۔“ جینا نے کہا۔

”ضرور آئیے۔“ میں نے کہا۔ اور اس بار جینا میرے سینے سے لگ گئی، پھر بھلا نشانہ کیوں خالی

جاتا۔ جینا کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔

”خدا کی قسم ڈیڑی، اب یہ سب مجھے اتنا آسان معلوم ہونے لگا ہے۔“

”مسٹر ایرس۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں، ہاں، بولو۔“

”یہ لوگ جو شکار کرنے گئے ہیں ناں، میری ٹخن گوتی ہے کہ شکار کر کے نہیں لائیں گے۔“

”کیوں؟“

”جیسا یہ علاقہ ہے، وہاں شکار کرنے کے لئے ایک مخصوص تکنیک ہوتی ہے، جو شاید ان

سے کسی کو معلوم ہو۔“

”ممکن ہے، لیکن یہ تو جانے والوں کیلئے بڑے شرم کی بات ہوگی۔“

”میری ایک تجویز ہے۔“

”کیا؟“ جینا اور ایرس نے ایک ساتھ کہا۔

”کیوں نہ ہم پرندوں کی اتنی مقدار جمع کر لیں جو سب کیلئے کافی ہو۔“

”کیا یہ ممکن ہے؟“

”کیوں نہیں مس جینا۔“

”ہاں، ہاں واقعی کیوں نہیں، جب دو فاعروں میں ایک درجن پرندے شکار ہو سکتے ہیں،

سب ناممکن تو نہیں ہے۔“

”لیکن اگر انہیں بھی شکار مل گیا تو؟“

”تب بھی یہ گوشت ضائع تو نہیں جائے گا، ہمارے کام آئے گا۔“ میں نے کہا۔

”ویری گڈ..... ویری گڈ۔ تم تو بڑے کام کے آدمی ہو، اس طرح تو ہماری بڑی گڈوا

جائے گی۔ ہم اپنا کام کرتے ہیں اور وہ اپنا ہم لوگ یہ گوشت اس وقت ظاہر کریں گے جب ا

ناکامی کا اعلان کریں گے۔“

”تب پھر تیار ہو جائیے۔“

”میں تیار ہوں۔“ اور اس کے بعد دلچسپ مشغلہ شروع ہو گیا۔ شارٹ گن جینا ہی

میں آپ کو زندہ رکھتی ہیں، لیکن محبت ایک بڑا مقدس جذبہ ہے، بہت دیر میں اس کے بارے میں اچھا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن آپ میری بات کو ذہن نشین کر لیجئے، میں کسی بھی قوت آپ سے محبت کر سکتی ہوں۔“ جینا ضرورت سے زیادہ بے تکلف تھی۔ اس نے کہا۔

”میرا خیال تھا کہ آپ راجوتی سے منسلک ہیں، آپ میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں، جو دوسروں میں نہیں۔ آپ اتنے عمدہ نشانہ باز ہیں، کہ آج اس کا تجربہ ہو گیا ہے، یقیناً آپ سپر ہیں، میں آپ کو کرنے لگی ہوں۔“ بہر طور بڑی سنگین صورتحال تھی، راجوتی کو بھی سنبھالنا ضروری تھا، کیونکہ وہ مال ایک بڑی شخصیت کی مالک تھی اور مجھے اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔

”آپ شاید بہت غلط کر رہی ہیں مس جینا، میں انتہائی بے حقیقت انسان ہوں۔“ دیکھیں انسان اگر انسان ہے تو بے حقیقت نہیں ہوتا۔“

”بہر حال میری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسی حسین لڑکی مجھے پسند کرتی ہے۔“

”اب میں بہت سی باتیں بے تکلفی سے کہہ دوں گی، میں نے تو اس پورے سفر کے دوران پرغور کیا ہے، مسٹر ہنس راج۔ وہ کون ہے، اس پورے گروہ میں جو آپ سے شاندار شخصیت کا ہو۔ میں ایک بات دعوے سے کہوں کہ نواب سلامت کی دونوں لڑکیاں بھی آپ سے متاثر ہوں کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”میرے لیے یہ ایک انوکھا انکشاف ہے۔“ غلط ہو تو گولی مار دیتا۔“

”میں نواب شرمندہ ہونے لگا ہوں۔“

”ایک بات بتائیے مجھے۔“ جینا نے دونوں ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جی۔“

”مجھے قبول کر لو گے؟“

”مس جینا۔“

میں تمہیں پیار کرنے لگی ہوں، تمہیں چاہئے مگر ہوں ہنس راج۔“ جینا نے اپنی بائیں میری ٹاڈال دیں، اور اگر ایس کی تیز آواز نہ سنائی دے جاتی، تو شاید مجھے ایک غلط عمل سے گزرنا

لہاں چلے گئے تم لوگ؟“ جینا پیچھے ہٹ گئی تھی، اس نے مایوس لگا ہوں سے مجھے دیکھا اور

عشق کریں، راجوتی میرے مالک کی بہن ہیں، میں نے تو کبھی خواب میں بھی ان کے بارے میں یہ نہیں سوچا۔“

”کیا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہنس راج؟“

”ہاں، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”کمال ہے۔“

”کیوں آخر کیا کمال ہے اس میں؟“

”ہم لوگوں کا خیال تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ مجھے معاف کرنا میں ذرا بے تکلف لڑکی ہوں، بڑی بے تکلفی سے میں نے یہ الفاظ کہہ دیئے ہیں لیکن ہم لوگ یہ سوچتے رہے ہیں۔“

”ہم لوگ کون۔“

”میں، سلامت بیگ کی بیٹیوں کے بارے میں بھی کہہ رہی ہوں، ہم لوگ آپس میں ارے میں بات کر رہے ہیں۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ جینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں خوشی کی کیا بات ہے؟“

”اب ہم میں سے کوئی بھی آپ سے محبت کر سکتا ہے۔“ جینا نے بے تکلفی سے کہا اور میرا خاموش ہو گیا۔

”آپ کچھ بولیں گے نہیں اس بارے میں۔“

”نہیں میں کچھ نہیں بولنا چاہتا۔“

”میرا خیال ہے، آپ کو اپنے خیالات کا اظہار ضرور کرنا چاہیے، تاکہ ہم لوگ بھی متاثر جائیں۔“

”پلیز مس جینا آپ ایسی بات نہ کریں۔“

”نہیں معافی چاہتی ہوں۔ مسٹر ہنس راج میں اپنی ہی بات کرتی ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیے کیا محبت انسان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کو کپڑے کی ضرورت ہے، آپ کپڑا پہنتے ہیں، آپ روٹی کی ضرورت ہے، آپ روٹی کھاتے ہیں۔ آپ براہ راست اس معاملے میں کیوں نہیں سوچتے۔“ مس جینا، روٹی آپ کی ذات کیلئے ہے، لباس آپ کے بدن کو ڈھکنے کا ذریعہ ہے، یہ دوا

”تم تو شکاری ہو؟“

”یقیناً ہوں، تمہیں شبہ ہے، اس بات پر۔“ ایرس فخر سے سینہ پھلا کر بولا۔ اس وقت اس کی گڈی چڑھی ہوئی تھی۔

”ارے پیارے شکاری اتنے پرندوں کو آسمان سے اتار کر لاؤ، بڑی مہربانی ہوگی تمہاری۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ رائے ہر دیپ سنگھ نے طنز سے لہجہ میں کہا۔

”آپ کیا کہتے ہیں۔“ ایرس نے مرزا سلامت بیک کی طرف رخ کر کے کہا۔

”چھوڑو یار بھوک کے مارے جان نکلی جا رہی ہے اور تم لوگوں کو مذاق کی سوچھی ہے۔ بڑی شرمندی کی بات ہے کہ ہمارے اطراف میں جانور ہم پر قہقہے لگاتے پھر رہے ہیں اور ہم، کچھ بھی نہیں کر پائے۔“ نواب سلامت بیک نے کہا۔

”اگر پرندوں سے دلچسپی ہو تو ہمیں اجازت دے دیجئے۔“ ایرس پھر بولا۔

”یار تجھے کیا ہو گیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”تو پھر جاییے اور کر لائیے شکار بڑی نوازش ہوگی آپ کی۔“ رانا ہریش کھر جی نے بھی طنز یہ نماز میں کہا۔

”آؤ، بیٹے، آؤ تم لوگ بھی آ جاؤ۔“ ایرس نے بھونٹائیوں سے اور جینا سے کہا۔

”بھونٹائیوں کے علاوہ کسی نے اس کے ساتھ جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں ایک طرف کھڑا تھا۔

”یار یہ انوکھا مذاق ہے، میں کہتا ہوں، کھانے کی تیاریاں کرو، اس بھاگ دوڑنے بھوک بری

رج چکا دی ہے، وہ سب ایرس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے، پھر دور سے ایرس کو آتے دیکھ کر سب اہل پڑے۔ بہت سے برتن ساتھ لائے جا رہے تھے۔

”یہ کیا لا رہا ہے۔“ سب سرگوشیوں کے انداز میں بولے۔

”پتہ نہیں۔“ ایرس فخر سے سینہ پھلائے ان کے درمیان پہنچ گیا اور پھر سب لوگ ان پرندوں کو

لہنے کے لئے ٹوٹ پڑے، بلاشبہ یہ ایک جادوئی کارنامہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ سب حیران رہ گئے۔

”یہ..... یہ..... یہ ایرس..... ایرس..... یہ کہاں سے آئے؟“

”شکار کئے ہیں؟“

”کہاں سے..... کب؟“

”ان پہاڑی ٹیلوں کے دوسری جانب جمیل ہے اور..... اور۔“ ایرس نے میری جانب دیکھا

پھر جینا کی طرف پھر بولا۔

بولی۔

”خیر ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

”ڈیڈی خاموش ہو جائیے آپ۔“

جینا نے ایرس کی طرف رخ کر کے کہا اور پرندوں کی ایک ڈار کی طرف نشانہ لگانے لگی۔ اس نے میرے سہارے سے فارگیا، ناکامی کا کیا سوال تھا۔ اسی دوران ایرس بھی ہمارے پار گیا تھا۔

”سمال ہے، تم لوگ تو غضب ڈھا رہے ہو۔“

”میں نے تو سوچا ہے ڈیڈی کہ اس مہم کے دوران میں مسٹر ہنس راج سے بہت کچھ سیکھ گی۔ بہر حال ہم لوگوں نے پرندوں کے اہلکار لگائے تھے، اتنے کہ سب لوگوں کیلئے کافی ہو جائے۔ پھر یوگان کا خیال بالکل درست نکلا، شکاریوں کی ٹولیاں منہ لٹکائے واپس آ گئی تھیں۔ البتہ رانا کھر جی واپس آئے۔ تو ایک چھوٹا سا ہرن ان کے ساتھ تھا اور اس شکار پر وہ شرمندہ تھے لیکن دوسروں کو انہوں نے خالی ہاتھ دیکھا تو قہقہے لگانے لگے۔

”لیجئے، ہنس راج جوتی ہم تو بلاوجہ ہی شرمندہ تھے، یہاں تو سب ہی کی بری حالت ہے۔“

”مگر یہ قصہ کیا ہے؟“ راج جوتی بولی۔

”ہمارا خیال غلط ہے۔ اس علاقے میں شکار ہمارے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔“

”پھر اب کیا ہوگا؟“

”بھئی شکار تو ملا نہیں، اب اپنی اوقات پر ہی آ جایا جائے۔“

”یعنی۔“

”بھوک لگنے لگی ہے، ان لوگوں سے کہو، کھانا تیار کریں۔“

”اور اس ہرن کے بچے کا کیا ہوگا۔“

”اسے رکھ لیتے ہیں، دیکھ، دیکھ کر خوش ہوں گے۔“ ہر دیپ سنگھ نے قہقہہ لگا کر کہا،

لوگ بھی ہنسنے لگے۔

”اس سے بہتر تو تھا کہ پرندوں کا ہی شکار کیا جاتا۔“ ایرس نے اداکاری شروع کر دی۔

”جی ہاں، پرندے آسمان سے ٹپک رہے ہیں کہ آجے مسٹر ایرس اور ہمیں شکار کرنا

کبھی تو عقل کی بات کر لیا کرو۔“

”یار میں تو عقل کی بات ہی کر رہا ہوں، لیکن تم لوگ اپنے آپ کو شکاری کیوں سمجھتے؟

ایک عجیب و غریب زندگی گزر رہی تھی۔ ہم جوؤں کا یہ گروہ نجانے اپنے ذہن میں کیا کیا بے رکھتا تھا، سارے کے سارے ایک ایسے اجنبی سفر پر چل پڑے تھے، جس کے اختتام کا شاید ابھی کوئی اندازہ نہ ہو، بس سفر تھا، جو جاری تھا اور اس کی کوئی حد نہیں تھی لیکن میں ایک ایسا کردار ان کے درمیان جس کا اس سفر سے کوئی مقصد نہیں تھا۔ ہندوؤں کی ایک مہادیوی مجھ پر قابض ہو لی اور اس نے مجھے اپنے مقصد کیلئے کچھ سے کچھ بنا ڈالا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب ہا کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کے ساتھ ایک ماہر شکاری کی حیثیت سے میں اپنا سفر کر رہا تھا اور اس نا میری جمالیاتی حس کی تسکین بھی ہو رہی تھی، لیکن میں غیر مطمئن تھا۔ جینا یا راجوتی دونوں کی ہامیرے لیے اجنبی کردار تھیں اور میرا ذہن اس سے میل نہیں کھاتا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ہا کی دونوں میری محبت میں گرفتار ہیں اور شاید ایک دوسرے سے رقابت بھی محسوس کر رہی ہیں، اور پر کچھ وقت کے بعد میں ان کے درمیان تنازعہ بن سکتا تھا، مگر سچی بات یہ ہے کہ جب اپنے پر غور کرتا، تو ایک عجیب سی کوفت کا احساس ہوتا اور میں یہ محسوس کرتا کہ ان سب کے درمیان ہا ایک بے مقصد کردار ہوں، جو دوسروں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ سفر جاری رہا اور چھوٹے واقعات پیش آتے رہے۔ روپ گجالی نے اس دوران کسی سے بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش لی تھی۔ یہ بھی ایک بچ تھا، کہ سفر میں وہ واحد عورت تھی، جو اپنے آپ کو لئے دیئے رکھتی تھی اور میں نے کسی بھی چیز میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

پتہ نہیں ہریش کھرجی سے اس کے کیسے تعلقات تھے۔ بظاہر تو لگتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن میں نے ان میں بہت زیادہ گھسنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی، پھر ت جب ہم ایک جنگل نما جگہ میں بسیرا کیے ہوئے تھے۔ میں رات کی تنہائیوں کا کے کیمپ سے کافی دور نکل آیا اور ماحول کے خوفناک اور بھیانک سنائے سے اپنا موازنہ لگا۔

”اور میرے ساتھ ایک ماہر شکاری بھی موجود ہے۔“  
 ”کون؟“ نواب سلامت بیک تعجب اور دلچسپی سے بولے۔ رانا ہریش کھرجی نے میری طرف دیکھا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر رخ دوسری جانب بدل لیا۔  
 ”میری بیٹا جینا۔“ ایرس نے کہا۔ اور جینا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ سب لوگ بے یقینی کے عالم میں جینا کو دیکھ رہے تھے اور جینا خواخواہ سر بلند ہو گئی تھی۔ دوسری لڑکیاں بھی حیرانی سے جینا کو دیکھ رہی تھیں، لیکن میں نے دیکھا کہ راجوتی کا چہرہ ست گیا ہے، ویسے اندازہ ہو گیا تھا کہ رانا ہریش کھرجی کو پتہ چل گیا ہے کہ پرندوں کے شکار میں صرف اور صرف میرا ہاتھ ہے۔ بھوٹانی ملازم کھالے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور باقی لوگ اپنے اپنے ٹریلر میں چلے گئے۔ میں بھی یونہی ٹھٹھنے کے انداز میں آگے بڑھ گیا تھا۔

پھر اچانک ہی میری نگاہ ایک ٹریلر کے عقب میں اٹھ گئی۔ میں نے راجوتی کو دیکھ لیا تھا، شاہ وہ کسی سے باتیں کر رہی تھیں، میں نے خود بھی ایک آڑ میں کھڑے ہو کر اسے دیکھا۔ دوسرے آدمی کا تو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کون تھا لیکن راجوتی کہہ رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سارے پرندے جینا نے شکار کیے ہیں۔“

”سب سے بڑی بات تو ان کی تلاش تھی۔“ دوسری آواز سنائی دی۔

”لیکن اتنے پرندوں کا شکار بھی تو معمولی بات نہیں ہے۔“

”بے شک، بے شک۔“

”مگر آپ تو یہاں موجود تھے، انکل۔“

”ہاں..... ہاں..... میں تو یہیں تھا۔“

”تو آپ نے غور نہیں کیا کہ پرندے کیسے شکار کئے گئے۔“

”میں شارٹ گن کے فائرز کی آوازیں سنتا رہا تھا۔“

”کیا ایرس اور جینا کے علاوہ بھی تھا، کوئی ان کے ساتھ۔“

”وہاں، ان کے ساتھ وہی تھا، میرا مطلب ہے تمہارا، ہندوستانی ملازم۔“

”ہنس راج؟“

”شاید، شاید۔“

”ٹھیک۔“ راجوتی نے کہا اور اس کے بعد خاموش ہو گئی۔

دیا گیا۔

کالی دیوی اگر کسی کو مقابلے پر محسوس کرتی تھی، تو وہ صرف میں تھی۔ بہر حال مجھے میرے قبیلے سے جدا کر کے اس سنسار میں ڈال دیا گیا اور نجانے کتنے عرصے تک میں بھٹکتی رہی، میرے راستے بند کر دیئے گئے، پھر میں نے ایک گھما میں بیٹھ کر اپنا گیان شروع کر دیا اور میرے پیروں نے مجھے بتایا کہ مجھے میری فطرتی ضرورت مل جائے گی، پر اس کا ذریعہ ایک مسلمان ہو گا۔ کالی دیوی اس مسلمان کو پیچھے کر کے میرے پاس بھیجے گی اور وہ میرے گیان کے راستے روکے گا اور وہ تم ہو۔ سنو جب تم میری پاس پہنچے، اس لمحے جب میں رانا ہریش کھرچی کے ساتھ جیون بتا رہی تھی، اس سے پہلے بھی میں نے ان ہزاروں سالوں میں بہت سے لوگوں کے ساتھ جیون بتایا ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی فطرتی تک پہنچنے کیلئے ہونا بھی تھا اور راستے بھی چاہئے تھے، سنو ہنس راج میں تمہیں اسی نام سے پکاروں گی، جب کہ مجھے تمہارا پرانا نام بھی معلوم ہے، تمہارا پرانا نام سکندر تھا ناں۔“ اس نے کہا اور میرے دل کو دھماکا سا لگا، میں نے کہا۔

”ہاں، یہی میرا نام ہے اور اس نام سے آج بھی مجھے محبت ہے۔“  
 ”ہمیشہ رہے گی، ہمیشہ رہے گی، کیونکہ یہ نام تمہاری بنیاد ہے۔“  
 ”آہ، مگر مجھ سے دھوکے سے یہ نام چھین لیا گیا۔“  
 ”میں جانتی ہوں۔“

”اور مجھے اس طرح یہ سفر کرتے ہوئے خوشی محسوس نہیں ہوتی جب کہ تم یہ بھی جانتی ہو روپ گجالی کہ کالی دیوی نے مجھے تمہارے پاس اسی مقصد کیلئے بھیجا ہے۔“  
 ”اچھی طرح جانتی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”تو پھر بتاؤ میں کیا کروں، میں خود تمہارے خلاف ایک قدم نہیں اٹھانا چاہتا اور میں نہیں جانتا کہ مجھ جیسا بے کار انسان تم جیسی بڑی قوتوں کیلئے کیا کر سکتا ہے۔“  
 ”ان باتوں کو چھوڑو۔ تم نے کوشش کی تھی کہ تم اپنے آپ کو گم کر دو لیکن بھرپور طریقے سے ایسا کر سکتے، میں تمہیں ترکیب بتا سکتی ہوں، کہ تم کس طرح تم ہو سکتے ہو، ہو سکتے تو کوشش کر لو، حالانکہ جادوگر فی سلسلہ تمہارا پیچھا کر رہی ہے، میں کالی دیوی کی بات کر رہی ہوں۔“  
 ”میں کوشش کروں گا، بھرپور کوشش کروں گا۔ یہ بات بھی تم جانتی ہو، روپ گجالی کہ میں ایک مولیٰ سافنس ہوں، مجھے یہ سب نہیں آتا، پر کوشش کروں گا، بھرپور کوشش کروں گا۔“  
 ”تو سنو، آج کی رات تمہارے کام کیلئے بہت مناسب ہے، یہاں سے اٹھو اور صبح تک سفر

کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے میں جنگل ہی کی مخلوق ہوں اور میری زندگی کا اختتام انہی جنگلوں میں ہو جائے گا۔ ایک چٹان پر میں جا بیٹھا، ہمالیہ کی ترانوں کا یہ علاقہ بدھ مت کے آٹھ سے مزین تھا۔ کہیں، کہیں تاریک خانقاہیں نظر آ جاتی تھیں۔ بدھ مذہب کے بارے میں مجھے ذرا معلومات نہیں تھیں، بس تھوڑی تھوڑی باتیں جانتا تھا۔ لاماؤں اور راہبوں کے بارے میں میرا علم کم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس وقت انہی تمام باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک ہی مجھے ام عقب میں قدموں کی آوازیں سنائی دیں، اور میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

لیکن جو کچھ دیکھا، اسے دیکھ کر پہلی بار میرے اوپر بوکھلاہٹ سی طاری ہو گئی، وہ روپ گجالی تھی، بھرے بھرے بدن اور سحر خیز حسن کے ساتھ، وہ میرے قریب آ رہی تھی۔ میں جلدی سے احرام کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ تو اس نے ایک ہاتھ کسی دیوی کی طرح سیدھا کیا، اور بولی۔  
 ”بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ وہاں سب گہری نیند سو رہے ہیں، آج تک مجھے موقع ہی نہیں ملتا تھا، کہ تم سے بات کروں، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، میں سنبھل گیا تو وہ بولی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں اسی پتھر کی چٹان پر بیٹھ گیا، وہ مجھ سے تھوڑے ہی فاصلے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحات وہ سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔  
 ”تمہارا مرض بھی میرے علم میں آ چکا ہے، تم ذات کے مسلمان ہو۔ تم سے تمہارا دھرم ہمارا نے چھین لیا، غلطی تمہاری تھی۔ تمہاری حسن پرستی تمہیں لے ڈوبی، پر جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ انہی تمہیں بہت سی حقیقتوں سے آشنا کرنا چاہتی ہوں، تمہارے لئے یہ سننا بہت ضروری ہے، میں دل سے روپ گجالی کو دیکھنے لگا، اس نے کہا۔

”ست پروتا۔ سمجھتی ہے کہ اس سنسار میں صرف وہی ہے، جسے کالا گیان ہے، ایسی بات ہو ہے۔ میں روپ گجالی ہوں، کیا ہوں۔ یہ نہ جانو تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔“

ہاں، میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا راستہ بیکار نہ کرو، کالی دیوی چاہتی ہے کہ سنسار میں کوئی کے مقابلے میں نہ آئے، لیکن اسے یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ میں نے صدیوں تپا پاک کی ہے، جس طرح کالی دیوی کی عمر ہزاروں سال ہے، اسی طرح میری عمر بھی اس سے کم نہیں ہے، میں فطرتی تو نہیں رکھتی پر ایک لمبی عمر کیلئے میں نے بڑی تپا پاک کی ہے اور ہزاروں سال سے جیتی ہوں، ایک قبیلہ ہے، جہاں میں دیوی کی طرح پوجی جاتی ہوں۔ میں اس قبیلے سے لے آئی گئی تھی، سب بھی کالی دیوی کی مدد سے کیا گیا، ورنہ مجھ پر قابو پانا اتنا آسان بھی نہیں تھا، میں گھماؤں میں گیان پورا کر رہی تھی کہ مجھ پر جادو کا جال ڈال دیا گیا اور جادوئی عمل سے مجھے میری فطرتی سے

علم نہیں ہے کہ میں تمہیں تمہارے مذہب کی واپسی کا ذریعہ بتا سکوں۔ ہاں، اگر کالی دیوی اور روپ گمبائی کے پھیر سے لگنا چاہتے ہو تو ایک عمل کرلو۔“

”میں سب کچھ کرنا چاہتا ہوں، پدم مہاراج۔“

”اپنے آپ کو دو صدی پیچھے لے جاؤ۔ اور وہاں جو کچھ تم پر بیٹے، اس میں اپنے آپ کو گم کر دو، اب تم صدیوں پہلے کے سنسار میں چلے جاؤ گے، تو کالی دیوی تمہیں تلاش نہیں کر سکے گی۔“ میں نے حیرت سے یہ ساری کہانی سنی، پھر میں نے کہا۔

”مگر میں کیسے جاسکتا ہوں، مہاراج۔“

”میں تمہیں صدیوں پیچھے کے جیون میں پہنچا دوں گا، تم اپنا ایک نام اختیار کر لو، اور مجھے بتا دو، پھر میں تمہیں اگلا کام بتاؤں گا۔“ بہت دنوں بعد دل کو ایک خوشی کا احساس ہوا تھا، مجھے حماد کے نام سے عظیم خان نے ہی مخاطب کیا تھا، کہ اب وہ میرا ساتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ چاہے اسے بھی پچھلے صدیوں کا سفر طے کرنا پڑے اور اس کے بعد ہمیں پورے سو اسیبے ایک قبر میں زندگی گزارنا پڑی تھی اور جب ہم قبر سے نمودار ہوئے، تو ہمارے سامنے ایک عجیب ہی دنیا پڑی ہوئی تھی۔

نجانے کتنے عرصے پہلے کی دنیا، جس کا انداز موجودہ دور کی دنیا سے معمولی سا مختلف تھا، لیکن ہر حال یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ ہم کسی اجنبی ماحول میں ہیں اور پھر ہمیں اس ماحول کے بارے میں طومات حاصل ہونے لگیں۔

ایک علاقے سے ہمیں دو گھوڑے ملے، نجانے کس کے گھوڑے تھے، یہ، بھاگے بھاگے پھر رہے تھے، ہم نے انہیں پکڑ لیا، عظیم خان بہت ہی دلچسپ انسان تھا۔ وہ مجھے حماد کہہ کر مخاطب کرتا تھا، اس عجوبہ کا نام لگلی تھا، جس کے حصول میں ناکام ہونے کے بعد اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی، رحال اس انوکھی دنیا کے بارے میں یہ سوچتا کہ یہ بہت عرصے پہلے کی دنیا ہے، بڑا عجیب لگتا تھا، ان جو کچھ ہمیں نظر آ رہا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ذرا الگ ہی ماحول ہے۔ عظیم خان نے کام کا آدمی تھا، تھوڑے ہی وقت میں اس نے معلوم کر لیا کہ یہ ایک قبائلی علاقہ ہے، اور یہاں یہ کی اجارہ داری چلتی ہے۔

شمانیہ کی آبادی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، اور وہیں کے رہنے والے وہیں کے لوگوں سے بدھ رہتے تھے، کچھ عجیب سا گڑبڑ ماحول تھا، ہم آوارہ گردی کرتے ہوئے ایک بستی میں پہنچ گئے، ہستی کے بارے میں ہم نے اس دھوکے سے اندازہ لگایا تھا، جو ہمیں بہت دور سے نظر آیا تھا۔ ہم دھوکے کی نوعیت کا اندازہ لگانا چاہتے تھے، اور ظاہر ہے، دھواں بستیوں سے ہی اٹھتا ہے، بستی جو

کرتے رہو، صبح کو تم جہاں پہنچو گے، وہاں تمہیں ایک پرانی خانقاہ ملے گی، خانقاہ میں ایک راہب موجود ہے، وہ تمہاری پھر پور سانسہ کرے گا، جو کچھ وہ تمہیں بتائے گا، وہی تمہارے آگے کے جیون کیلئے کارآمد ہے، من چاہے تو میری بات پر عمل کر لو اور اگر نہ من چاہے تو جو تمہاری مرضی ہو، وہ کرو۔ میں اپنا کام کر رہی ہوں، یہ لوگ اسی جانب بڑھ رہے ہیں، جہاں میں انہیں لے جانا چاہتی ہوں، ان سب کے من میں دولت ناچ رہی ہے، دولت انہیں ملے گی، لیکن بڑی مشکلوں کے بعد۔ روپ گمبائی مزید الفظ کہے بغیر واپس مڑی، اور کچھ لمحوں کے بعد میری نگاہوں سے اوچھل ہو گئی۔

لیکن میرے دل و دماغ میں جو پہلے عجیب گئی تھی، وہ میرے لئے ناقابل برداشت تھی، کیا کر دوں، کیا نہ کر دوں، سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا اور اس کے بعد ایک دیوانگی ہی کے سے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تاریک راستوں پر چل پڑا۔ ہر بات سے بے نیاز ہر احساس بے نیاز راستہ کس طرح کتنا مجھے معلوم نہیں تھا، صبح کو جب میں چل چل کر محکم سے دور ہو گیا تھا، وہ لوٹی خانقاہ نظر آئی، جہاں پہنچ کر میں دروازے گر پڑا تھا۔

پھر جس شخص نے مجھے اٹھایا، اس کا نام پدم سرگونا شیوا تھا، پدم سرگونا شیوا سفید بالوں والا ایک بوڑھا آدمی تھا، لیکن کافی طاقتور تھا۔ تین دن تک وہ میری مدد کرتا رہا، اس دوران ایک اور شخص کو گھر میں لے وہاں دیکھا، جو بڑی پیاری سی شخصیت کا مالک تھا، اور اس نے میری بڑی خدمت کی تھی جب میری ہوش و حواس درست ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔

”تم کون ہو بھائی؟“

”میرا نام عظیم خان ہے۔“ بہت عرصے کے بعد ایک مسلمان نام سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی حالانکہ رانا ہریش کمر جی کے گروہ میں نواب سلامت بیگ بھی موجود تھے، لیکن وہاں کی صورتحال بڑی تکلیف دہ ہو گئی تھی، پدم سرگونا شیوا میرا علاج کر رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جب میں اس خانقاہ کے باہر پہنچا تو شدید بخار میں مبتلا تھا، عظیم خان نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

”بس یوں سمجھو..... کہ میرا منی بھی ایک انوکھی کہانی ہے، عاشق تھا، خودکشی کر لی اور دریا سا سونا گاچی میں کود پڑا۔ سونا گاچی مجھے یہاں تک بہا کر لے آئی اور یہاں مجھے پدم سرگونا شیوا نے اپنا چیلہ بنا لیا، لیکن اس نے مجھ سے میرا مذہب نہیں چھینا، بلکہ مجھے تعلیم دی کہ زندگی کھونے کی چیز نیک ہے، اسے پانے کیلئے اپنے آپ کو کسی حوالے کر دو، عظیم خان بڑا خوش مزاج شخص تھا، میری اس کو دوستی ہو گئی، اور میں نے اسے اپنے بارے میں بتا دیا۔ تب ایک دن پدم سرگونا شیوا نے کہا۔

”ہاں، تمہاری کہانی مجھے پہلے بھی معلوم ہو چکی ہے، تم نے اپنا دھرم کھو دیا ہے، میرے پاس انا

ہاتی ہے، وہ ان ہی پر اسرار دادیوں میں گزر جائے گی، یہ وادیاں ہمیں زندہ واپس جانے کی ہالت کبھی نہیں دیں گی، لیکن میں اس قدر ناامید نہیں تھا، میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، اگر تو مر گیا، تو تیری لاش تو میں اٹھا کر جدید آبادیوں تک نہیں لے جاسکتا لیکن وہ دھڑے سے کرتا ہوں کہ لوگوں کو اکٹھا کر کے کسی مناسب جگہ تیری یادگار ضرور بنادوں گا اور ان خود اپنے ہاتھوں سے پھول چڑھاؤں گا۔“

”خیر ایک بات میں بھی کہتا ہوں، تجھ سے اگر واقعی میں مرنے لگا تو اکیلا نہیں مروں گا، کوئی نہ لایا کی ترکیب ضرور نکال لوں گا کہ تو بھی مرے ساتھ ہی مر جائے۔“

میں ہنس کر خاموش ہو گیا تھا، واقعی عظیم خان کا ساتھ چھوڑنا مرے لیے بھی ممکن نہیں تھا، ہم ہستی سے چل پڑے، ہمارے گھوڑے ہمارا ساتھ دے رہے تھے، شانہ کے نقوش کی ترتیب جیسا میں پہلے بتا چکا ہوں، ہو چکی تھی، تقریباً چھ دن اور چھ راتوں کا سفر طے کر کے آخر کار ہم ایک خوبصورت جگہ پہنچے، یہ ایسی پہاڑی چٹانیں تھیں، جو آگے جا کر ایک دم ختم ہو جاتی تھیں، اور ان کے خفاک گہرائیاں تھیں، اور ان گہرائیوں میں شانہ آباد تھا۔ شانہ کی پہچان یہ تھی، کہ پتھروں کی بڑی عمارتیں بنی ہوئی تھیں، اور ان عمارتوں کے درمیان انسان ننھے ننھے کھلونوں کی مانند چلتے اور عمل کرتے نظر آتے تھے، یہاں رک کر ہم بہت دیر تک اس عجیب و غریب مملکت کو دیکھتے، جس کا نام شانہ تھا، ہم یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے، حالانکہ راستے میں نے شانہ کے لباس پہن لیے تھے، اور اپنی رائفلوں اور ایمونیشن کے ساتھ مکمل طور پر شانہ بن گئے، لیکن اس کے باوجود یہاں کا مکمل جائزہ لینے کے بعد ہی ہم ان کے درمیان جاسکتے تھے، لیکن ابھی خطرہ ہماری زندگیوں ختم کر سکتا تھا۔

اب اسے تقدیر کی رہنمائی کہا جائے یا پھر تدبیر کی کارگیری، کہ ہم ان لوگوں میں پوری طرح گمے تھے اور ہستی کے کسی بھی شخص نے ہماری جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی، ہماری یہاں پہلا دن رات بھی گزر گئی، لیکن کوئی کارروائی وجود میں نہیں آئی، جو مشکلات کا باعث ہوئی، جب ہمیں وہ ہو گیا کہ ہماری شخصیت یہاں بے دارغ ہے، تو ہم نے شانہ کی آبادی کا جائزہ لینا شروع کر دیا، ہمیں یہاں کے ہمارے میں مکمل معلومات درکار تھیں اور سب سے پہلے کوئی ایسا ٹھکانہ کرنا تھا، جو ہمارے لیے قیام گاہ کی جگہ مہیا کر دے، بڑی احتیاط کے ساتھ ہم نے اس پوری فکر لگایا۔

میں نے دیکھا کہ یہاں کے رہنے والے ہمارے جیسے نقوش ہی رکھتے ہیں، شاید یہ ہی بات

کوئی بھی تھی، شاید نشیب میں تھی، طویل فاصلہ کرنے کے بعد ہمیں وہ ہستی نظر آئی، اور ہم نے وہاں ایک جگہ پوشیدہ ہو کر وہاں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ڈھلاؤں پر رکھتے بکھرے ہوئے تھے، بھیڑیں اور بکریاں بھی نظر آ رہی تھیں، ہستی معمولات سے بھرپور زندگی سے قریب اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ہستی کے پہلے مکان کے قریب پہنچ گئے، ہستی والے اچھی فطرت کے لوگ تھے، انہوں نے مہمانوں کو مہمانوں کی حیثیت سے خوش آمدید کہا، چھوٹے چھوٹے جمونہڑوں پر مشتمل یہ ہستی زیادہ بڑی نہیں تھی، ہم نے ان سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اور ہمیں یہ معلوم ہوا کہ شانہ والے یہاں نہیں ہوتے، شانہ تو بہت آگے ڈھلاؤں میں آباد ہے، بہر حال ساری باتیں اپنی جگہ یہاں تک کافی کر ہمیں بڑے سکون کا احساس ہوا تھا، مہمان نواز لوگ اور پرسکون ماحول ہستی کے سردار کا نام لگا تھا، مہمانوں کے ہمارے میں پوچھا تو ماگنے اور ادھر ادھر دیکھ کر خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”ہماری ہستی کا کوئی بھی شخص شانہ کی برائیوں میں نہ ایک لفظ سننا پسند کرے گا اور نہ ہی تم سے کچھ کہنا، لیکن میں تمہیں بتاؤں، ہم شانہ سے خوفزدہ ہیں۔ ابھی تم یہ بات نہیں جانتے کہ بے شمار شانہ یہاں مقامی لوگوں کی حیثیت سے آباد ہیں اور یہاں سے ٹولیاں بن بن کر جاتی ہیں اور بستیوں میں جا ہی جاتی ہیں، ہم ان سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ ہمارے آدمیوں کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، دل سے کوئی ان کے ساتھ نہیں، لیکن سب کو اپنی زندگی پسند ہے۔ تھوڑے دن پہلے کی بات ہے کہ سوکانہ نامی ہستی میں جا ہی پھیلی تھی، اور اب وہ ہستی غیر آباد ہے، جو شخص جا ہی پھیلانے کا سبب بنا تھا، اب وہ شانہ میں رہتا ہے، انہوں نے بے شمار مقامی لوگوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ انہیں ڈرا دھمکا کر یا انہیں لالچ دے کر انہوں نے اپنی مدد پر آمادہ کیا ہے۔ شانہ جو ہتھیار استعمال کرتے ہیں، وہ آگ اور دھماکوں کے ہتھیار ہیں، ان ہتھیاروں کو وہ آسمان کا جادو کہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر شانہ سے کوئی مقابلہ کرنے کے بارے میں سوچے تو آسمان کا جادو اسے جاہ کر دیتا ہے، یہ سب سے خراب مسئلہ ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔“ ہمیں بہت سی صورت حال کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا، یہاں ایک بہت ہی بہتر بات ہوئی، وہ یہ کہ ہمیں شانہ کے لباس مل گئے اور یہ لباس ہم نے اپنی جسامت کے مطابق محفوظ کر لیے تاکہ مناسب موقع پر وہ ہمارے کام آجائیں، پھر کافی دن تک ہم یہاں رہے، وہاں جو زیغائن کی خواہش کے مطابق سارا انتظام کر کے آئے تھے، اس لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ آخر کار یہاں کافی قیام کے بعد اور شانہ کا نقشہ مرتب کر کے ہم لوگ وہاں سے آگے چل پڑے۔ عظیم خان اب بہت زیادہ شرارتیں کرنے لگا تھا، کلی بار اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا، کہ اب زندگی کا تو کوئی امکان نہیں ہے، تھوڑی بہت زندگی

”تو پھر تھوڑا وقت تو میرے پاس گزار دو، تمہارا گھر کہاں ہے؟“  
 ”نہیں بڑی اماں، ہمارا کوئی گھر نہیں ہے۔“  
 ”ارے واقعی؟ اگر ایسا ہے تو کیا یہ جمونپڑا تمہارے لئے کارآمد نہیں ہوگا؟“  
 ”نہیں بڑی اماں جمونپڑا تمہارا ہے۔“

”بڑی اماں، بڑی اماں کئے جا رہے ہو، حالانکہ جب میں نے تم سے سامان اٹھانے کیلئے منع کیا تھا، تو تم نے کہا تھا کہ بیٹا کہہ رہی ہوں، میں تمہیں اور اس کے بعد سامان تمہارا سر پر رکھوانے سے گریز کر رہی ہوں۔“

”کیا کیا ہے میں نے؟“ عظیم بولا۔  
 ”تو اب بڑی اماں کہہ کر تم جمونپڑے کو میرا کہہ رہے ہو۔“  
 ”لو بھئی یہ تو بہت برا ہوا۔“  
 ”کیوں، کیا ہوا؟“

”بڑی اماں کو ہماری وجہ سے تکلیف ہوگی۔“

”بیٹا تمہاری وجہ سے مجھے یہی تکلیف ہو سکتی ہے، جو اس وقت ہوئی، یعنی یہ کہ میں اتنا بوجھ مانے سے بچ گئی، میرے دو جوان بیٹے ہوں، تو میری زندگی بٹ جائے گی۔“  
 ”مگر بڑی اماں۔“

”اگر مگر کچھ نہیں، اب تم میرے پاس ہی رہو گے، میرے پاس سب کچھ ہے، کھانے پینے کی ہر شے کی نہیں ہے، بڑی اچھی زمینیں ہیں میری، اس سے سبزیاں آتی ہیں، لیکن بس تمہا ہوں، دنیا میں، بیٹا تھا، جس کا نام نورا تھا، اور بس اس کے بعد نورا دنیا سے رخصت ہو گیا اور میری زندگی میں کچھ رہا۔ اب اگر تقدیر نے مجھے دو دو بیٹے عطا کر دیئے ہیں، تو کم از کم میرے ساتھ یہ سلوک تو نہ کرو۔“  
 ”میں خان نے میری طرف دیکھ کر مجھے آنکھ ماری اور بولا۔“

”یہ تو بہت بری بات ہوگی، بڑی اماں سمجھیں گی کہ ہم۔“  
 ”کچھ نہیں سمجھوں گی میں کچھ نہیں کہوں گی، تم بس میرا دل نہ توڑو۔“  
 ”یوں ہماری یہ مشکل بھی حل ہوگئی۔“

اور بوڑھی عورت عظیم خان کو نورا کہہ کر مخاطب کرنے لگی۔ وہ ہم دونوں سے بہت متاثر نظر آتی اور اس نے ہم سے اپنے بیٹے کے بارے میں بہت سی باتیں کیں اور اس نے مجھے شال کہہ کر لب کیا، لیکن نام کوئی بھی ہو، ہمیں تو اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ بوڑھی کی تھوڑی سی خدمت ہو جاتی تو

تھی، جس کی وجہ سے ہماری طرف کسی کی توجہ نہیں گئی تھی، اینٹوں کے مکانات میں زندگی گزارنا انداز چند ہی لمحوں میں اپنی وضاحت کر دیتا تھا، ہم کسی ایسے محل کی تلاش میں تھے، جو ہمارے بہتری مہیا کرے، پھر عظیم خان نے یہاں اپنی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ بوڑھی عورت شیزالیہ اپنا سا اٹھائے جا رہی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، عظیم خان نے جلدی سے آگے بڑھ کر شیزالیہ کو اور اس کا سامان اپنے شانوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

”بڑی اماں۔ یہ تو بہت بری بات ہے کہ ہم جیسے جوانوں کا سامنا ہونے کے باوجود تم سامان خود اٹھائے جا رہی ہو۔“ بوڑھی نے ہمیں حیرت سے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔  
 ”کون ہو بیٹا تم؟“

”لو بڑی اماں بیٹا کہنے کے بعد پوچھ رہی ہو، کون ہیں ہم۔“ عظیم کی چرب زبانی پر میں دیا۔

بوڑھی عورت کے چہرے پر ایسے آثار نظر آئے، جیسے وہ رونے والی ہو۔ ”عظیم نے ا بڑھتے ہوئے کہا۔“

”اپنا گھر بتاؤ، تاکہ ہم یہ سامان تمہارے گھر پہنچا دیں۔“  
 ”میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ۔“ اور ہم بوڑھی کا سامان لئے ہوئے ایک جمونے سے جمونپڑے میں پہنچ گئے۔ جس کا دروازہ بند نہیں تھا، سامان اندر رکھتے عظیم خان نے کہا۔  
 ”اماں جب بھی کوئی کام ہو ہمیں آواز دے لیتا۔“

”سنو بیٹا کہاں جا رہے ہو؟“

”بس اماں چلتے ہیں۔“

”بیٹا ایسے نہ جاؤ، میرے ساتھ کچھ وقت گزار لو، آج تم نے میرے دل میں نجبائے دے ہوئے دکھ تازہ کر دیئے ہیں۔“ عظیم خان جمونپڑی کی زمین پر بیٹھ گیا، اور بولا۔  
 ”بڑی اماں تم دکھی نہ ہو، یقین کرو، جب ہم نے تمہیں سامان اٹھا کر لڑکھڑاتے قدمور جاتے ہوئے دیکھا، تو ہمارے دل نے کہا۔“

”لعنت ہے ہماری جوانی پر، جو تمہارے کام نہ آ سکے۔ اپنے دل سے ہر دکھ نکال دو۔“  
 ”ہمیں آواز دو گی، ہم تمہارے پاس آ جائیں گے۔“

”بیٹا شانیہ ہو۔“

”ہاں، بڑی اماں۔“



وہ الگ منافع کی بات ہے۔ ظاہر ہے دعائیں بھی مل سکتی تھیں، یہ ساری صورتحال خاصی دلچسپ تھی اور ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کر رہے تھے، کہ شانیہ کا سربراہ کون ہے، اور کس طرح وہ ان لوگوں کو کنٹرول کرتا تھا، ہماری سمجھ میں کافی دن تک یہ بات نہیں آ سکی تھی اور ہم مسلسل یہ جائزہ لینے کی کوششوں میں مصروف تھے، اب چونکہ یہاں ہمارا ایک مقام بن گیا تھا اور بوڑھی کے ساتھ رہتے ہوئے کسی نے بھی ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا، البتہ ہستی کا چکر لگاتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ پوری آبادی میں بھلیاں لگی ہوئی ہیں اور ان بھٹیوں پر بہترین ہتھیار تیار کیے جا رہے ہیں، یہ ہتھیار لازمی بات تھی، اس جنگ کے لیے تیار کئے جا رہے ہیں، جیو یہ لوگ لڑنے والے تھے، ہم ان لوگوں کی مہارت کا اچھی طرح جائزہ لے رہے تھے، اور اس تشویش کا فکار بھی تھے کہ بے چارے آبادیوں والے کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوتے جا رہے ہیں اور انہیں زیادہ تر اس مصیبت کا علم نہیں ہے۔ بہر حال اس کے بعد عظیم خان نے کہا۔

”کیا خیال ہے، حماد شانیہ کی یہ آبادی تو بڑی سنگین نوعیت کی حامل ہے، ہم کیوں نہ آگے بڑھ کر شانیہ کا جائزہ لیں۔“

”مطلب۔“

”مطلب یہ ہے کہ ہم اچھی طرح شانیہ کو دیکھیں اور اس پر غور کریں کہ یہاں کیا کیا ہے؟“

”بات بہتر ہے اور تجویز عمدہ میں سمجھتا ہوں، ہمیں اس سے خاصی معلومات ہو جائیں گی۔“

”لیکن شرط یہ ہے کہ بڑے خفیہ طور پر یہ کام کیا جائے اور ایک طرح سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے آپ کو کسی بھی مشکل میں مضمحل نہ لایا جائے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

”اچھا آئیڈیا ہے۔“

”تو پھر اب کیا کہتے ہو؟“

”میں سمجھتا ہوں ہمیں چلنا چاہیے۔“ اور پھر ہم دونوں نے تیاریاں کر لیں، بڑی اماں یعنی شیزالیہ سے ہم نے اجازت مانگی، بوڑھی واقعی ہم سے محبت سے ملتی تھی، اس نے کہا۔

”تم جلدی واپس آ جانا، اب جب تم نے مجھے محبت دے دی ہے، تو اس عمر میں مجھ سے یہ محبت چھیننے کی بات نہ کرنا۔“ بہر حال اس کے بعد ہم لوگوں نے مختصر تیاریاں کیں اور پھر وہاں سے چل پڑے۔ پھر ہم کافی طویل فاصلہ طے کر کے شانیہ سے دور نکل آئے تھے، شانیہ کی آبادی ہمارے لیے بڑی حیرتوں کی باعث تھی۔

اور ہم اس کے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے، بلند یوں پر سے نیچے اترتے ہوئے دور دور تک

گلابوں کی بہار چھائی ہوئی تھی۔ بادلوں کے سائے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گلاب کے پھولوں کی خوشبو دور دور تک منتشر کر رہے تھے اور ہم اسے وادی گلاب کہہ سکتے تھے، بڑی حسین جگہ تھی اور ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان علاقوں میں آنے کے بعد طبیعت پر ایک عجیب سا سحر طاری ہو گیا۔

نا۔ سفر کے پہلے مرحلے میں ہم اس پھولوں کی وادی سے گزرے۔ اس کے بعد ہمارا واسطہ ان گھنے جنگلوں سے پڑا جن کے سائے روشنی کو زمین تک پہنچنے دیتے تھے، ان کی شاخیں آپس میں الجھی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے اندھیرا پھیلا رہتا تھا اور اس جگہ گھوڑوں کا سفر کرنے پر کافی پریشانی ہو رہی تھی اور وہ جگہ جگہ رک جاتے تھے، آگے چل کر یہ جنگل اور خوفناک گئے تھے، درختوں کی شاخوں سے لمبے لمبے سانپ لپٹے رہتے، جن سے بچ کر چلنا دن کی روشنی میں لا دشوار تھا، رات کو یہ سفر اور بھی خطرناک ہو گیا، لیکن اب چونکہ یہاں آگئے تھے۔ اس لئے واپس لائیں جاسکتے تھے۔ البتہ ان علاقوں میں قیام کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی لمحہ موت کا لمحہ بن سکتا۔ البتہ یہی خوش بختی تھی کہ جنگلوں میں درندے نہیں تھے اور یقینی طور پر ان کے یہاں موجود نہ

نے کی وجہ یہ خوفناک حشرات الارض تھے، بہر حال اس سنسنی خیز وادی کا اختتام اس وقت ہوا، جب بج بلند ہو گیا۔ رات کو ہم سفر جاری رکھتے پر مجبور تھے۔ لیکن جنگلوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ہمیں اس ہوا کہ اب ہم ممکن سے بری طرح چور ہو گئے ہیں، یہاں کا سفر بے حد سنسنی خیز ہو گیا تھا۔ جنگل کے سرے پر تا حد نگاہ دیران پہاڑیاں بکھری ہوئی تھیں، اونچی نیچی بھورے رنگ کی ہیں جگہ جگہ سر جوڑے کھڑی ہوئی تھیں، اور ان کے درمیان کوئی ایسی چمکندہ نظر نہیں آتی تھی کہ دیکھ کر احساس ہوا کہ ان راستوں پر بھی انسانی قدم آچکے تھے، یا ان پر سفر ہوتا رہا۔ حشرات لہ یہاں بھی پہاڑوں کے درمیان موجود تھے اور چٹانوں کے درمیان ریگتے پھر رہے تھے، چٹانچہ لے ایک ایسی جگہ منتخب کی، جہاں آس پاس کوئی چٹان نہیں تھی۔

البتہ فاصلے پر بہت بڑی چٹانیں نظر آ رہی تھیں، یہاں پہنچنے کے بعد ہم گھوڑوں سے اتر پڑے، انے گھوڑوں کی پشت سے وہ سامان نیچے اتار لیا، جسے ہم ساتھ لے کر آئے تھے، گھوڑوں کے چارہ اور پانی رکھنے کے بعد ہم دونوں لمبے لمبے لیٹ گئے، اس سفر کی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اران میں نے یا عظیم خان نے آپس میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔

”اصل میں یہ سب ہماری توقع کے خلاف تھا۔“

پھولوں کی وادی کو یا ان جنگلوں کی طرف آنے کی دعوت دیتی تھی۔

”جنگل بہت گہنا تھا، اور بہت خوفناک بھی۔“

”کیوں؟“

”بس، مجھے زندگی کی خوشیوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہائے لیلیٰ کیا سوچتی ہوگی، تو اپنے دل کا ایک محبوب ملا، تو ایسا مکمل، کہ دوسروں کے قبضے میں زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے، مری ہے۔ انسان کبھی، کبھی اپنی مرضی سے جی بھی نہیں سکتا، فائرنگ کی آواز اچھی خاصی تیز ہو گئی۔ اچانک ہی عظیم خان چوٹا، اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

”ارے تم۔“

”اور ایکٹنگ کر رہے ہو، اچھی نہیں لگ رہی۔“

”ایکٹنگ کہو گے تم اسے، زندگی کے سب سے بڑے دکھ میں مبتلا ہوں، آہ، لیلیا، ارے باپ، یہ گولیاں کہیں ہماری جانب نہ رخ کر لیں۔“

”آؤ دیکھیں۔“

”میری نظر کمزور ہو گئی ہے، اور مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ عظیم خان نے کہا، لیکن میں اب اس نہ آرائی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔

”ارے، ارے، اب کیا اس بھرے جنگل میں کیا تنہا چھوڑ جانے کا ارادہ ہے، حالانکہ فحش بھوکا ہوں۔“

میں نے عظیم خان کی کوئی بات نہیں سنی، لیکن سامان میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ عظیم خان میرا ہب سمجھ گیا تھا، چنانچہ کراہتا ہوا اٹھا اور خود بھی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ہم تیزی سے اس پہاڑی کی جانب چل پڑے، جدھر سے گولیاں پلنے کی آوازیں آرہی تھیں، ابھی ہم نے آدھا فاصلہ بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک پہاڑوں کے رختوں سے ایک سر بلند ہوا اور ہم لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ما جانب سے رائل کی گولیوں نے ہمارا استقبال کیا، ایک گولی عظیم خان کے پاؤں سے لکل گئی۔

میں چونکہ اس سے پہلے اس سر کو دیکھ چکا تھا، اس لئے میں نے اپنا رخ بدل لیا تھا، عظیم خان مجھ کو میری جانب لپکا، لیکن دوسری جانب ایک آوی نہیں تھا، بلکہ ان کی تعداد کافی تھی۔ انہوں نے پہاڑی چٹانوں پر سے پتھروں کی آڑ لے کر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ اور ہمارے ٹوڑوں کی پشتوں پر بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا، لیکن اس وقت ہم نہایت مہارت سے ہبہ سواری اہرہ کر رہے تھے۔ بار بار ہمیں گھوڑوں کی پشتوں پر جھکنا پڑتا اور پھر سیدھے ہو کر ایسی چٹانوں کی آٹھ کرنے لگتے، جو فی الحال ان گولیوں سے محفوظ کر لیں۔

”آخر کار ہم نے اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔“

لیکن اب ہم اس دادی کو اس لئے خطرناک کہہ سکتے تھے، کہ وہ ایک سرخ دھوکہ تھا اور اس دھوکے کو کھا کر آگے کا سفر جان لیوا بھی ہو سکتا تھا اور اس دوران ہم نے آپس میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ بہر حال اب آنکھیں کھلی رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ شاید اس جنگل میں داخل ہونے کے بجائے دس بیس میل لمبا راستہ منتخب کر لیا جاتا، تو زیادہ بہتر ہوتا۔ آگے چل کر یہ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ جنگل میں جانوروں سے بڑھ بھڑ ہو سکتی ہے اور بہر حال یہ بات ہمارے لئے زیادہ خطرناک ہو سکتی تھی۔ عظیم خان تو بالکل نیم مردہ حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میری اپنی حالت بھی بہر حال نہایت بہتر نہیں تھی۔

چنانچہ میں نے صاف ستھری جگہ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس وقت عظیم خان کی کیفیت کیا ہے، لیکن بہر حال تھوڑی دیر تک میں رہا۔ پھر آٹھ خود بخود کھل گئی تھی۔ میں نے ایک نگاہ عظیم خان کو دیکھا، وہ بے سدھ سو رہا تھا، ہم اب تک کچھ کھایا بھی نہیں تھا، یہ جگہ اتنی خطرناک تھی، کہ کھانے پینے کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا تھا، گھوڑوں نے البتہ کھائی لیا تھا۔

ایک بار پھر میں نے عظیم خان کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ جاگ اٹھے، تو کارروائی کی جاسکتی ہے، بہت دیر سے کچھ کھایا نہیں تھا اور جب تھوڑی سی تھکن دور ہو گئی تو بھوک رہی تھی۔ بہر حال عظیم خان کے اعزاز سے یوں لگتا تھا، جیسے وہ بہت زیادہ تھکا ہوا ہے اور نیند میں قدر مست ہے کہ کھانے کے بارے میں نہیں سوچے گا۔

بہر حال زیادہ دیر نہیں گزری تھی، تھوڑا بہت کھانا پینا کر کے میں سونے کیلئے لیٹ گیا اچانک ہی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں اور میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ یہاں بھی مصیبتیں تعاقب کر رہی ہیں۔ میں نے دل میں سوچا۔ عظیم خان کی بھی یا تو نیند پوری ہو گئی تھی، یا پھر فائرنگ کی وجہ سے کھل گئی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے بڑے عجیب سے اعزاز میں پوچھا۔

”آگے؟“

”کون؟“

”پٹانے والے“ وہ مخصوص انداز میں بولا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

”ہاں تمہاری شادی کی خوشی میں فائرنگ ہو رہی ہے۔“

”مگر میں ناشاد ہوں۔“ وہ معمول لہجے میں بولا۔

خاصا فاصلہ طے ہو گیا، گولیاں چلانے والوں کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔

اتنا فائر کرنے کے بعد تو وہ ہم کیا ہمارے گھوڑوں کو بھی ہلاک کر سکتے تھے، لیکن ہم ان سے بچتے رہے، البتہ تھوڑے فاصلے پر اب ہمیں ایک ایسی چٹان نظر آرہی تھی، جہاں ڈھلان بکھر ہوئے تھے اور ہم یہاں پناہ لے سکتے تھے، یہاں صورت حال کچھ اور نظر آئی، ہم نے دیکھا کہ کو زمین پر پڑا ہوا ہے اور اس کے چاروں طرف بہت سے گھوڑے سوار نظر آرہے ہیں، یہ گھوڑے شامی ہی تھے۔ خاص قسم کے لباس میں لمبوس جس شخص کے گرد وہ کھڑے تھے۔ وہ پتہ نہیں کون تھا۔ بات بھی ذرا تعجب خیز تھی کہ انہوں نے شامیوں کے لباس میں ہونے کے باوجود ہم پر گولیاں چلا تھیں۔

بہر حال ان لوگوں نے ہمیں دیکھا اور پھر اچانک ان لوگوں نے بھی ہم پر فائرنگ شروع دی۔

بڑی عجیب بات تھی اور کیا یہ لوگ شامی نہیں ہیں، اگر شامی ہیں تو کیا کسی مختلف گروہ سے تھارکتے ہیں، کیونکہ ہماری طرف ہونے والی فائرنگ آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی، اس مجبوری تھی کہ اب ہم اپنی بندوقیں اتار لیں، چنانچہ مجھ سے پہلے عظیم خان نے گولی چلائی تھی اور ام کامیاب نشانہ لگایا تھا، بلند چٹان پر سے ہمارا نشانہ لگانے والا شخص اوندھے منہ نیچے آ رہا۔

اتفاق کی بات یہ تھی کہ جو شخص زمین پر پڑا ہوا تھا، اس کے قریب ہی اوپر سے گرنے والا آیا تھا، اچانک ہی زمین پر پڑے ہوئے شخص نے اس زخمی شخص پر جھپٹا مارا اور پھر دو فائر ہوئے زخمی شخص جو عظیم خان کی گولی سے زخمی ہوا تھا، اچھل کر دور جا گرا۔ یہ فائر یقینی طور پر نیچے کھڑے ہوئے شخص نے کیے تھے، دوسرے لوگوں نے اس کی طرف رائفلوں کے رخ کر لئے، مجبوری تھی۔

چنانچہ ہم لوگوں نے گولیاں برسانی شروع کر دیں، جس کی وجہ سے وہ زمین پر پڑے۔ شخص پر فائر نہ کر سکے، انہوں نے اس شخص کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی، مگر سات، آٹھ افراد ان میں سے پانچ ہماری گولیوں کا شکار ہو گئے تھے، وہ بہ مشکل تمام گھوڑوں پر سوار ہو سکے تھے، انہوں نے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا دیا۔

انہوں نے جس سمت کا رخ کیا تھا، ہم نے اس طرف دیکھ لیا تھا، اب ان کے جانے کے یہ ضروری تھا کہ ہم اس زمین پر پڑے ہوئے شخص کا جائزہ لے لیں، چنانچہ ہم آگے بڑھے، اس شخص کے سر پر پہنچ گئے۔ جس نے گولی چلا کر اس شخص کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن قریب پہنچ کر ہم نے

فحص کی صورت دیکھی تو ہم حیرت سے چونک پڑے۔

وہ مرد نہیں، عورت تھی۔ اس کا پورا جسم کچھڑ میں لپٹا ہوا تھا، چہرے پر بھی چکنی مٹی کی موٹی تہہ چڑھی ہوئی تھی، صرف آنکھیں صاف تھیں، سر کے بال بھی مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے اور یہ مٹی خشک ہو گئی تھی۔ شاید وہ کسی دلدل میں گر پڑی تھی۔ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا، یا پھر ممکن ہے، اسے دلدل میں ڈبو کر باہر نکالا گیا ہو، اس کی ٹانگوں سے بھی مٹی لپٹی ہوئی تھی، لیکن اس مٹی سے ابلتا ہوا خون صاف دیکھا جاسکتا تھا، یقینی طور پر اس کی ٹانگیں زخمی کر دی گئی تھیں۔ میں نے عظیم خان سے کہا۔

”عظیم خان قرب و جوار میں دیکھ اور کوئی زخمی تو نہیں ہے۔“ عظیم خان نے گردن ہلائی اور اپنے گھوڑوں کو چاروں طرف دوڑانے لگا۔ وہ ادھر ادھر گھوڑے کو دوڑا رہا تھا کہ اچانک ہی زمین پر پڑی ہوئی لڑکی نے کروٹ بدل لی اور اچانک ہی اس نے مجھے پر فائر کر دیئے، میں نے بمشکل اپنے آپ کو اس کے فائرؤں سے بچایا تھا۔ اور پھر میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”بے وقوف کی بچی، ہم تیری مدد کر رہے ہیں اور تو ہم پر ہی فائرنگ کر رہی ہے۔ ایک بار پھر لمبے اچھل کر ایک طرف ہٹنا پڑا اور اس کے بعد کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں اس کے ہاتھ سے بندوق ال لوں۔ چنانچہ میں نے اچھل کر اس کے ہاتھوں پر ٹھوکر ماری، اور بندوق اس کے ہاتھوں سے نکل ردور جا پڑی۔ لیکن کافی تنومند تھی، لمبے قد، اور بھرے بھرے بدن کی مالک تھی، لیکن مٹی میں لتھرا اچھرہ کافی خوفناک لگ رہا تھا۔ صرف آنکھیں تھیں، جو مٹی سے محفوظ تھیں۔ ورنہ مٹی میں اس کے تمام دخیال چھپے ہوئے تھے۔

”اور کوئی زندہ نہیں ہے، البتہ چند لاشیں پڑی ہوئی ہیں، مگر یہ صاحبزادی حرافہ معلوم ہوئی۔“ عظیم خان نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اب کیا کیا جائے؟“

”اب تم سے کچھ کہوں گا تو برا مان جاؤ گے۔“

”برامانے والی کوئی بات ہوئی، تو صرف تیرا ہی نہیں مانوں گا۔ بلکہ تیرے جڑے ہی توڑ دوں۔“

”کیا کہا؟“

”ہاں عظیم خان تو یہاں آ کر خاصا جگڑ گیا ہے۔“

”یار تو سوچ یہ بھی کوئی زندگی ہے، نجانے ماضی کے کون کون سے دور میں بھگ رہے ہیں،

ایوں لگ رہا ہے کہ ہماری داستان ماضی ہی میں ختم ہو جائے گی۔“

”بات یہ ہے کہ چونکہ یہ ایک لڑکی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک لڑکی کی زندگی بچانا ہر مرد کا کام ہے، چنانچہ یہ کام میں سرانجام دوں گا۔“

پھر عظیم خان نے دانتوں سے لڑکی کے کپڑے پھاڑنے شروع کیے، وہ لڑکی کے قریب پہنچ گیا تھا اور ابھی اس نے لڑکی کے لباس سے منہ ہٹایا بھی نہیں تھا کہ لڑکی سانپ کی طرح پلٹی اور اس نے ہاری قوت کے ساتھ عظیم خان کے سینے پر لات ماری، عظیم خان اچھا خاصا طاقتور آدمی تھا، وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا، پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہر لڑکی ہر مرد کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور صورت حرام میں تیری مدد کر رہا ہوں۔“ وہ آگے بڑھا تو لڑکی وحشت زدہ لگا ہوں سے اسے دیکھتی رہی، اس بار اس نے ایک الٹی قلابازی کھائی اور پھر ڈھپ سے زمین پر جا گری، بہتا ہوا خون لکیریں بناتا ہوا دور تک پھیل گیا تھا بل نے کہا۔

”یہ جنگل کی بلی ہے، تمہارے ہاتھوں پٹیاں نہیں بخوائے گی، اسے یہ پٹیاں دے دو، ہو سکتا ہے یہ خود استعمال کرے۔“

”ہوں پاک باز، صورت حرام کہیں کی۔“ عظیم خان نے پٹیوں کا ڈھیر لڑکی کے سامنے لگا دیا اور خود پیچھے ہٹ گیا، تب لڑکی کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے، اس نے ایک پٹی اٹھائی اور وڑی سی پیچھے کھسک کر ایک پتھر سے ٹک لگا کر بیٹھ گئی، پھر اس نے اپنے زخم پر پٹیاں باندھنا شروع کر دی تھیں۔

بہت دیر تک وہ یہ کام کرتی رہی، ہر آہٹ پر وہ وحشت زدہ ہرنی کی مانند چوہک کر دیکھنے لگتی نا، بہر حال ہم لوگ اس کے بارے میں اندازہ لگانے لگے، لڑکی کے نقوش بتاتے تھے کہ وہ بھی یہ ہے، لیکن اب یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ہم نے ہر اس شخص کو شامیہ سمجھ لیا تھا، جس کے نقوش تھوڑے بہت جاذب نگاہ تھے، یا یہاں کے ی باشندوں سے مختلف۔“

ہو سکتا ہے، شامیہ جیسی شکلوں کا کوئی اور قبیلہ آباد ہو، ہم بلاوجہ ہر ایک کو شامیہ سمجھ رہے ہیں۔“

”لڑکی نے اپنے زخموں پر پٹیاں لپیٹ لیں، خون ان پٹیوں پر بھی آ گیا تھا لیکن اب زیادہ اپینے کا امکان نہیں تھا، اب وہ خامی چاک و چوبند نظر آ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر اب تسکین اور تکلیف کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے، میں اور عظیم خان اس کی لیب و غریب کیفیت پر حیرت کا شکار تھے۔

”اصل میں میں نے ان تمام چیزوں پر کبھی غور نہیں کیا لیکن اب مجھے موقع ملا ہے تو میں ان باتوں پر غور کر رہا ہوں۔“

”مانتا ہوں اس بات کو لیکن ہم ماضی میں ختم نہیں ہو سکتے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ ماضی پیچھے ہے، اور ہم حال کے لوگ ہیں، ہمارا نقصان جو کچھ بھی ہوگا، حال میں جا کر ہوگا۔“

”اب ماضی، مستقبل، حال میں ان تمام باتوں کو نہیں سمجھتا، اوہو دیکھو، غالباً اس کی ٹانگیں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔“ عظیم خان نے کہا۔

”میں پہلے ہی اسے دیکھ چکا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی پر نقاہت طاری ہو چکی ہے، ار ہمارے پاس اس طرح کے انتظامات تو تھے نہیں، کہ اس کی ٹانگوں کی مرہم پٹی کریں، جو کچھ فوری طور پر ہو سکتا تھا، وہ کر دیا، لڑکی نے عجیب سی نگاہوں سے پانی کے اس برتن کی جانب دیکھا، جو شاید مر والوں میں سے کسی ایک کا تھا، اور میں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر پانی کا وہ برتن اٹھا لیا، لڑکی نے اختیار دووں ہاتھ پھیلائے اور میں نے پانی کا برتن اس کے ہاتھ میں دے دیا، اس نے دانتوں اس خاص قسم کے چوڑے کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور پھر وہ بوتل منہ سے لگائی، سارا پانی پینے کے ایک دم اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی، ہم اسے دیکھ رہے تھے، میں نے عظیم خان سے کہا۔

”یہاں کیا ہنگامہ آرائی ہوئی ہے؟“

”ان پانچوں لاشوں میں سے ایک بھی یہ بتانے کے لیے تیار نہیں ہے، ویسے میرا خیال ہے بھی مر گئی۔“

”نہیں یہ زندہ ہے۔“

”کیسے پتہ ہے؟“

”غور سے دیکھو۔“

”مگر یا تم اسے غور سے دیکھ رہے ہو۔“

”اس وقت میں بالکل مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”مرنے والوں کی تعداد پانچ یا چھ ہے۔“ عظیم خان نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کے لباس کی پٹیاں پھاڑ کر اس کے ان زخموں پر کسی جائیں۔“

”چلو ٹھیک ہے، اب یہ کام تم سرانجام دو۔“

لیکن یہ ایک قابل رشک بات تھی کہ اتنے زخم کھانے کے بعد بھی وہ اس وقت کافی پرسکون نظر آرہی تھی، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر خاصی طاقتور ہے اور پورے ہوش و حواس میں ہے، پھر میں نے کہا۔

”اب بتاؤ، اس کا کیا کریں۔ یہاں پڑی پڑی تو یہ مڑ جائے گی۔ اور یہ بھی کوئی پتہ نہیں کہ اس کے دشمن کتنے فاصلے پر ہوں۔“

”مگر یہ گوئی اور بہری ہے۔ ابھی تک اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا، ہم کیسے اس سے معلوم کریں۔“

”دونوں ٹانگیں زخمی ہیں اس کی کیا خیال ہے۔ اسے ساتھ لے چلیں۔“

”لڑکی کیا تو بولنا جانتی ہے، اگر بولنا جانتی ہے تو ہماری باتوں کا جواب دے؟“ میں نے کہا۔

”لڑکی نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ عظیم خان کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے، اس کے ساتھ ہم صرف ایک احسان کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیا؟“

”اس کی کپٹی پر رکھ کر ایک گولی داغ ہو، ورنہ اس کے دشمن نجانے اس کے ساتھ کیا سلوک

کریں۔“ میں نے چونک کر عظیم خان کو دیکھا، تو اس نے مجھے آنکھ مار دی۔ تب میں نے کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو، اس کی موت، اس کی زندگی سے زیادہ پرسکون ہوگی۔“ عظیم خان نے

کندھے سے رائفل اتاری، تو لڑکی بے اختیار چیخ پڑی۔

”تمہارا دماغ خراب ہے کیا، میں زندہ ہوں، ہوش و حواس میں ہوں، لگتا ہے تم اپنے ہوش

حواس کھو بیٹھے ہو۔“

عظیم خان کے حلق سے ایک تہقہ نکل گیا۔

”دیکھا تم نے اتنی دیر سے ہم کوشش کر رہے تھے، یہ زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹ رہی تھی،

یہ ہوتی ہے، ترکیب نمبر 111 ایک سو گیارہ تو اے بولنے والی لڑکی! اب تو بتا کہ ہم تیرے لئے کیا

کریں، تیرے دشمن اگر آگئے تو تیرا حساب کتاب کر دیں گے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہوگا، وہ بہت دیر سے یہ کوشش کر رہے تھے، اور اس میں ناکام رہے

تھے۔“

”مگر تو.....؟“

”دیکھو تم یہاں سے چلے جاؤ، تمہارا بہت، بہت شکریہ۔ اسلحہ موجود ہے، اصل میں میرے ہاں

لحم ہو گیا تھا، میرا مطلب ہے، گولیاں۔ ورنہ جب تک میرے پاس گولیاں تھیں، میں نے انہیں ہٹائیں آنے دیا، وہ تین دن سے میرا تعاقب کر رہے ہیں، اور تین دن کے بعد اپنی ان کوششوں

نامیاب ہو گئے ہیں۔“

”چلو تسلیم کر لیا، لیکن اب تمہاری ٹانگیں بے کار ہو چکی ہیں، ان کے بغیر تم کیا کر سکتی ہو؟“

انے ادھر، ادھر دیکھا، پھر بولی۔

”میرا گھوڑا بھی مر چکا ہے، کیا تم یہ دو رائفلیں اٹھا کر مجھے دے سکتے ہو، وہ جو سامنے پڑی

ہیں۔“

میری نگاہیں ان رائفلوں کی جانب اٹھ گئیں۔ یہ مرنے والوں کی رائفلیں تھیں، جو ہماری

ہاں کا شکار ہوئے تھے، میں نے عظیم خان کو اشارہ کیا، اور عظیم خان نے بڑھ کر وہ دو رائفلیں

میں۔ پھر انہیں لڑکی کے پاس لا کر بولا۔

”اب بولو۔“ لڑکی نے دونوں رائفلیں دونوں پاؤں میں پکڑیں اور اس کے بعد پھر میں نے

ہجرت ناک منظر دیکھا۔ رائفلوں کو میسا کھی کی طرح بظلوں کے نیچے دبا کر وہ پھرتی سے کھڑی ہو

ئی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے کہا۔

”میں ان کے سہارے چلی جاؤں گی، ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔“ اس نے واقعی رائفلوں کے

بے کئی قدم آگے بڑھائے اور ہم دونوں حیران رہ گئے۔ بہر حال مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے کہا۔

”سنو۔ ہمارے گھوڑوں میں سے تم ایک گھوڑا لے لو، اور جہاں چاہے لے جاؤ، ہم تمہاری

مدد چاہتے ہیں۔“ لڑکی نے میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

”نہیں میں اپنی مدد خود کروں گی، تمہارا شکریہ ادا کر چکی ہوں۔“

”نہیں کر پاؤ گی، زخموں سے بہہ جانے والا خون آخر کار تمہیں بے ہوش کر دے گا۔“

”مگر میں نے کہہ دیا ہے، تم سے تم میرے لئے جو کچھ کر چکے ہو، اگر وقت نے اجازت دی، تو

نہیں اس کا صلہ ادا کروں گی، بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ، میں تمہارا ساتھ نہیں جاؤں گی، اور

ہم مجھے مجبور کر سکو گے۔“

”ہم تمہیں مجبور کر سکتے ہیں، لیکن اب تمہیں مجبور کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ ہم تمہارے دوست

دشمن نہیں۔“

”تم نے مجھے گھوڑا دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

”ہاں۔“

صہبت کا شکار ہوئی تھی، ویسے جو کوئی بھی تھی، حیرت انگیز تھی، دونوں ناگئیں ناکارہ ہونے کے باوجود اٹل گتا ہے کہ جیسے ان ناگوں کا اس کے وجود سے تعلق نہ ہو۔“ نہ اسے اپنے زخموں کی پروا تھی، کمال واقعی کمال ہے۔“ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

راستے طے ہوتے رہے، پہاڑ ریتلے میدان گھوڑوں کے قدموں تلے آتے رہے، پھر بہت دے ہم نے ایک پہاڑی سلسلہ دیکھا۔ ایک عظیم الشان پہاڑی سلسلہ جس کے درمیان ایک دراڑ ہوئی تھی۔ بالکل ایسا لگتا تھا کہ جیسے پہاڑ کی چوٹی سے لے کر زمین تک دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہو، یہ پہاڑی انسانی ہاتھوں کی تراش ہے، تو ایک ناقابل تصور چیز ہے۔ بہر حال ہم وہاں سے تھوڑا گے بڑے، تو ہمیں پتھروں ہی سے بنی ہوئی وہ عمارت نظر آئی، جسے عمارت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ایک پتھر کی سی جگہ تھی۔ ہم رک گئے، عظیم خان نے کہا۔

”تم نے دیکھا حمار۔“

”ہاں۔“

”اس کا مطلب ہے، انسان یہاں موجود ہوں گے۔“

”امکانات تو ہیں۔“

”مگر جگہ کون سی ہے؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”آؤ، دیکھیں۔“ ہم لوگ بڑی احتیاط سے وہاں پہنچ گئے، اور پھر ہم نے پتھروں کی اس ت کو غور سے دیکھا، خانقاہ کی سی کیفیت تھی۔ لیکن ویران خانقاہ میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم لوگ ت کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں اس قدر سردی تھی کہ بدن پر کپکپاہٹ کا سا ل ہوا جب کہ باہر کا موسم خاصا شدید تھا۔ عمارت کی ایک حیرت ناک شکل تھی، ہم اسے اندر یکٹے رہے اور اس کے بعد باہر نکل آئے۔ عظیم خان نے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ اس عمارت کو دنیا کی پراسرار ترین عمارت کہا جاسکتا ہے۔“

”دنیا کی پراسرار چیزیں تو یہاں اور بھی بہت سی نظر آتی ہیں، کیا تم واقعی وادی شاکال گونی ماجیز کو معمولی سی چیز کہہ سکتے ہو۔“

”نہیں، یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ تو مجھے بت ہی خوبصورت جمیل نظر آئی، یہ بہت زیادہ وسعتوں میں نہیں پھیلی ہوئی تھی، لیکن اس قدر نمی کہ زبان سے ادا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے کنارے بہت بڑے درخت نظر آرہے تھے، اور

”تو لاؤ، مجھے ایک گھوڑا دے دو۔“

”تم اس پر سوار ہو جاؤ گی؟“

”دے کر دیکھو۔“

”عظیم خان! یہ بہت زیادہ بہادر بننے کی کوشش کر رہی ہے، میرا خیال ہے، اسے گھوڑا دے دو۔“

عظیم خان نے تفریحاً ایسا کہا تھا۔ لڑکی کی جو کیفیت ہم دیکھ چلے تھے، وہ صاف بتاتی تھی کہ اپنے بچاؤ کی کوشش ضرور کر رہی ہے لیکن اس کی آنکھیں بار بار اس انداز میں مز جاتی تھیں۔ جیسے اپنی غشی کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ عظیم خان نے گھوڑا لے جا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا اور دوسرا حیرت انگیز منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ رائفلوں کے بل پر اچھلی تھی اور ایک اسوار کی طرح گھوڑے پر چابیٹھی تھی۔ پھر اس نے رائفل بلند کر کے ایک فائر کیا، اور اس کے ساتھ گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

”اے، اے، اے،“ عظیم خان کے منہ سے بے اختیار نکلا، اس نے اپنی رائفل سیدھی کر لیکن میں نے اس کی رائفل پکڑ کر اسے اونچا کر دیا۔

”کیا حق پن کر رہے ہو؟“

”وہ سچ گھوڑا لے گئی۔“

”تو پھر؟“

”تمہاری عقل ختم ہو گئی ہے کیا، ہم کیا کریں گے آخر؟“

”عقل تمہاری ختم ہو گئی ہے عظیم خان، پہاڑوں پر پانچ گھوڑے بٹک رہے ہیں، ان مرد والوں کے گھوڑے، ان میں سے کوئی گھوڑا، ہمارے کام آ سکتا ہے، ان کا اسلحہ بھی موجود ہے۔“

”اوہ واقعی؟“ عظیم خان نے کہا۔

”لو تم، میرا گھوڑا پکڑو، میں اپنے لئے گھوڑوں کا بندوبست کرتا ہوں، پھر میں نے کافی آٹا کر ایک خوبصورت گھوڑا اپنے قبضے میں کیا تھا، واپس پہنچا تو عظیم خان ان لوگوں کا اسلحہ اور کھالے اشیاء بھی انکشی کر چکا تھا۔ میں نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور اس کے بعد ہم وہاں چل پڑے، عظیم خان کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ کافی فاصلے تک وہ منہ سے آواز بھی نہیں نکال سکا لیکن پھر یہ خاموشی طویل ترین ہو گئی۔ تو اس نے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکی نے ہماری کھوپڑیاں گھما کر رکھ دی ہیں، نجانے کون تھی؟“

قریب ہی پھول موجود تھے۔ درختوں میں پھل لٹکے ہوئے تھے۔ یہ بات ناقابل یقین تھی۔ عظیم نے کہا۔

”دیکھو دوست! آج تک میں تمہاری باتیں ماننا چلا آیا ہوں، اس وقت تمہیں میری ایک ماننا ہوگی۔“

”بولو کیا۔“

”یہاں کم از کم ایک ہفتہ قیام کریں گے۔ اتنا تھک چکا ہوں کہ زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔“

”تمہاری مرضی جیسے دل چاہے کرو۔“

”واقعی صورت حال بڑی سنگین ہے، اس وقت اگر ہم نے اپنے جسموں کو سکون نہیں دیا، خود بیمار پڑ جائیں گے۔“

”میں نہیں چاہتا کہ تم بیمار پڑو۔“

”تو پھر قیام کیلئے یہ عمارت جو باقاعدہ ایک ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ کی حیثیت رکھتی ہے، حاصل کیا جمیل اور خوراک کیلئے اس کے کنارے آگے ہوئے درخت اور کیا چاہیے۔“ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

ان ساری چیزوں کو دیکھنے کے باوجود ایک خیال دل سے نہیں لگتا تھا، وہ یہ کہ یہ سارا جادو کا ہے، اور ہم جدید دنیا کے لوگ ہیں، اور وہاں سے جادو کے ذریعے اس محرزہ زمین تک آ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کریں گے۔ بہر حال خانقاہ کے گرد کا ماحول اتنا خوبصورت تھا کہ ہم نے یہاں پر ہر قیمت پر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ درختوں سے پھل توڑ کر کھائے۔ جمیل میں نہانے۔

قرب و جوار میں ابھی تک کسی کی موجودگی کا کوئی شک و شبہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ یہ انداز نہیں ہو رہا تھا کہ آس پاس کوئی آبادی ہے یا بھی نہیں۔ ”تقریباً کئی گھنٹے نہانے کے بعد ہم خانقاہ میں پہنچے۔ خانقاہ کی ٹھنڈک ایک عجیب و غریب کیفیت رکھتی تھی۔ ہم جب خانقاہ میں ہوئے اور ہم نے اس کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیا تو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ خانقاہ میں ایک سا سوراخ بنا ہوا تھا، جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔

اور پتھر کی چٹان میں خود بخود پیدا ہو گیا تھا لیکن پہلے ہم جس وقت یہاں آئے تھے تو یہ سارا تاریک پڑا ہوا تھا۔ اب اس سوراخ میں مدھم مدھم روشنی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی سوراخ دوسری طرف موجود ہے، لیکن دوسری طرف جانے کا راستہ کس طرف موجود ہے، یہ بات حیران

تھی، میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

عظیم خان بھی اس طرف متوجہ تھا، پھر اچانک خانقاہ کے دروازے میں یعنی اس طرف سے جس طرف ہم داخل ہوئے تھے، کسی سائے کا احساس ہوا، اور ہم نے پلٹ کر دیکھا، تو ایک لمبے کیلئے پھر روٹنے لگے کھڑے ہو گئے، سیاہ کفن نما لباس میں ملبوس ایک بد شکل بوڑھی عورت وہاں کھڑی ہوئی ہمیں دیکھ رہی تھی۔

اس کے بدن میں رعشہ تھا، اور اس کی گردن اس طرح بل رہی تھی، جیسے وہ اسے جان بوجھ کر ہلا رہی ہو، پھر اس کی گھر کھراتی آواز ابھری۔

”دو پتاؤں کے گھر میں تمہاری آمد کیا معنی رکھتی ہے۔ یہاں صدیوں سے عبادت ختم ہو گئی ہے اور اب یہ ایک ویران مسکن ہے۔ یہاں ایسا نہ کرو۔ جاؤ، یہاں سے دور چلے جاؤ۔ عورت کی آواز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ایک پراسرار کیفیت جو ایک لمبے میں سمجھ میں نہیں آتی تھی، ہم دونوں اسے پکھلتے رہے۔ پھر ہم نے کہا۔

”بزرگ خاتون ہم تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔“

”نہیں، یہ جگہ عام لوگوں کیلئے نہیں ہے، تم جاؤ یہاں سے۔ جوان شانی جاؤ، یہاں سے چلے آؤ۔ یہاں تمہارا رکنا تمہارے لئے خطرے کا نشان ہو سکتا ہے۔ رات کی تاریکیوں میں یہاں جو آتے ہیں، وہ ٹھیک نہیں ہوتے، تمہارے لئے مشکل ہی مشکل ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو ہم مشکلات کو قابو میں کرنا جانتے ہیں۔“ عظیم خان نے کہا۔ اور بوڑھی اسے گھورنے لگی، پھر بولی۔

”تمہاری مرضی میں نے تمہیں ہوشیار کر دیا، اب بے کار ہے، ہنوتھوڑا سارستہ دو مجھے۔“ وہ نے قدموں سے اندر آگئی اور عظیم خان اسے غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے بوڑھی کو ایک گوشے میں تے دیکھا، وہ دو زانوں بیٹھ گئی تھی، اور پھر اس نے اپنا سراپنہ گھٹنوں میں جھکا لیا تھا، اس کے وہ خاموش ہو گئی۔ عظیم خان دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔

”ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، میں تم سے بڑی بی بی! یہ سوراخ کے دوسری طرف کیا اور یہ روشنی کی ہے؟“

لیکن بوڑھی نے اس بات پر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے عظیم خان سے کہا۔

”اس نے ہمارا یہاں آنا پسند نہیں کیا ہے، اس لئے تم اسے پریشان کرنے کی کوشش نہ کرو، وہ کسی بات کا جواب نہیں دے سکی۔“ عظیم خان نے بوڑھی سے کئی سوالات کئے لیکن بوڑھی نے

کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

چنانچہ وہ بھی خاموش ہو گیا۔

بوڑھی اس طرح ساکت پڑی رہی تھی، خانقاہ میں قیام کرنے کے بجائے ہمیں باہر کا منظر دیا حسین معلوم ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں اندر اس عمارت میں سردی بے پناہ تھی، جب موسم نہایت خوشگوار تھا، عظیم خان نے کہا۔

”کیا خیال ہے حماد، میرا خیال تو یہ ہے کہ اندر کے بجائے ہم باہر زیادہ پرسکون رہیں گے میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ عظیم خان کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی، باہر آ کر وہ جمیل کے کنارے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا۔

”میں تمہیں ایک بات بتاؤں؟“

”کیا؟“

”وہ بوڑھی عورت نہیں ہے۔“

”کون؟“

”وہ جس کے پاس سے ہم آ رہے ہیں۔“

”خانقاہ کے اندر۔“

”ہاں۔“

”تو پھر کون ہے وہ؟“

”کوئی جوان لڑکی ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو تم۔“

”میں بکواس کر رہا ہوں۔“

”ہاں، تمہاری کھوپڑی خراب ہو گئی ہے۔“

”نہیں، تمہاری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔“

”تم نے اسے غور سے دیکھا ہے۔“

”سو فیصدی۔“

”میں نے غور نہیں کیا، لیکن وہ۔“

”اس نے بوڑھی عورت کا میک اپ کیا ہوا ہے؟“

”زیادہ ماکرون بننے کی کوشش مت کرو۔“

”میں ماکرون نہیں بن رہا۔“

”تو پھر یہاں میک اپ کیسے کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتا لیکن اس نے میک اپ کیا ہوا ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”مان لو گے جب میں صورت حال بتاؤں گا، تو مان لو گے۔“

”کیا صورت حال بتاؤ گے۔“

”سنو، اب بھی اگر تم پلٹ کر دیکھو تو یا خانقاہ میں کسی پتھر کے سوراخ سے یا دروازے سے

ان نکال کر وہ ہمیں دیکھ رہی ہوگی۔“

”بہت زیادہ اعتماد کا مظاہرہ کر رہے ہو۔“

”اچانک پلٹ کر دیکھ لو۔“ اس نے کہا۔ اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ درحقیقت ایک سایہ سا

اے کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے حیرت سے عظیم خان کو دیکھا اور بولا۔

”عظیم خان کیا واقعی؟“

”یاد رکھ رہا ہوں، کبھی، کبھی عظیم خان کی بات بھی مان لیا کرو۔“

”مگر کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟“

”ہے۔“

”تو پھر۔“

”اب اس کیلئے ایک اور تجربہ چاہو تو کر سکتے ہو۔“

”کیا؟“

”گھوڑوں پر بیٹھو اور یہاں سے نکل چلو۔ اتنا فاصلے طے کریں گے، ہم اس کی نگاہوں سے

ہو جائیں، گھوڑے کسی جنگل کے درخت سے باغیچہ، واپس آ کر اسے دیکھو، میری بات کی

ہو جائے گی۔“

جانے کیوں مجھے عظیم خان کی اس بات میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی، میں نے کہا۔

”اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے، چلو چلتے ہیں۔ چنانچہ اس منصوبے کے تحت ہم خانقاہ کے

پر آ گئے، اور اس طرح کی باتیں کرنے لگے، جیسے یہاں سے جانے کا منصوبہ بنا رہے ہوں،

یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ رہی ہے لیکن بہر حال ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے،

سے چل پڑے۔ عظیم خان نے مجھے حیران کر دیا لیکن بہر حال وہ احمق نہیں تھا۔ کئی بار اس کا



تجربہ ہو چکا تھا، ہم نے خاصا فاصلہ طے کر لیا۔ پھر میں نے کہا۔  
 ”اب گھوڑے روکو گے، یا نہیں، واپس خانقاہ بھی جانا ہے۔“  
 ”ہاں، یہ جگہ ٹھیک ہے، یہاں گھوڑے باندھ دو۔“

”اچھا خاصا پیدل مارچ کراؤ گے، چلو اب واپس چلیں۔“ اس نے کہا اور ہم چبھتے  
 وہاں سے واپس خانقاہ کی طرف چل پڑے۔ ازراہ احتیاط خانقاہ تک گھوڑوں پر سفر نہیں کیا جا  
 اس لئے ہم نے پیدل کا راستہ اختیار کیا تھا۔ بس خواجہ دیوانگی طاری ہوئی تھی۔ ورنہ اس کی  
 تو نہیں تھی۔

شدت جوش سے ہم بہت دور نکل آئے تھے، واپسی کے سفر میں میں نے دانت پیٹنے  
 عظیم خان سے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں عظیم خان کہ تو اس کائنات کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔  
 اونہ، ابھی تم نے مصیبتیں دیکھی ہی کہاں ہیں۔ عظیم خان بولا اور میری نظروں میں  
 جانے کون کون سی تصویریں گھوم رہی تھیں۔ گھر، ماں، باپ، بہنیں، جو نہ جانے کہاں ہوں۔  
 اسکے بعد کے بدلے ہوئے واقعات ان تمام چیزوں کا تصور کر کے آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔



عظیم خان سچ سچ شیطان کا دوسرا عکس تھا۔ اس نے مری آنکھوں میں شاید آنسوؤں کی نمی دیکھ  
 لی تھی۔

دوسرے لمحے میں میری آواز ابھری۔  
 ”حماد۔“

”ہوں۔“ میں نے چونک کر کہا۔  
 ”رور ہے ہو۔“

”ہاں۔“  
 ”کیوں؟“

”اپنی تقدیر پر۔“  
 ”خیریت۔“

”خیریت پوچھ رہا ہے اب نہ جانے کتنا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑیگا۔“ میں نے بات بتائے  
 ئے کہا۔

”ڈر رہے ہو دوست۔“ عظیم خان نے شاطرانہ لہجے میں کہا۔  
 ”کیا مطلب.....؟“

”مطلب میں نہیں بتاؤں گا، وہ تمہیں ہی بتانا ہوگا۔“ عظیم خان نے شرارت سے مسکراتے  
 ئے کہا۔

”تیری کیفیت بھی بہت عجیب ہے، عظیم خان۔“  
 ”کیوں؟“

”بس جب حماقتوں کے موڈ میں ہوتا ہے، تو ایک سے ایک اعلیٰ پائے کی حماقت کرتا ہے۔“

”ہاں، بولو، بولو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم جو کچھ کہو گے، وہ کروں گا۔ یار بس کیا بتاؤں، یہ اپنی دہلا تو تھی، ہی شاطروں اور چال بازوں کی دنیا، لیکن ان پر اسرار واد یوں میں بھی یہ سب کچھ ہوتا ہے، جن کی تاریخ کا بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے، خیر تم کہو، میں اپنی اس حماقت کا کیا کفارہ ادا کر سکتا ہوں۔“

”جاؤ، دونوں گھوڑے لے کر آؤ۔“

”ارے باپ رے مر گیا۔“ عظیم خان کراہتا ہوا بولا۔

”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں واپس ان گھوڑوں تک جاؤں اور انہیں لے کر آؤں گا، تو اس خیال کو ماسے نکال دو، میں کبھی ایسا نہیں کروں گا، اگر تم نے اس خانقاہ سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، تو میں ماسک مخالف سمت اختیار کروں گا اور گھوڑے وہیں چھوڑ دیئے جائیں گے۔“

”نہیں، پیارے بھائی نہیں، میں دقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتا، لیکن ایک بات میں بھی کہے ہا ہوں، تمہاری شرط مان رہا ہوں، جاتا ہوں اور گھوڑے لے کر آتا ہوں، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ماسک اس خانقاہ میں، میں ذرا لمبا قیام کروں گا، میرے اندر اب ان پہاڑوں اور جنگلوں میں بھٹکنے کی تائ نہیں ہے۔“

”چلو لمبے میں جاؤ، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اور عظیم خان منہ بناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ یہ سزا اس کیلئے بہت بہتر تھی۔ اپنے آپ کو بہت ذہین ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اس نے۔ پھر جب وہ چلا گیا تو میں نے سوچا کہ بات تو واقعی ن ہے، چلو ٹھیک ہے۔ وہ بوڑھی عورت بقول عظیم خان کے جوان لڑکی بے شک نہیں تھی، لیکن تھی تو ا۔ اگر تھی تو کہاں گئی؟

دفعتاً مجھے اس جھیل کا خیال آیا، جو یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی اور میں نے دل میں سوچا کہ میں ہے، بوڑھی جھیل کے پاس ہو۔ چنانچہ میں باہر نکل آیا، اور عظیم خان کے بارے میں تو مجھے اچھی طرح اندازہ تھا، کہ ایک بار اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے دوبارہ فوراً ہی اتنا فاصلہ طے پڑے گا۔ وہ بہت دیر میں آئے گا۔

یہ الگ بات ہے کہ وہاں سے گھوڑوں پر بیٹھ کر وہ جلدی واپس آجائے، لیکن اس دوران میں اکا جائزہ لے سکتا تھا۔

خوبصورت اور حسین جھیل دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے کنارے درختوں سے بھرے تھے، اور ان درختوں پر پھول لگے ہوئے تھے۔ اچانک ہی نجانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا

”لیکن حماد! اپنی فطرت کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟“

”مطلب؟“

”تمہارے اندر ایک خاص خوبی ہے، اگر میں کوئی ٹھیک کر لیتا ہوں تو تم میرے تعریفوں پہلے ہاتھ دیتے ہو اور کہیں چھوٹی سی غلطی بھی ہوگئی، تو بس عظیم خان تم یہ ہو، تم وہ ہے۔“

”اول تو یار ہم اس منحوس چکر میں پڑ کر اپنی زندگی کے نجانے کتنے سال کھو بیٹھے ہیں، اب یوں لگتا ہے، جیسے اس وادی شاکال گمنی میں پیدا ہوئے اور اس میں مر جائیں گے۔ یقیناً کربھ اوقات تو کلیجہ منہ کو آتا ہے اور یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی زندگی میں ایک چھوٹی سی غلطی کی کتنی بڑ سزا ملتی ہے۔“

”یہ تو آسمانوں کی تاریخ ہے، دوست زمین پر اگر دوہرا دی جائے تو تعجب کی کیا بات ہے۔“

”مثلاً؟“

”ایک چھوٹی سی غلطی ہی نے شیطان کو شیطان بنا دیا، ورنہ کیا عیش ہوں گے، اس کے لیکن ہ آگیا، پہلے ہی جال میں۔“

مجھے ہنسی آگئی، میں نے کہا۔

”تو مذہبی باتیں بھی کر سکتا ہے۔“

”خیر ایسا نہ کہو، مذہب سے دور تو نہیں ہوا ہوں میں کیا سمجھ۔“

میں خاموش ہو گیا، میرے ذہن میں بڑا تجسس تھا اور میں بھی یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی عورت ہے یا نہیں۔ طویل فاصلہ طے کرتے ہوئے ہم لوگوں کو لطف آگیا تھا، پھر کچھ دیر کے بعد چھپتے چھپاتے خانقاہ پہنچ گئے اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس پر اسرار خانقاہ میں داخل ہو گئے، خانقاہ گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور کسی انسان کا پتہ نہیں تھا، اب تو ہمیں اور بھی حیرت ہوئی، پھر میں نے عظیم خان نے خانقاہ کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن پر اسرار اور ویران خانقاہ میں واقعی کوئی موجود نہیں میں نے دانت پیستے ہوئے، عظیم خان کو دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ سامنے کرتا ہوا بولا۔

”خدا کی قسم یار! اب تو میرے پاس کہنے کیلئے کچھ نہیں ہے۔“

”لیکن میرے پاس بہت کچھ ہے۔“ میں نے بدستور جھلاتے ہوئے انداز میں کہا اور عظیم ہنسنے لگا، پھر بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ یہاں سے بھاگ گئی۔“

”میرا کوئی خیال نہیں ہے، صرف ایک خیال ہے، جس کی تکمیل تجھے کرنی ہے۔“

”یہ کیا حرکت۔“

”گھوڑے سے اتارنے کا ایک آسان نسخہ۔“ میں نے جواب دیا اور عظیم خان گردن ہلانے لگا۔

”نہیں مروں گا۔“

”کیا مطلب؟“

”کہاناں، نہیں مروں گا۔“

”کیا ارادہ ملتوی کر دیا۔“

”ایسے نہیں مروں گا۔“

”تو پھر کیسے مرو گے؟“

”تم اگر چاہے ہو کہ میں مرجاؤں، تو تم خود سوچو کہ تم عقل سے پیدل ہو۔“

”مطلب؟“

”یہ وادی شا کال گونی ہے۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“

”اور ہم ماضی میں سفر کر رہے ہیں۔“

”کر رہے ہیں۔“

”تو کیا میں ماضی میں مرجاؤں گا۔“ اس نے کہا اور میں چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا، پھر

”یہ میرے حلق سے ایک تہقہہ نکل گیا۔“

”یار عظیم خان تو بہت چالاک ہے؟“

”اور تم انتہائی احمق۔“

”اچھا بکواس بند کرو، چلو گھوڑے ہمارے۔“

”یہ کام بھی میں کروں۔“

”تو اور کیا میں کروں گا۔“

”دیکھو پہلے کام کی تو تم نے مجھے سزا دی تھی۔“

”ہاں تو پھر؟“

”اب میں وہ سزا پوری کر چکا ہوں، یہ آخری کام ہے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

جیسے اس پر اسرار جادوگری کا یہ حصہ بھی خاصا پر اسرار ہو، ورنہ یہاں ان درختوں کے پھلوں کا کیا حصہ ہے۔ بہر حال جمیل کا یہ دلکش منظر بے حد حسین تھا، ابھی دور دور تک عظیم خان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

چنانچہ کافی دیر تک جمیل کے پاس رہا، اور کچھ پھلوں کو سمیٹ کر میں واپس خانقاہ میں آ گیا۔ اب اتنی بداخلاقی تو نہیں کر سکتا تھا کہ عظیم خان کے بغیر پھلوں کو کھانا شروع کر دیتا۔

پھلوں کو ایک جگہ رکھ کر میں نے سوچا کہ ایک بار پھر ذرا خانقاہ کا جائزہ لے لیا جائے اور اگر بار میں اس کا جائزہ بڑی گہری نگاہوں سے لیتا رہا، پھر اچانک ہی میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا، یہ دونوں رائٹلیں تھیں۔ جو میں نے اس زخمی لڑکی کو دی تھیں، اور وہ انکثر بیساکھیاں بنا کر گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر ہوا ہو گئی تھی، میں نے سو فیصدی پہچان لیا، یہ وہی رائٹلیں تھیں۔

”میرے خدا، میرے خدا۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ وہ لڑکی تھی یا چلاوا پھر ان رائٹلیں کی یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے، لاکھ کوشش کے باوجود میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

عظیم خان واپس آ گیا، جس حال میں واپس آیا، اسے دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی، جس نے اسی سے اسے دیکھ لیا تھا، ایک گھوڑے کی پشت پر اوندھا لیٹا ہوا تھا، دوسرا گھوڑا اس کے ساتھ چلا آ تھا، رفتار اتنی ست تھی، کہ گھوڑے پر بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اگر انسان تھکا ہوا نہ ہو۔ قریب آنے کے بعد وہ گھوڑے سے نیچے اترا تھا، میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

”کیا مر گئے؟“

”مرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”کامیابی کتنی دیر میں حاصل ہو جائے گی۔“

”یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“

”گھوڑے کی پیٹھ پر مرو گے، یا نیچے آ کر؟“

”مرنا تو نیچے آ کر چاہتا ہوں، مگر اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“

”ابھی ایک منٹ۔“ میں نے اچانک ہی گھوڑے کے منہ پر ایک تھپر رسید کر دیا۔

تھپر رسید کرنا تھا کہ گھوڑا دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا اور عظیم خان بڑے اطمینان سے چلا رہا۔ البتہ گھوڑے نے دوپٹی ماری تھی، اور اس سے عظیم خان بچ گیا تھا، پھر وہ پھرتی سے کھڑا رہا اور مجھے گھورنے لگا۔

”ایک بات میں بھی تمہیں بتاؤں۔“  
 ”چلو تم بھی بتادو، میں کب منع کر رہا ہوں۔“  
 ”وہ زخمی لڑکی جو ہمیں ملی تھی ناں۔“  
 ”ہاں۔“

”اسکے دانے ہاتھ پر ایک تل تھا اور میں سچ بتاؤں اس بوڑھی عورت پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ اہل عورت نہیں ہے، وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر ہوا تھا۔“  
 ”مطلب؟“

”مطلب! یہ ہے کہ اس کے ہاتھ بہت خوبصورت اور نوجوان ہاتھ تھے، اس نے اپنا پورا روپ لپکا تھا، لیکن ہاتھوں پر تہدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور، اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ ان ہاں پر ایک تل بھی تھا۔“  
 ”ناممکن ہے۔“

”اب تم جو کچھ بھی کہہ لو، یا کچھ اور کہہ لو، لیکن میں اپنی بات سچ کہہ رہا ہوں۔“  
 ”مگر وہ تو زخمی تھی۔“

”کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ زخمی نہ ہو، ویسے تمہیں ایک بات یاد ہے؟“  
 ”کیا؟“

”جب وہ وہاں پڑی ہوئی تھی اور ایسے پڑی ہوئی تھی، جیسے مر گئی ہو۔ تو ہم نے اسے گولی کا فیصلہ کیا تھا۔“

”ہاں۔“

”اور اس کیلئے تیار بھی ہو گئے تھے۔“  
 ”بالکل۔“

”اور وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔“  
 ”ہاں۔“

”جس طرح وہ اٹھ کر بیٹھی تھی، اس سے کیا تم یہ اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ زخمی تھی؟“  
 ”میں نے اتنا غور نہیں کیا؟“

”مگر میں نے غور کیا ہے۔“

”ہمارا مطلب ہے، وہ زخمی نہیں تھی؟“

”ہوتا ہے۔“  
 ”نہیں ہوتا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، چھوڑ دو کھلے گھوڑے۔“ میں نے کہا اور عظیم خان غصیلے انداز میں گھوڑے لگا، پھر بولا۔

”خدا کی قسم کھاتا ہوں، گھوڑے نہیں باندھوں گا۔ یہ بھاگ ہی کیوں نہ جائیں۔ میرا کہ میں راہب حق بن کر اس خانقاہ میں بیٹھ جاؤں گا اور تم مجھے نہیں لے جا سکو گے۔“ اب ذرا کچھ سی محسوس ہونے لگی تھی، چنانچہ میں نے گھوڑوں کو باندھا اور ہم دونوں اندر آ گئے، عظیم خان نے کے انبار دیکھے، تو خوش ہو کر ان پر جھپٹا اور ٹھنڈی زمین پر لیٹ کر پھل کھانے لگا۔ پھر بولا۔

”زندگی میں یہ لطف بھی حاصل ہو گیا، کبھی خواب میں بھی تم نے سوچا تھا، ویسے بات و لطف ہے، مزہ آ رہا ہے، کیا اس وقت۔ ویسے ایک بات بتاؤں، میں نے تو اچانک ہی سوچا تھا سمجھ میں آتی ہے اور سچی لگتی ہے۔“

”کون سی بات؟“

”ہم باغی میں مرنے نہیں سکتے، ایک نیا تصور، ایک نیا خیال تھا اور میں خود بھی اس بار سوچ رہا تھا، واقعی اگر ہم وادی شاکال گونی میں سفر کر رہے ہیں، تو موت تو ہمیں مستقبل میں ملے گی، یعنی اس وقت جب ہم اپنا عمل طے کر رہے ہوں، یہاں تو صرف ایک دیدہ ور کی حیثیت ہیں اور تھوڑے سے باغمل بھی ہیں۔“

عظیم خان پھل کھاتا رہا، اور میں سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”عظیم بھائی! ایک عجیب بات بتاؤں تمہیں؟“

”یہاں ساری باتیں ہی عجیب ہیں اور کوئی عجیب بات ہے تو وہ بھی بتادو۔“

”ایک گوشے میں مجھے وہ بندوقیں مل گئی ہیں۔“

”کون سی بندوقیں۔“

”وہی جو زخمی لڑکی نے لی تھیں۔“

”کیا؟“ عظیم خان اچھل کر بیٹھ گیا۔

”ہاں۔“

”اوہ، میرے خدا یا۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”بالکل یہ ہی مطلب ہے میرا۔“  
 ”اور یہ مطلب ہے تمہارا کہ یہ وہی لڑکی تھی؟“  
 ”سو فیصدی۔“

”خیر سو فیصدی تو مت کہو۔ کیونکہ آدمی، میں نے تمہارے بغیر پھل نہیں کھائے اور تم مجھے پا  
 بغیر پھل کھاتے جا رہے ہو۔“

”ارے کیا واقعی۔“ عظیم خان نے شرمندگی سے کہا۔

”اور اس کے ہم پھل کھاتے رہے۔“ پیٹوں میں وزن پہنچا تو بدن ڈھلنے لگے، اور ہم خانقا  
 ٹھنڈی زمین پر لیٹ گئے۔ واقعی یہ زمین اس وقت پر لطف بستر محسوس ہو رہی تھی اور نجانے کب  
 پر لطف بستر پر ہمیں نیند آگئی، گہری اور پرسکون نیند، پھر ہم سوتے رہے، وقت گزرتا رہا، جب جا  
 رات ہو گئی تھی۔ خانقاہ میں اس طرح مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ایک پراسرار ماحول محسوس ہو رہا  
 طبیعت پر ایک عجیب سا بوجھ سوار تھا۔

پھل موجود تھے، پیٹ تو بھرا جاسکتا تھا، اس کے علاوہ جمیل کے قرب و جوار میں پھلے  
 جنگل میں جانور بھی مل سکتے تھے، لیکن رات اتنی ہو گئی تھی کہ اب شکار کا موڈ نہیں تھا۔ اچانک ہی  
 عظیم خان نے کہا۔

”حمدا“

”ہاں۔“

”چلو جمیل پر نہیں گے؟“

”میرا دل بھی یہ ہی چاہ رہا تھا۔“

”سپینے اور حکمن نے بدن بوجھل کر دیا ہے۔“

”نہانے کے بعد طبیعت خوشگوار ہو جائے گی۔“

”چلو۔“

ہم نے باہر نکل کر گھوڑوں کو دیکھا اور پھر ان کی لگا میں کھول دیں، یہ سوچ کر کہ وہ بھی  
 گے، وفادار جانور مالکوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اس لئے ہمیں اس بات کی امید تھی کہ گھوڑے  
 چھوڑ کر بھاگیں گے نہیں۔ بلکہ اپنی خوراک لے کر واپس یہیں آجائیں گے۔ گھوڑے ہماری امہ  
 مطابق تھوڑے سے آگے آگے اور جنگل کی گھاس چرنے لگے۔ جب کہ ہم دونوں درختوں کے  
 بیٹھ گئے اور وہاں اپنے لباس اتارنے لگے لیکن ابھی ٹھیک طریقے سے لباس اتارے بھی نہیں

ہیں منگٹانے کی آواز سنائی دی۔ یہ کسی لڑکی کے منگٹانے کی آواز تھی۔

ہم دونوں چونک کر ایک دم سنبھل گئے اور پھر ہم نے جھانک کر جمیل کی طرف دیکھا، ستاروں  
 کی مدد ہم روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، بے شک چاند نہیں نکلا تھا لیکن ستاروں کی روشنی میں ہم  
 دور دور تک منظر دیکھ سکتے تھے اور ہمیں جمیل میں ایک شعلہ سا لپکتا نظر آیا، یہ وہی حسین لڑکی تھی، جواب  
 جمیل میں نہا رہی تھی۔

اس کا راہباؤں کا لباس جمیل کے کنارے رکھا ہوا تھا۔ دفعتاً عظیم خان نے کہا۔

”دیکھا تم یہ بڑی شاطر لڑکی ہے۔“

”کیا خیال ہے، ہم بھی اس کے ساتھ شطرنج کھیلیں۔“

”کیسے؟“

”میں اس کے کپڑے اٹھا کر لاتا ہوں۔“

”نہیں۔ عظیم خان یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔“

”اوہ میرے پیارے بھائی صاحب! یہ تم اچانک کیسے ہو گئے؟“

”ہم ماضی میں سفر کر رہے ہیں جب کہ ہمارا اخلاق حال میں بلکہ اب تو یہ کہنا چاہیے کہ مستقبل

میں خراب ہوا تھا۔ ماضی میں اس اخلاق کو خراب نہیں ہونا چاہیے۔“

عظیم خان نے اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آگئی، پھر میں نے کہا۔

”تو پھر؟“

”بس دیکھتے رہو، کیا ہوتا ہے؟“

”دیکھنا بد اخلاق نہیں۔“ عظیم خان مجھے گھور کر بولا۔

”اوہ، مگر! تو وہاں جائے گا، تو اس کا لباس اٹھائے گا، تو وہ کیا تجھے دیکھ نہیں لے گی اور پھر

ہمیں تو یہ انداز بھی نہیں ہے کہ وہ ہے کیا شے؟“

”جو کچھ ہے، خدا کی قسم لا جواب ہے۔“ عظیم خان نے منگٹانے ہوئے کہا۔ دوسری جانب

لڑکی کی منگٹانہٹ سنائی دے رہی تھی۔

نجانے کیوں مجھ پر اخلاقیات کا بھوت سوار ہو گیا تھا اور میں اسے دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

پھر میں نے اسے مخاطب کیا۔

”عظیم خان۔“

”بولو؟“

”تیرا اخلاق کچھ زیادہ خراب تو نہیں ہو گیا؟“

”کیوں؟“

”ہم نے ہر طرح کے جرائم کئے لیکن ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔“

”اس سے پہلے ہم کسی ایسی کیفیت کا شکار بھی تو نہیں ہوئے۔“

”پھر بھی انسانیت کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”تو میں کیا کر رہا ہوں۔“

”آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا ہے۔“

”آنکھیں بند کرلوں۔“

”بالکل۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ پہلے اس نے ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔“

”وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پائے گی۔“

”تو میں اسے ناکام ہی تو کر رہا ہوں۔“ وہ بولا اور مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اسے گھور-

ہوئے کہا۔

”عظیم خان تو واقعی بہت بدل گیا ہے۔“

”یار کیا کروں، وہ لیلیا اور چو تھیں، وہ بھی چھن گئیں، اب کوئی نہ کوئی تو مرکز نگاہ ہو، کیا یہ داغ

پر اسرار نہیں ہے۔“

”یہ لڑکی؟“

”ہاں، ویسے تو عظیم خان، تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ لڑکی ہو سکتی ہے، جسے ہم نے سہارا دے

گھوڑے پر بٹھایا تھا اور اس کے بعد وہ وہاں سے فرار ہو گئی تھی۔“

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شکل و صورت سے تو وہ نہیں لگتی، لیکن بڑی شاطر اور چالاک ہے، مجھے

پہلے ہی اس پر شبہ ہو گیا تھا۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لڑکی کی مسکناہٹیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

پھر جب وہ جھیل سے باہر نکلی تو میں نے عظیم خان کو گریبان سے پکڑ کر اسے آگے کھینچ لیا، ا-

اس سے زیادہ بد اخلاقی کی اجازت میں اسے نہیں دے سکتا تھا، چنانچہ ہم دونوں وہاں سے تھوڑی ا-

گئے، تاکہ لڑکی لباس لے، یہ فیصلہ ہم نے دل میں کر لیا تھا کہ لباس پہننے کے بعد جب وہ یہاں

جانے کی کوشش کرے گی، تو ہم اسے مخاطب کریں گے اور اس سے کہیں گے کہ اس نے ہمیں

دیا ہے۔ ہم نے اتنا وقت صرف جتنے وقت میں وہ لباس تبدیل کرے، اس کے بعد جب ہم

پلٹے تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

میں نے اور عظیم خان نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، تا حد نظر اس کا پتہ نہیں تھا، ایسا لگتا تھا،

اسے زمین نگل گئی ہو۔ عظیم خان پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں دیکھ رہا تھا، پھر اس نے کہا۔

”باپ رے باپ، اب تو یہ یقین کرنا پڑے گا کہ وہ چھلاوہ ہے اور اسے تلاش کرنا، ممکن کام

ہے۔ میرے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی، میں نے کہا۔

”عظیم خان یہ بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“

”نہ وہ چھلاوہ ہے، نہ اسے تلاش کرنا مشکل کام ہے۔“

”مگر کیسے؟“

”آؤ۔“ میں نے کہا، اور آگے بڑھ کر جھیل کے اس حصے میں پہنچ گیا۔ جہاں لڑکی کے کپڑے

پھوئے تھے، یہاں میں نے جھک کر زمین کو دیکھا لیکن یہاں ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔ جس سے

ا کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے۔ عظیم خان نے ایک اور زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

میں نے جھلا کر کہا۔ ”کیوں؟ دانت کیوں پھاڑ رہے ہو؟“

”جناب جاسوسی فرما رہے تھے ناں، آپ کا کیا خیال تھا کہ آپ اس کے قدموں کے نشانات

ن کر کے آگے بڑھ جائیں گے۔“

”ہاں، میرا یہی خیال تھا، میں اس سے انکار نہیں کرتا۔“

”حضور وائی وہ بھی کوئی اونچی چیز ہی معلوم ہوتی ہے، آئیے ذرا آگے آئیے، نشانات یہاں

ن ہو سکتے، آگے مل جائیں، پھر ہم دونوں آگے بڑھنے لگے، لیکن حقیقت میں۔ مجھے اس وقت بڑی

ندگی اٹھانا پڑی تھی، جب کوئی ایک بھی نشان نہیں ملا تھا اور میدان صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے

پے پر غصے کے تاثرات تھے، میں نے کہا۔

”کبھت پھر بے وقوف بنا گئی۔“

”ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں اور اب مزید جاننے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے کیا

ہے؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عظیم خان کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔

”اسے قتل کرنے والا بھی کوئی ہوگا۔“

”تم یقین کرو، میں یہ ہی سوچ رہا تھا۔“

”تو پھر اب کیا کیا جائے؟“

”کچھ نہیں، میں اس لڑکی کے لیے دکھی ہوں، اب ہم ایسا کرتے ہیں کہ اس لڑکی کو اسی خانقاہ جلا دیتے ہیں۔“

”کیا؟“ میں نے چونک کر عظیم خان سے پوچھا۔

”جلا دیتے ہیں اس لڑکی کو۔“

”مطلب کیا ہے یا ر؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔“

”میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔“ عظیم خان نے کہا۔ اور اس کے بعد اس نے یہاں ایسی جمع شروع کر دیں، جو بآسانی جل سکتی تھیں، میں اس کی یہ کارروائی دیکھتا رہا، لیکن اس کی یہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھی، تھوڑی دیر تک عظیم خان ایسی چیزیں جمع کرتا رہا، ان کو اس نے لڑکی کے گرو جمع کر دیا تھا۔ پھر واقعی اس نے ان چیزوں کو آگ لگا دی، شعلے آہستہ تمام چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔ عظیم خان میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا تھا، پھر وہ خانقاہ ارکھل آیا اور ہم خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ گئے، میں نے عظیم خان سے کہا۔

”میرا خیال ہے، اب تم لڑکی کی جگہ لینے کی کوشش کر رہے ہو، عظیم خان ہنس پڑا، پھر بولا۔

”سمجھا نہیں۔“

”تم بھی اب پر اسرار حرکتیں کر رہے ہو۔“

”یار ایک بات بتاؤں۔“

”ہاں، بولو۔“

”تم بے حد طاقتور آدمی ہو۔“

”واقعی دل سے اعتراف کر رہا ہوں، کہ تمہاری جسمانی قوتوں کا میں بالکل مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”بلکہ کیا؟“

”لیکن تمہاری کھوپڑی میں کچھ نہیں ہے۔“

”آپ تو بہت ذہین آدمی ہیں۔“

”پہلے تمہیں اپنے آپ سے ذہین سمجھتا تھا، لیکن اب اپنے آپ کو تم سے ذہین سمجھ رہا ہوں۔“

”اس بے وقوفی کی وجہ۔“

”آؤ۔“

”کہاں؟“

”خانقاہ کی طرف۔“ میں نے عظیم خان سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

+++

اس بات کی امکانات میرے ذہن میں تھے کہ ممکن ہے لڑکی ہمیں دوبارہ خانقاہ میں چنانچہ ہم تھوڑی دیر کے بعد خانقاہ میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے ہم نے خانقاہ کے گوشے گوشے چھان مارا تھا لیکن وہ بوڑھی نظر آئی تھی۔ جس کے بارے میں باہر جا کر عظیم خان نے کہا تھا کہ بوڑھی نہیں، بلکہ کوئی نوجوان لڑکی ہے۔ اور اس کا جواب بھی پیش کیا تھا۔ غرض یہ کہ اس بار بھی خانقاہ میں داخل ہوئے، اس بات کا ہم بخوبی اندازہ لگا چکے تھے کہ خانقاہ میں کوئی جگہ اندر دا ہونے کیلئے ہے ایسا کوئی راستہ نہیں تھا، جس سے کوئی باہر نکل سکے، سامنے کا دروازہ بند کر دیا جائے خانقاہ بند ہو جاتی تھی، ہم اندر داخل ہوئے اور پھر خانقاہ کے اندرونی کمرے میں پہنچے تو ہمارے ذہنوں کو شدید جھٹکا لگا، وہاں پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی، جس کا پیٹ چاک کر دیا گیا تھا اور اس خون بہہ رہا تھا، کافی مقدار میں یہ خون بہہ چکا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی کسی نے اسے چھرا کر قتل کیا ہو، تھوڑے فاصلے پر ایک خون آلود چھرا بھی پڑا ہوا تھا۔ کچھ اور قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر ہمارے آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ یہ وہی لڑکی تھی، جو تھوڑی دیر پہلے جمیل میں نہا رہی تھی، عظیم خان نے ہونٹ سکر گئے، اس نے انفسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ بہت برا ہوا۔“

”مگر اسے قتل کس نے کیا؟“

”پتہ نہیں۔“ عظیم خان کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ اس کی نگاہیں لڑکی پر جمی ہوئی تھیں، مگر بھی بڑا انفسوس کر رہا تھا، عظیم خان نے کہا۔

”کاش یہ ہمیں اپنے بارے میں بتا دیتی، تو ہم اس کی مدد کرتے، بھلا ہمیں کیا پڑی تھی کہ اسے کوئی نقصان پہنچاتے۔“

”واقعی یار بڑا انفسوس ہوا، یہ جان کر ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ۔“

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے، اچانک ہی میں نے چونک کر کہا۔

”عظیم خان!“

”ہاں۔“

”وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لڑکی اب بھی زندہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”لڑکی اب بھی زندہ ہے، مطلب وہی ہے، جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”اور وہ لاش؟“

”لڑکی ہی کی ہے، اور یہ لڑکی جانتے ہو کون ہے؟“

”جی نہیں میں نہیں جانتا۔“

”سو فیصدی وہی لڑکی ہے، جو ہمیں زخمی حالت میں ملی تھی اور شاید اسی وقت بھی اسے مرنا

گھوڑا اور کا رہا، باقی اس نے ڈرامہ کیا تھا۔“

”عظیم خان بہت اونچا اڑنے کی کوشش کر رہے ہو، جو کچھ ہوگا، ابھی دیکھتے رہنا، وہ اس دن

بھی لاش نہیں تھی، بلکہ اس کا زخم ایسا ہی تھا جیسے اس وقت ہم نے اسے اپناج لڑکی کی شکل دے

دیکھا تھا، وہ کوئی بہت ہی بڑی شاطرہ ہے، ابھی عظیم خان یہ جملہ ادا کرنے پایا تھا کہ خانقاہ

دروازے سے کوئی باہر نکلا، دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی اور باہر نکلنے والا ہمارے پاس پہنچا

رک گیا تھا، پھر اس کی آواز ابھری۔

”رب عظیم تمہیں غارت کرے۔“ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہی لڑکی تھی، واقعی وہی لڑکی تھی

جو ہمیں زخمی حالت میں ملی تھی، کمر پر دو دنوں کا تھر رکھے کھڑی تھی، پھر اس نے کہا۔

”تم نے خانقاہ کو آگ لگا دی، میرا ٹھکانہ جلا دیا تم نے۔“

”روحوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا، ڈیئر، تم ایک روح ہو، ایک بھلی ہوئی آوارہ روح، جو کہ

اور کسی بھی جگہ اپنے آپ کو منتقل کر سکتی ہے۔ تمہیں بھلا ٹھکانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”جنگلی ہو، جاہل ہو، کہینے بھی ہو۔“

”جانتی ہو، ان گالیوں کے جواب میں تمہارے ان گلابی رخساروں پر اتنے تھپڑ لگائے جائے

ہیں کہ ان رنگ سرخ ہو جائے۔“

”ہاں، ہاں، مار لو نا، مارنے ہی کے شوقین ہوتا۔“

”تو پھر تم نے یہ تمام حرکتیں کیوں کی ہیں؟“

”گڈ، گڈ ویری گڈ، اب کیا پروگرام ہے، بے وقوف بنانے کی کوئی نئی کوشش۔“

”نہیں، سنو، میں تم سے تعاون کرنا چاہتی ہوں، کیا سمجھ کر دو گے مجھ سے تعاون؟“

”پتہ نہیں، تم تعاون کسے کہتے ہو؟“ عظیم خان بولا۔ لڑکی نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آؤ، میرے ساتھ۔“ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ آگے بڑھ گئے، خانقاہ کے دروازے سے شعلوں کی زبانیں باہر لپک رہی تھیں۔

لڑکی مجھ سے چند قدم آگے چل رہی تھی اور میں اس کا جائزہ لے رہا تھا، دلکش بدن کی مالک

فی، حالانکہ جو لباس اس نے پہنا ہوا تھا، وہ ایسا نہیں تھا کہ جس سے اس کا جسم نمایاں ہو، لیکن ہوا

لے آوارہ جموٹے جب اس کے لباس کو اس کے جسم سے چپکا دیتے تھے، تو اس کے بدن کی لطافتیں

ماپاں ہو جاتی تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ وہ کوئی بات کرے، وہ خاموشی سے آگے بڑھ رہی تھی، پھر

اں نے کافی فاصلہ طے کر لیا اور یہ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جمیل کے مخالف سمت پہنچ گئی، یہاں

ای بڑی گھوری چٹانیں بکھری ہوئی تھیں، جن کے اطراف میں سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے، یہ علاقہ تو

بہت کھل بڑا ہی خوبصورت تھا، میں انتظار کرتا رہا کہ وہ رکے۔ پھر اپنے بارے میں بتائے، پھر اچانک

ٹٹ کر دیکھا اور کہا۔

”میرا نام لائونٹا ہے۔“ پھر وہ ایک دم چونک پڑی، اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے

ہا۔

”تمہارا ساتھی کہاں ہے؟“ اس کے ان الفاظ پر میں چونکا، میں نے پلٹ کر حیرانی سے پیچھے

لہا، عظیم خان موجود نہیں تھا، میں لڑکی کی طرف آنکھیں پھاڑنے لگا۔ لیکن اچانک ہی میں نے

راتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی، جس جگہ میں کھڑا تھا، یہاں ایک بڑی سی چٹان نظر آ رہی تھی،

میں نے دوڑ کر چٹان کی دوسری طرف دیکھا، دوسری جانب کچھ گہرائیاں تھیں، لیکن زیادہ نہیں، ابھی

باہر ہی جمناک رہا تھا کہ اچانک دوڑتے آدمیوں کی آوازیں قریب پہنچیں اور اس کے بعد مجھ پر

افائر ہوئے، زندگی بچانے کا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ برق رفتاری سے اس کھائی

اگود جاؤں۔ کھائی میں اس طرح کود کر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا، خاصی چوٹ لگی تھی اور لڑھکتا ہوا

تک چلا گیا تھا۔

لیکن زیادہ آگے نہیں گیا تھا کہ وہ میرے سر پر پہنچ گئے، جنہوں نے مجھ پر فائرنگ کی تھی اور

کے قدموں کی آواز میں نے سنی تھی، بہت ہی چوڑے چٹکے، جسموں کے مالک، خطرناک صورت

لے لوگ تھے، جن کی شخصیت سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت بے رحم اور کوئی خطرناک عمل کر

لے والے ہیں۔ انہوں نے بندوقوں کی نالیاں میرے بدن سے لگا دیں۔ میرے تن بدن میں

لگ رہی تھی۔ میں نے ان کو دیکھا، ان کی تعداد چار تھی، پھر میں غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اور تمہیں یہ اندازہ ہے کہ تمہیں تمہاری اس حرکت کا کیا نتیجہ مل سکتا ہے، ہٹاؤ بندوقیں



بچے کیلئے زنگ بھاگنا شروع کر دیا، پھر مجھے ایک بڑی چٹان کی آڑ مل گئی اور اسکے پیچھے پہنچ کر سب سے پہلے میں نے بندوق سیدھی کی اور پھر اپنی طرف دوڑ کر آنے والوں میں سے ایک لٹکانہ بنالیا۔ اپنے ایک ساتھی کے گرتے ہی انہیں عقل آگئی اور پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے۔ اب ملٹری نگاہوں سے ان کو دیکھ رہا تھا، جو سامنے سے آ رہے تھے لیکن اس وقت مجھے اپنے ہاتھیں سمت مراہٹ محسوس ہوئی اور میں سانپ کی طرح پلٹ پڑا۔

اگر وہ سریلی آواز میرے کانوں میں ابھرتی تو یقینی طور پر وہ بھی گولی کا شکار ہو جاتی، یہ وہی لٹکان لڑکی تھی، جس نے اپنا نام لائونا بتایا تھا، چنانچہ لائونا دوڑتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی اور اس نے اپنے ہاتھ دھوئے کہا۔

”اس طرح تم ان کے چنگل سے نہیں نکل سکو گے، مجھے اپنی گرفت میں لے لو اور اپنی ڈھال اٹھو، ان سے کہو کہ وہ اپنی بندوقیں پھینک دیں، ورنہ تم مجھے مار ڈالو گے۔“ لڑکی کے الفاظ نے ایک دہرے ذہن کو عجیب سے چکر میں ڈال دیا۔ پھر میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کون ہو تم؟“

”خاناہ کی بیٹی وہ لوگ میری زندگی بچانے کیلئے بندوقیں پھینک دیں گے۔“

”لڑکی، تم پھر کوئی نئی چال چل رہی ہو۔“

”دیکھو میں جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو، ورنہ۔“ لڑکی نے کہا۔ اور اس بار میں نے شدت نفرت سے اس کے خوبصورت ہال اپنی ٹانگیں میں جکڑ لئے۔ رائفل کا بٹ اپنی بغل میں دبا کر میں نے ان کو دیکھا، جو زمین پر چھپکی کی طرح رہ جاتے ہوئے اس سمت آ رہے تھے، چنانچہ میں نے بندوق اٹھ کر لی، اور ان میں سے ایک نشانہ لینے لگا، لیکن یہ بھول گیا کہ شیطان لڑکی کوئی عمل کر سکتی ہے، اوقات میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، ایسی زوردار ضرب لگی تھی، میرے سر کے پچھلے حصے میں ایسا بیان نہیں کر سکتا، چکرانی ہوئی آنکھوں سے میں نے لڑکی کی جانب دیکھا۔ جو ہاتھ میں پکڑے ہوئے پھر سے میرے سر پر دوسری ضرب لگانے کی کوشش کر رہی تھی، پھر دوسری ضرب لگی اور بندوق سے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔

اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا تھا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ہوش کب آیا تھا، البتہ ہوش آیا، تو تیز دھوپ اور گرم ہوا میرے ارد گرد جھیلی ہوئی تھی، میں نے آنکھیں کھول کر اوپر نگاہ اٹھی۔ سورج میرے سر پر چمک رہا تھا، اور اس کی چش اور تیز روشنی مجھے تیر کی طرح اپنی آنکھوں میں لٹکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی تو سر کی پشت کے زخم نے

بھاؤ۔“ لیکن میرے ان الفاظ پر ان میں سے ایک نے بندوق کی نال میرے پیٹ میں چھو۔ ہوئے کہا۔

”اب تم اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ، ورنہ بدن کے سوراخ گئے بھی نہیں جاسکیں گے۔“ اس کے لمے میں جس قدر غراہٹ تھی، اس کا اندازہ ایک لمحے میں مجھے ہو گیا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں، اسے کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ البتہ یہ احساس مجھے ہوا تھا کہ ان کے چہرے۔ نفوش مقامی لوگوں جیسے نہیں ہیں۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے عظیم خان پر بھی غصہ آ رہا تھا اور اپنی حماقت بھی کہ اس طرح آسانی سے ان کے چنگل میں پھنس گیا، غلطی میری تھی، مجھے ہوشیار رہنا چاہیے تو مسلسل دھوکے کھا رہا ہوں، اس بات کے امکانات بھی ہیں کہ یہ سب کچھ بھی لڑکی ہی کا کیا دھرا ہو۔ بس اس بات نے ذہن پر دیوانگی سوار کر دی، میں بندوق والے کی نال پکڑی اور دوسرے لمحے زور سے جھٹکا دیا، شاید کچھ زیادہ ہی طاقت صرف ہو گئی تھی کہ بندوق والا میرے سر سے گزر دوسرے جانب گرا تھا، بقیہ تین افراد نے بدحواسی میں گولی چلا دی، گولیاں چلیں اور ہال ہال بھاگے، ہوئی بندوق چونکہ میں نے نال کی طرف سے پکڑی ہوئی تھی، میں اسے سیدھا کئے بغیر استعمال نہ کر سکتا تھا، میں نے زمین پر لوٹ لگائی اور بندوق کو لاٹھی کی طرح گھمایا، ان میں سے دو کے پاؤ بندوق کی پلینٹ میں آ گئے اور وہ بری طرح گرے، لیکن تیسرے نے اچھل کر خود کو بچالیا تھا اور تھوہوئے دوبارہ گولی چلا دی تھی۔ البتہ میں ہوشیار ہو چکا تھا، چنانچہ گولی کی آواز کے ساتھ ہی اپنی چھوڑ دی۔

اس لئے گولی مجھے تو نہ لگ سکی، البتہ وہ جس کی بندوق میرے ہاتھ میں تھی اور میرے سر۔ گزر کر دوسری طرف گرا تھا اور خود کو بچانے کی کوشش میں تھا، اس گولی کی زد میں آ گیا، گولی نے اس کے سر کے چھترے اڑا دیئے تھے، میری نگاہ بے اختیار اس لڑکی کی جانب اٹھ گئی، جس نے یہ کم شروع کیا تھا۔ پہلے تو میرے ذہن میں یہی سب کچھ تھا کہ ممکن ہے، یہ لڑکی ہی کے آدمی ہوں یہاں لا کر اس نے ہمیں اپنے چنگل میں پھنسانے کی کوشش کی ہو، لیکن اب میں نے اسے دیکھا اور اپنی جگہ ہکا بکا کھڑی ہوئی تھی، سب کچھ دیکھ رہی تھی، میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں جان بچانے کے لئے دوڑ پڑوں۔

چنانچہ میں نے سنبھل کر ایک چٹان کے عقب میں چھلانگ لگا دی، میری بندوق کی زد میں آ جولوگ گرے تھے، وہ اب سنبھل کر کھڑے ہو گئے تھے، انہوں نے بھاگتے ہوئے مجھ پر اندھا د گولیاں برسانا شروع کر دیں لیکن اب میں ان کے نشانے پر نہیں آ سکتا تھا، میں نے ان کے نشا

احتجاج کیا اور میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔

اب میری نگاہوں کے زاویے بدل گئے تھے اور میرے سامنے کوئی لمبی لمبی چیز نظر آ رہی تھی میں نے غور سے دیکھا، تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لکڑی کے موٹے موٹے تنے ہیں۔ درختوں کے تنوں کو جوڑ جوڑ کھنجر بنائے گئے تھے اور ایسے ہی ایک کھنجرے میں مجھے قید کر دیا گیا تھا، لکڑی کے تنے چاروں طرف سے میرے گرد احاطہ کئے ہوئے تھے، چھت بھی انہی تنوں کی بنی ہوئی تھی اور دھوپ سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا، دروازے کو لکڑی کے موٹے حصے سے بند کیا گیا تھا۔

میں نے حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ میرے قرب و جوار میں ایسے بہت۔ کھنجرے بنے ہوئے تھے اور ان میں سے کچھ کھنجروں میں بے شمار افراد قید نظر آ رہے تھے۔ میں حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ نہ جانے میں کس کا قیدی تھا۔ رفتہ رفتہ حواس جاگتے جا رہے تھے اور گزرتے ہوئے لمحات مجھے یاد آ رہے تھے میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کھنجروں میں خان کو تلاش کیا۔ لیکن عظیم خان نہیں آ رہا تھا، مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگا۔ مجھ سے بہتر تو خان ہی رہا تھا، جس نے صورتحال کی نزاکت کو سمجھ کر اسی وقت اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا، جب لڑکی کے ساتھ آگے جا رہا تھا۔ واقعی بیشتر موقعوں پر اس نے مجھ سے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیا تھا میں تو اس لڑکی کے چال میں پھنس گیا تھا لیکن عظیم خان آسانی سے اس کے چنگل سے نکل گیا تھا اب اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ لڑکی نے میرے سر پر حملہ کر کے ان لوگوں کو مجھ سے ہٹا دلائی تھی، جو سو فیصدی اسی کے ساتھ تھے۔ میرے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

”قسم کھاتا ہوں، اگر تم دوبارہ نظر آ گئیں، تو میں تیرے سر کے تمام بال صاف کر دوں گا، ناک اور کان کاٹ دوں گا اور اس کے بعد میں دیکھوں گا کہ تو کتنی ذہین ہے۔“ لیکن اس طرح پر غصہ کرتے رہنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہاں پر توجہ دینے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ البتہ آنکھیں ان لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جو مختصر سے لباسوں میں لمبوس ہڈیوں کی مالائیں پہنے، ہاتھوں بھالے کھنجر اور کھانڈیاں لٹکائے، ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے، ان میں سے کبھی میری جانب متوجہ نہ تھا۔

میں انہیں دیکھتا رہا اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھنجروں میں ان قیدیوں کو بھی جو بے چارے تپتی ہوئی دھوپ اور سورج کی کرنوں میں مر رہے تھے، یہ بدحال لوگ مجھے کون تھے، کچھ سمجھ نہ رہا تھا، زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کچھ لوگوں کا غول مجھے اپنی طرف آتا ہوا محسوس ہوا، مہینا یہ سمت آ رہے تھے، سب سے آگے ایک بھرا ہوا دیو تھا، اتنے چوڑے چپکے بدن کا مالک، گوشت

اواں سے سجا ہوا کہ دیکھ کر خوف آئے، وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا اور چیخا چلاتا بھی مار رہا تھا۔

لیکن اس کے منہ سے نکلنے والی آواز میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، تھوڑے ہی فاصلے پر میں نے کچھ گھوڑے سواروں کو دیکھا، میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ لوگ پھرے ہوئے میری جانب لپٹ آ رہے ہیں، پھر سب سے پہلے چوڑا شخص کھنجرے کے قریب پہنچا تھا اور اس نے درختوں کے تنوں میں گلائیاں کھسک کر ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے غرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

”اودہ کتے او، خنزیر باہر نکل، میں تیری ہڈیاں چبانے کے لئے بے چین ہوں اور رب عظیم کی لم میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، تو نے میری بھائی کو ہلاک کیا ہے، میں تیری آنکھوں کے حلقوں میں لپٹا ڈال کر سب سے پہلے انہیں روشنی سے محروم کر دوں گا، پھر تیرے بدن کی چند پیاں اڑا دوں گا، میری ان ہڈیوں کو بازوؤں میں دبوچ کر سرمہ بنا دوں گا، زندہ نہیں چھوڑوں گا میں تجھے۔“ وہ اواں کی طرح چیخ رہا تھا اور میں اس کا جائزہ لے رہا تھا، البتہ ابھی تو میں اس کے ہاتھوں کی زد میں نہ تھا، میں نے کہا۔

”بے وقوف کون تھا تیرا بھائی؟ اور کب میرے ہاتھوں مارا کیا؟“

”باہر نکل، باہر نکل، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا، آ تو سہی ذرا، میرے چنگل میں۔“ جواب میں ہنس پڑا تھا۔ میں نے کہا۔

”مجھے باہر تو ہی نکال سکتا ہے، تو کوشش نہیں کرنا تا کہ تیری خواہش پوری ہو جائے۔“ اسی ناگھوڑے سوار کھنجرے کے پاس پہنچ گئے اور انہیں دیکھ کر مجمع کے افراد پیچھے ہو گئے، یہ لوگ بھی اہل تشدد ہی معلوم ہوتے تھے، لیکن اسی مختصر لباس اور وحشی فطرت کے ساتھ، سمجھ میں نہیں آ رہا نا لوگ ہیں، ان کے حلیوں سے وحشت نکلتی تھی، تنک دھڑنگ رہنے والے یہ لوگ، تہذیب سے معلوم ہوتے تھے، پھر ایک دراز قد آدمی گھوڑے سے اترا اور اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا تو پاگل ہو گیا ہے، زودنا، موت آگئی ہے تیری، مجھ سے رابطہ کرنے کے بجائے تو میرے کے پاس آیا ہے، تو جانتا ہے تو کیا بکواس کر رہا ہے۔“

جس کو زودنا کہا گیا تھا، وہ واپس پلٹا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے سردار، میں اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکتا، اسے مجھے دے، اسے مجھے دے دے، اس نے میری زندگی کا سہارا جمین لیا ہے، آہ اس نے میرے

کہیں، کہیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور اچھی خاصی پریشانیاں بھی اٹھائیں لیکن ایک فطرت بھرے اندر تھی، جب مجھ پر دیوانگی سوار ہوتی تھی تو میں زمانہ قدیم کا وحشی بن جاتا تھا۔ عظیم خان میری لبست محل سے کام لینے کا عادی تھی، لیکن میں جب کبھی حالات میری مرضی کے خلاف ہو جاتے تو محل سے بے گانہ ہو جاتے اور اس وقت میری وہ وحشتیں عروج پر پہنچ جاتی تھیں۔

بہر حال جیسے ہی میں بنجرے سے باہر نکلا، وہ وحشی مجھ پر ٹوٹ پڑا، گوشت کا یہ پہاڑ میری ہاب بڑھا ہی تھا کہ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور وہ آگے بڑھ کر پوری قوت سے ستونوں والے بنجرے سے ٹکرایا لیکن فوراً ہی سانپ کی طرح پلٹ پڑا، میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں موجود لوگوں نے دلچسپی سے مجھے دیکھتے ہوئے جگہ چھوڑ دی تھی، یہاں تک کہ وہ شخص جسے سردار کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، پیچھے ہٹ گیا تھا، میں نے اس سے کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ اپنے بھائی کے قتل کا الزام مجھ پر کیوں لگا رہا ہے، وہ کون تھا اور کیا میں نے اسے قتل کیا یا نہیں، میں نہیں جانتا، لیکن بہر حال یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ایک ایسے شخص کو قاتل کہہ کر مجھ سے بدلہ لیا جا رہا ہے۔ جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس نے کسے قتل کیا۔“ میں یہ جملے ادا کر بھی نہیں پایا تھا کہ زرونا پوری قوت سے ایک بار پھر میرے پاس پہنچا اور اس نے میرے سینے پر ٹکڑ مارنے کی کوشش کی، لیکن اس بار میں نے اس کی گردن پر ہاتھ جمایا اور اسے بالکل پیچھے ہٹا دیا، جیسے تین میں مل فائٹر جیسے کو اپنے جسم کے پاس سے گزار دیتے ہیں، وہ ایک بار پھر پیچھے نکل گیا۔

اور اس بار اس نے پوری قوت سے تیسرا حملہ کیا تھا، اور پھر جب یہ تیسرا حملہ بھی ناکام رہا تو اس نے ایک طرف رکھا ہوا کھانا اٹھا لیا، جو اس کے ساتھی نے شاید اسی کے لئے رکھا تھا۔ کھانسی کی آواز نہ تھی، لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کے کچھ ساتھی آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ دیو قامت شخص نے کھانا اٹھا لیا اور اسے گھماتا ہوا میری جانب بڑھنے لگا، پھر جیسے ہی میرے قریب پہنچا میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ پر لات ماری اور اس کے فوراً بعد گھوم کر ایک بھرپور لات اس کی گردن پر رسید کی اور وہ نیچے جا گرا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی اٹھ کر اس نے اپنے ساتھی سے پستول مانگا تھا اور اس کے ساتھی نے فوراً ہی اپنی پستول اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اب میں اس پر مارشل آرٹس کے داؤ استعمال کروں، ایک حیرت جج کے ساتھ میں نے دونوں ہاتھ سیدھے کئے اور پھر زمین پر بیٹھ کر لوٹ لگائی اور ایک پاؤں اوپر اٹھا دیا، پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا، ایک آدمی نے آگے بڑھ کر پستول اٹھا لیا اور میرا نشانہ باندھا، تو سردار نے غصیلی آواز میں کہا۔

اکھوتے بھائی کو قتل کر دیا ہے، میں تنہا رہ گیا ہوں، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا، اگر میں نے اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہ کیا، تو میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ دیکھ سردار میں نے ہمیشہ تیری لالا کی ہے، تیری خدمت کی ہے، اسے مجھے دے دے سردار، اسے مجھے دے دے، اس آدمی کو مجھے دے دے۔“

”ایک آدمی کی قیمت جانتا ہے تو۔“ اس شخص نے کہا۔

”ساری زندگی تیری غلامی کرتا رہوں گا، بس اسے میرے حوالے کر دے۔“

”پاگل ہو رہا ہے، تو پاگل ہو رہا ہے، میں تیرے دکھ میں برابر کا شریک ہوں، لیکن ایسا نہ کہ پہلے بھی تو ایک آدمی کو اپنے ہاتھوں سے فرار کر چکا ہوں، تو نے تو نئے میں اس شخص کو یہاں ۵ بھانگے کا موقع فراہم کیا تھا، میں نے تجھے معاف کر دیا تھا۔ اس بار آدمی کو میرے ہاتھوں سے ہلاک نہ کر۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں، کہ تو اپنا یہ ارادہ ترک کر دے۔“

”نہیں سردار، ایسا نہ کہہ، میں تیری یہ بات نہیں مان سکوں گا، اگر تو ایسا نہیں کر سکتا تو ۵ میرے سینے میں اتار دے، اپنے پستول کی ایک گولی مجھے بھی مار دے۔ لیکن مجھے میری اس قسم ۵ محروم نہ کر، جو میں نے اپنی بھائی کے قاتل سے بدلہ لینے کیلئے کھائی ہے۔“ زرونا نے کہا۔

”یہ پاگل ہو گیا ہے، دیکھو اسے سمجھاؤ۔“ جس شخص کو سردار کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، اس دوسروں سے کہا۔

”ہم نے اسے بہت سمجھایا ہے سردار، یہ جانتا ہے کہ تم کبھی اس کی اجازت نہیں دو گے لہذا پھر بھی نہیں مانتا۔ کہتا ہے، اگر ایسا نہ ہوا تو یہ خودکشی کر لے گا۔“

”یہ میرا نقصان کر رہا ہے، خیر اگر یہ ایسا ہی چاہتا ہے، تو یہ ہی سہی، یہ میرا بہت اچھا ساتھی میں اس کی بات ماننے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ اور اس بعد وہ شخص خوشی سے کھڑا ہو گیا۔ سردار نے اجازت دے دی تھی، تو پھر بھلا دوسرے لوگوں پریشانی ہوتی، تو یہ پستول آدمی مجھے خون آشام لگا ہوں سے دیکھتا ہوا، میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اور سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس بنجرے کا تالا کھول دیا، جس میں مجھے قید کیا گیا تھا، پھر وہ ہوئی آواز میں بولا۔

”باہر نکل کئے، باہر نکل، اور دیکھ موت کیسی دلکش ہوتی ہے۔“ شاید آپ لوگ اسے یہ سنا ہی سمجھیں، اپنے آپ پر ناز کرنے کی کوشش سمجھیں، یا پھر یہ سمجھیں کہ میں اپنے آپ کو کوئی سمجھتا ہوں، زندگی میں بے شمار اور پریشان کن واقعات پیش آئے، ہر جگہ فتح حاصل نہیں ہوئی

”نہیں، پہلی بات تو یہ کہ کوئی دوسرا مداخلت نہیں کرے گا، دوسری بات یہ کہ پستول استعمال نہیں ہوگا۔ خبردار اب اسے پستول نہ دیا جائے۔“ وہ شخص ایک دم پیچھے ہٹ گیا، لیکن زروٹانے ایک بار پھر ایک چھوٹی کپھاڑی اٹھالی تھی، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اب وہ سنبھل گیا ہو، یہ دو تین وار ناکام ہو جانے کے بعد میری پھرتی اور مستعدی دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ صورتحال مختلف ہے، لیکن مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس طاقتور آدمی کے ساتھ پھرتی سے نمٹا جائے تو اپنی طاقت کا لوہا بھی منوایا جاسکتا ہے۔ لیکن چالاکی سے کام لے کر اور جو جی اس بار اس نے کپھاڑی گھما کر مجھ پر وار کیا، میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور اس کے بعد پھرتی سے اسے موڑ کر ایک گھونسا اس کے منہ پر رسید کیا، وہ اچھل کر پیچھے گر آیا اور لوگوں کے منہ سے آوازیں نکل گئیں، یہ بھی مارشل آرٹ کا کارنامہ تھا، درنگ معنوں میں اس کے جسم کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے خود بھی یہ اندازہ تھا کہ میں ایک پہاڑ سے گھرا ہوا ہوں، چنانچہ پہاڑ کو پہاڑ ہی سمجھ کر مار رہا تھا، چونکہ اسے تین چار بار میرے ہاتھوں مار کھانا پڑی تھی، اس لئے وہ اور زیادہ خوفناک ہو گیا تھا، اس بار جب کہ نیچے گرا تو ایک پتھر اس کے منہ پر لگا تھا اور اس کی پیشانی پھٹ گئی تھی، خون بھی بہتا ہوا اس کے پورے چہرے پر بکھریا تھا اور اس کی آنکھیں بھی اس خون سے متاثر ہوئی تھیں، جن کی وجہ سے اسے بار بار آنکھیں کھولنی اور بند کرنی پڑ رہی تھیں۔

اس بار اس نے بہت ہی طوفانی انداز میں ہاتھ بڑھا کر مجھ پر کپھاڑی سے وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں پیچھے ہٹ گیا اور جیسے ہی وہ مجھ پر جھکا، جھک کر آگے آیا، میں نے بھرپور قوت سے اسے پاؤں کی ٹھوکرا کر اس کے منہ پر ماری، میرے پاؤں کو بھی مزہ ہی آگیا تھا لیکن اس کا منہ بھی خون سے لہر گیا تھا اور اب میرے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے اٹھنے نہ دوں، آخر کب تک میں اس کے حملوں سے بچ سکوں گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ مذاق ہی مذاق میں کھوپڑی ترخ جائے، یا گردن کندھوں کا ساتھ چھوڑ دے۔

چنانچہ اس بار میں نے اس پر اس طرح حملہ کیا، میں نے اس کپھاڑی والے ہاتھ کو زمین پر لگا اور اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر مضبوط گھونسوں کی بارش اس کے چہرے پر کرنے لگا، وہ مجھے خود پرے دھکیلنے کی فکر میں تھا لیکن میری کوششوں نے اس کی قوت مدافعت ختم کر دی اور پھر میں نے اس کے کپھاڑی والے ہاتھ پر ضرب لگائی اور اس کا پیچہ کھل گیا، میں نے کپھاڑی کو ٹھوکرا ماری اور جیسے ہی ”اچھلی، میں نے اسے لپک لیا، اب میں اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا اور کپھاڑی میرے ہاتھ میں دبلی ہوئی تھی، کچھ لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس بات پر یقین کر کے آنکھیں کھولنے انتظار کرنے لگے کمر مرنے والے کے حلق سے آخری جھج لکے۔ میں نے کپھاڑی کو بلند کیا، کسی نے کوا

داخلت نہیں کی تھی۔ کپھاڑی آہستہ آہستہ نیچے جھکی اور پھر اس کے بعد میں اس کے قریب سے ہٹ گیا۔

سب لوگ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔



میں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میں نہیں جانتا کہ اپنے بھائی کے قتل کا الزام یہ مجھ پر کیوں لگا رہا ہے، جب کہ میں نے کسی کو لال نہیں کیا اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا بھائی کون ہے، یا کون تھا، لیکن میں اس پر فتح حاصل کر کے بھی قتل نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اگر یہ بے وقوفی کر رہا ہے (میں یہ بے وقوفی نہیں کرنا چاہتا۔“ سردار نے اسے دیکھا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر بولا۔

”اسے بند کر دو۔“ اور اس کے بعد واپس اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس چلا گیا، جیسے ہی وہ لگا ہوں سے اوجھل ہوا، وہ لوگ جو آس پاس بکھرے ہوئے تھے، اس آدمی کو سنبھالنے لگے اور ان میں سے کچھ نے مجھے کنہرے میں دھکیل دیا۔ چونکہ میں صورتحال سے کوئی آگاہی نہیں رکھتا تھا، اس لئے ابھی کوئی مداخلت بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، میں خاموشی سے کنہرے میں لٹ گیا تھا لیکن یہ جو ہنگامہ ہوا تھا، یہ میری سمجھ سے باہر تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، کچھ بھی نہیں جانتا تھا میں۔

پھر دوپہر کے بعد جب سورج ڈھلا تو مجھے وہاں سے ایک اور خیمے میں منتقل کر دیا گیا۔

مرحال مجھے اس صورتحال سے بڑی پریشانی تھی، خاص طور سے اس لئے کہ عظیم خان میرے ساتھ میں تھا۔ اس سے زیادہ غصہ مجھے اس شیطان لڑکی پر تھا، ہم نے تو اسے ہر طرح کا تحفظ دیا تھا لیکن مانے گزب کڑوا لی تھی۔ اس دوران میں یہ جائزہ لے رہا تھا کہ اگر میں ان لوگوں کے چنگل سے فرار کرنے کی کوشش کروں اور اپنے دو چار محافظوں کو مار کر یہاں سے نکل جاؤں تو مناسب نہیں ہوگا، وگرنہ اس سے یہ انداز بھی نہیں لگایا جاسکے گا کہ یہ لوگ مجھے یہاں کیوں لائے تھے اور ان کا چکر کیا ہے۔ البتہ یہ جگہ جہاں مجھے قید کیا گیا تھا، پہاڑوں میں بنا ہوا ایک غار تھا، جو کافی عظیم الشان تھا اور ان تک لانے کیلئے مجھے ایک لمبی سرنگ سے گزارا گیا تھا، پھر میں ایک سلاخوں والے دروازے اندر داخل کر دیا گیا تھا، اس غار کے علاوہ ایک اور غار بھی موجود تھا، جس میں کئی قیدی زمین پر بے ہوش سو رہے تھے، مجھے یہاں لانے والے دروازہ بند کر کے چلے گئے اور میں ان قیدیوں کو بے لگا، پھر میں اس دوسرے سوراخ کی جانب بڑھ گیا۔

”تم یہاں کب سے ہو؟“

”میں نے کہا ناں، کیسے بتا سکتا ہوں، البتہ اتنا بتا سکتا ہوں کہ جب مجھے یہاں لایا گیا تو زمین  
اگل سے جل تھل تھی، یعنی وہ موسم بارشوں کا موسم تھا۔“

”کون سے قبیلے کے باشندے ہو تم؟“

”پورب قبیلہ تھا میرا۔“

”وہاں کیا کرتے تھے؟“

”بکریاں چراتا تھا۔“

”ان کے قبضے میں کیسے آ گئے؟“

”وہ کالی بھیڑ جس نے میری نقدیر میں سیاہیاں بھر دیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کالی دھاریاں تھیں، ان کے بدن پر لیکن میں نے نہ سوچا اور اسے پکڑنے دوڑ پڑا، پھر جب

ایک پہاڑی کی آڑ میں پہنچا تو وہاں یہ لوگ پہلے سے موجود تھے، انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور یہاں پہنچا  
ا۔“

”تم چمدا ہے تھے؟“

”ہاں۔“

”بھیڑیں کہاں گئیں؟“

”جہنم میں۔“

”کیا مطلب؟“

”کیوں میرے کان کھا رہے ہو، مجھے اپنا گھریا دیا جاتا ہے، جب میں ماضی یاد کرتا ہوں۔“ وہ

انے والی آوازیں بولا۔

”نہیں خود کو سننا لو! اور مجھ سے باتیں کرو، مجھ سے باتیں کرنا ہو سکتا ہے تمہارے حق میں

ندہ ہو۔“ اس نے ایک شخصڑی سانس لی، تو میں نے پوچھا۔

”یہاں کتنے قیدی موجود ہیں؟“

”کیا تمہیں گننا آتا ہے؟“

”ہم ایک دوسرے کو گنتے نہیں ہے، بس ان کی شکلیں دیکھتے ہیں اور اپنے گھریا دکر کے روتے

اندرا داخل ہوا، تو آگے روشنی نظر آئی اور میں اس روشن جگہ پہنچ گیا، غار کی چھت میں مشعلیں  
روشن تھیں اور چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے یہ مشعلیں اوپر نصب کی گئی تھیں، اس غار میں پہلے  
سوراخ تھے اور ہر سوراخ کے دوسری طرف سے انسانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، نجانے یہ  
کتنی وسعت میں پھیلے ہوئے تھے، لگتا تھا، جیسے پورا پہاڑ اندر سے کھوکھلا ہوا ہو اور اس میں انسانوں  
قید کر دیا گیا ہو۔ دلچسپ بات یہ بھی کہ پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں تھا اس غار میں ہوں، لہذا  
چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچنا میرے لئے مشکل ثابت نہیں ہوا۔

”میں کچھ دیر سوچتا رہا اور اس کے بعد آگے بڑھ کر ان قیدیوں کے پاس پہنچ گیا، جو غار کی  
دیوار سے لگے بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے میری جانب توجہ نہیں دی تھی، وہ اس طرح ہر سوراخ  
اور خاموش تھے، جیسے یہ ہی ان کی قیام گاہ ہو، میں جس شخص کے پاس جا کر بیٹھا تھا، اس نے گردن  
تک نہیں اٹھائی تھی، پھر میں نے خود ہی اسے مخاطب کیا اور کہا۔

”سنو۔“ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر شخصڑی سانس لے کر گردن جھکا لی۔

”میں تم ہی سے بات کر رہا ہوں۔“

”یہاں کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا۔“ وہ اداس لہجے میں بولا۔

”کیوں؟“

”میں نے کہا ناں، بات کرے گا تو وجہ بھی بتائے گا۔“

”دیکھو! میں تم سے مخاطب ہوں اور یہ بہت بری بات ہے کہ انسان، انسان کی بات کا جواب

نہ دے۔“

”انسان۔“ وہ تلخ انداز میں ہنسا۔

”ہاں۔“

”تم اب بھی خود کو انسان سمجھتے ہو۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اس دشت ناک ماحول میں انسان تو نہیں رہ سکتے۔ مجھے تعجب ہے یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ اہل  
صورتحال کا اندازہ ہوا ہو اور تم اب بھی خود کو انسان سمجھ رہے ہو، لیکن کوئی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ تم لو  
کو انسان سمجھنا بھول جاؤ گے۔“

”کیوں.....؟“

”کیونکہ یہاں چاند اترتا ہے، نہ سورج۔ تاریکی وقت نہیں بتاتی، یہاں موسموں کا اندازہ ہو

لمرے ہوئے تھے، سرنگوں کے قدرتی جال ادھر سے ادھر پھیلے ہوئے تھے اور یہ ایک بے شمار قیدیوں کا لہذا خانہ تھا۔ پھر یہاں مجھے پہلی رات گزر گئی۔ دوسری صبح قیدیوں کو کھانا تقسیم کیا گیا، دو وقت کھانا دیا ہاتا تھا اور جو کچھ دیا جاتا تھا، اس کے بارے میں سنگھو نے واقعی صبح کہا تھا۔ موٹی موٹی سادی چاول کی دہلیاں اور اس کے ساتھ ہی کسی طرح کی پکی ہوئی گھاس جس میں نمک ہوتا تھا، نہ مرچ، لیکن ایک ت ہے کہ کسی بھی چیز کا اگر مزہ لیا جائے اور وہ تبدیل ہو تو بڑی عمدہ لگتی ہے۔ مجھے بھی یہ کھانا پسند تھا، میں نے امن پسندی کا ثبوت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کھانا لانے والے بڑے بڑے برتن اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے، لیکن ان کے ساتھ سلع افراد کا ایک پورا گردہ موجود تھا، جو ایک ایک قیدی پر نگاہ رکھتا تھا، بڑے غار میں ان سب کو جمع کر کے کھانا تقسیم کیا گیا تھا، میں نے کھانا گردن جھکا کر لیا تھا، اور ان لوگوں کے بارے میں اندازہ اتار رہا تھا، پھر دوپہر کو میں ٹہلتا ہوا اس لوہے کی سلاخوں والے دروازے تک پہنچ گیا، جس کے بری جانب پھرے دار موجود تھے، لیکن ان پھرے داروں میں، میں نے جس لڑکی کو دیکھا، اسے یاد کر مجھے جبر جمہری سے آگئی اور میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی لیکن میں نے اپنے آپ کو نبھالا، لڑکی غالباً ان پھرے داروں سے کچھ معلومات حاصل کر رہی تھی، میں نے اسے دیکھا اور اس نے بھی مجھے دیکھ لیا، پھر وہ برق رفتاری سے آگے بڑھی اور سلاخوں والے دروازے کے پاس پہنچ گئی، اس نے منہ سے اشارہ کر کے مجھے بلایا لیکن میں اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔

”ادھر آؤ، براہ کرام ادھر آؤ۔“ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

”سنو، کیا تم بتاؤ گے کہ تم اور تمہارا ساتھی یہاں کیا کرنے کے لئے آئے تھے، تم پر کیا مصیبت ٹ پڑی تھی، کون سے قبیلے سے تمہارا تعلق ہے۔“ جواب میں مجھے ہنسی آگئی، اور میں نے کہا۔

”اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ تیرے حسن نے ہمیں تمہاری طرف متوجہ کیا تھا، تو تیرا نام لے کر میں اس ن پر تھوکتا ہوں۔“ میں نے زمین پر تھوک دیا، لڑکی کی پیشانی پر ٹیل پڑ گئے تھے، اس نے کہا۔

”اور تم جانتے ہو کہ اس کے نتیجے میں تمہاری گردن بھی کاٹی جاسکتی ہے۔“

”ہاں، کتوں نے میری گردن کاٹنے کی کوشش بھی کی تھی۔“

”سنو، اس وقت بھی میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی، نہ ہی میں نے تمہاری گردن کاٹنے کی کوشش کی تھی، تم بلاوجہ ہی پھنسن گئے، لیکن تمہاری زندگی بچانے کیلئے تمہیں زخمی کرنا ضروری اگر میں ایسا نہ کرتی، تو تم یقیناً کرو۔ آخر کار تم وہاں مار جاتے، میں نے تمہیں بچانے کے لئے زخمی تھا، تاکہ تمہیں قیدی بنا لیا جائے، لیکن میں تمہیں ایک پیشکش کرنا چاہتی ہوں، مجھے ایک بہت

ہیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”سنگھو۔“ اس نے جواب دیا۔

”سنگھو، دیکھو تقدیریں بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ رب عظیم اگر ہماری مدد کرے گا تو ہم یہاں سے نکل جائیں گے، تم البتہ یہ بتاؤ کہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں کیا معلوم ہے؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ بھیڑیں چرانے والا ایک آدمی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں، کہ اپنے بچے سے دور ہوئے مجھے بہت سے سورج، بہت سے چاند گزر گئے اور یہاں جتنے لوگ موجود ہیں، سب میری ہی طرح کے ہیں، ان کا تعلق مختلف قبیلوں سے ہے۔“

”یہ لوگ آخر تم سے کیا چاہتے ہیں؟“

”ارے بھائی کیوں میرے کان کھا رہے ہو، کسی اور سے معلوم کر لو۔“

”نہیں سنگھو! مجھے تم سے معلوم کرنا ہے اور خبردار! خدمت کرو، جو میں پوچھ رہا ہوں، مجھے

بتاؤ۔“ وہ ہنسا اور بولا۔

”ہاں! اب تم نے صحیح زبان میں بات کی ہے، مجھے ذراؤ میں بات کروں گا تم سے۔“

”چلو یہ ہی سہی، کھانے پینے کیلئے تمہیں کیا ملتا ہے؟“

”وہ جو ہم اپنے جانوروں کو بھی نہیں کھلاتے تھے۔“

”کیا تمہیں اپنی جگہ قیام کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔“

”نہیں ان سرنگوں اور غاروں میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے، ہمیں ان غاروں کا دور

حصہ عورتوں کے لئے ہے، وہاں قیدی عورتیں، مرد سبھی شامل ہیں۔“

”ان لوگوں نے بھی یہ نہیں بتایا تمہیں کہ تم لوگوں کو یہاں کیوں قید کر دیا گیا ہے۔“

”نہیں، ان سے کون پوچھے گا۔“

”ٹھیک ہے، سنگھو فکر مت کرو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے بعد نبھا۔

کیوں اپنے کندھوں پر ایک ذمہ داری محسوس ہوئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اس بد نصیب گردہ کو ان لوگوں سے آزادی دلاؤں گا، میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں مجھے کس مقصد کیلئے بھیجا گیا ہے، بات تو ابھی تک سمجھ میں نہیں آسکی تھی، پتہ نہیں وہ شیطان ہم سے کیا چاہتا تھا، لیکن اپنے کئے کا کوئی ملال نہیں ہوتا، بھنسن گئے تھے اور لگ رہا تھا کہ نکلنا مشکل ہی ہوگا، اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

بہر حال اللہ مالک تھا، میں نے تمام غاروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، لا تعداد قیدی بہار

نوجوان نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگا۔

”میں قبیلہ سالوم کا رہنے والا ہوں، رواتوں کے مطابق مجھے سردار بنایا جانے والا تھا اور واری کے حصول کے لئے مجھے ایک سیاہ ہرن جنگل سے پکڑ کر لانا تھا، میں ہرن کی تلاش میں پھر رہا کہ مجھے کالا ہرن نظر آ گیا اور میں نے اس کے پیچھے گھوڑا دوڑا دیا، لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میری بی بی مجھے اس ہرن کے پیچھے لئے جا رہی ہے، میں جب پہاڑوں میں پہنچا تو ایک جال ڈال کر مجھے لیا گیا، جال میں پھنسے ہوئے کے باوجود میں نے ان میں سے تین آدمیوں کو ختم کر دیا تھا، لیکن جال انہوں نے مجھے ڈھی کر دیا اور میں پکڑا گیا۔“

میں نے محسوس کیا کہ یہاں جتنے لوگ موجود ہیں، انہیں ایسے ہی کسی نہ کسی طرح پکڑا گیا ہے، اصل بات کہیں سے پتہ نہیں چلتی تھی۔ آخر یہ کون لوگ تھے اور یہ پکڑ دھکڑ کیوں کر رہے تھے۔ ن ہو اس بوڑھے شیطان پر جس نے ہمیں اس حال میں پھنسا دیا تھا، کوئی بات علم میں تو ہوتی، ہم اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کر سکتے۔ یہاں تو بس جھک ہی مار رہے تھے، عظیم خان نجانے کہاں مر ہوگا، ہو سکتا ہے۔ ابھی وہ ان کے جنگل سے باہر ہو۔ اب یہ بات نہیں معلوم تھی کہ انہوں نے قید خانے بنا رکھے ہیں، اگر کہیں اور بھی یہ قید خانے ہوئے تو ممکن ہے کہ عظیم خان ان میں سے قید خانے میں ہو، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، بہت سے لوگ مجھے ملے، ان میں سے ایک شہرون بھی تھا۔

شہرون بھی ایک شاندار شخصیت کا مالک تھا، آہستہ آہستہ میری بھی شناسائی ہو گئی، میں نے اس

بچھا۔

”کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گے کہ تم یہاں کیسے آ پھنسے؟“

”بس میرے دوست تقدیر کی بات ہوتی ہے، مجھے اپنی گرفتاری کا کوئی غم نہیں ہے، لیکن افسوس ہے کہ سلیہ بھی ان کی قیدی ہے۔“

”سلیہ کون؟“

”وہ جسے ایک رات بھی میری قربت حاصل نہ ہوئی، ہم شادی کے فوراً بعد اپنی زندگی کے اس میں گرفتار ہو گئے۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”وہ بھی ان لوگوں کی قید میں ہے، عورتوں کے قید خانے میں۔“

بڑا مقام حاصل ہے اور میں اگر چاہوں تو تمہیں اپنے خاص محافظوں میں شامل کر سکتی ہوں لیکن چونکہ تمہارا دماغ الٹ گیا ہے اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے، چنانچہ تمہیں یہ غلط فہمی دور کرنا ہوگی۔“

”میں تیرے اوپر تھوک چکا ہوں، کیا تیرے لئے اتنا کافی نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور لڑکی مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی، پھر بولی۔

”ٹھیک ہے، اگر ایسی بات ہے تو پھر تجھے اپنے اس عمل کا نقصان اٹھانا ہوگا، سمجھا۔“

جواب میں میں زور سے ہنس پڑا تھا۔

”وہ تنہی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی اور پھر بولی۔“

”یہ ہنسی تیری آخری ہنسی ہے اور اس کے بعد تو جب تک جیئے گا روتا ہی رہے گا۔“ لڑکی نے غصیلے لہجے میں کہا، پھر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے واپس چل پڑی اور کچھ لمحوں کے بعد میری نگاہوں سے اوچھل ہو گئی، میں بھی وہاں سے ہٹ آیا اور سامنے والی سرنگ سے ہوتا ہوا غار کے اندرونی حصوں کی جانب بڑھتا رہا، پھر ایک جگہ جا کر رک گیا۔

یہاں موجود لوگ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد مردہ جانوروں کی طرح ادھر ادھر لپٹ گئے، بہر حال میں جانتا تھا کہ وقت گزارنے کے لئے ان لوگوں سے شناسائی ضروری ہے، سبھی کی کہانیاں انوکھی تھیں۔

میں ان سے معلومات حاصل کرتا رہا اور اس کے بعد آرام سے لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں بہت سے منصوبے آرہے تھے، لیکن اس کی تکمیل کے لئے وقت لگتا تھا، یہاں میں نے جس کی بھی کہانی سنی، ایک جیسی تھی۔ ایک نوجوانوں سے میری ملاقات ہوئی، جس کی آنکھوں سے میں نے ہمیشہ آنسو ٹپکتے ہوئے دیکھے تھے اور اس کے قریب پہنچا اور میں نے کہا۔

”تم جس تن و توش کے آدمی ہو، مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس جسامت کا فحش رو سکتا ہے۔“

”فکر نہ کرو، کچھ وقت گزر جانے دو، تم بھی روؤ گے۔“

میں ہنس پڑا تھا، میں نے کہا۔

”شاید ایسا ہو، لیکن ابھی اس کے امکانات نہیں ہیں، ویسے میں تمہارے بارے میں جانتا چاہتا

ہوں۔“

”بے کار ہے، بے کار ہے!“ اس نوجوان نے کہا۔

”جو باتیں کہیں، کبھی بے کار سمجھی جاتی ہیں، وہ بڑی کار آمد ہوتی ہیں۔“ مجھے اپنے بارے میں

”تو پھر یہ سمجھ لو میرے دوست شہروں کہ اب تمہاری رہائی کا وقت قریب آ گیا ہے۔“  
 ”ناممکن ہے، یہ لوگ بہت ظالم ہیں، بڑے ہی سفاک، قیدیوں کے ساتھ ذرا بھی رحم نہیں کرتے، انہیں دھوپ اور تپش میں چھوڑ دیتے ہیں اور وہ جب بے بس ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ ان اپنی مرضی کا کام لیتے ہیں۔ آہ، تم شاید یقین نہ کرو، بہت ظلم کرتے ہیں، وہ ہم پر۔ میں سلیہ بارے میں کیا تاؤں تمہیں، اسے مجھ سے چھین لیا گیا۔“

”ایک بات بتاؤ شہروں؟“

”ہاں پوچھو۔“

”کیا تم یہ جانتے ہو کہ ان کا مقصد کیا ہے؟“

”کوئی نہیں جانتا۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ کسی کو کچھ بتاتے نہیں ہیں۔“

”کسی نے کچھ بتانے کی کوشش بھی کی؟“

”بہت مختصر۔“

”کیا؟“

”یہ لوگ جادوگر ہیں۔ یہ قرب و جوار کے تمام قبیلوں میں اپنی طاقت پھیلاتا چاہتے ہیں، قبیلے کے جوانوں کو گرفتار کرتے ہیں تاکہ کوئی ان سے مدافعت نہ کر سکے، جنگ نہ کر سکے، پھر ایک یہ بادلوں کی طرح انہیں گے اور ہر جگہ اپنی طاقت پھیلا دیں گے۔“

”ایک دوسری بات۔“

”وہ بھی پوچھ لو، تم سے باتیں کر کے اچھا لگتا ہے۔“

”ہاں؟“

”اس کی وجہ؟“

”تم بہت اچھی باتیں کرتے ہو۔“

”کاش میں تمہاری رہائی میں مدد کر سکوں۔“

”تمہارے سینے میں بڑے نیک جذبے ہیں، لیکن ایسا مشکل ہو جائے گا۔“

”کیوں؟“

”اس سے پہلے بھی یہ کوشش ہو چکی ہے۔“

”آہا، تو پھر۔“ میں نے دلچسپی سے سوال کیا۔  
 ”نتیجے میں دس یا بارہ افراد مارے گئے، ان کی لاشیں ہمارے درمیان ڈال دی گئیں اور ہمیں اگیا کہ یہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

”اب بھی ایک چھوٹے سے غار میں ان کے سوکھے خنجر پڑے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی ہمیں ان سامنے سے گزرا جاتا ہے تاکہ ہم انہیں دیکھیں اور اس کے بعد فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکیں۔“  
 میں خاموش ہو گیا، لیکن ابھی تک مجھے ان پر اسرار لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔

قید خانوں کے محافظ جن کے چہروں سے سفاکیت نکلتی تھی، ہم پر نگرانی کرتے تھے۔ میرے ن میں رہ رہ کر صرف عظیم خان کا خیال تھا، اب تک ایسی کوئی کوشش کارآمد نہیں ہوئی تھی، جس کے ن میں کوئی موثر قدم اٹھا سکتا۔ یہاں سے خاموشی سے دوسروں کی داستانیں سنتے ہوئے وقت گزر تھا اور طبیعت پر شدید بے زاری طاری ہوتی جا رہی تھی لیکن پھر ایک دن ماحول بدل گیا، رات کا تھا، باہر خوفناک طوفان آیا ہوا تھا۔ محافظ دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ غاروں میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی، اب ایک محافظ میرے قریب آ گیا، اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ مجھے حیرت ہوئی، وہ میرے پاس آ بیٹھ گیا تھا، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا، محافظ کے اس طرح بیٹھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، لیکن پھر اس کی مدھم سی آواز ابھری۔

”حماد۔“ اور اس آواز نے میرے پورے اعصاب کشیدہ کر دیئے تھے، میرا بدن جھنجھکا کر رہا تھا۔ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن عظیم خان کی آواز میں نے بخوبی پہچان لی تھی، عظیم خان میرے اب بیٹھا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا، تو وہ بولا۔

”نہیں، نہیں کوئی سرگرمی دکھانی کی کوشش مت کرو، ابھی صورت حال ہمارے حق میں بہتر نہیں۔“

”عظیم خان۔“

”ہاں، میں ہی ہوں۔“

”تم، تم ٹھیک ہو؟“

”ٹھیک نہ ہوتا، تو تمہارے پاس کیسے آ سکتا تھا؟“

”تم محافظوں کے لباس میں ہو۔“



”ہاں۔“

”اس طرح تمہیں یہاں کوئی بھی ختم کر سکتا ہے؟“  
 ”اتنا آسان نہیں ہوگا، یہ سب اپنی اعصابی قوتیں کھینچے ہیں، اگر ان کے اندر کسی محافظہ کلمہ کرنے کی جرأت ہوتی، تو اب تک یہ بہت کچھ کر چکے ہوتے۔“ عظیم خان نے جواب دیا۔  
 ”لیکن عظیم خان تم۔“

”میں تم سے رخصت ہونے کے بعد پوری کہانی تمہیں سنا رہا ہوں، فکر مت کرو، باہر ہلاکا طوفان ہے، ایسا خوفناک طوفان کہ چٹانیں اڑی جا رہی ہیں، وہ تو یہ غار بہت محفوظ اور مضبوط ہیں، ورنہ طوفان کے اثرات یہاں تک پہنچ سکتے تھے۔ محافظوں نے اپنی جان بچانے کیلئے ایسی جگہیں حاصل کر لی ہیں، جہاں وہ طوفان سے محفوظ رہ سکیں۔“  
 میں خاموشی سے عظیم خان کی صورت دیکھتا رہا۔ عظیم خان کافی بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ بہر حال اس نے یہاں بھی مجھ پر فوقیت حاصل کر لی تھی، کیونکہ ایسا تندرست نظر آ رہا تھا کہ میں رکھ بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا، پھر میں نے کہا۔

”عظیم خان کیا تم مجھے یہاں سے نکال کر لے جاسکتے ہو؟“

”نہ صرف تمہیں بلکہ ان تمام قیدیوں کو یہاں سے نکالنے کا بندوبست کر لیا ہے میں نے۔“  
 عظیم خان کے لہجے میں شدید سسنی تھی اور میں خود بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا، میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھتا رہا، تو عظیم خان نے کہا۔  
 ”آج کی رات اور ابھی ہم کچھ نہیں کر سکیں گے، ہمیں اپنے کام کے لئے وقت درکار ہے چنانچہ تم آرام سے رہو۔“

”تم جا رہے ہو کیا؟“

”میں نے کہا ناں، بالکل نہیں۔ مجھے جانے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میں تمہارے پار بیٹھوں گا، کیونکہ میں خود بھی تم سے دوری کے اثرات کا شکار رہ چکا ہوں۔“  
 میں نے پہلی بار محبت بھری نگاہوں سے عظیم خان کو دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جیگر بھی فطرت کا مالک تھا، یا جس طرح بھی کہا جائے کہ ہم ایک مشترکہ جال میں پھنسے ہوئے تھے لیکن تو اچھا انسان، پھر اس نے اپنی داستان کا آغاز یوں کیا۔

+++

تم نے اسے قتل کر دیا، میں نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، نجانے کیوں یہ صبح مجھے اس کی محسوس ہوئی تھی۔ ایک ایسی صبح جو محسوسات کا آغاز ہوتی ہے اور انسان کو فوراً ہی احساس ہوتا ہے کہ اس پر کوئی نہ کوئی برا وقت پڑنے والا ہے۔ میں خود کو تم سے جدا نہیں کہتا، ہمارے سارے اطاعت ایک دوسرے سے منسلک ہیں، لیکن بد نصیبی وہی تھی۔ اگر ہم اس لڑکی کی سنگت ناہٹ پر غور نہ کرتے تو معاملہ خراب ہو جاتا یا پھر اتنا خراب نہ ہوتا۔

بہر حال تمہاری اس کیفیت سے میں ایک دم الجھ گیا تھا، میں نے ان چاروں آدمیوں کو بعد میں مارتا تھا، جنہوں نے تم پر گولیاں برسائی تھیں، بہر حال میں اپنی جگہ سے غائب ہو گیا تھا کہ میں ری مدد کر سکوں، جس جگہ میں پوشیدہ تھا، وہاں سے چٹان کے پیچھے کا منظر نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ تم کس طرح ان کا شکار ہوئے۔ اس لڑکی کو میں نے نظر انداز کر دیا تھا، نے یہ مصیبت کھڑی کر دی تھی اور جو ہمارے لئے عذاب کی وجہ بنی تھی۔

میں نے اس وقت تمہیں دیکھا، جب وہ تمہیں اس جگہ تھمیت کر لا رہے تھے، حالانکہ میرے دلچاشت کرنا بے حد مشکل کام تھا، میں چاہتا تو ان تینوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا، میں کھیل خراب نہیں کرنا چاہتا تھا، اگر میں ناکام رہتا، تو پھر تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔  
 چنانچہ میں نے عقل سے کام لے کر خاموشی سے یہ منظر دیکھا، مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کی ہستی ورنہ نہیں ہے، اونچے نیچے مکانات اور جمونہ پڑے صاف نظر آ رہے تھے، تمہارے بارے میں مجھے ہوا تھا کہ تمہیں گولی نہیں لگی ہے، بہر حال میں اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا، پھر میں لاشوں کو دیکھنے لگا، جو تمہارے شکار ہوئے تھے لیکن ان میں سے ایک اپنے ہی ساتھی کی نشانہ بنا تھا، اس کے بعد وہ لوگ تمہیں لے کر کافی دور نکل گئے تو میں بھرتی سے اپنی جگہ سے وراسی سمت دوڑنے لگا جہاں وہ دونوں لاشیں پڑی تھیں۔

میں نے ان دونوں کی صورتیں دیکھیں، ایک کے سر پر گولی لگی تھی، اس لئے اس کے سر کے

چیتھڑے اڑ گئے تھے اور چہرہ بری طرح بگڑ گیا تھا، دوسرے کو وہ گولی لگی تھی جو تم نے چلائی تھی اور یہ سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی، اس لئے وہ دشمن ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ہلاک ہو گیا تھا، میں نے اسے بغور دیکھا، اس کی شکل کا تجزیہ کیا اور پھر میں نے اس کا لباس اس کے بدن سے اتار لیا، چونکہ یہ لوگ ایک ہی طرح کا لباس پہنے ہوئے تھے، اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ لباس کسی خاص ایہیہ کے حامل ہیں، میں نے اس کا لباس اتار کر خود اپنے جسم پر پہنا اور اس کے جسم سے پہنے والے خون کو اپنے چہرے پر جگہ جگہ لایا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اس کی لاش اٹھا لیا اور اس لئے ہوئے ایک سہ چل پڑا، مجھے کسی ایسی مناسب جگہ کی تلاش تھی، جہاں اس لاش کو ضائع کیا جاسکے اور پھر میں نے اس کی تلاش اس جمیل میں ڈبودی، میں نے لاش کے ساتھ بڑے بڑے پتھر باندھ دیئے تھے اور لائبر گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی، اس کام سے فارغ ہو کر واپس پلٹا اور تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا اس جگہ نکلا گیا، جہاں تھوڑی دیر قبل وہ لاش پڑی ہوئی تھی، اس کا خون اب بھی زمین پر پڑا ہوا تھا۔

چنانچہ میں نے ایک جھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اپنی پیشانی پر رگڑ دیا، میری بیانی کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی اور میرے مصنوعی خون میں اصلی خون بھی شامل ہو گیا، حالانکہ زخم لگانا آسان کام نہیں تھا، تم اب بھی اس کے نشانات میرے چہرے پر دیکھ سکتے ہو، لیکن جو کچھ میں سوچ رہا تھا، وہ میرے لئے بڑا کارآمد ہو سکتا تھا، جس شخص کا روپ میں نے دھارا تھا، اس شخص کا نام مجھے نہیں معلوم تھا، لیکن اس وقت یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔

چنانچہ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا، مجھے معلوم تھا کہ تمہیں لے جانے والے واپس ضرور آئیں گے اور ان لاشوں کو یہاں سے اٹھا کر لے جانے کی کوشش ضرور کریں گے، چنانچہ میں اسی کا انتظار کر رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے دور سے ان لوگوں کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ یقیناً صورتحال معلوم کرنے کے بعد انہی لوگوں کو اٹھانے کیلئے آئے تھے۔

چنانچہ میں اطمینان سے اوٹھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ لڑکی اس بات کو تصدیق نہیں کر سکے گی کہ یہ شخص بھی مر گیا تھا کیونکہ میں نے لڑکی کو ان لاشوں کی طرف متوجہ ہو نہیں دیکھا تھا۔ میں زمین پر اوٹھا ہوا رہا اور تھوڑی دیر بعد وہ لوگ میرے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ سہ چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے، پھر میں نے کسی کی رونے کی آواز سنی، کوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا خاص موسیٰ اور بھونڈی آواز تھی، لیکن اس وقت میں کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے دوسرے ساتھ مجھ بھی سیدھا اور پھر ان میں سے کوئی چیخا۔

”یہ زندہ ہے، یہ زندہ ہے، اس کے سر میں صرف زخم ہے، اٹھاؤ اسے جلدی سے لے چلو، تاکہ اس کا علاج کیا جاسکے۔“ پھر کچھ لوگوں نے مجھے ہاتھوں میں اٹھالیا، میرا کام پورا ہو گیا تھا، میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ”اے معبود کریم یہ لوگ مجھے پہنچانے نہ پائیں۔“ لیکن بہر حال میں خطرات کی آغوش میں جا رہا تھا۔

وہ لوگ مجھے اٹھائے ہوئے ایک کشادہ جموینڈے میں داخل ہو گئے، میں نے آنکھوں میں لہری پیدا کر کے جموینڈے کا ماحول دیکھا اور مجھے احساس ہو گیا کہ یہ کوئی حکیم یا وید ہے، جو یہاں موجود ہے۔ اس کی داڑھی، سفید نقوش بھدے اور چہرہ بے حد خوفناک تھا، اس نے میرا زخم دیکھا، پھر بڑبڑایا۔

”نہیں زخم تو گہرا نہیں ہے، پھر یہ بے ہوشی کیسی ہے؟“

کسی نے جواب نہیں دیا، بوڑھے نے میرے زخم کو صاف کر کے اس پر کچھ دوائیں لگائیں، رہے رنگ کے کچھ پتے میرے چہرے پر رکھے اور اس کے بعد کوئی چیز اس پر چپکا دی، ان میں سے کسی نے پوچھا۔

”کیا ہم اسے اس کے جموینڈے میں پہنچا دیں۔“

”ہاں، اگر کوئی اور بات ہو تو میرے پاس لے آنا۔“

”ایک بار پھر مجھے اٹھایا گیا اور ایک دوسرے جموینڈے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں انہوں نے مجھے لپٹا لیا اور وہ سب باہر نکل گئے۔ جموینڈے کو خالی دیکھ کر میری جان میں جان آئی تھی اور میں نے اس کی بات کو ابھی مجھے پہچانا نہیں گیا، پھر بھی میرے کان باہر لگے ہوئے تھے، کسی نے کہا۔“

”شیرال کا خیال رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی اور تکلیف ہو جائے۔“ مجھے پتہ چل گیا کہ نام شیرال ہے، دوسرے نے کہا۔

”بے چارہ زخمی ہو گیا، اس کی بد نصیبی اسے پہاڑوں میں لائی تھی، لیکن اب اس کا خیال رکھنا ہی ہے۔“

میں ان لوگوں کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ ان کے دوسرے جیلے میری سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ اس کی بد نصیبی اسے کہاں سے پہاڑوں میں لائی تھی، کیا وہ کہیں دور سے آیا تھا، مگر کہاں سے، لیکن مال کا جواب حاصل کرنا ضروری نہیں تھا۔ البتہ میں سوچ رہا تھا کہ کوئی تو میرا جاننے والا ضرور ہو گا، تاکہ تو آگیا ہوں اور ابھی تک کسی کو شک نہیں ہوا لیکن شاید زیادہ دیر تک میں ان لوگوں کو فائدہ نہ بنا سکوں۔

دو تین گھنٹے گزر گئے، کوئی میری جھونپڑی میں نہیں آیا تھا، پھر شام ہو گئی، شام کے بعد آکر نے میرے جھونپڑے میں روشنی کی۔ میں بستر پر لیٹا اسے دیکھتا رہا، مجھے ایک لمحے کے اندر اندازہ گیا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے، روشنی جلا کر اس نے مجھے دیکھا اور پھر میرے پاس آگئی، میں نے ا بے ہوش پڑے رہنے کی اداکاری نہیں کی تھی، عورت نے مجھے دیکھا اور بولی۔

”کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

”پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ میری شناسا ہوگی، لیکن اس کے چہرے کی سرد مہری اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ شیرال کو نہیں جانتی، میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی اور عورت چلی گئی۔ رانا جھونپڑے کے باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ میں بہر حال اس طرح یہاں آرام تو نہیں کر سکتا تھا، تمہاری بے حد فکر تھی، حماد، یقین کرو یا نہ کرو۔

بہر حال اپنی جگہ سے اٹھ کر میں نے خاموشی سے باہر جھانکا، ماحول سناں تھا اور قبیلے کے آرام کی نیند سو رہے تھے، میں خاموشی سے باہر نکل آیا اور اس کے بعد میں نے وہاں سے باہر جا کے راستے تلاش کئے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا، میں ان کی نگاہوں سے بچ کر سفر کرتا رہا۔ ویسے بات بتاؤں، حماد، اس وحشی قبیلے کا طرز زندگی بہت ہی اعلیٰ تھا اور میں اس سے متاثر ہوا تھا۔ ان ایک ترتیب نظر آتی تھی، مکانات بھی مضبوط اور سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔

بہر حال میں ایک میدان میں پہنچ گیا۔

یہاں بہت دور دور تک مخصوص قسم کے بنجرے پھیلے ہوئے دکھائی دیے، لیکن میں ان بنجر کے درمیان تمہیں تلاش نہیں کر سکا، میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ یہاں کے رہنے والے ا دوسرے پر توجہ نہیں دیتے۔ اس چہل قدمی کے دوران کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ ہم کچھ عجیب سی نیم وحشی فضاء ہو رہی تھی۔

پھر میں اس علاقے میں نکل آیا، جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دوری سے جانور اور ہولناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں، البتہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ جانور قیدی بنائے گئے ہیں جانوروں کا قید خانہ تھا، اس قید خانے کے پاس چار آدمی آگ روشن کیے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان سے ایک نے مجھے دیکھا اور بولا۔

”آؤ، شاید تم گشت پر ہو؟“

”نہیں، میں اپنی بھیڑ تلاش کر رہا ہوں۔“

”بھیڑ۔“

”ہاں۔“

”مگر وہ ادھر کہاں سے آگئی؟“

”مجھ سے عشق لڑا رہی تھی، کجبت دھوکا دے کر بھاگ آئی۔“

”کیا؟“ وہ سب ہنس پڑے۔

”ہاں، وہ میری محبوبہ تھی۔“

”بھیڑ؟“

”ہاں بھئی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”تم اپنی محبوبہ کو بھیڑ کہتے ہو؟“

”نہیں، میں بھیڑ کو اپنی محبوبہ کہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”سمجھ گئے، سمجھ گئے، ہم لوگ، کیوں بھئی سمجھ گئے ناں تم۔“

”ہاں، یہ نفی میں ہے، خیر تم فکر مت کرو، جاؤ، اپنی جھونپڑی میں جا کر سو جاؤ، تمہاری محبوبہ پہنچ جائے گی۔“

میں خاموشی سے گردن جھکا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا، وہ لوگ ہنس رہے تھے، لیکن یہ ایک تھا۔ خاص طور سے تجربہ کہ یہ الگ الگ ایک دوسرے کی صورت پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ یہ بات ے لئے باعث اطمینان تھی اور میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کم از کم میں تھوڑا بہت وقت ان لوگوں کے نگراروں، البتہ میں واپس اپنے جھونپڑے میں نہیں آیا، بلکہ ایک اور جگہ بیٹھ کر ان حالات کے میں سوچنے لگا تھا۔

اپنی اس آزادی کو میں ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتا تھا اور یہاں پہنچ کر مجھے احساس ہو گیا کہ نصیحت کسی خطرے میں نہیں ہے۔ ساری باتیں اپنی جگہ حماد لیکن میری ذہنی کیفیت بالکل بہتر تھی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ تم پر نجانے کیا ہوتی ہے، میں بہت پریشان تھا، تمہارے لئے دوج رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ بنجرے میرے ذہن میں الجھے ہوئے تھے۔ میں بہت قریب سے تو نہیں دیکھ سکا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں وحشی جانور موجود ہیں، اور خونخوار لیکن آخر کیوں؟

ایک بار پھر میں نے بنجروں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا، لیکن اس بار میں بڑے محتاط انداز میں یہ اچھانچا تھا، گو میں ان کے قریب نہیں پہنچ سکا لیکن پھر میں نے یہ دیکھ لیا کہ میری توقع کے ہاں وحشی جانور بند ہیں، اور شاید انسان بھی۔ اس سے زیادہ کیونکہ میں فوری طور پر کچھ نہیں کر

”یہ شیرال ہے، میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔“

”شیرال تم اس طرف کیسے آئے؟“

”میری محبوبہ بھاگ گئی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بیٹھو، بیٹھو، کوئی بتا رہا تھا کہ تم اپنی بھینٹ کو محبوبہ کہتے ہو۔“

تب میں انہیں کہانیاں سنانے لگا۔ میں نے انہیں اس بھینٹ کی کہانی سنائی، جو بہت خوبصورت تھی۔ جس کے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی مانند تھیں اور جس کی آنکھیں اور جس کا سنگ مرمر کا بنا ہوا جسم وہ لوگ قہقہے لگاتے رہے، انہوں نے میری خوب خاطر مدارت کی، اس کے بعد انہوں نے مجھے انداز کر دیا اور میں ان پہاڑوں میں بھٹکتا رہا، میں ان چٹانوں کے درمیان ہوتا ہوا، اسی جگہ پہنچا جہاں سے میں ان پہاڑوں کا نظارہ کر سکتا تھا، لیکن میں نے ایک چٹان دیکھی، جس کے نشیب کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے، مجھے حیرانی ہوئی، نیم وحشی نظر آنے والے یہ لوگ درحقیقت اتنے لمبے تھے۔

شائینوں میں، میں نے ایک خاص بات محسوس کی تھی۔ وہ یہ کہ وہ ذہن ہیں اور مقامی باشندوں رح بے وقوف نہیں۔ یہ رات میں نے وہیں گزاری اور اس وقت میں ایک چٹان کے عقب میں اٹھا کہ مجھے کچھ نسوانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں اور میں چونک کر جاگ گیا۔ یہ آوازیں چٹان امری جانب سے آرہی تھیں۔ وہیں میں نے چند لوگوں کو دیکھا۔ یہ بھی مقامی باشندے تھے اور میں انہیں کے ساتھ تھیں۔ وہ چٹانوں کے نشیب میں ایک چھوٹے سے چشے کے پانی سے منہ دھو رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ان کا پیچھا کیا۔ وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں ل کے کٹہرے تھے اور ان کے ساتھ میں نے ان کٹہروں کو دیکھا۔ ان میں شیر، چیتے، بھینٹے بے خوفناک اور خوشخوار جانور بند تھے، جو انسان کے قاتل ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بھی اتنی تھی کہ ان رہ جاؤ گے۔

بہر حال اس کے بعد تم یہ سمجھ لو کہ میرے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا اور میں اپنے طور پر صوبے پر چل پڑا تھا۔ میں شیرال کے جمونڈے ہی میں رہ رہا تھا اور مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ پھر اس شام میں ایک قبوہ خانے میں بیٹھ کر قبوہ پی رہا تھا کہ میری نگاہ اس شخص پر پڑی جس نے عام طور پر ان جانوروں کے بنجرے کے پاس دیکھا تھا۔ یہ ایک چوڑے شانوں والا آدمی تھا بڑے چہرے سے بڑا پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے مجھے گردن اٹھا ما، پھر گردن جھکا لی۔ پھر میں اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

سکا تھا لیکن میں نے یہ دیکھنا چاہا کہ اپنے جمونڈے میں مجھے تحفظ حاصل ہے یا نہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں کو حقیقت کا علم ہو گیا ہو۔

چنانچہ تجربے کے طور پر میں نے اپنے جمونڈے کا رخ کیا تھا اور یہاں پہنچ کر مجھے احساس کہ میری شخصیت بالکل مستحکم ہے، بہت سے افراد نے مجھے دیکھا، بلکہ مجھ سے میرا احوال پوچھا۔ مگر کسی نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی، جس سے مجھے یہ احساس ہوتا کہ وہ مجھے اجنبی سمجھ رہے ہوں۔ شخص جس کا نام شیرال تھا اور میں نے جس کا روپ دھارا تھا، اس کے بارے میں مجھے علم ہوا تھا کہ وہ نیا نیا آیا ہے اور تمام لوگوں سے اس کی بہترین شناسائی نہیں ہوئی ہے۔ نئے آنے والوں کا بارے میں البتہ مجھے اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں سے آتے ہیں۔

ممکن ہے ان کا تعلق کسی دوسرے قبیلے سے ہو اور وہ یہاں آکر آباد ہو رہے ہوں، البتہ ہمارا بھی بالکل درست تھی۔ حما کہ وہ لوگ مجھے اپنی شکل و صورت سے شاپے نظر آرہے تھے۔ یعنی بھرے صورت کے مالک اور کسی حد تک چالاک کچھ لوگوں سے میری شنائی تھی، یعنی شیرال کی حیثیت۔ مجھے جانتے تھے، لیکن ایسے لوگ بھی میری طرف مشکوک نہیں ہوئے، ہاں ان میں سے ایک نے ظاہر وہ تھا جس نے میری پیشانی پر پٹی باندھی تھی، مجھ سے میری خیریت کے بارے میں پوچھا تھا، پھر زخم کی تفصیل جانی تھی۔ پھر اس نے میری پیشانی کی پٹی بھی کھول کر دیکھی، لیکن میں نے اس سے اذہمک کی بات نہیں کی اور اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”افسوس سر کی چوٹ نے شیرال کا ذہن متاثر کیا ہے۔“ یہ بات اس نے چند افراد سے کہا اور وہ ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے۔ پھر مجھے ایک دراز قد شخص کے سامنے پیش کیا گیا یہاں نمایاں حیثیت کا حامل تھا، انتہائی خوفناک شکل و صورت رکھتا تھا، وہ لیکن اس کی نگاہیں گہری تھیں، تاہم اس کی نگاہوں کی گہرائیاں مجھے پہچان نہ سکیں۔ البتہ اس نے افسردہ لہجے میں کہا ”تم نہیں جانتے کہ میرا ایک، ایک آدمی قیمتی ہے اور شیرال ہمارے لئے بہت اہمیت ہے، تم اس بات کو ذہن میں رکھو کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔“

بہر حال اس کے بعد میں یہاں کارروائیاں کرتا رہا، میرا کام یہی تھا کہ قرب و جوار بارے میں معلومات حاصل کروں، مجھے بہت سی معلومات حاصل ہو گئی تھیں، وہ شاپے ہی پر پوری ہستی انہی کی ہے، پھر ایک دن میں ایک ایسے علاقے میں جا نکلا، جہاں اونچی اونچی پہاڑ چھلی ہوئی تھیں، یہاں بہت سے لوگوں کی ذمہ داریاں پھرے کے طور پر لگائی گئی تھیں۔ انہار مجھے دیکھا اور ان میں سے دو تین میرے پاس پہنچ گئے، ان میں سے ایک نے کہا۔

”تم کچھ پریشان لگتے ہو بزرگ! اور تعجب کی بات یہ ہے کہ تم یہاں تنہا ہو۔“ بوڑھے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر گردن جھکا لی۔

”تم یہاں قہوہ پینے آئے ہو اور قہوہ پیو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“

”جی نہیں چاہتا اور پھر تمہاری شخصیت میں ایک ایسی بات ہے بزرگ جو میری آنکھ میں آنسو لارہی ہے۔“

”کیا.....؟“ بوڑھا چونک کر بولا۔

”ہاں، تمہاری شکل میرے باپ سے ملتی جلتی ہے۔“

”کیا واقعی؟“ اس بار میں نے بوڑھے کے چہرے پر دلچسپی کے آثار دیکھے تھے۔

”ہاں، اور اسی وجہ سے میں یہاں آ گیا ہوں۔“

”تمہارا باپ کہاں رہتا ہے؟“

”آسانوں میں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ مرچکا ہے۔“

”اوہو، کب؟“

”بہت عرصہ ہوا۔“

”مجھے افسوس ہے۔“

”لیکن میں تمہیں دیکھ کر پاگل ہو گیا ہوں محترم بزرگ۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ تم میرے باپ کے ہم شکل ہو۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا باپ بہت یاد آتا ہے۔“

”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“

”اگر تم مجھے اجازت دو تو میں تمہیں دیکھ لیا کروں۔“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں ان جانوروں کی نگرانی کرتا ہوں۔ جو ان بنجرؤں میں

ہیں۔“

”آہ..... بنجرؤں میں بند جانور کتنے دکھ لگتے ہیں..... کیا انہیں دیکھ کر تمہیں افسوس

”آہ“

”وہ خوشخوار درندے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”ہر زندگی..... زندگی ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں، لیکن بہر حال یہ میری ذمہ داری ہے۔“

”بزرگ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان کو انسان ہی رہنا چاہئے، درندگی نہیں کرنی چاہئے۔“

”اسی میں میری زندگی ہے۔“

”یہ صرف تمہارا خیال ہے۔“

”آہ..... تم نہیں جانتے کہ میں ان کا غلام ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر شخص اپنی زندگی کا غلام ہے۔“

”جو کہنا چاہتے ہو وہ بہت عجیب ہے۔ شاید! تم اسے قبول نہ کر سکو۔“

”میں کوشش کروں گا۔“

”ان جانوروں کو آزاد کر دو۔“

”آزاد کر دوں؟“

”ہاں.....!“

”مگر کیسے؟“

”بنجرؤں کے دروازے کھول دو۔“

”یہ بہت خطرناک ہوگا۔“

”لیکن کیوں.....؟“

”آخر وہ وحشی جانور ہیں..... اور یہاں بے شمار افراد موجود ہیں اور پھر تم کیا سمجھتے ہو خود میری

کی خطرے میں نہیں پڑ جائے گی؟“

”اس کی ایک ترکیب ہے؟“

”کیا.....؟“

”بنجرؤں کی چھت پر چڑھ کر دروازے کھول دو۔ وہ نکل کر بھاگیں گے، کوئی تمہاری طرف

بہ ہوگا، لیکن تم سے ایک بات کہوں، شاید تم یقین نہ کرو۔“

”کہو!“

”لیکن یہ ہمارے ذریعے ہوا ہے۔“  
 ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“  
 ”کیا مہذب دنیا میں ہم۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔!“ عظیم خان مسکراتی نگاہوں سے دیکھ کر مجھے کہنے لگا اور میں ٹھٹھکی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ واقعی مہذب دنیا میں بھی تو ہمارا یہ ہی کام تھا۔ بہر حال انسانی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ نہ میں جانتا تھا اور نہ عظیم خان اور نہ ہی دوسرے وہ جو ہمارے ساتھ قیدی تھے۔ لیکن سب کے سب سبھی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک عجیب سی ہنگامہ ہدف نداشتی۔ دل دہل رہا تھا۔ ان میں سے کون کون ان جانوروں کا شکار ہو رہا ہے۔ بہر حال یہ اہمیت ناک فضاء ساری رات جاری رہی۔ سورج کی روشنی ہوئی اور اس کے بعد سناٹا چھٹا چلا گیا۔ ام سب خاموش تھے۔ ایک لمبے کیلئے پلک نہیں جھپکی تھی۔ پھر صبح کی روشنی ہوئی تو عظیم خان نے ہمرے ہاتھ میں ایک رائفل تھما دی اور کارٹوسوں کی چٹنی بھی۔ اس کے اپنے پاس بھی رائفل موجود تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”ہمیں باہر لکنا ہے۔ رات تو گزرا لی۔ دن تو یہاں نہیں گزرا۔ بہر حال ہماری یہ منزل نہیں ہے، آگے چلنا ہوگا۔“

”لیکن عظیم خان دوسرے لوگ۔۔۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا بنجروں میں بند قیدی ان درندوں کا شکار نہیں ہوئے ہوں گے۔“

عظیم خان نے تعجب سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”حماد! کیا بات ہے۔ تم ان دنوں مجھے کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہو۔“

”اور تم مجھے انتہائی غیر سنجیدہ۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”میں ایک سنجیدہ سوال کر رہا ہوں۔“

”لیکن وہ محفل سے خالی ہے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”اس لیے کہ قبیلے کے لوگ تو آزاد بنچھیوں کی مانند باہر کی زندگی گزار رہے تھے اور قیدی لہروں میں تھے۔ قیدیوں کو اگر خود ہی بنجروں سے باہر نکل کر جانوروں سے کھیلنے کا شوق ہوا تو بالکل تھ ہے۔ ورنہ وہ تو بنجروں میں ہیں اور جانور بنجروں میں نہیں ہو سکتے۔ وہ تو بنجروں سے لکے ہیں

”یہ آسمان کا اشارہ ہے، مجھے خواب میں بتایا گیا تھا کہ تم مجھے یہاں ملو گے اور بہت سی زندگیوں کیلئے نجات کا راستہ بنو گے۔“

بوڑھے کے چہرے پر عجیب سے آمار پھیل گئے تھے۔ پھر اس نے کہا۔  
 ”اگر ایسا ہے تو میں دیوتاؤں کی خوشی کیلئے یہ سب کچھ کروں گا اور ڈیڑھ سالہ آج رات ہونے والا ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ میں عظیم خان کی بات سن کر چونک پڑا۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ آج رات۔“ عظیم خان کے ہونٹوں پر ایک بڑا سراہٹ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔



اور عظیم خان کا کہنا بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ درحقیقت اپنے معاملات میں مجھ سے آگے نکل گیا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ کر دکھایا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تھا اور اس نے بڑی سنسنی خیز فضاء پیدا کر دی تھی، آدمی رات کا وقت تھا کہ اچانک شیروں کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی انسانی چیخیں۔ پھر یہ آواز بڑھ گئی اور انسانی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ لوگ بچ رہے تھے۔

”بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ! یہ جانور کھل گئے۔۔۔۔۔ بچاؤ!“  
 میں نے عظیم خان کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک سبک سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”عظیم خان!“

”ہوں۔۔۔۔۔!“

”یہ تو واقعی۔۔۔۔۔!“

”تو تم کیا سمجھتے تھے؟“

”ایک بات بتاؤ عظیم خان۔۔۔۔۔؟“

”کیا۔۔۔۔۔؟“

”کیا ہم درندے نہیں بن گئے ہیں؟“

”کن معنوں میں کہہ رہے ہو؟“

”مطلب یہ ہے کہ یہ درندے تو انسان کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“

”یہ ان کا کام ہے۔“

اصحاء ورنہ چپا گئے تھے۔ زرخے اور میڑ ڈالے گئے تھے، آپکھیں نکال لی گئی تھیں۔ بازو غائب ہے اگلی غائب تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے کئے ہوئے بازو اور کٹی ہوئی ٹانگوں کے ماتھ زمین پر گھسٹ رہے تھے اور زندگی تلاش کر رہے تھے۔ جبکہ ان چٹانوں میں زندگی کا وجود نہیں تھا۔ ہم ان کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ بات کسی ایک کی نہیں تھی۔ عظیم خان نے متاثر ہلے میں کہا۔

”اور اب اس کے بعد اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ گھوڑے تلاش کرو اور جتنی دور نکل سکے ہو نکل جاؤ۔ جانوروں کی بھی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ گھوڑے وغیرہ بھی بچارے مارے مارے مارے تھے۔ بعض گھوڑے بھی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے ایک گھوڑے کو دیکھا۔ کسی وحشی مارے نے اس کے بازو کا پورا گوشت چبا ڈالا تھا اور وہ لنگڑا لنگڑا کر ایک ایک قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ لیکن ہمیں ایسے چاک وچو بند گھوڑے مل گئے جو ہمارے لیے سواری کا کام دے سکتے تھے۔ جانور لا انسانوں سے خاصا مانوس ہوتا ہے۔ خاص طور سے وہ جانور جس کا انسانوں سے براہ راست تعلق نا ہو۔ ان دو گھوڑوں نے اپنے پیروں پر چلنے والے دو افراد کو دیکھا تو خود ہمارے قریب پہنچ گئے ہمیں اپنی سواری کی پیکش کر دی۔ جیسے کہنا چاہتے ہوں، جلدی چلو۔

یہاں سے دور نکل چلو۔ ہم نے ان کی اس فرمائش پر عمل کیا تھا۔ ان کی پشت پر سوار ہو کر ہم انہیں دوڑایا اور اس وحشت ناک ماحول سے دور نکل جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس وقت یہ ہماری بستی تھی۔ ان قیدی غلاموں کا بھی ہم جائزہ نہیں لے سکتے تھے۔ جن میں کچھ ابھی بچروں لہتے تھے۔ لیکن یہ بھی دیکھا تھا ہم نے کہ وہ بچرے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بہر حال قدرت نے انسان کو بڑی طاقت بخشی ہے، وہ اپنے تحفظ کیلئے کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا۔ ہماری کادشوں نے ان قیدیوں کو قید کی مشکل سے نکال دیا تھا۔ اب اس کے بعد زندگیاں بچانا کام تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ سمتوں کا تعین تو کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ بس منہ اٹھے تاحہ نظر پتھر کی چٹانیں پتھرے میدان کہیں درخت، کہیں ریکستان، گھوڑے بھی شاید خوفزدہ تھے اور ان کی یہ ہی خواہش تھی کہ درندوں کی بستیوں سے دور نکل جایا جائے۔

چنانچہ وہ بھی جان توڑ کر دوڑ رہے تھے۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ سر پر دھوپ نیچے پتھر ملی لیکن گھوڑوں نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ سورج ڈوبا تو ہوائیں ٹھنڈی ہو گئیں اور ان ٹھنڈی میں ہمیں ایک ہلکا سا جھل نظر آیا۔ گھوڑوں نے خود بخود اپنا رخ تبدیل کر دیا تھا۔ ہمیں کچھ کی ضرورت ہی نہیں پیش آرہی تھی۔

اور کھلی فضاء میں اپنے دشمنوں پر حملہ آور ہوئے ہوں گے۔ ہاں اگر قیدیوں نے فوراً بھاگنے کی کوشش کی، تو پھر دوسری بات ہے۔“

”میں واقعی شرمندہ ہو گیا تھا۔ عظیم خان ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ پھر عظیم خان نے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے قیدیوں سے کہا۔

”تم لوگ باہر نکلو گے۔ محافظوں کا اسلحہ پڑا ہوا ہوگا، اگر وہ ہلاک ہو گئے ہوں گے تو یہ اسلحہ لے کر تم اپنی حفاظت کرتے ہوئے یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ کیا سمجھے؟“

اس کے بعد اس نے وہ بچرے کھول دیئے کیونکہ وہ ایک محافظ کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ اس لیے اس کے پاس چابیاں بھی موجود تھیں۔ قیدیوں کی آزادی سب سے زیادہ اچھی محسوس ہوئی۔ پھر کچھ چپچسپ سنائی دیں۔ غالباً وہ محافظ تھے، جو درندوں سے بچ کر یہاں ان غاروں میں آچپے تھے اور اس وقت قطعی اس قابل نہیں تھے کہ قیدیوں سے مقابلہ کریں، لیکن زیادہ تر وہ تھے، جنہوں نے قیدیوں پر ظلم ڈھائے تھے اور یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی کسی پر ظلم کرتا ہے تو دوسرا اپنی باری کا انتقام کرتا ہے اور وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ خونخوار ہوتا ہے۔ کچھ فائر! کچھ دھماکے ہوئے اور اس کے ہوا خاموشی چھا گئی۔

میں اور عظیم خان صبر و سکون سے گزرنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں جلدی ٹینڈر تھی اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ گھوڑا سا وقت گزر جائے، ماحول کچھ سا زگار ہو تو باہر کی صورتحال آ جائزہ لیں اور اس کے لیے ہم نے آدھے دن کا انتظار کیا۔

یہاں وقت کے اندازے تو ہو گئے تھے۔ وقت کے مطابق اس وقت دن کے کوئی بارہ بجے ہوں گے جب ہم رائٹلین سنبھالے ہوئے باہر نکلے۔ غار کے دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک رچکھ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ دونوں پیروں کے بل کھڑے سر کھبا رہے تھے۔ سوچ رہے ہو کہ کدھر کا رخ اختیار کریں۔ اب یہ ان کی بد قسمتی تھی کہ ہمارا راستہ انہوں نے روکا تھا۔ چنانچہ ہم نے اور عظیم خان نے گولیاں چلائیں اور رچکھ دیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم باہر نکل آئے تھے اور باہر کا منظر درحقیقت ایسا تھا کہ عبرت ہوتی تھی۔

انسانی زندگی بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ کس طرح اپنے آپ کو ہلاکتوں میں ڈالتی ہے، اس کا جیسوں کو زندگی سے محروم کرنا اور اس سے خوش ہونا اور اس کے بعد خود موت کا شکار ہو جانا۔ درندوں نے بھی قیدیوں کی حیثیت سے رہائی پائی تھی اور اپنے قید کرنے والوں کے بدترین دشمن تھے۔ چنانچہ انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ایسی لا تعداد لاشیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ جن کے

دیکھا کہ عظیم خان ہاتھ میں بڑا سا پیالہ لیے کچھ کھا رہا ہے۔ میں حیران ہو گیا، عظیم خان کو کھانے پینے کی یہ چیز کہاں سے مل گئی۔ لیکن پھر میں نے غور سے دیکھا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اچانک خوشی ہوئی تھی۔ یہ تربوز کی تیل تھی جو خاصے بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں وہاں سائز کے تربوز لگے ہوئے تھے۔ بکے اور کھانے کیلئے تیار تربوز بلاشبہ قدرت کی نعمتوں کا کسی بھی جگہ تعین کر لیا جائے انسان کے پاس شکر کے الفاظ ناکافی ہوتے ہیں۔ تربوز شکم سیری کیلئے اہلین، بھوک اور پیاس کا انتہائی معقول انتظام ہوتا ہے۔ میں عظیم خان کے پاس بیٹھ گیا اور عظیم خان نے برابر رکھا ہوا تربوز اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور پھر کا ایک نوکدار ٹکڑا..... مجھ سے کئے لگا!

”اسے درمیان سے کاٹو..... ہاتھ ہی سے کھانا پڑے گا۔“

میں نے وہ تربوز اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ جانوروں کی طرح کھانا بھی کبھی کبھی کس قدر دلکش لگتا ہے۔ تربوز کا آدھا ٹکڑا توڑ کر میں نے برابر میں رکھا اور باقی میں اٹھیاں داخل کر دیں اور اس کے بعد میں وحشیوں کی طرح تربوز کا سرخ گودا کھانے لگا۔ جو معدے میں پہنچا تو یوں محسوس ہوا کہ بے ٹھنڈک سارے وجود میں اتر گئی ہو اور اس کے بعد ہم تربوز کھانے میں مصروف ہو گئے۔

خدا انسان کیلئے زندگی کا درجہ رکھتی ہے۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہ ٹھنڈی اور میٹھی شے جس قدر اس موجود ہے، وجود میں اتار لی جائے۔ عظیم خان اپنے طور پر مصروف تھا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے ایک تربوز کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ تو اچانک ہی میں نے دیکھا کہ تربوز میں انسانی نقوش نمودار ہو گئے ہیں۔ بڑی تفصیل کے ساتھ یہ نقوش ابھرتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے پٹی پٹی آنکھوں سے تربوز کو دیکھا۔ تیل میں لگا ہوا تھا۔ زمین پر پھیلا ہوا تھا، لیکن اس میں نمودار ہونے والے نقوش اقدار واضح تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ عظیم خان کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اہم بات ہو گئی ہے، خاموش پا کر وہ میرے قریب آ گیا اور بولا۔

”کیا بات ہے؟“

لیکن بات بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، وہ اسے بھی نظر آ رہا تھا، کے منہ سے تربوز کے ٹکڑے باہر نکل آئے۔ اب جو نقوش نمودار ہوئے تھے، وہ ایک شناسائی رکرتے جارہے تھے، سو فیصدی روپ گبتالی کا چہرہ تھا۔ جو اپنے نقوش مکمل کر چکا تھا، پھر اس کی ہنسی اور اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ اس نے مجھ کی طرف اشارہ کیا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں، اب تک جو کچھ دیکھتے آ رہے ہو، اسے دیکھ کر بھی تمہاری

بہر حال ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہ بہت ہی معمولی سا جنگل تھا۔ درخت بھی زیادہ کچھ نہیں تھے۔ بس ہلکی ہلکی چھاؤں..... لیکن اب چونکہ سورج ڈھل گیا تھا۔ اس لیے چھاؤں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ البتہ گھوڑوں کیلئے یہاں نہایت معقول بندوبست تھا۔ سب تقدیر کے حوالے تھا۔ قیدی انسانوں کی گرفت میں تھے۔ یہ جانور بھی اگر وفا کا خیال رکھیں تو ہمارے پاس واپس آ جائیں گے۔ آزادی چاہتے ہیں تو ہمیں حق حاصل نہیں کہ ان کی آزادی ان سے چھین لیں۔ چونکہ پورا دن گھوڑوں کی پشت پر گزرا تھا۔ ساری رات جاگتے رہے تھے۔ اس لیے عظیم خان نے کہا۔

”حماد..... بہتر یہ ہے کہ آرام کیلئے کوئی جگہ تلاش کی جائے۔“ میں نے ایک سمت اشارہ کیا۔ یہاں بہت ہی لمبی لمبی گھاس تھی اور ایک درخت اس طرح اس گھاس پر سایہ کیے ہوئے تھا کہ جس طرح کوئی ماں اپنے بچے کو دھوپ سے بچانے کیلئے اپنے دوپٹے کی چھاؤں میں لے لیتی ہے۔ کچھ جگہ ہمارے لیے بہتر تھی۔ عظیم خان پر تو کچھ ایسی نیند طاری تھی کہ لیٹتے ہی سو گیا۔ لیکن مجھے شہ بھوک لگ رہی تھی۔ گھوڑے کی پشت پر ہڈیاں گزرتی تھیں۔ میں لیٹ کر سوچنے لگا کہ کھانے کچھ کا یہاں کوئی بندوبست نہیں ہے۔ دور دور تک لگا ہیں دوڑالی تھیں، ایسے موقعوں پر ناریل کے درخت قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہوتے ہیں اور صحراؤں میں موجود گلستان انسانی زندگی کو خوشیوں کی لہر سناتے ہیں۔

لیکن یہاں وہ سب کچھ نہیں تھا۔ میں نے لگا ہیں دوڑالی تھیں۔ پھر میں بھی عظیم خان کی طرف سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند بہت سے احساسات کو سٹلا دیتی ہے، میں بھی سو گیا۔ پھر اس وقت جاگا جب آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور زمین پر چاندنی کا سمندر بہہ رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا میں نے دیکھا کہ عظیم خان میرے پاس موجود نہیں ہے۔ پھر اچانک ہی دور سے اس کی آواز سنا دی۔

”حماد! اگر تم جاگ گئے ہو تو اس طرف آ جاؤ، ادھر اپنی داہنی سمت۔“

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دور سے مجھے چاندنی میں عظیم خان نظر آ رہا تھا، ایک جگہ ۱۱ ہوا نجانے کیا کر رہا تھا۔ دور کا کافی فاصلے پر دونوں گھوڑے پیٹ بھرنے کے بعد آرام سے زمین بیٹھے ہوئے سو رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ قدرت نے انسانوں ہی سے لہ جانوروں سے بھی ان کی خوراک دینے کا وعدہ کیا ہے اور کہیں یہ بے زبان انسان پر فوقیت حاصل جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی سے مانگ نہیں سکتے۔ چھین نہیں سکتے۔

میں اٹھ کر عظیم خان کی طرف چل پڑا اور چند لمحات کے بعد اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں



آنکھیں نہیں کھلیں۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”عقل کے اندر سے ہو، میں تمہیں مختصر بتاتا چکی ہوں، کالی دیوی جسے بہت پر دتا کہتی ہوں تمہیں شکار کر چکی ہے۔ اس نے تمہیں اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ تم سے تمہارا دھرم چھین کر تمہارا مستقبل کالا کر دیا ہے۔ صرف میں ہی ہوں جو تمہیں تمہارا سب کچھ دے سکتی ہوں۔“

”دے سکتی ہو..... میں نے خوشی کے عالم میں پوچھا۔“

”ہاں..... پانا مشکل ہوتا ہے، جبکہ گنوا سب سے آسان۔“

”میں اپنا سب کچھ کیسے حاصل کر سکتا ہوں۔“

”میں تمہیں بتاؤں گی۔“ روپ گبتالی نے کہا۔ پھر سرکوشی میں بولی۔ ”تمہیں اس ساتھی سے

الگ ہونا پڑے گا۔ آج ہی دوست۔“

میں نے عظیم خاں کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے ہم سے بے نیاز تریوز کھانے میں معروف تھا۔ روپ گبتالی نے مجھے جو کچھ بتایا اسے سن کر مجھے چکر آگیا تھا۔ مجھے اپنا سب کچھ حاصل کرنے کے لئے بالکل ہی الگ راستے اختیار کرنے تھے۔ اس کے لئے مجھے صحرائے اعظم افریقہ کے اندر داخل علاقوں کا سفر کرنا تھا۔ روپ گبتالی کا قبیلہ وہیں آباد تھا۔

”تم راج کے بارے بہت مشہور ہو چکے ہو، تمہیں کچھ لوگ ملیں گے جو ہاتھیوں کے شکار کے لئے افریقہ کے اندرونی حصوں میں جانا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ایک ڈاکٹر جو ڈاکٹر ”جنگر“ کے نام سے مشہور ہے۔ تمہارا نام اس کے ذہن میں بھی ہے۔“

”لیکن میں تو ان علاقوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”اپنے دل و دماغ میں اپنی یہ طلسم بساؤ..... باقی سب کچھ بھول جاؤ۔ خود کو ایک نئے انسان

روپ دے دو۔ اسی میں تمہاری نجات ہے۔“

”میں تیار ہوں، میں نے کہا۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری مدد کروں گی۔ اس نے کہا اور پھر وہ مجھے اس پھول کے بارے میں بتانے لگی، جو ایک قبیلے کا مقدس نشان تھا۔ بڑی عجیب اور بے حد بے اسرار داستان تھی۔ لیکن میں قیمت پر کالی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا، چنانچہ تیار ہو گیا۔

بے چارے عظیم خاں کو رات کی تاریکی میں چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کے بعد جو سفر کیا تھا وہ دم گبتالی کی مدد سے کیا تھا اور کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ کیا مزے کی بات تھی، ایک غریب لڑکا

رگی گزارنا مشکل تھا پہلے تبت کے دریاؤں کے درمیان اور اب افریقہ کے خوفناک جنگلات کی رگ رواں دواں تھا۔

میں افریقہ کے شہر ہال ڈونا میں مقیم تھا کہ رات بے کشن نے مجھ سے ملاقات کی۔ بے کشن بے دولت مند اور ہم جو انسان تھا۔ اسے صحرائے اعظم میں ہاتھیوں کے شکار کا شوق تھا۔

”یہ تو میری خوش نصیبی کی حد ہے کہ فنس راج جیسا شکاری اس وقت یہاں موجود ہے۔ میرے سات میری خواہش ہے کہ میں تمہارے ساتھ افریقہ کے گھنے جنگلات کا سفر کرتا۔“

مجھے تیار ہونا تھا، کیونکہ روپ گبتالی کا ہی منصوبہ تھا۔

بے پناہ دولت کے مالک بے کشن کے افریقہ میں داخلے کے انتظامات معمولی نہیں تھے۔ ہم رائے اعظم کے ہیٹ میں داخل ہو گئے اور ہاتھیوں کا شکار کرنے لگے۔ شکاری زندگی اب میرے بھی خاصی دلچسپ ہو گئی تھی، لیکن پھر ایک دن بے چارہ..... بے کشن ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔

جوشی تیندوے نے بے کشن پر حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔ بے کشن کی زندگی کی کوئی امید تھی کہ روپ گبتالی کی پیش گوئی کے مطابق ایک ڈاکٹر نما جادوگر مل گیا، جس کا نام ”جنگر“ تھا۔

یہ شخص افریقہ میں ایک دیوتا کی طرح پوجا جاتا تھا اور افریقی اسے ”روتا تو“ صحت کا دیوتا مانتے

جنگر مجھ سے اس طرح ملا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

”کیسے ہو فنس راج.....؟“

”بالکل ٹھیک..... اپنے بارے میں سناؤ جنگر.....“

”میں پیدائش کے بعد سے اب تک ٹھیک ہوں۔“

”کیا کر رہے ہو آج کل.....؟“

”وہی پرانا کھیل، تیلیوں کی تلاش، پھولوں پر تجربات۔“

”ڈاکٹر ہو۔“

”وج ڈاکٹر..... معالجہ۔“

”میرے ساتھی کو دیکھو۔“

”کیا ہوا ہے اسے.....؟“

”ایک تیندوے نے زخمی کر دیا ہے، شدید بخار میں مبتلا ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں.....“ جنگر نے کہا۔

”مجھے اس کی زندگی کا خطرہ ہے۔“

”مجھے نہیں ہے۔“

”بغیر دیکھے ہوئے۔“

اس کا ایک مراثر اڈہ جو دواؤں اور جراحی کے اوزاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے یہ اوزار ہال میں ڈال دیئے اور انہیں خوب ابالا پھر وہ صابن سے اتنی دیر ہاتھ دھوتا رہا کہ مجھے خوف ہوا کہ اس کا کمال اڑھڑ جائے گی۔ اس کے بعد اس نے بے کشن کو افریقہ کی کسی ایسی بوٹی کا عرق دیا کہ غریب بے کشن ایسا بیہوش اور بے خبر ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مر گیا ہو۔ جگر نے بتایا کہ یہ بوٹی اس سیاہ فاموں سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد اس نے کسی تیز اوزار سے بے کشن کی ران کے ذرا کھولے انہیں صاف کیا اور پھر ابالی ہوئی جڑی بوٹی ان پر رکھ کر پٹی کس دی۔

کافی دیر بعد بے کشن کو ہوش آیا تو جگر نے اسے پھر کچھ پینے کو دیا۔ یہ دوا اس کے حلق سے نیچے اتری ہی تھی کہ بے کشن کے پسینے چھوٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بخار غائب تھا۔ قصہ مختصر دوا بعد جگر کا مریض اٹھ بیٹھا اور سخت بھوک کی شکایت کر کے کھانا طلب کیا اور ایک ہفتے کے اندر اسے وہ اس قابل تھا کہ ہم اسے آسانی سے ساحل تک پہنچا سکتے تھے۔ میں نے واپسی پر جگر سے اپنے ہاں کرشن میں ٹھہرنے کی درخواست کی اور خلاف توقع جگر نے حامی بھری۔

کیمپ میں جگر اور ہم ایک ہفتے تک ساتھ رہے اور پھر وہاں سے کرشن تک کے بحری سفر بھی ہمارا ساتھ دیا۔ چنانچہ اس عرصہ میں ہم دونوں آپس میں خاصے بے تکلف اور گہرے دوست بن چکے تھے۔ اپنے ماضی کے متعلق اس نے کچھ نہ بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ وہ افریقہ کے جنگلوں میں کیا بھٹک رہا تھا۔ البتہ اس نے علم الحیات اور علم الانسان کے متعلق بہت سی باتیں کہیں۔ چونکہ میں اپنے طور پر اور اپنی عقل کے مطابق افریقہ کے سیاہ فاموں کے رسم و رواج اور فطرتوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اس لیے یہ موضوع میرے لیے دلچسپ تھا۔

دوسری بہت سی چیزوں کے علاوہ اس نے مجھے وہ کیڑے کوڑے اور رنگ برنگی تتلیاں دکھائیں، جو اس نے آوارہ گردی کر کے جمع کی تھیں۔ یہ چیزیں اس نے بسکوں میں بڑی مہارت سے ٹانگ رکھی تھیں۔ پھر اس نے مجھے وہ خشک پھول دکھائے، جو اس نے بلند خشک فاصل کے صفات کے ذریعہ میں دبا کر احتیاط سے رکھے تھے۔ ان میں چند پھول، بقول، جگر ”پولن“ تھے۔ یہ دیکھ کر کہ پولین بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ کیا میں دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت اور حیرت انگیز پھول دیکھنا پسند کروں گا۔ ظاہر ہے میرا جواب اثبات میں تھا۔ اس پر اس نے ایک بکس میں

ایک چٹا پیکٹ برآمد کیا۔ جو دوفٹ، چھ انچ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ جگر نے بڑی احتیاط سے کھول کر اس کی وہ چٹائی کھولی جو پیکٹ میں لپیٹی ہوئی تھی۔ چٹائی کے نیچے پیکٹ یا ڈبے کا ڈھکن تھا، جو ہلکا تھا۔ اس کے نیچے پھر کئی چٹائیوں کی تھیں۔ اس کے نیچے دو گتے تھے اور ان گتوں کے درمیان اہول تھا اور اس پودے کی ایک پتی تھی، جس پر یہ پھول اگا تھا۔

خشک ہونے کے باوجود یہ پھول ایک حیرت انگیز چیز تھا۔ اس کے باہر کی طرف ایک بصورت غلاف سا تھا۔ جس پر کالی دھاریاں تھیں۔ پھول کا رنگ چمکدار سنہرا تھا، یہ غلاف پھول کو ادا دینے ہوئے تھا۔ کھلے ہوئے پھول کے بیچ میں کیونکہ پھول کھلا ہوا تھا۔ ایک پیالی سی تھی اور اس کے عین بیچ میں اس کے پینڈے میں ایک سیاہ داغ تھا۔ اس سیاہ داغ کو غور سے دیکھنے کی اہمیت تھی، سرسری نظر سے دیکھنے پر بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ سیاہ داغ ایک زبردست بندر، اس کی شکل کا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی بھونکیں، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں منہ اور بڑا سا جڑا سب کچھ ل نظر آ رہا تھا اور یہ سارے نقوش وہ تھا سیاہ داغ بنا رہا تھا۔

”کیا ہے یہ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جواب!“ جگر نے کہا۔ ”یہ پولن گریز کا سب سے حیرت انگیز نمونہ ہے اور میں نے اسے لٹ کیا ہے اور اس پودے کی تازہ جڑ کی قیمت لاکھوں پونڈ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔“

”تب تو بھائی یہ کاروبار سونے کی کان کنی سے زیادہ منافع بخش ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو اس لیے تمہارے پاس؟“

جگر نے بڑی اداسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اتنا خوش قسمت کہاں؟“ اس نے کہا۔

”تو پھر پھول کیسے آگیا۔ تمہارے پاس! ظاہر ہے کہ پودے ہی سے توڑا گیا ہوگا۔ پھر اس کی مل کرنے میں کون سی مشکل درپیش تھی۔“

”یہ ذرا طویل داستان ہے لیکن میں تمہیں سناتا رہا ہوں سنو!“ پچھلے ایک برس تک میں اس میں سے پھولوں اور قلیوں وغیرہ کے نمونے جمع کرتا رہا تھا۔ جو چٹاری کے پیچھے اور وہاں سے مدید عجیب نمونے مل گئے اور اپنی سی آوارہ گردی کے سلسلے میں پورے تین سو میل آگے بڑھ کر کے گویا قلب میں گھستا چلا گیا“ اور اس قبیلے یا یوں کہو کہ ان لوگوں میں پہنچ گیا“ جنہوں نے پہلے ہی سفید قام کو نہ دیکھا تھا۔ یعنی میں وہ پہلا سفید قام تھا کہ جو ان لوگوں میں پہنچا تھا۔ یہ لوگ ہلاتے ہیں۔ فطرتاً جبگو ہیں اور ان کی رگوں میں ہولون خون کی آمیزش ہے۔“

”ان لوگوں کے متعلق میں سن چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کورا لیا زونا کے دور سے پہلے یعنی

”انگولی! اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو پھر سیاہ قام گوریلے کو انگولی کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کم سے کم اس شخص نے تو مجھے گوریلے کا بھی افریقی نام بتایا تھا، جس سے میری ملاقات مغربی ساحل پر ہوئی تھی۔“

”آچھے..... چھا۔ تب تو یہ واقعی عجیب بات ہے، جیسا کہ خود جنہیں ابھی معلوم ہو جائیگا۔ اب یہ انگولی کہتے ہیں کہ بڑے زبردست جادوگر ہیں اور جس دیوتا کی یہ پرستش کرتے ہیں، وہ ایک گوریلا ہی ہے، کم سے کم مجھ سے تو یہی کہا جاتا ہے کہ ان کا دیوتا گوریلا ہے، لیکن ان کا ایک ہی نہیں بلکہ دو دیوتا ہیں۔“

”دوسرا دیوتا بھی کوئی جانور ہی ہوگا۔“

”نہیں ان کا دوسرا دیوتا یہ پھول ہے۔ جسے تم دیکھ رہے ہو، یعنی یہی عجیب و غریب سنہرا پھول ہے۔ جس پیالی میں بندر کا سر بیٹا ہوا ہے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ انہوں نے اس پھول میں بے ہوشی کی وجہ سے گوریلے کی پرستش شروع کر دی یا پھر اس گوریلے کی وجہ سے اس بندر کے سر اگلے پھول کو اپنا دوسرا دیوتا بنالیا۔ بہر حال اس کے متعلق ہولون لوگوں سے اور پھر اس شخص سے معلوم ہونیں۔ جو اپنے آپ کو انگولی سردار ظاہر کر رہا تھا۔“

”کیا کہا ان لوگوں نے؟“

”ہولون لوگوں کا کہنا ہے کہ انگولی دراصل شیطان ہیں، جو ڈونگوں میں سوار ہو کر جمیل اور دلوں کے خفیہ راستوں سے جہازوں کے جھنڈوں میں بنائے جاتے ہیں اور ہولون کی عورتوں اور ان کو چمالے جاتے ہیں اور پھر ان کو اپنے دیوتاؤں پر بھیجتے چڑھا دیتے ہیں، بعض دفعہ انگولی، ہولون ہستی پر باقاعدہ حملہ کر دیتے ہیں اور وہ جیسا کہ ہولون لوگوں نے کہا ہے، جب حملہ کرتے ہیں، تو ڈونگوں کی طرح چیختے اور چلاتے ہیں، مردوں کو وہ لوگ قتل کر دیتے ہیں اور بچوں کو اٹھا لے جاتے۔“

ہولون نے ان شیطانوں پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کامیاب نہ ہوئے کیونکہ یہ جیسا کہ وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں خشکی کے آدمی ہیں، انہیں پانی سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ان پاس ڈونگے بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ جزیرے تک نہ پہنچ سکے۔ بشرطیکہ وہ علاقہ حقیقت میں جزیرہ ہو۔ انہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں انگولی کا گوریلا دیوتا رہتا ہے۔ وہاں ایک عجیب و بے پھول اگتا ہے اور یہ پھول بھی دیوتا کی طرح پوجا جاتا ہے۔ اس کی کہانی انہیں اپنے ہی قبیلے ان لوگوں سے معلوم ہوئی تھی، جنہیں انگولی نے اپنا غلام بنالیا تھا۔ لیکن جو بعد میں فرار ہونے میں

دوسو برس عرصہ ہوا۔ یہ لوگ جنوب کی طرف بھاگ گئے تھے۔“

”خیر تو یہ لوگ میری بات سمجھ سکتے تھے اور میں ان کی بولی سمجھ سکتا تھا، کیونکہ یہ لوگ جو بولتے ہیں وہ شولوزہان کی گڑبڑ ہوئی شکل، ابتداء میں تو ان لوگوں نے چاہا کہ مجھے قتل کر دیں، پھر انہوں نے مجھے آزاد کر دیا۔“

”وہ کیوں.....؟“

”اس لیے کہ وہ لوگ مجھے پاگل تسلیم کر چکے تھے۔ ہنس راج بہت سے لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں، عام خیال یہ ہے۔ لیکن میں خود اپنے آپ کو صحیح الحواس اور دوسروں کو پاگل سمجھتا ہوں۔“

”خیر اپنا اپنا خیال ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ کیونکہ اس وقت میں جگر کی صحیح الحواس بحث کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ”ہاں تو پھر کیا ہوا؟“

”بعد میں کسی طرح ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں دوا دارو بھی کرتا ہوں، چنانچہ ان کا ہا جس کا نام لالی تھا۔ میرے پاس آیا کہ میں اس کی رسولی کا علاج کروں، رسولی غیر معمولی طور پر تھی۔ بہر حال میں نے جرأت سے کام لے کر اس کی رسولی کا آپریشن کیا اور اسے بھلا چنگا کر دیا کام بڑا ہی خطرناک تھا کیونکہ اگر آپریشن کے دوران یا اس کے بعد لالی مر جاتا تو مجھے بھی قتل آ جاتا۔ خیر تو آپریشن کامیاب رہا۔ لالی کی رسولی میں نے نکال کر پینک دی اور اس کا زخم منڈا گیا۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت سے ہولون لوگ مجھے ایک عجیب سا مریمنے لگے۔ اس کے علاوہ لالی نے مجھے اپنا خون بدل بھائی بنالیا۔ یعنی اس طرح کہ اس نے اپنی اور میری کلائی پر کئی دے کر اور پھر اپنی کلائی میری کلائی پر رکھ کر اپنا خون میری رگوں میں داخل کر دیا۔ چنانچہ اب لالا میں تھا اور میں اس میں، یعنی میں لالی تھا اور لالی میں۔ دوسرے لفظوں میں ہولون لوگوں کا بادشا بھی بن گیا۔ اب تک ان کا بادشاہ ہوں اور جب تک زندہ ہوں ان کا بادشاہ رہوں گا۔“

”تمہاری یہ بادشاہت کبھی ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”لیکن

کہے جاؤ۔“

”وہیں مجھے معلوم ہوا کہ ہولون علاقے کی مغربی سرحد سے پرے زبردست دلدل میں جمیل ہیں، ان دلدلوں کے بعد جیرن نامی ایک جمیل ہے اور اس جمیل کے بعد ایک وسیع و عریض اور علاقہ جو کہتے ہیں کہ جزیرہ ہے۔ اس جزیرے کے عین بیچ ایک پہاڑ ہے، اس علاقے کا نام ہے۔ چنانچہ اس مناسبت سے وہ لوگ بھی انگولی کہلاتے ہیں۔ جو اس علاقے میں آباد ہیں۔“

لےنے کی ہمت کی ہے؟“

”اے آقا! میں ڈوینو ہوں۔ میں انگو لی لوگوں میں سردار اور اپنے علاقے کا عظیم اور مشہور آدمی تھا۔“

”تو پھر اے انگو لی کے سردار ڈوینو تم یہاں اکیلے کیوں آئے ہو؟“ میں نے پوچھا ”اور وہ بھی اگلے کے اندر میرے میں؟“

”سفید قام آقا! تم اپنی کہو۔ خود تم یہاں اکیلے کیوں آئے ہو؟“ اس نے جواباً پوچھا ”بہر حال تم کیا چاہتے ہو؟“

”اے روتا نو! میں زخمی ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم میرا علاج کرو اور اس تکلیف سے مجھے نجات دو۔“ اور اس نے اپنے اس ہاتھ کی طرف دیکھا۔ جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”بھلا پھینک دو اور اپنا لبادہ کھولو کہ میں دیکھوں کہ تم میں چاقو چھپائے ہوئے تو نہیں ہو۔“

”اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنا بھلا کٹی فٹ دور پھینک دیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے ہاتھ کی پٹی الگ کر دو۔“

”اس نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ میں نے دیا سلائی کی تیلی جلائی اسے دیکھ کر وہ خوفزدہ

لگا۔ حالانکہ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ میں نے تیلی کی روشنی میں اس کے ہاتھ کا معائنہ کیا،

ات کے قریب والی انگلی کی پور جوڑ کے قریب سے غائب تھی۔ انگلی کے سرے کو داغا گیا تھا اور اس

لہذا اور پچھنی گھاس کی پچاس بندھی ہوئی تھیں، مجھے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ ڈوینو کی انگلی کسی درندے

کاٹ لی تھی۔

”کس درندے نے یہ انگلی کاٹ لی؟“ میں نے پوچھا۔

”بندر نے۔“ ڈوینو نے جواب دیا۔ ”زہریلا بندر روتا نو! میری یہ انگلی جڑ سے کاٹ دوور نہ کل

سورج غروب ہونے سے پہلے میں مر جاؤں گا۔“

”ڈوینو! تم اپنے لوگوں کے سردار ہو، چنانچہ! تم اپنے علاقے کے وچ ڈاکٹروں سے کیوں نہیں

پوچھ کہ وہ تمہاری انگلی تمہارے ہاتھ سے الگ کر دیں؟“

”نہیں نہیں۔“ اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ ”وہ یہ کام نہ کریں گے۔“

”کیوں نہ کریں گے؟“

”اس لیے کہ یہ ہمارے اصول اور قانون کے خلاف ہے اور یہ کام میں نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر

ٹٹ کالا ہوا تو ہاتھ کاٹ دیا جائے گا اور اگر کہنی تک گوشت کالا ہوا تو پورا بازو جسم سے الگ کر لیا

کا میاب ہو گئے تھے۔“

”ظاہر ہے کہ تم نے اس جزیرے تک پہنچنے کی کوشش کی ہوگی؟“ میں نے کہا۔

”یہ تم نے غلط نہیں کہا، میں نے کوشش کی اور نرسلوں کے کنارے تک پہنچ بھی گیا۔ نرسلوں کا

کنارہ ایک ڈھلوانی میدان کے سرے پر تھا اور وہ چارلی جمیل اس جگہ سے شروع ہوئی تھی۔ خیر تو

وہاں پہنچ کر میں نے چند دنوں کیلئے قیام کیا اور تھلیاں پکڑتا اور پودوں کے نمونے جمع کرتا رہا۔ سورج

غروب ہوتے ہی میرے سیاہ قام ملازم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے تھے، کیونکہ رات اندھیرا اترنے

کے بعد بقول ان کے وہاں کوئی پاگل ہی ٹھہر سکتا تھا، یا پھر وہ شخص جس کو اپنی زندگی عزیز نہ ہو۔ تو ایک

رات میں اپنے کیمپ میں اکیلا سو رہا تھا کہ دفعتاً میری آنکھ کھل گئی اور مجھے احساس ہوا کہ وہاں اکیلا

نہ تھا، میں اپنے خیمے سے باہر آیا اور غروب ہوئے چاند کی، کیونکہ رات ختم ہو رہی تھی۔ روشنی میں میں

نے دیکھا کہ ایک شخص میرے خیمے کے دروازے کے عین سامنے اپنے بھالے کے دستے پر جھکا کھڑا

تھا۔ بھالے کا قد غیر معمولی طور پر لمبا تھا۔ خود وہ شخص بھی خاصا طویل القامت تھا۔ تقریباً چھ فٹ ۱۱

انچ۔ لیکن بھلا اس کے قد سے بھی لمبا تھا۔ اس شخص کا سینہ چوڑا اور شانے مضبوط تھے اور اس نے

سفید لبادہ پہن رکھا تھا۔ جو اس کے شانوں سے شروع ہو کر بازوؤں تک پہنچ رہا تھا۔ اس کے سر پر ایک

ٹک سی فیتے دار ٹوپی تھی اور وہ بھی سفید تھی۔

اس کے کانوں میں تانبے یا سونے کے بالے اور کلایوں میں اسی دھات کے کنگن پڑے

ہوئے تھے۔ اس کی جلد گہری کالی تھی، لیکن چہرے کے نقوش چھٹیوں کے سے نہ تھے۔ بلکہ قدرے

مختلف تھے۔ ناک ستواں تھی اور ہونٹ پتلے تھے، جیسے کہ عربوں کے ہوتے ہیں۔ اس کے بائیں ہاتھ

پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور خود وہ شخص عجیب الجھن میں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال معلوم ہوئی

تھی، وہ یوں بے حرکت کھڑا تھا کہ میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ کہیں ان بھوتوں میں سے تو

نہیں جنہیں بھول ہولون، انگو لی جادوگر، ہولون لوگوں کو پریشان کرنے کیلئے ان کی بستیوں کی طرف

بھیج دیتے ہیں۔

بہر حال ہم بہت دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر کار اسی نے اپنی زبان

کھولی۔ اس کی زبان سمجھنا مشکل نہ تھا۔

”اے سفید قام آقا! کیا تم وہی ہو، جس کا نام روتا نو ہے اور جو بیماروں کو اچھا کرتا ہے۔“ اگر

نے پوچھا۔

”بے شک میں وہی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن تم کون ہو کہ تم نے میری نیند خراب

اس نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ سُرخ تھا، تو اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ جب آپریشن ختم ہوا، تو اینو پر بے ہوش طاری ہونے لگی، چنانچہ میں نے شراب میں پانی ملا کر اسے پینے کو دی، چند لمحوں بعد لاوہ ہوش میں تھا۔

”اے روتاؤ!.....“ جب میں اس کے ہاتھ پر پٹی کس رہا تھا، تو اس نے کہا۔ ”تم نے مجھ پر احسان کیا ہے، چنانچہ یاد رکھو جب تک میں زندہ ہوں، تمہارا میں غلام ہوں، تاہم میں چاہتا ہوں کہ تم میرا ایک اور کام بھی کرو۔ میرے علاقے میں ایک خوفناک اور خوفناک درندہ موجود ہے، وہی میں نے میری انگلی کاٹ لی تھی۔

یہ درندہ بدروح ہے۔ جو ہم لوگوں کی جان لے لیتا ہے اور ہم اس سے ڈرتے ہیں، میں نے اسے کہ تم لوگوں کے پاس جادوئی ہتھیار ہوتے ہیں، جو بہت دور سے اور ایک زبردست آواز کے ساتھ فکار اور دشمن کو مار گراتے ہیں۔ روتاؤ!.....! میرے علاقے میں چلو، اس خوفناک درندے کا خاتمہ کرو۔ یہ میری درخواست ہے، چلو.....“ روتاؤ! کیونکہ میں بہت زیادہ خائف ہوں اور حقیقت میں، میں خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔

”نہیں.....“ میں نے جواب دیا۔ ”میں کسی کا خون نہیں بہاتا اور کسی کی جان نہیں لیتا۔ سوائے لیوں کے اور وہ بھی کبھی کبھی لیکن اگر واقعی تم اس شیطان سے خائف ہو۔ تو اسے زہر کیوں نہیں کھلا دیتے۔ تم لوگ بڑے زوداثر زہروں سے واقف ہو۔“

”روتاؤ! یہ سب بیکار ہے۔ بیکار ہے۔“ اس نے روہنسی آواز میں کہا، وہ شیطان ہر قسم کے روں کو بچا جاتا ہے۔ چند زہر وہ کھا لیتا لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور جو قاتل زہر ہیں انہیں وہ چھوٹا نہیں، اس کے علاوہ کوئی سیاہ قام اس کا خاتمہ نہیں کر سکتا۔ البتہ کوئی سیاہ قام اس کی جان لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بدروح فانی ہو اور سچ تو یہی ہے۔ روتاؤ! کہ وہ ہمارے یہاں کتنی ہی نسلوں سے یہ اہت چل آ رہی ہے کہ اس درندے کا خاتمہ ایک سفید قام ہی کرے گا۔“

”عجیب درندہ ہے، عجیب روایت ہے؟“ میں بڑبڑایا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ڈوینو جو کہہ رہا ہے، وہ سچ نہیں ہے۔ عین اس وقت میں نے اپنے آدمیوں کی آوازیں سنی۔ وہ قد آدم گھاس کے دان میں تھے۔ چنانچہ ہم انہیں دیکھ نہ سکتے تھے۔ بہر حال وہ کوئی گیت گاتے ہوئے، کیپ کی طرف دھرے تھے۔ آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کیپ سے کافی دور تھے۔

ڈوینو نے بھی یہ آوازیں سن لیں اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب مجھے چلنا چاہئے کیونکہ یہ مناسب ہوگا کہ کوئی مجھے یہاں نہ دیکھے۔“ وہ بولا۔ روتاؤ

جائیگا۔“

میں تپائی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ دراصل میں سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہا تھا کیا یہ آپریشن اندھیرے میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ڈوینو نے سمجھا کہ میں نے اس کی درخواست رد کر دی ہے، چنانچہ وہ مشتعل ہو گیا۔

”سفید قام! کوئی فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو۔“ اس نے اپنے جذبات کو قابو میں کر ہوئے کہا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں موت سے ڈرتا ہوں، بے شک زندگی بہت بری چیز ہے۔ موت اس سے بھی بری ہو۔ روتاؤ! اگر تم نے انکار کر دیا، تو میں اس جگہ خود اپنے ہاتھوں سے خاتمہ کر لوں گا اور پھر میرا بھوت تمہیں پریشان کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ تم خود اپنی زندگی سے آ کر میرے پاس روحوں کی دنیا میں چلے آؤ گے۔“

”روتاؤ! کیا چاہیے تمہیں اپنی اس خدمت کے صلے میں؟ ہاتھی دانت، سونا، لوہڑی..... ملا کہو اور جو تم طلب کرو گے، پاؤ گے۔“

”خاموش رہو۔“ میں نے کہا۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ اگر وہ اسی طرح مشتعل رہا اور بولتا رہا، پھر اسے بخار چڑھ آئے گا اور اس کے بعد اگر آپریشن ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا اور خطرناک ہوگا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ میں نے اس سے ان بہت سی باتوں کے متعلق نہ پوچھا جنہیں معلوم کرنے بے چہن تھا۔ میں نے آگ جلائی اور اپنے اوزار پانی میں ڈال کر بالائے لگا۔ ڈوینو حیرت سے ہ کارروائی دیکھ رہا تھا، کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں جادو کر رہا ہوں۔

اس عرصہ میں سورج طلوع ہو چکا تھا۔ ”ہاں تو ڈوینو میں نے کہا۔“ لاؤ اب ہم دیکھیں کتنے بہادر ہو؟“

”تو برادر ہنس راج میں نے وہ آپریشن کیا اور اس کی انگلی جڑ سے یعنی ٹھیک اسی جگہ سے جو وہ ہتھیلی سے ملتی ہے کاٹ لی، ڈوینو نے یہ غلط نہ کہا تھا کہ وہ بندرجس نے اس کی انگلی کاٹ لی زہر یلا تھا۔ یہ انگلی اب بھی میرے پاس اسپرٹ میں رکھی ہوئی ہے اور تم چاہو تو اسے دیکھ سکتے ہو۔ تو بعد میں میں نے اس انگلی کی چیر پھاڑ کی تو معلوم ہوا کہ پوری انگلی، یعنی جڑ تک، سڑ گئی تھی گوشت سیاہ پڑ گیا تھا۔ لیکن اس سے آگے کا گوشت سُرخ اور صحت مند تھا۔ ڈوینو نے یہ بھی غلط کہا تھا۔ کہ اگر اس کی انگلی کاٹ نہ لی جاتی، تو یہ زہر اس کے پورے ہاتھ میں بازو میں پھیل جاتا۔ ڈوینو واقعی بڑا بہادر شخص تھا، کیونکہ اس پورے آپریشن کے دوران وہ چٹان کی طرح بے حر بیٹھ رہا اور آف! تک نہ کی اور نہ ہی اس کے منہ سے سسکی نکلی۔ بلکہ جب میں نے اس کی انگلی کا

معاوضہ۔ ہاں بولو..... کیا چاہتے ہو.....؟“

”میں اپنے علاج کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ٹھہرو میں نے سنا ہے کہ تمہارے علاقے میں کوئی حیرت انگیز پھول آگیا ہے، ایک ایسا پھول جس کے بازو سے ہیں اور ان کے نیچے ایک پیالی ہے۔ بس مجھے وہی پھول چاہئے۔“

”کس نے بتایا، تمہیں! اس پھول کے متعلق؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ پھول مقدس ہے، اس کے باوجود اے سفید قام تمہاری خاطر یہ خطرہ مول لیا جاسکتا ہے۔ جاؤ..... اے سفید قام جاؤ..... اور اپنے ساتھ اس سفید قام کو لے کر آؤ..... جو اس درندے کا خاتمہ کر سکتا ہے اور پھر میں مالا مال کر دوں گا۔ ہاں اس سفید قام کو لے کر نرسوں تک آؤ اور ڈوینوں لے گا اور تمہاری خدمت میں حاضر ہو جائیگا۔“ اور پھر اس نے لپک کر اپنا بھالا اٹھایا اور نرسوں میں گھس کر غائب ہو گیا اور پھر میں نے اسے نہ دیکھا اور شاید اب دیکھ بھی نہ سکوں گا۔

”اگر ایسا ہی تھا، برادر جنگر تو پھر یہ پھول تمہارے پاس کہاں سے آگیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”سنو توسی ہنس راج تم سچ ہی میں بول پڑتے ہو۔ اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد ایک صبح میں اپنے خیمے سے باہر آیا تو یہ پھول خیمے کے دروازے کے سامنے مٹی کے ایک برتن میں، جس میں پانی تھا۔ وہ دھرا ہوا تھا۔ جب میں نے ڈوینو سے کہا تھا کہ وہ میرے لیے یہ پھول لائے تو میرا مطلب یہ تھا کہ وہ پھول اور اس کا پودا جڑ سمیت لے آئے، لیکن اس نے یہ سمجھا کہ صرف پھول چاہتا ہوں یا شاید یہ بات ہو کہ وہ پودا بیجے کی جرات نہ کر سکا ہو۔ بہر حال کچھ نہ ہونے سے کچھ بہتر ہے۔“

”جناب جنگر! پودا حاصل کرنے کیلئے تم خود کیوں نہ گئے، اس علاقے میں؟“

”اس کی چند وجوہات تھیں، لیکن سب سے زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ وہاں جانا ناممکن تھا، ہولوں لوگوں نے قسم کھا کر کہا کہ اگر اس پھول کو کوئی دیکھ بھی لیتا ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے، چنانچہ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرے پاس یہ پھول ہے، تو انہوں نے مجھے ستر میل تک اندرون ملک ہٹ آنے تک مجبور کر دیا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ میں اس وقت تک انتظار کروں۔ جب تک مجھے کوئی ایسا ساتھی نہیں مل جاتا، جو میرے ساتھ اس ہم پر چلنے کے لئے تیار ہو جائے۔ سچ یہ ہے، ہنس راج.....! کہ مجھے یہ ہی خیال آیا تھا کہ تہا تم وہ شخص ہو، جو انسانوں کی انگلیاں کاٹ لیتا ہے اور انگوٹھی لوگوں کو خوفزدہ کئے ہوئے ہے۔“

برادر جنگر نے اپنی لمبی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا دیا۔



برادر جنگر نے بُر خیال انداز میں اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔

”اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جب میں نے یوں سوچا تو اس کے کچھ عرصہ بعد ہماری اوقات ہو گئی۔“

”برادر جنگر!“ میں نے کہا۔ ”لوگ تمہارے متعلق عجیب و غریب باتیں کہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارے دماغ وغیرہ میں کوئی فتور نہیں ہے۔“

برادر جنگر پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مسکرا دیا۔

کرٹن کھینچ کر میں نے اپنے گھر میں برادر جنگر کے قیام کا بندوبست کیا اور پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کہا۔ ”جنگر.....! میں تمہاری داستان پر جو تم نے پھول کے متعلق سنائی تھی، رکتا رہا ہوں اور چند نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

”اور وہ کیا نتائج ہیں، ہنس راج؟“

”پہلی بات تو یہ کہ تم اعلیٰ درجہ کے گدھے ہو؟“

”اور یہ نتیجہ تم نے میری کون سی بات سے اخذ کیا ہے؟“

”اس بات سے کہ ڈوینو تمہارے پاس خود آیا تھا، اس کے باوجود تم نے اس سے زیادہ باتیں لوم نہ کیں۔“

”یہ تم نے غلط نہیں کہا، لیکن یہ نہ بولو ہنس راج! کہ پہلے میں ڈاکٹر ہوں اور پھر سب کچھ ہوں، نچہ اس وقت میرے دماغ میں کوئی اور خیال تھا ہی نہیں۔ سوائے اس کے کہ ڈوینو کی انگلی کاٹ کر بے تکلیف سے نجات دوں اور پھر اس کے بعد اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ اس سے مزید بات کر سکتا۔“

”دوسری بات یہ کہ یہ شخص ڈوینو گوریلے دیوتا کا یا تو محافظ یا پھر مہنت اور مجھے یقین ہے کہ یہ ن خود تم نے بھی معلوم کر لی ہوگی اور یہ کہ وہ گوریلے ہی تھا، جس نے ڈوینو کی انگلی کاٹ لی تھی۔“

”یہ تم نے کیسے کہہ دیا؟“

”میں نے دیوتا قامت بندروں کے متعلق بہت کچھ سنا ہے، یہ وسطی افریقہ میں پائے جاتے ہیں انہیں کورال کہتے ہیں، سنا ہے کہ یہ بندر، انسانوں کی انگلیاں اور پوریں کاٹ لیتے ہیں، میں نے سنا ہے کہ یہ بندر گوریلے کے مشابہ ہوتے ہیں۔“

”تم نے کہا تو مجھے بھی یاد آیا۔ ایک دفعہ بہت دور سے میں نے ایک کورال دیکھا تھا۔ ایک قامت مجبورے رنگ کا بندر تھا جو اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے گھونٹوں، اپنا سینہ کوٹ رہا تھا۔ خوف کی وجہ سے میں اسے زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔“

”ان قبائل میں انگوئی قبیلہ بھی شامل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میں انگوئی لینڈ کی مہم کیلئے روپیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اس مہم میں تمہیں بھی چلنا ہوگا۔ اگر نہیں تو ظاہر ہے، میں بھی لٹل جاؤں گا۔ سچ ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ میں تم پر بھروسہ کئے بیٹھا ہوں۔ یعنی اگر تم ساتھ ہوئے تو اہم ہولوں اور تمہارے دوسرے کافر دوستوں کی مدد سے اکثر علاقوں سے بخیر و خوبی گزر جائیں گے۔“

”بھنگ میں تمہارے ساتھ چلوں گا بلکہ اگر تم نہ چلے، تو میں اکیلا ہی اس مہم پر روانہ ہو جاؤں گا۔ میں بہر حال انگوئی لینڈ کا کھوج لگانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ چاہے وہاں میری قبر ہی کیوں نہ بن ائے۔“

میں نے حیرت سے جگر کی طرف دیکھا..... میری چھٹی حس نے پھر بادور کیا کہ وہ کوئی خاص مقصد چھپاتا چاہتا ہے۔

”جگر ایک پھول کی خاطر تم اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو اور یہ بات دل کو نہیں لگتی، میرے خیال میں تو اس کی تہہ میں کوئی اور ہی جذبہ یا رُت پ کام کر رہی ہے، اگر ایسا ہی ہے تو مناسب ہوگا کہ تم مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ اور سب کچھ سچ بتا دو۔“

”ہنس راج! تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔ چنانچہ میں اعتراف کیے لیتا ہوں کہ انگوئی کے متعلق مانے جتنا کچھ تمہیں بتایا۔ میں نے اس سے کچھ زیادہ ہی سنا ہے۔ یہ باتیں مجھے ڈوینو کی انگلی کا نشان کرنے کے بہت بعد معلوم ہوئی تھیں۔ اگر پہلے معلوم ہو گئی ہوتیں تو میں اکیلا ہی انگوئی لینڈ مانس پڑنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ لیکن جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وقت نکل چکا تھا اور میں انگوئی لینڈ میں نہ جاسکتا تھا۔ جیسا کہ میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں۔“

”کیا باتیں سنیں تم نے؟“

”میں نے سنا ہے کہ ان کے دیوتا کے علاوہ ایک ”سنہری دیوی“ بھی ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا؟“ میں سمجھتا ہوں وہ گوریلے کی مادہ ہوگی۔“

”تو اس سے کیا ہوا میں نہیں جانتا۔ البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ سنہری دیوی شروع ہی سے لی دلچسپی اور غور کامرکز بنی ہوئی ہے، شب بخیر۔“

”جگر تم ایک پُر اسرار انسان ہو۔“ جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو میں کہا۔

”اور سب سے بڑی چیز تو یہ کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو، خیر ایک نہ ایک دن میں تمہارا یہ راز لوہ کر کے رہوں گا۔“

”تیسری بات یہ کہ اگر یہ پھول انگلستان لے جایا جائے تو اس کی خاص قیمت وصولی جاسکتی ہے۔“

”یہ تم نے کوئی نہیں کہی کیونکہ میرا خیال ہے، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس کی قیمت لاکھوں پاؤں ہو سکتی ہے۔“

”چوتھی بات یہ ہے کہ میں اس پھول کو تلاش کرتے اور اسے پودے سمیت اپنے ساتھ لاکھوں پاؤں میں بچ کر تمہارے اس منافع بخش سودے میں حصہ دار بن سکتا ہوں۔“

جگر کی باتیں کھل گئیں۔ ”آہا۔“ وہ بولا۔ ”اب تم نے مطلب کی بات کہی ہے، میں حیران تھا کہ تم نے اب تک اس کے متعلق کیوں کچھ نہ کہا۔ بہر حال دیر آید درست آید.....“

راؤ بے کشن کو میں نے ابھی تک جگر کی سنائی ہوئی داستان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، لیکن وہ خود جگر کا ممنون کرم تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایک لمحے کے اندر ایسے کسی بھی عمل کے لیے تیار ہو جائے گا، جس کے ماضی میں اور جگر ہوں گے۔

”افریقہ کے ان علاقوں میں جہاں ہمیں اس مہینے سے موسم باراں شروع ہو جاتا ہے، اپریل کے آغاز تک ہوتا ہے، چنانچہ ہم اپریل تک تو نہیں جاسکتے۔“ اور جگر نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی۔

”تو پھر ٹھیک ہے، اس عرصے میں تم میرے پاس ہی قیام کرو۔“ میں نے مطمئن ہو کر کہا۔

”شکر یہ راج! لیکن میرا بھی یہ خیال ہے کہ اتنے مہینوں تک میں ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں بھی کسی طرف نکل جاؤں گا اور پھر آ جاؤں گا۔“ جگر خاموش ہو گیا اور دفعتاً عجیب طرح کے خواب ناک جذبات اس کے بشرے عیاں ہوئے۔

”ہنس راج! میرے لیے تو یہ مقدر ہو چکا ہے کہ اس براعظم کی انجانی راہوں اور اندھیرے خطرناک جنگلوں میں اس وقت تک بھٹکتا رہوں۔ جب تک کہ مجھے معلوم نہیں ہو جاتا.....؟“

”کیا معلوم نہیں ہو جاتا.....؟“ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”میرے اس سوال پر وہ اچانک چونکا۔ جیسے غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے کوئی بات نکلنے والی تھی اور جسے اس نے بروقت ہونٹوں میں روک لیا۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ جیسے جگر کوئی خاص بات مجھ سے چھپا رہا تھا، پھر اس نے بات بتاتے ہوئے کہا۔

”جب تک میں اس براعظم کے چپے چپے سے واقف نہیں ہو جاتا، یہاں ابھی بہت سے قبائل ایسے ہیں جن میں، میں اب تک نہیں گیا ہوں۔“

اور پھر میں سوچنے لگا کہ جنگر کی اس کہانی میں کہاں تک صداقت تھی۔ پھر نتیجہ پر پہنچا کہ ممکن ہے، یہ محض روایت نہ ہو بلکہ خود جنگر کے دماغ کی یا پھر کافروں کے توہم پرست دماغوں کی ان کا ہے۔ لیکن میں نے یہ خیال جھٹک دیا۔ جنگر نے جو کچھ کہا تھا، وہ نہ تو روایت تھی اور نہ ہی سنگی یا توہم پرست دماغ کی ایجاد، بلکہ وہ سب حقیقت تھی۔ ثبوت؟ ثبوت..... وہ عجیب و غریب پھول تھا جو جنگر نے مجھے دکھایا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ انگوٹھی واقعی عجیب لوگ تھے، جن کے تین دیوتا تھے۔ ایک دیوتا، ایک سنہری دیوی اور تیسرا وہ مقدس پھول۔ افریقہ عجیب لوگوں اور عجیب دیوتاؤں کا مرکز ہے۔ مگر میں نے لیوشن کی تلاش میں انگلینڈ روانہ ہونے سے پہلے جنگر سے وہ ڈبہ حاصل کرا لیا تھا۔ جس میں وہ مقدس اور حیرت انگیز سنہری خشک پھول محفوظ تھا، تاکہ لیوشن کو جو اتفاق سے خود ہارا پھولوں کا بہت بڑا شوقین تھا یہ یقین دلا سکوں کہ یہ ہم بہر حال اس کے لیے منافع بخش ہو سکتی ہے۔ راؤ جے کشن نے اپنے ایک خاص ساتھی لیوشن کو طلب کر لیا اس نے اپنے اس ساتھی کے ہاں ہی لے جاتا تھا۔ لیوشن سے ملاقات کرنے میں مجھے پورا ایک ماہ لگ گیا۔ کیونکہ وہ کسی دوسرے ملک کا روہاری دورے پر گیا ہوا تھا۔ بہر حال جب وہ آیا تو مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا اور جب میں اس سے پھول کا ذکر کیا تو وہ تڑپ اٹھا اور فوری طور پر اس پھول کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں نے ڈبہ اسی میز پر رکھ دیا، جو اس کمرے میں روشن دان کے ٹھیک نیچے رکھی ہوا تھی۔ اس کا ڈھکن کھولا اور وہ روٹی ہٹائی جو اوپر دھری ہوئی تھی اور کالج کی دو شفاف چادروں کے درمیان میں وہ پھول موجود تھا۔

پھول اور اس کے ساتھ پتی خشک ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر شاعر تھی۔

لیوشن اس پھول کی طرف دیکھتا رہا اور اس کی آنکھیں پھلتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ مجھے غلہ ہوا کہ وہ حلقوں سے نکل آئیں گی۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑا کر دوسری طرف لگا ہیں پھیر لیا اور چند ثانیوں بعد وہ ایک بار پھر اس پھول پر جھکا ہوا تھا۔

”میرے خدا.....!“ آخر کار اس کی قوت گویائی عموماً آئی۔ ”میرے خدا! کیا اس فانی دنیا میں ایسی چیز کا پیدا ہونا ممکن ہے؟ یقین نہیں آتا، اسے تم نے تو نہیں بنایا۔ اپنے ہاتھوں سے مسٹر راج“

”لیوشن!“ میں نے کہا۔ ”یہ آپ مجھے دوسری دفعہ جھوٹا کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ خدا حافظ میں ڈبہ بند کرنے لگا۔“

”نہیں..... نہیں خدا کیلئے برا نہ مانئے۔“ وہ گڑ گڑایا۔ ”اس گنہگار کی لفرشوں کو نظر انداز کر۔“

مسٹر راج! تم نہیں سمجھتے بہر حال جب تم پولن جمع کرنے لگو گے، تو خود بخود سمجھنے لگ جاؤ گے۔ میں گل نہیں ہوں، البتہ یہ پھول دیکھ کر بے شک اپنے حواس کو بیٹھا ہوں، مسٹر راج.....! تمہارے دست نے غلط نہیں کہا تھا۔ بے شک یہ..... سپری پیدم ہی ہے۔“ اور یہ الفاظ اس نے چچی اور کانبٹی وئی آواز میں کہے تھے۔ اس کی قیمت سونے کی کان ہی ہو سکتی ہے۔ ویسے..... اس کا پودا کہاں ہے، مسٹر راج؟“

”افریقہ کے کسی دور افتادہ اور گنہ نام خطے میں“ میں نے جواب دیا۔ ”غالباً تین سو میل اندرون“ اور پھر میں نے لیوشن کو ضروری نام اور پھول کے اگنے کے علاقے کا محل وقوع حذف کر کے سے مختصر اودہ داستان سنا دی، جو خود میں نے جنگر سے سنی تھی اور آخر میں کہا کہ مجھے کسی ایسے شخص کی اس ہے، جو اس ایک مہم کا خرچ برداشت کر سکے۔ میں نے کہا کہ یہ مہم دراصل اسی علاقے کی ہے، اس کہتے ہیں کہ پھول اگتا ہے۔ راؤ جے کشن سے اس بارے میں تفصیلی ملاقات کے بعد لیوشن نے مجھ سے اس مہم کے اخراجات کے بارے میں پوچھا۔

”میرے اندازے کے مطابق اچھی خاصی رقم درکار ہوگی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیونکہ ہمیں ت سے بار بردار بہت سا ضروری سامان اور ہندو قیں ساتھ لینی ہوں گی اور اس کے علاوہ کچھ تجارتی باہ اور قبائلی سرداروں کے لیے تحائف بھی ساتھ لینے ضروری ہیں۔“

”میں تو اسے سستا سودا کہوں گا۔ لیکن فرض کرو راج! کہ یہ مہم کامیاب رہی اور پھول مل کر لیا گیا، تو پھر کیا؟“

”تو پھر یہ لیوشن! کہ اس پھول کی قیمت میں سے یعنی جتنی قیمت میں یہ فروخت ہوگا۔ ایک حصہ جنگر کا ہوگا کیونکہ انہوں نے ہی اس کا پتہ لگایا ہے اور اس کے متعلق میں تمہیں سب کچھ بتا ہوں۔“

”اچھا پھر؟“

”چونکہ اس مہم کا پکستان میں ہوں گا، اس لیے ایک تہائی میرا ہوگا۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہے گا مالک بلا شرکت غیرے وہ شخص ہوگا۔ جو روپیہ لگائے گا۔“

”ٹھیک ہے، تو پھر یہ طے رہا۔“

”ہیں! یعنی کیا طے رہا؟“

”یہ ہی کہ ہم منافع کے حصے اس طرح کریں گے، جیسا کہ تم نے کہا۔ البتہ میں اتنی رعایت چاہوں گا کہ سب سے پہلے یہ پودا خریدنے کا اختیار مجھے دیا جائے۔“



جکی ہے۔ اسے نہ تو کوئی آگے بڑھا سکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹا سکتا ہے۔ لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ ہمارے سامنے زندگی کی بہت سی راہیں کھلی پڑی ہیں۔ لیونٹن ذرا غور کرو! یہاں کا عیش و آرام چھوڑنا اپنے درختوں مستقبل کو ٹھکرا کر ایک نایاب پھول کی تلاش میں افریقہ کے جنگلوں کی خاک چھاننا ہاں تک مناسب ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے مجھے فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہی پہنچنے والا ہے۔ کیونکہ شاید ہی مجھے کوئی دوسرا شخص ایسا مل سکے، جو اس مہم پر سرمایہ لگانے کو تیار ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود میری درخواست ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم ان باتوں پر غور کرو۔ جو میں نے کہی ہیں۔“

لیونٹن چند ثانیوں تک میری صورت نکتا رہا اور پھر دفعتاً اس نے ایک قہقہہ لگایا اپنا وہی مخصوص دلکش قہقہہ۔

”شکریہ!“ میں نے جواب دیا۔

”رہی دوسری باتیں۔“ لیونٹن نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”میں خود بھی اکتا گیا ہوں اور دنیا مٹا چاہتا ہوں، چنانچہ تمہارا اس پھول کی تلاش کا خیال ہی گھر سے نہیں نکال رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہ میں بھی اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اس پھول کی تلاش تو ایک بہانہ ہے، مجھے تو سنسنی ہی اور رومان کی تلاش ہے۔ تمہاری طرح سے میں بھی قضاء و قدر کا قائل ہوں۔ خدا نے اپنی خوشی، ہمیں بھیجا اور اپنی مرضی سے ہمیں واپس بلائے گا۔ چنانچہ خطرات، اور زندگی، موت کا معاملہ میں پر چھوڑنا ہوں۔“

”ہاں لیونٹن! ممکن ہے کہ تمہیں سنسنی خیزی اور رومان مل جائے، کیونکہ ان چیزوں کی افریقہ کوئی کمی نہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں تمہیں اچل مل جائے اور پھر کسی سیاح کو افریقہ کے جنگل ایک قبر نظر آئے۔ بہر حال تم نے فیصلہ کر لیا اور میں تمہاری جرأت کو داد دیتا ہوں۔“

اس کے باوجود میں اس معاملہ میں مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ جہاز میں سوار ہونے سے کوئی ایک پہلے کافی غور و خوض کے بعد میں نے لیونٹن کے والد کو ایک خط لکھا اور انہیں لیونٹن کے فیصلے سے روکنے کے بعد اس مہم کے خطرات تفصیل سے بیان کر دیئے۔ راؤ جے کشن اپنی بیماری کے بعد ہم سے دستبردار ہو کر ہندوستان واپس چلا گیا تھا، لیکن اس شریف آدمی نے لیونٹن کو اپنا نعم البدل میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بھی میری بات کو سن کر اپنی زندگی اپنی شخصیت کو بدل دینے پر تیار ہوا۔

+++

”میں سمجھا نہیں!“

”اگر ہم یہ پودا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو اسی کی قیمت کا اندازہ لگا کر اس قیمت کا ایک تہائی حصہ جنگل کو اور ایک تہائی تمہیں دے دوں گا اور پودا خود رکھ لوں گا، اس کی اجازت مجھے راؤ جے کشن نے دی ہے اور کہا ہے کہ اس کی کاشت کاری میں ہی کروں۔“

”لیونٹن! تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ سرمایہ خود تم اس مہم پر لگاؤ گے اور ہمارے ساتھ اس مہم پر بھی چلو گے؟“

”بے شک یہ ہی ہے میرا مطلب! یعنی تم اور جنگل اس مہم پر روانہ ہو گے بشرطیکہ تم مجھے اسے ساتھ لے جانا پسند کرو اور ہم اس قیمتی پھول کو تلاش کر لیں گے، اسی لئے میں نے کہا ہے کہ یہ ملے رہا۔“

چنانچہ دوسرے دن یہ باقاعدہ طور پر طے ہو گیا اور ضروری دستاویزات کی تیاری سے قبل میں نے لیونٹن کو ان خطرات سے بھی آگاہ کر دیا۔ جو اس مہم میں ہمیں پیش آ سکتے تھے، میں نے بغیر کلاگ لپٹ کے کہہ دیا کہ اس مہم پر اسے کفن باندھ کر چلنا ہوگا۔ کیونکہ وہاں افریقہ کے اندھیرے جنگلوں میں موت مختلف صورتوں میں آ سکتی ہے۔ یعنی بھوک، پیاس، بخار اور درندوں کی صورت میں..... یا پھر وحشی سیاہ فام بھی اپنے بھالو سے ہمارا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر سخت اذیت دے کر مار ڈالیں۔ اس کے برخلاف میں نے کہا کہ کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں اور ممکن ہے کہ ہمیں یہ پودا سرے سے کسی جگہ ملے ہی نہیں۔“

”تم بھی تو یہ خطرہ مول لے رہے ہو، ہنس راج؟“ اس نے کہا۔

”میری بات دوسری ہے، لیونٹن!“ میں نے جواب دیا۔ ”کیونکہ اس قسم کے خطرات میری زندگی کا ایک ہم حصہ ہیں۔ چنانچہ میں پہلے بھی ایسے بہت سے خطرات سے دوچار ہو چکا ہوں۔ اگر کے علاوہ مجھے چند ایسے تجربات ہوئے ہیں اور ان چیزوں سے محروم ہو گیا ہوں۔ کہ اب میری نظر میری زندگی کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ نہ تو تمہیں ایسے تجربات ہوئے ہیں اور نہ ہی محرومیت سے سادہ پڑا ہے۔ زندگی کی اب مجھے کوئی پروا نہیں چاہے آج مرجاؤں چاہے چند برس اور زندہ رہوں۔ میرے لیے سب برابر ہیں اور آخر میں یہ کہ ہم جوئی میری فطرت بن چکی ہے اور اس کی سنسنی خیز میرے لیے ضروریات زندگی کی صورت اختیار کر چکی ہے۔“

شہروں کی گہما گہمی سے میری طبیعت گھبرا گئی ہے۔ اس کے علاوہ میں قضاء و قدر پر یقین رکھتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جب میرا وقت آئے گا، مرجاؤں گا۔ موت کی جو گھڑی میرے لیے مقرر

”ایک منٹ بعد یہ ریل چل پڑی۔“

”ارے ہاں ہنس راج!“ لیوٹن نے کہا۔ ”یہ شخص ایک خط میرے نام لایا ہے اور تمہارے نام ایک خط ہے یہ لو۔“

”میں نے لفافہ چاک کر کے تہہ کیا ہوا خط نکالا اور پڑھنے لگا۔ بڑے اور قدرے ترجمے حروف

مکری!

آپ نے جو خط مجھے لکھا، وہ مجھے مل گیا تھا۔ یقیناً! میرا ایڈریس آپ کو لیوٹن سے ہی ملا ہوگا۔ بے شک! آپ کی جگہ کوئی ”خود غرض“ شخص ہوتا، تو کبھی کوئی خط نہ لکھتا، چنانچہ ثابت ہوا کہ آپ ریف اور قلع انسان ہیں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میرا بیٹا جس مہم پر روانہ ہو رہا ہے، وہ بے ناک ہے۔

محترم! میرے اور میرے بیٹے کے درمیان جو اختلافات ہیں، ان کا آپ کو علم نہیں۔ میں اپنے مکان پر گیا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کا خط مجھے آج ملا ہے۔ جو آپ نے دفتر کے پتے پر لکھا تھا، مجھے فوراً شہر آجانا چاہئے تھا، لیکن گنتھیا کے زبردست حملے نے مجھے بستر پر ڈال دیا ہے اور بھی نہیں سکتا۔

چنانچہ! اب اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ لیوٹن کو ایک خط لکھوں، ممکن ہے! وہ اس مہم پر روانہ ارادہ ترک کر دے اور واپس آجائے اور یہ خط میں اپنے ایک معتبر کلرک کے ہاتھ لیوٹن کو ہوں، میں نے چٹک لیوٹن سے اختلاف رائے کیا ہے اور آئندہ بھی شاید میرے اور اس کے میل نہیں کھائیں گے، اس کے باوجود میں اسے بہت زیادہ چاہتا ہوں۔ چنانچہ اگر خدا خواست ہو گیا، تو میں برداشت نہ کر سکوں گا۔

ب اگر میری درخواست پر لیوٹن نے عین وقت پر اپنا ارادہ ترک کر دیا، تو مجھے احساس ہے، نقصان ہوگا اور آپ مشکل میں پھنس جائیں گے۔ لیکن ناممکن ہے کہ لیوٹن اپنا ارادہ ترک لیونکہ آخر وہ میرا بیٹا ہے۔ چنانچہ میری ضد اور ہٹ دھرمی اسے ورثے میں ملی ہے۔ اُس اُسے خدا کے بعد آپ کے حوالے کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ اس کا خیال رکھئے آپ کے بھائی جیسا ہی ہے۔

اسے کہئے گا کہ مجھے جب بھی موقع ملے خط لکھے اور آپ بھی وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہیں۔ ہر پھول پسند نہیں اور اب تو ان سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود میں لیوٹن کے ان

میرے اس خط کا جواب نہ آیا۔ چنانچہ ہم سفر کی تیاریاں کرتے رہے، ضروری انتظامات کر لے میں ذرا بھی وقت پیش نہ آئی کیونکہ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ وہ سامان خرید لیا، جو اس مہم کے لیے ضروری تھا اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میں پہلے کبھی کسی مہم پر اس طرح خود تیاریاں کر کے روانہ نہیں ہوا تھا۔

آخر کار ہماری روانگی کا وقت آ گیا، ہم لوگ ہنگامی کے اسٹیشن پر تھے۔ ریل کے روانہ ہونے میں دو تین منٹ باقی تھے اور ہم اپنے ڈبے میں سوار ہو رہے تھے کہ مجھے پلیٹ فارم کی بھیڑ میں ایک شخص نظر آیا۔ جو ادھر ادھر بھاگ کر جیسے کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ میں نے فوراً اس کی طرف دیکھا، وہ شخص مجھے بہت پریشان دکھائی دیا۔

جب وہ میرے قریب سے گزر رہا تھا، تو میں نے اس سے کہا۔ ”کس کی تلاش ہے تمہیں؟“

”مسٹر لیوٹن کی!“

”اگر اس کی تلاش ہے، تو وہ اندر ہے۔“

وہ شخص ایک دم ڈبے میں داخل ہو گیا اور لیوٹن کے ہاتھ میں ایک خط پکڑا دیا۔ وہ چند ثانیوں تک خط پڑھتا رہا اور وہ شخص ڈبے سے باہر آ کر منتظر کھڑا رہا۔ خط پڑھنے کے بعد لیوٹن نے اس کا چھلا حصہ جس پر کچھ لکھا ہوا نہ تھا، پھاڑ کر بڑی عجلت میں چند سطریں لکھیں اور پھر کاغذ کا وہ ٹکڑا میری طرف بڑھا دیا کہ میں اس شخص کو دے دوں، مجھے اس کی تحریر پڑھنی تو نہیں چاہیے تھی، لیکن پڑھے لہے نہ رہ سکا۔ لکھا تھا۔

”اب وقت گزر چکا ہے ابا! خدا آپ کو خوش اور شاد کام رکھے۔ خدا نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو اپنے اس ضدی اور بے وقوف بیٹے کو معاف کر دینا۔ جس نے ہمیشہ آپ کو پریشان کیا ہے اور کبھی کبھی اپنے دل میں یاد کر لیتا۔“

”لیوٹن!“

خیال تھا کہ جنگر وہاں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ لیکن اس آوارہ گرد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بوڑھا فرمنٹس جو کبھی بہت مابہر ہندوق بردار تھا۔ اب ہمارے گھر کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور ہمارے استقبال کو موجود تھا اور اس سے مجھے معلوم ہوا کہ میرے انگلستان روانہ ہونے کے فوراً بعد میں روتانو، یعنی جنگر بھی اپنا بکس اور تتلیاں پکڑنے کا جال لے کر جنگلوں کی طرف چلا گیا۔

وہ یہ بتا کر نہ گیا تھا کہ کس طرف اور کہاں جا رہا ہے اور نہ ہی میرے نام کوئی خط چھوڑ گیا تھا۔ فلک پودوں، پھولوں اور تتلیوں کے بکس بھی غائب تھے اور لیکن یہ چیزیں فرمنٹس نے بتایا روتانو نے ایک جہاز کے ذریعے جو کرشن میں چند گھنٹوں کے لیے نگر انداز ہوا تھا، امریکہ بھوادی تھیں۔ رہا جنگر اور یہ کہ اس کا کیا ہوا، وہ کہاں گیا تو اس کے متعلق میں معلوم نہ کر سکا۔ سوائے اس کے کہ اسے کشمورہ میں دیکھا گیا تھا۔ بعد میں چند سیاہ قاموں سے جو اس طرف آٹکے تھے اور میرے شناسا تھے معلوم ہوا کہ جنگر کو آخری دفعہ سرحد پر دیکھا گیا تھا۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جنگر کے اس طرح غائب ہو جانے سے ہم پریشان اور بدحواس گئے۔ اور یہ سوال درپیش تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ جیسے کہ طے پایا تھا، جنگر ہمارا رہبر بننے والا تھا۔ مائے بغیر ہم کچھ نہ کر سکتے۔ تنہا وہی تھا جو ہولوں لوگوں سے واقف تھا۔ تنہا وہی شخص تھا جو بڑے اسرار لی لینڈ کی سرحد تک گیا تھا اور حالانکہ میں افریقہ کے جنگلوں میں سفر کر چکا تھا اور ان کی دشواریوں کا ی تھا۔ تاہم جنگر کی رہبری اور مدد کے بغیر کم سے کم اس مہم میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔

چند دن گزر گئے اور جنگر کی کوئی خبر نہ آئی اور کوئی سراغ نہ ملا۔ تو میں اور لیونٹ مشورہ کرنے، راستہ کی دشواریوں اور اس مہم کے خطرات بیان کرنے کے بعد میں نے لیونٹ سے کہا کہ سب ہوگا کہ ہم اس پھول کی تلاش کا ارادہ ترک کر کے شولو لینڈ میں ہاتھیوں کے شکار کو چلے، کیونکہ وہاں ایک خاص جنگل میں ہاتھیوں کی اب بھی افراط تھی۔

لیونٹ اس کے لیے تیار ہو گیا۔ کیونکہ اسے ہاتھیوں کا شکار پسند تھا۔ خصوصاً اس کے لیے یہ بھی کے لیے بہر حال ایک نئی چیز اور انوکھا تجربہ تھا۔

اس کے باوجود میں نے چند ثانوں کی غور و فکر کے بعد کہا۔ ”یہ عجیب بات ہے، مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے جب بھی عین وقت پر پروگرام بدلا ہے، خصوصاً جب بھی مجبوراً ایسا کیا ہے، تو دوسرا سفر بے نتیجہ رہا۔ بلکہ اس میں کچھ نقصان ہی برداشت کرنا پڑا ہے۔“

”اگر ایسا ہی ہے، تو سکھ اچھا لیتے ہیں۔“ لیونٹ نے کہا۔ ”اور فیصلہ خدا پر چھوڑتے ہیں۔“ نے جیب سے صرف کراؤن کا ایک سکھ نکال لیا۔ ”اگر چہرہ آیا تو پھول کی تلاش میں جاؤں گے

پھولوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں، جنہیں وہ کہنا م کے مکان پر چھوڑ آیا تھا۔

مخلص..... جوزف لیونٹ۔“

جوزف کے اس خط نے مجھے بہت متاثر کیا اور اسے پڑھ کر میں بے چین ہو گیا۔ کچھ کہے میں نے یہ خط لیونٹ کی طرف بڑھا دیا۔

”لہا کا غصہ بیشک تیز ہے لیکن ان کا دل بُرا نہیں ہے۔ لیونٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”بس چلے چلو! اپنا ہاتھ میں بل کی مٹھی پر رکھ چکا ہوں۔ چنانچہ اب واپس نہ جاؤں گا، اب میں لوٹ گیا تو بزدل مشہور ہو جاؤں گا اور میری یہ حرکت خود ابا کو بھی پسند نہیں آئے گی، چاہے وہ اس سے کچھ نہ کہیں۔ چنانچہ! ہنس راج مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ یہ بے فائدہ ہے۔“

اس کے بعد لیونٹ خاموش ہو گیا۔ اس کے بشرے سے اداسی عیاں تھی، وہ بھانگی ہوئی کی کڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی اداسی دور ہونے لگی اور ہم جب چگالی پہنچے، تو وہاں جذبات پر قابو پا چکا تھا۔

اب وہ پہلے کی ہی طرح ہشاش بشاش تھا لیکن میں اب خود بھی اداس تھا اور جوزف بارے میں سوچ رہا تھا۔

جہاز کی روانگی سے پہلے میں نے جوزف کو ایک اور خط لکھا اور انہیں صورتحال سے آگاہ کر کے بعد انہیں تسلی دی کہ وہ لیونٹ کی فکر نہ کریں۔

اور مجھے یقین تھا کہ لیونٹ نے بھی اپنے والد کو خط لکھا ہوگا۔ حالانکہ یہ خط اس نے مجھے دا نہیں۔

کرشن میں پہنچنے اور وہاں سے آگے روانہ ہونے کے کچھ ہی دیر پہلے مجھے اپنے خط کا جواب ملا۔

جوزف صاحب نے لکھا تھا کہ وہ صورتحال سے واقف ہیں۔ چنانچہ اگر کچھ ہوا، بھی تو! الزام وہ مجھے نہ دیں گے اور مجھے ہمیشہ اپنا ہمدرد سمجھتے رہیں گے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ اگر روپہ کی ضرورت ہو تو میں جتنی رقم چاہوں ”اسٹیٹ بینک“ کی کسی شاخ سے ان کے حساب میں سے سکتا ہوں۔ اس کی ہدایت انہوں نے بینک کو کر دی ہے۔ آخر میں انہوں نے لکھا تھا کہ کم سے کم ایک معاملہ میں ان کے بیٹے نے بڑی ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ اب وہ اپنے احترام کرتے ہیں اور اس پر انہیں فخر ہے۔

ماہ مارچ کے اوائل میں ہم لوگ بخیر و خوبی کرشن پہنچ گئے اور ایک مکان میں مقیم ہو گئے۔

اپنے تھے کہ وہ ان آدمیوں کو بلالائیں، جن سے میں واقف تھا اور اکثر سفروں میں میرے ساتھ رہتے۔ یہ لوگ جنہیں میں نے طلب کیا تھا، شکاری تھے۔ جن لوگوں کو میں نے بلایا تھا۔ ان میں سے ہارہ تیرہ تو جلد ہی آگئے۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ اپنے سیاہ قام ملازموں کے ساتھ میرے نکلتا ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں۔ یہ لوگ میرا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں اور چونکہ مجھ پر ضرورت سے زیادہ اعتبار بھی کرتے ہیں۔ اس لیے بغیر کچھ پوچھے میرے ساتھ کہیں بھی اور کسی بھی مہم پر چلنے لپٹے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے سردار کے طور میں نے جس شخص کا انتخاب کیا تھا، اس کا نام اٹھا۔ فونا، شولو تھا۔ پست قامت تھا، لیکن اس کا سینہ بچی کے پاٹ کی طرح چوڑا اور مضبوط تھا۔ اس ناکہانی کچھ اس طرح تھی، جو اس نے ہمیں سنائی۔

فونا، اوجیز عمر سے کئی قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ لیکن اس کی جسمانی قوت پورے افریقہ میں مشہور تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک تندرست اور ٹھکڑے ساڑ کو سینگوں سے پکڑ کر پھانسیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ..... کہ یہ محض افسانہ نہ تھا کیونکہ ایک دفعہ اس نے ایک زخمی اور پھرے ہوئے جنگلی بھینسے کو لوں سے اس وقت تک پکڑ رکھا تھا، جب تک میں نے آکر اس بھینسے کو گولی نہ ماری۔

وہ غیر معمولی قوت کا حامل شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ شولو لینڈ میں ایک ادنیٰ سردار لیکن مشہور تھا۔ اڈاکر تھا، اس نے شوانیہ کی زبردست جنگ میں شہزادے لوگاش کی حمایت میں جنگ کی تھی۔ اس جرم تھا، جسے سوراہیہ والوں نے کبھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ اس جنگ کے کوئی ایک برس بعد فونا کو مار کیا گیا کہ ”سیفانوں“ نے اسے سونگھ لیا ہے کہ وہ ایک بدروح اور جادوگر ہے۔ چنانچہ اسے لی ہی قتل کر دیا جائے گا۔ یہ اطلاع ملنے ہی فونا اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کو لے کر شولو لینڈ سے ہو گیا۔ لیکن سورالیوں کے جلادوں نے اس کا تعاقب کیا اور کالنگ کے قریب انہیں موت کے تار دیے۔ جلاد چار تھے اور فونا اکیلا تھا، اس کے باوجود اپنی بیوی اور بیٹے کو قتل ہوتے دیکھ کر بہز اس جانکاہ منظر نے اسے پاگل کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ دفعۃً چاروں طرف پرٹوٹ پڑا اور آخر کار ان چاروں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن وہ خود اپنی بیوی کے ساتھ جو زندہ بچ گیا۔ اس حالت میں کالنگ کی سرحد پر پہنچا کہ صحیح معنوں میں اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا اور دم قدم پر چکر اکر گر پڑتا تھا۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی یہ دوسری بیوی بھی مر گئی۔ اس کے بچے کے غم نے اسے ردیا اور فونا نے پھر شادی نہ کی۔ غالباً اس لیے کہ وہ اب مفلس اور قلاش تھا۔ کیونکہ سورالیوں کے تمام مویشیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یا شاید اس لیے ان چاروں جلادوں کا تنہا مقابلہ کرنے

اور اگر الٹا پڑا تو ہاتھیوں کے شکار کو! اور اس نے سکھ اچھال دیا۔ وہ فرش پر گرا اور لڑھکتا ہوا اس صندوق کے پیچھے چلا گیا جس میں نو ادوات بھرے تھے۔ ہم دونوں نے مل کر پورا زور لگا کر صندوق کھسکا دیا۔ دیوار اور صندوق کے درمیان تھوڑی سی جگہ نکل آئی۔ لیونٹ اس صندوق پر پیٹ کے بل لیٹ کر صندوق کے پیچھے جھانکنے لگا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کیونکہ یہ سکھ ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والا تھا دیا سلائی کی تیلی جلائی کہ لیونٹ بخوبی دیکھ سکے۔ صندوق اور دیوار کے بیچ میں مٹی کی تہہ میں سکھ پڑا ہوا تھا۔

”کیا ہوا لیونٹ؟“ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”پھول، میرا مطلب ہے یہ چہرہ!“ اس نے جواب دیا۔

بہر حال فیصلہ ہو گیا۔ چنانچہ اب اس کے متعلق کچھ کہنے اور سوچنے کی بھی ضرورت نہیں۔“

بعد کے چند دن بہت معروف گزرے۔

اب اسے اتفاق کہنے یا ہماری خوش قسمتی کہ اس وقت گھاٹ پر ایک چھوٹا سا جہاز موجود تھا۔ شکار گونا می ایک پرنگی اس جہاز کا مالک تھا۔ جو مختلف قسم کا تجارتی سامان مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں اور مدعا سرکنک پہنچایا کرتا تھا۔ شکار گونا بشرے اور وضع قطع سے بھی ایک چھٹا ہوا بد معاش تھا اور مجھے یہ شک ہو گیا تھا کہ وہ جو تجارتی سامان اپنے جہاز پر لاتا ہے، وہ کچھ اور نہیں بلکہ غلام ہوتے ہیں۔ ان علاقوں میں غلاموں کی تجارت زوروں پر تھی اور افریقہ میں بردہ فروشوں کی کی نہ تھی۔ بہت ممکن تھا کہ خود شکار گونا بھی بردہ فروش ہی ہو۔

”کوئی اور وقت ہوتا تو شکار گونا جیسے شخص سے سودا نہ کرتا، لیکن چونکہ وہ چناری جا رہا تھا اور چنار ہی سے ہمیں اندرون ملک جانا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے اس معاملہ میں بات چیت کی کہ وہ ہمیں اور ہمارے ساتھ ہمارا سامان بھی چناری پہنچا دے۔

دو وجوہات کی بناء پر شکار گونا سے معاملہ طے کرنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اول تو یہ کہ وہ ہمیں لے جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے کہا کہ شکار کی غرض سے چناری نہیں جاتا۔ کیونکہ وہاں شکار بہت کم ملتا ہے اور دوم یہ کہ اس نے کہا کہ وہ فوراً اپنے جہاز کا ٹکڑا اٹھانا چاہتا ہے۔ بہر حال میں نے اس کے ان دلائل کا وہ جواب دیا، جو کسی کو بھی خاموش کر سکتا ہے۔ یعنی رشوت، نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے جہاز کی روانگی چودہ دن کیلئے ملتوی کرنے پر رضامند ہو گیا۔

یہ معاملہ طے ہو گیا، تو میں بار بردار جمع کرنے کی طرف روانہ ہوا اور ہمیں کم از کم بیس فاموں کی ضرورت تھی۔ میں نے کرن پینچے ہی اپنے ہوی شولو لینڈ اور کالنگ کے عقب کی طرف دا

کے وہ بد صورت بن گیا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے اسامی نے فونا کا دایاں تختہ صاف دیا تھا اور خود فونا کے بقول وہ اب ”تکھا“ تھا۔

دوسری بیوی کی موت کے بعد فونا ہم سے ملا اور اس نے کہا، وہ شورش کا سردار ہے اور ”رٹ“ ہے اور میرا بندوق بردار اور شکاری بننا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اپنا ساتھی بنا لیا اور مجھے یا تھا کہ اس پر مجھے کبھی پچھتاوا نہیں پڑے گا۔ ہر چند کہ فونا کبھی کبھی جادو کر لیا کرتا تھا اور پھر اس کا وہ بھی تیز تھا۔ لیکن وہ بہادر تھا۔ شیر کی طرح، بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ جنگلی بھینسے کی طرح بہادر جیلا کیونکہ شیر تو کبھی کبھی بزدل بن جاتا ہے۔

دوسرا شخص ایک کرنالی شخص تھا۔ جسے میں نے بلایا تو نہیں تھا، لیکن جو اپنے آپ ہی آگیا اس کا نام آرگس تھا۔

چنانچہ ایک دن یوں ہوا کہ ضروری انتظامات کے سلسلے میں دن بھر گھر سے باہر رہنے کے میں واپس آیا، تو برآمدے میں سفید بالوں والا سیاہ فام پالتی مارے اپنا مخصوص پائپ پھونک رہا تھا ”شام بخیر باس۔“ وہ بولا۔

”شام بخیر!“ میں حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کک..... کون ہو تم؟“

”میں..... آرگس۔“

”ٹھیک ہے۔ تم آرگس ہو لیکن یہاں کیوں آئے ہو؟“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کسی مہم کا آغاز کر رہے ہیں۔ میں اس میں آپ کا ساتھ دیتا ہوں۔“

”لیکن میں تم جیسے لوگوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔“ میں نے اس کے منہ سے شراب بوجھوس کر کے اپنا ہاتھ ناک پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جوئے کی توبہ ہے باس! کہ اس کا خاتمہ بخیر ہو گیا، کیونکہ میرے پاس داؤ لگانے کے کچھ رہا ہی نہیں سوائے اپنی ذات کے اور مجھ بوڑھے کو کون جیتنا پسند کرے گا۔“

”اوہ..... تو..... تم..... جو ابھی کھیلتے ہو؟“

”میں نے کہا ناں توبہ کر لی ہے..... رہی شراب تو اس سے بھی توبہ کر لی، کیونکہ کل رُخڑے کی ایک بوتل میں نے میری معدے میں انگارے بھر دیئے تھے اور میری آنتیں چھڑ تھیں۔ اب تو بس میں پانی ہی پی لیتا ہوں۔ حالانکہ تھوڑا سا پیتا ہوں، پانی! اور اس میں تمباکو کی پہنچاتا ہوں اور کام چل جاتا ہے۔ میں نے سنا کہ آپ کسی مہم پر جا رہے ہیں۔ چنانچہ میں آ

ساتھ دینے کے لئے آگیا ہوں۔“

”تم بوڑھے اور کتے ہو اور ماہانہ ایک شلنگ اجرت اور اسکوف (کھانا) پر بھی مہنگے ہو۔ آرگس! تم بالکل بے کار ہو۔“

آرگس مسکرایا! اور اس کی یہ مسکراہٹ رفتہ رفتہ اس کے کانوں تک پھیل گئی۔

”ہاں باس میں بوڑھا ہوں لیکن ہوشیار ہوں۔ ساری زندگی میں عقل جمع کرتا رہا ہوں۔ جیسے موسم بہار کے بھڑوں کا چھتا شہد سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ تم فکرت کرو میں نے اب شراب اور جوئے سے بالکل توبہ کر لی ہے۔ میں تمہارا ہر منصوبہ پوری دلجمعی سے پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔“

”آرگس! یہ سب بیکار ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ یہ مہم بڑی خطرناک ہے اور میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں، جن پر میں اعتبار کر سکوں۔“

”اور..... بوڑھے آرگس سے بڑھ کر اور کون معتبر ہو سکتا ہے؟“

”سبھت۔“ میں نے کہا۔

”میں قسم کھاتا ہوں۔“ آرگس نے کہا اور گھٹنوں کے بل گر کر میرا ہاتھ چوم لیا اور پھر اٹھا اور بولا۔ ”آپ مجھے ایک موقع دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ میری زندگی کو مزید جہنم بننے سے بچالیں۔“ اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر نجانے کیوں مجھے اس پر ترس آگیا اور میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے! تم میرے ساتھ اس مہم پر چل سکتے ہو۔ لیکن تم قسم کھا کر کہو کہ کم سے کم اس پورے سفر میں شراب کو ہاتھ تک نہیں لگاؤ گے۔“

”میں قسم کھاتا ہوں، باس.....!“ آرگس نے کہا اور پھر بڑے کاروباری لہجے میں بولا۔ ”اب اگر آپ مجھے دو کبل دے دیں، تو میں ان کا شکریہ ادا کروں گا اور ہاں پانچ شلنگ تمباکو کے لیے اور ایک نیا چاقو بھی اور ہاں..... بندوقیں اور رائفل بھی.....“

”ٹھیک ہے۔ میں نے کہا! یہ پانچ شلنگ اور تمہیں کبل بھی مل جائیں گے اور نئی بندوق اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی۔ بندوقیں عقی کمرے میں ہیں اور وہاں تمہیں دوسرے باس کی بندوقیں مل جائیں گی، جو اس سفر میں ہمارے ساتھ ہوگا۔ جاؤ! انہیں صاف کر کے تیل دے دو۔“



”وہی جو ایک کتا کرتا ہے۔“  
”یعنی؟“

”اپنے آقا کی حفاظت۔“

”شاباش!“ میں نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”آرگس! تم نے اس لمبی داڑھی والے شخص کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ جو سیاہ فاموں میں روتالوں کے نام سے مشہور ہے؟“

”سنا ہے ہاں! اور وہ کئی چاندوں پہلے میں نے اسے ایک سرائے میں دیکھا تھا۔ اس کے ایک ساتھی سیاہ فام نے مجھے بتایا کہ وہ ان چیزوں کی تلاش میں جا رہا ہے۔ جو زمین پر ریگتی ہیں اور ہوا میں زمین سے تھوڑی اوپر اڑتی ہیں۔ تم جانو ہاں وہ پاگل ہے۔“

”خیر وہ اس وقت کہاں ہے؟“ تم جانو اسے تو اس مہم میں روانہ ہونے کیلئے ہمارے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔“

”اب ہاں میں روح تو ہوں نہیں کہ بتا سکوں کہ وہ کہاں بٹک رہا ہے۔ اس وقت؟ لیکن ہاں مشہور.....! فونا بتا سکتا ہے۔ وہ زبردست دیچ ڈاکٹر ہے۔ اور قاصطے اس کی نظر کے سامنے سمٹ جاتے ہیں اور آج ہی رات کو اس کا مقدس سانپ اس کے بدن میں داخل ہو گیا ہے۔ کیونکہ فونا ابھی گھر کے پھجھوڑے بیٹہ کو مستقبل میں دیکھ رہا تھا۔ خود میں نے دائرے کے باہر کھڑے ہو کر اسے ایسا کرتے دیکھا تھا۔“

”آرگس اور میرے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی اور پھر میں نے لیوشن سے پوچھا کہ وہ سیاہ فاموں کا جادو دیکھنا پسند کرے گا۔“

”ہاں..... ہاں.....!“ اس نے جواب دیا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب بکواس ہے۔“

”بکواس ہی ہے۔ کم از کم زیادہ تر لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہاں..... لیوشن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض دفعہ یہ ”جادوگر“ عجیب پیشین گوئیاں کر جاتے ہیں۔ جو اہم ثابت ہوتی ہیں۔“

چنانچہ آرگس کی راہبری میں ہم گھر کا چکر کاٹ کر دوسری طرف گئے۔ یہاں ایک اصطبل تھا اور اس کے عقب میں پانچ فٹ بلند دیوار تھی۔ اس دیوار کے بعد میرے ملازم سیاہ فاموں کی جمونہڑیاں رخصت تھیں۔ اس محن میں دو کڑے کی مٹی بچھا کر اسے ہموار کر دیا گیا تھا۔ اس محن میں ہماری طرف رخ کئے فونا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے گرد دائرے بنائے وہ سیاہ فام بیٹھے تھے جو اس مہم پر ساتھ چلنے لے تھے۔ ان میں سے ایک فرنٹس بھی تھا اور دو اور لڑکے بھی۔ فونا کے سامنے کئی ایک چھوٹے

آخر کار تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ بندوقوں، کارتوسوں، دواؤں، تحائف اور اشیاء خورد و نوذ کے بکس ”شکاگو کے جہاز“ ”سلاویہ“ پر پہنچ گئے۔ وہ چار گدھے بھی جہاز پر سوار کرا دیئے گئے جنہیں میں نے اسی خیال سے خرید لیا تھا کہ ممکن ہے، آگے چل کر سواری یا پھر بار برداری کے لیے ان کی ضرورت پڑ جائے، درندوں اور انسانوں کے بعد صرف گدھے پر ٹیسٹی کھسی کا زہر اثر نہ ہوتا تھا۔

کرن میں یہ ہماری آخری رات تھی اور بے حد حسین رات تھی، وہ اس لئے کہ شفاف آسمان، پورا چاند روشن تھا۔ شکاگو کے اعلان کے مطابق دوسرے دن سہ پہر کے وقت جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ میں اور لیوشن برآمدے میں بیٹھے تمباکو پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

”یہ واقعی عجیب بات ہے کہ جنگل ایسا کیا گیا کہ واپس ہی نہ آیا۔“ میں نے کہا۔

وہ اس مہم پر جانے کے لیے بے قرار تھا۔ یہ پھول حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ کسی اور دم سے جو اس نے مجھ سے بیان نہیں کی، میں سمجھتا ہوں کہ کہیں مر مرا گیا ہوگا۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔“ لیوشن نے کہا۔ ”جنگلوں اور وحشیوں میں تنہا بھٹکنے والے کا انجام ایسا ہوتا ہے۔“

”نہیں راج! یہ میرا دم ہے یا تم بھی کوئی آواز سن رہے ہو۔؟“

”آواز میں بھی سن رہا تھا۔ سامنے کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی ان میں رینگ رہا ہو۔“

”کتنا ہے، یا ممکن ہے، آرگس ہوا!“ میں نے کہا۔ جہاں میں بیٹھا ہوا، یا لیٹا ہوا ہوتا ہوں۔ تو وہ اس جگہ کہیں قریب دبکا رہتا ہے۔ یہ شخص عجیب عجیب جگہوں پر گھس پڑتا ہے۔“

”آرگس کیا یہ تم ہو؟“ میں نے آواز دی۔

جھاڑیوں میں سے ایک انسانی سایہ ابھرا۔

”ہاں..... ہاں میں ہی ہوں۔“

”کیا کر رہے تھے؟“

جھوٹے الاؤ جل رہے تھے۔

میں نے ان الاؤ کو شمار کیا تو معلوم ہوا کہ چودہ تھے اور میں نے سوچا کہ الاؤ کی تعداد اتنی ہوتی تھی۔ جتنی کہ ہماری اور ہمارے سیاہ قام بار برداروں کی۔ یعنی ہم کل چودہ آدمی اس سفر پر روانہ ہونے والے تھے۔ ایک سیاہ قام ان الاؤ میں پتلی ٹہنیاں اور خشک پتے جھونکنے میں مصروف تھا کہ الاؤ دھکتے رہیں۔ دوسرے لوگ خاموش بیٹھے غور سے اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ رہا..... فونا تو وہ یوں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے بیٹھے ہی بیٹھے سو گیا ہو۔ اس نے اپنے دونوں گھٹنوں کو پراٹھا رکھے تھے اور اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔

اس نے اپنی کمر پر سانپ کی کینچلی پلیٹ رکھی تھی اور ایک عجیب سا بیک بھی باندھ رکھا تھا۔ انسانی ناخنوں کا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ فونا کے دائیں طرف پروں کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ پر گدھوں کے بازوؤں سے نوچے گئے تھے اور بائیں طرف چاندی کے سکے ڈھیر تھے اور یہ یقیناً ان سیاہ قاموں نے بطور فیس ادا کیے تھے۔ جن کی قسمت کا حال فونا بتانے جا رہا تھا۔

ہم دیوار کے سایہ میں خاموش اور بے حرکت کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد فونا جیسے اہلما عجیب و غریب نیند سے بیدار ہو گیا۔ پہلے تو وہ کچھ بڑبڑایا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور چند ثانیوں تک ایسے الفاظ کہتا رہا۔ جو میری سمجھ میں نہ آئے اور پھر وہ تین مرتبہ اس طرح کانپ گیا۔ جیسے اس پر تشویش کا دورہ پڑ گیا ہو اور پھر اس نے صاف اور بلند آواز میں کہا۔

”میرا سانپ آگیا اب وہ میرے اندر ہے۔ اب میں سن سکتا ہوں اور دیکھ بھی سکتا ہوں۔“

تین الاؤ جو فونا کے عین سامنے تھے۔ بقیہ الاؤ سے نسبتاً بڑے تھے اور فونا نے گدھ کے پروں کا گٹھا اٹھا کر اور پھر اسے درمیانی الاؤ میں سے آگے پیچھے گزارے اور ساتھ ہی ساتھ میرا نام لینے لگا۔

”ہنس راج..... ہنس راج..... ہنس راج!!!!“

میں جانتا تھا کہ وہ اپنے سانپ یا روح سے پوچھ رہا تھا کہ اس سفر میں مجھ پر کیا گزری گی۔

”اس کی روح نے اسے کیا بتایا، یہ میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ فونا نے سر ہلایا اور وہ پر رکھ دیا۔ گٹھے

میں سے دوسرا پر نکالا اور اسے بھی الاؤ کے شعلوں میں سے گزرنے لگا اور اس دفعہ وہ جو نام لے رہا تھا۔ وہ تھا، ”لیوشن.....“ اس پر کو دائیں طرف کے الاؤ کے شعلوں سے گزرنے کے بعد فونا نے اسے غور سے دیکھا اور پھر سر ہلا کر ایک طرف رکھ دیا۔

چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ فونا یکے بعد دیگرے گٹھے میں سے پر نکالتا اور سیاہ قاموں کے نام لے لے کر انہیں الاؤ میں سے گزارتا۔ ابتداء میں نے خود اپنے پر سے کی اور کہتا تھا کہ کرا سے الاؤ

میں سے گزار دیا۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ ہر سیاہ قام کی قسمت کا الاؤ جُدا تھا۔ اس کے بعد وہ لہک بار پھر جیسے خوابوں کی دنیا میں پہنچ گیا اور اس کا سر اس کے گھٹنوں پر جھک گیا۔ چند ثانیوں بعد وہ بھاڑ ہوا، ایک انگڑائی لی اور ایک بجائی۔

”کہو..... کہو.....“ تماشاخیوں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ ”تم نے دیکھا، تم نے سنا، کیا کہا ہے۔ تمہارے سانپ نے میرے متعلق؟“

”اور میرے متعلق!“

”میرے متعلق!“

”ہاں میرے متعلق بھی!!“

”کہو..... کہو جلدی کہو۔“

”ہاں..... ہم بے چین ہیں۔ بتاؤ!“

”ہاں..... میں نے سنا اور میں نے دیکھا۔“ فونا نے جواب دیا۔ ”میرے سانپ نے مجھے بتایا کہ سڑ بہت زیادہ خوفناک اور بہت زیادہ خطرناک ہوگا۔ وہ لوگ جو اس سفر پر جائیں گے۔ ان میں ہر چھ مرتبہ جائیں گے۔ گولیوں سے یا بھالوں سے یا بیماری سے اور دوسرے زخمی ہوں گے۔“

”لیکن!“ ان میں سے ایک بولا۔ ”لیکن کون مرے گا اور کون زندہ واپس آئے گا۔ یہ نہیں بتایا ارے سانپ نے؟“

”ہاں..... میرے سانپ نے یہ بھی بتایا ہے۔ لیکن میرے سانپ نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ اس کی لقم خاموش رہوں، مبادا! تم لوگوں میں سے اکثر بزدل بن جائیں، میرے سانپ نے مجھ سے بھی ہے کہ حیف ہے اس پر جو سوالات پوچھے۔ کیونکہ جو پوچھے گا، وہ سب سے پہلے مرے گا۔“ اب تم نے ہوتم؟ کس میں ہمت ہے، اب پوچھنے کی.....؟ کون پوچھتا ہے؟ تم..... اور تم..... اور تم پوچھو ہمت ہے۔ تو.....؟“

اور یہ عجیب بات ہے کہ کسی نے نہ پوچھا۔ پہلے کبھی میں نے کسی انسانی گروہ کو اپنے مستقبل اتنا بے پروا نہیں دیکھا تھا جتنے کہ وہ سیاہ قام اس وقت نظر آرہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ایک نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مناسب ہوگا کہ وہ خاموش رہیں اور جو کچھ ہوتا ہے اس کے متعلق نہ مبادا فونا ان میں سے کسی کی موت کی پیشگوئی نہ کر دے۔ چنانچہ جو ہوتا ہے، وہ ہو کر ہی رہے

”میرے سانپ نے مجھ سے کچھ اور بھی کہا ہے۔“ فونا بولا۔ ”اور یوں کہا ہے۔ اس نے کہ

لے ایک ضرور کام سے جانا ہے۔“

چنانچہ میں اس چھوٹے سے دروازے میں سے جو دیوار میں بنا ہوا تھا، نکل کر دوسری طرف صحن میں پہنچ گیا۔ میں یوں ظاہر کر رہا تھا، جیسے ٹھٹھا ہوا غیر ارادگی طور پر اس طرف آکھلا ہوں۔ پھر ان الاؤ کے قریب پہنچ کر جیسے حیرت سے چلتے چلتے ٹھہر گیا۔

”ہیں فونا!“ میں نے کہا۔ ”تم پھر دوج ڈاکٹر کا کام کر رہے ہو۔ حالانکہ میں نے سنا ہے کہ اس ام نے تمہیں بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔“

”ہاں..... تم نے ٹھیک سنا ہے اور اس کام کی مجھے بڑی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔“  
”یہ تم نے غلط نہیں کہا بیٹا۔ اس کام کی مجھے بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ یعنی میرے لٹی، میری دو بیویاں اور میرا بچہ اور اس کام نے مجھے آوارہ گرد بنا دیا ہے۔ لیکن یہ آوارہ گردی مجھے ن آئی ہے۔ کیونکہ میری ملاقات تم سے ہوئی اور میں تمہارے ساتھ انجان جگہوں پر جاؤں گا۔ اں میرے ساتھ عجیب اور حیرت انگیز واقعات ہوں گے۔ ہاں!“ اس نے معنی خیز انداز میں اضافہ کیا۔

”تمہیں بندوق چلانے اور شکار کرنے کا حلیہ ملا ہے اور میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے بندوق اور شکار کرنا ترک کر دیا ہے؟ تمہیں بھٹکنے کا حلیہ ملا ہے اور تم اسے چھوڑ کر کیا کبھی مگر بیٹھے ہو؟“  
پھر اس نے جلتے ہوئے پردوں میں سے ایک پر اٹھایا۔

”بیٹا! میرے کان تیز ہیں اور ابھی ابھی میں نے وہ الفاظ سنے تھے، جو ہوانے ٹھیک میرے اُن تک پہنچائے تھے۔ ہاں، بیٹا! میں نے یہ الفاظ سنے تھے اور انہیں ہوا میں تیرتے دیکھا تھا۔..... تم بے کہا گیا تھا کہ ہم سیاہ قام اس وقت تک صحیح پیشین گوئی نہیں کرتے، جب تک کہ ہمیں ندی جائے اور مالہ صورت حال کے پیش نظر یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ اس کے باوجود جو ہاں میں ہوتا ہے۔ ان چٹانوں پر چڑھ کر جو حال کو ماضی اور مستقبل سے جدا کرتی ہیں۔ اس کو دیکھتا ہے، جو بیچ و خم کھاتا ہوا۔ وادیوں، جنگلوں اور دلدلوں میں دور دور تک چلا گیا ہے۔ تک کہ وہ آسمانوں میں غم جو جاتا ہے۔ چنانچہ اس جلتے ہوئے پردوں جو میرے ہاتھ میں ہے۔ مستقبل دیکھ رہا ہوں۔ اب بیٹا ہنس راج! یا اس کا کچھ حصہ دیکھ رہا ہوں۔ تمہارا راستہ دور، دور تک جاتا ہے اور اس نے اپنی شہادت کی انگلی پر پھیرا۔ ”یہ ہے سفر!“ اور اس نے پر کا ایک ٹکڑا لیا۔ ”اور یہ ہے، دوسرا اور تیسرا سفر اور یہ بھی، یہ بھی، یہ بھی اور وہ پردوں میں سے نکلے توڑتا

اس گروہ میں اگر کوئی ایسا لومڑ ہوا جو یہ سوچ کر ان چھ مرنے والوں میں سے شاید وہ بھی ایک ہو۔ مرنے کی فکر کر رہا ہے، تو پھر میرا سانپ بتا دے گا کہ وہ لومڑ کون ہے اور پھر میں جانتا ہوں کہ ا لومڑ کے ساتھ کیسا سلوک کیا جانا چاہئے۔

فونا کے اس اعلان کے جواب میں ان تمام سیاہ قاموں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ کہ ہنس را، کو چھوڑ کر بھاگ جانے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے اور مجھے یقین ہے کہ ان بہادروں۔ یہ غلط نہیں کہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کو فونا کے جادو پر یقین تھا۔ تاہم وہ موت م کے نازل ہونے کی پیشین گوئی فونا نے کی تھی۔ ابھی کافی دور تھی اور ان میں سے ہر ایک یہ امید لگا۔ ہوئے بیٹھا تھا کہ شاید اس کا شمار ان چھ میں نہیں ہوتا۔ جن کے لیے موت کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ ا کے علاوہ یہ لوگ موت سے اس قدر مانوس تھے کہ اس سے ڈرتے نہ تھے۔

سیاہ قاموں میں سے ایک نے بہر حال بحث کو طول دینے کی کوشش کی تو فونا نے بڑی عداوت سے جھڑک دیا اور کہا کہ مرنے والے کیوں اپنی موت کیلئے اجرت دیں۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ”ان کے جو اس سفر میں مرجائیں گے، پس ماندگان کو وہ فیس لوٹا دی جائے گی۔ جو انہوں نے اس وقت کی۔“

”فونا بے ایمان نہیں۔“ فونا نے کہا۔

”آرگس!“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ فونا کے سامنے جو الاؤ سلگ رہا ہے، ان میں تمہارا بھی ہے؟“

”نہیں ہاں!“ اس نے میرے کان میں کہا۔ ”آپ نے مجھے کیا یہ قوف سمجھ رکھا ہے۔ اگر مجھے مرنا ہے، تو مر جاؤں گا اور زندگی ہے، تو زندہ رہوں گا۔ تو پھر میں یہ معلوم کرنے کے لئے ایک شلنگ کیوں دینے لگا کہ میرا وقت کب آئے گا، اس کے علاوہ فونا ایک شلنگ لے کر سب کو خوفزدہ کر دیتا ہے، لیکن کچھ کہتا نہیں۔ میں اسے ٹھٹھاتا کھڑی جا، ہاں تم شلنگ نہ دو گے، تو یقیناً فونا حالانکہ زبردست اپنا لگا تمہارے متعلق پیشین گوئی نہ کرے گا۔ کیونکہ اس کا سانپ فیس کے بغیر بولتا ہی نہیں۔“  
آرگس کی یہ دلیل ظاہر ہے کہ نکو اس تھی، اس کے باوجود شاید عام تھی۔ کیونکہ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ کوئی بھی خانہ بدوش عورت اس وقت تک قسمت کا ”صحیح حال“ نہیں بتائے گی، جب تک کہ چاندی کے سیکے اس کی پھیلی ہوئی، پھیلی پر نہ رکھ دیئے جائیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں راج!“ لیوٹن بولا۔ ”یہ فونا اتنی بہت سی باتیں جانتا ہے تو اس سے پوچھو کہ جھگڑا کیا جیسا کہ آرگس نے مشورہ دیا تھا۔ کہ فونا کیا جواب دیتا ہے۔ یہ مجھے بعد میں بتا دینا کیونکہ اس وقت



فونا نے پنل کا وہ ٹکڑا لے لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا، بالکل اسی طرح جس طرح اس نے لے ہوئے پروں کو دیکھا تھا اور پھر اس نے اپنے بڑے بڑے پنچوں سے اس بڑے الاؤ میں سے جو ری قسمت کا الاؤ تھا، راکھ کھینٹ کر اس کی ایک ٹیکری سی بنائی اور پھر اس ٹیکری پر پھیلی مار مار کر سے چٹا کر دیا۔ اب اس نے پنل کی ٹوک سے اس راکھ پر انسان کا ایک بے ڈھنگا خاکہ بنایا، جیسا کہ بچے کوئلے سے دیواروں پر بناتے، جب وہ خاکہ بن گیا تو فونا نے اکڑوں بیٹھ کر اسے دیکھا اس مقور کی طرح سر ہلایا، جو اپنے شاہکار سے پوری طرح مطمئن ہو۔ اس وقت ہوا کے جمو کے نے لگے تھے۔ ان جمو کوں نے بھی ہوئی، راکھ کے ذرات اڑا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فونا کے بنائے کے خاکے کی چند لکیریں مٹ گئیں اور چند پھیل گئیں۔

اس اثناء میں فونا آنکھیں بند کر کے بیٹھ رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر راکھ پر بنے ہوئے ڈرے ہوئے خاکے اور خود راکھ کے ڈھیر کو غور سے دیکھا، اس نے راکھ اپنی مٹیوں میں سمیٹ لی پھر مٹیاں کھول کر اسے یوں یہ پھینک دیا اور پھر اس تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ جو اس راکھ نے بنائی تھی اور میں نے دیکھ کر راکھ ایک قدر ترقی منظر بنا رہی تھی۔

”سب صاف ہے، بیٹا!“ فونا نے بڑے یقین سے کہا۔

”سفید فام آوارہ گرد روتا نو مر انہیں ہے۔ وہ زندہ ہے، لیکن بیمار ہے، اس کی ایک ٹانگ کو کچھ یا ہے۔ چنانچہ وہ چل پھر نہیں سکتا۔ شاید کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہے یا شاید کسی درندے نے کاٹ لیا۔ وہ ایک ایسی جمونپڑی میں پڑا ہوا ہے۔ جیسی کہ سیاہ فام بنایا کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جمونپڑی میں برآمدہ ہے اور اس کی دیواروں پر تصویریں ہیں۔ یہ جمونپڑی بہت دور ہے۔ اب یہ میں جانتا کہ یہ کہاں ہے؟“

”بس!“ میں نے پوچھا کیونکہ فونا خاموش ہو گیا تھا۔

”نہیں!“ روتا نو تندرست ہو رہا ہے اور ہم سے وہاں آئے گا، جہاں ہم جا رہے ہیں اور وہ آتے آئے گا، جب ہم مصیبت میں ہوں گے۔ بس میں کہہ چکا، نصف کراؤن، ہنس راج!“

”تمہارا مطلب ہے ایک شلنگ؟“

”نہیں ہنس راج بیٹا! ایک شلنگ تو معمولی جادو کے لیے ہے۔ مثلاً سیاہ فاموں کی قسمت کے لئے۔ جس کا تعلق سفید فاموں سے اور ایسے زبردست جادو کے ماہر بڑے ویج ڈاکٹر

ہیں اور میں بھی ایک بڑا ویج ڈاکٹر ہوں۔“

میں نے اسے نصف کراؤن دے کر کہا۔

اور یہ وہ سفر ہے جو سب سے زیادہ کامیاب ہوگا جو تمہیں امیر بنا دے گا اور یہ وہ سفر ہے حیرت انگیز ہے اور اس میں تم عجیب واقعات دیکھو گے اور عجیب لوگوں سے ملو گے اور پھر..... اور میں نے پر، پر کچھ اس ڈھنگ سے پھونک ماری کہ اس کے جلے ہوئے سارے بال جھڑ گئے اور کچھ نہیں رہتا، سوائے اس ٹھنڈے جیسا کہ میرے قیلے والے قبر کے سر ہانے گاڑ دیتے ہیں، لیکن استون یادگار کہتے ہیں۔ اے میرے پیارے بیٹے! تم ایک دور دراز علاقے میں مرو گے، لیکن اس پیچھے اپنی وہ عظیم یادگار چھوڑ جاؤ گے، جو سینکڑوں برس تک اس دنیا میں رہے گی۔ کیونکہ دیکھو یہ پرکا ڈھڑی پر آگ اڑ نہیں کر سکی۔ دوسرے لوگوں کی بات الگ ہے، بیٹا!“

”ممکن ہے، ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن فونا مناسب ہوگا کہ تم اپنے جادو سے الگ رکھو۔ کیونکہ میں یہ معلوم کرنا ہی نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ کیا واقعات ہوں گے اور میرا انجام کیا ہوگا آج کو کچھ بھی ہے، میرے لیے کافی ہے اور مجھے آئندہ کل یا آئندہ مہینے آئندہ برس کی فکر نہیں، ہمارا مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ آج جو تمہیں دیا گیا ہے۔ اس پر مبر و شکر کرو اور غیب کی باتیں جاننے کو شش نہ کرو۔“

”ٹھیک ہے ہنس راج! اور تمہاری کتاب میں ہی بڑی عمدہ بات کہی گئی ہے۔ جیسا کہ تمہارا سیاہ فام شکاریوں میں سے چند اس وقت سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ کچھ ہی دیر پہلے یہ لوگ ایک اکا شلنگ میری بند مٹی میں ٹھونس رہے تھے کہ میں ان کا مستقبل بتا دوں اور ہنس راج! تم بھی تو معلوم کرنا چاہتے ہو۔ تم اس دروازے میں سے نکل کر میرے پاس اپنی کتاب کا کوئی جملہ کہنے آئے، پوچھو بیٹا! جو پوچھنا ہے، جلدی کرو کیونکہ میرا سانپ اب نکلنے لگا ہے اور وہ جلد از جلد اپنے میں گھس جانا چاہتا ہے۔ جو اس دنیا کے نیچے ہے۔“

”تو پھر!“ میں نے شرم سے سرخ ہو کر کہا کیونکہ یہ فونا عجیب آدمی تھا۔ دل کی بات معلوم کر تھا۔ ”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ تم بتا سکو، حالانکہ مجھے یقین ہے کہ تم نہ بتا سکو گے کہ سفید فام کا کیا بنا جس کی لمبی داڑھی ہے اور جسے تم روتا نو کہتے ہو۔ اس سفر پر چلنے کے لیے اسے تک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہی ہمارا راہبر تھا۔ اب بتاؤ کہ وہ کہاں ہے اور تک یہاں کیوں نہیں پہنچا ہے؟“

”ہنس راج! ایسی کوئی چیز ہے، تمہارے پاس جو روتا نو کی ہو؟“

اور میں نے اپنی واسکٹ کی جیب سے پنل کا ایک ٹکڑا برآمد کیا۔ پنل کا یہ ٹکڑا جھگر کا تھا اس نے مجھے دیا تھا۔ اور میں نے خدا جانے کیوں اسے سنبھال رکھا تھا۔

”سنو فونا! میں تمہیں ایک زبردست شکاری اور بہادر شخص تو ضرور یقین کرتا ہوں، لیکن ہلو جادوگر تم نے بکواس اور فریبی ہو، چونکہ تمہاری پیشینگوئیاں یقین کے قابل نہیں ہیں، اس لیے میں کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ اگر واقعی روتا تو اس ملک میں ہے، جہاں ہم جا رہے ہیں اور مصیبتا کے وقت ہم سے آلا تو میں اپنی وہ دونالی رائل تمہیں تحفہ دے دوں گا جس کی تم تعریف کیا کر۔“

فونا کے بشرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو بیٹا! وہ بندوق مجھے اس وقت دے دو۔ کیونکہ بہر حال وہ میری ہوگی۔ میرا سانپ جمور نہیں بولتا، خصوصاً اس وقت جب فیس نصف کراؤن ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تم ایشیائی بڑے ہوشیار ہوتے ہو۔“ فونا بولا اور سمجھتے ہو کہ تم سب کچھ جانتے ہو۔ لیکن نہیں ہے۔ ہنس راج! کیونکہ بہت سی نئی چیزیں سیکھنے کی دھن میں تم لوگوں نے بہت سی پرانی ہا! بھلا دی ہیں۔ وہ سانپ جو میرے پاس ہے، وہ جموتا نہیں ہے اور تم کہتے ہو کہ فونا! میدان جنگ شیر بہادر شکاری اور فطرت انسان جب پر جلاتا ہے تو جموت بولتا ہے اور جب راکھ پر لکھی ہوئی پڑھتا ہے۔ تو اس وقت بھی جموت بولتا ہے۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا فونا! کہ تم جموتے ہو۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا۔ کہ تمہارا تصور تمہیں دے رہا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک آدمی وہ باتیں بتا دے جو اس کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔“

”اے ہنس راج! اے بہادر شکاری کیا مجھے میرا تصور دھوکا دے رہا ہے۔ حالانکہ میں شاکر ہوں۔ اس شکاری کا جو سب سے بڑا جادوگر تھا اور جو راستہ کھولنے والا کے نام سے مشہور تھا۔ اور کیا ان آنکھوں کے علاوہ انسان کی دوسری آنکھیں نہیں ہیں، جن سے وہ ان واقعات کو ان چیزوں کو دیکھ لیتا ہے۔ جو دوسروں کو نظر نہیں آتے؟ لیکن ہنس راج کل اس جہاز سے جس سفر کرنے والے ہیں، کوئی یہ پیغام بھیجے کہ فوراً واپس آ جاؤ کہ جہاز میں کچھ گڑبڑ ہے۔ تو اس تم اپنے الفاظ یاد کرنا۔ جو میں نے کہا ہے اور پھر سوچنا کہ میں ”فونا“..... مستقبل کے اندر میرے میں جھانک کر ان چیزوں کو دیکھ لیتا ہوں یا نہیں۔ جو دوسروں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ ہنس راج! حالاً تم اس وقت وہ بندوق مجھے دو گے، لیکن وہ میری ہو چکی، ہاں..... فونا کی، جسے تم دھوکے باز اورا کہتے ہو اور ہنس راج چونکہ تم نے مجھے دھوکے باز کہا ہے، اس لئے آئندہ کبھی تمہاری اور اس قسم قسمت نہ دیکھوں گا۔ جو تمہارے ساتھ بیٹہ کرکھانا کھاتا ہے۔ ہاں میں نہ دیکھوں گا، پر کیا کھاتا

لو دیکھوں گا کہ ہوا کی انگلی دل پر کیا لکھتی ہے۔“

پھر وہ اٹھا، دایاں ہاتھ بلند کر کے مجھے سلام کیا۔ چاندی کے سکے جمع کئے۔ جادوئی چیزوں کا اہلی تھیلا اٹھایا اور اس جھوپڑی کی طرف چلا جس میں وہ سویا کرتا تھا۔ جب ہم گھر کا چکر کاٹ کر دوسری طرف جا رہے تھے، تو ہماری مڈ بھیڑ بوڑھے نگہبان فرنڈس ہو گئی۔

”شازل۔“ وہ بولا۔ ”ہنس راج مہاراج! لیوشن نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ وہ اس باورچی کمرال کے لیے جہاز پر جا رہے ہیں تاکہ ہمارے اس سامان کی حفاظت کر سکیں جو اس پہنچ گیا ہے۔ کمرال ابھی ابھی آکر لیوشن کو بلا گیا ہے۔ کیوں“ اس نے کہا کہ وہ کل بتائے گا۔ میں سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ البتہ حیران ضرور تھا کہ ایسی کیا بات ہوئی کہ لیوشن نے یکا یک اس میں سونے کا فیصلہ کر لیا۔



دوسرے دن صبح طلوع ہونے کے تقریباً دو گھنٹے بعد کسی نے دروازے پر اتنے زور سے دستک مارا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ فرنڈس کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا کہ باورچی کمرال فوراً مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ کمرال کیا کر رہا تھا۔ حالانکہ گزشتہ رات مجھے مطلع کیا گیا تھا کہ لیوشن جہاز سلاویہ پر سونیں گے۔ بہر حال میں نے کہہ دیا کہ اسے اندر بھیج دیا جائے۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ یہ کمرال دوغلی نسل سے تھا۔ ماں ہندوستانی قلی کی نسل سے پھر اس خون ایک آدھ قطرہ سفید خون بھی مل گیا..... اور کئی ایک خون کی آمیزش بھی تھی۔ بہر حال اس ملاوٹ در سے جو چیز بنی تھی، وہ کمرال تھا۔ چونکہ اس کی رگوں میں مختلف قوموں کا خون گردش کر رہا تھا۔ اس لیے اس شخص میں برائیاں کم تھیں اور خوبیاں زیادہ۔ تاہم میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس جیسا ہا آج تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ اس کی یہ بزدلی اسے بڑے خطرات مول لینے سے روک نہ سکتی تھی۔ چنانچہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ تازہ ہم جس پر ہم ہونے والے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک تھی اور کمرال کی بزدلی سے میں چونکہ واقف تھا، اس لیے میں نے بھی اسے سمجھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس کے باوجود وہ یہ درخواست کیے رہا کہ میں اس ہم پر اسے بھی اپنے ساتھ لے چلوں۔ کیونکہ اسے مجھ سے انیت ہو گئی تھی۔ کمرال ایک افریقی عیسائی مبلغ کا بیٹا تھا اور اس نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ وہ بیک وقت بہت سی لائیں بڑی روانی رکھتا تھا اور انگریزی بھی صحیح بول لیتا تھا۔ کئی برس تک وہ کسی اسکول میں مدرس

”اس کے بعد صاحب بہت کچھ شور شرابا اور بہت کچھ گڑبڑ ہوئی، افریقی نے مسٹر لیوشن کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں، لیکن مسٹر لیوشن نے لنگر کی چرخی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”اگر ان میں سے کسی نے لنگر کی چرخی کو چھوا بھی تو پھر یا تو وہ مردود نہیں یا پھر مسٹر لیوشن نہیں۔ اس کے بعد میں نہیں جانتا کہ کیا ہوا۔ کیونکہ میں جہاز کے عرشے کے اوپر والے حصے پر کھڑا دیکھ رہا تھا اور بے خبر تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے اٹھا کر سر کے بل سمندر میں پھینک دیا اور چونکہ میں عمدہ تیراک ہوں۔ اس لیے تیر کر کنارے پر آگیا۔“

”جی صاحب! میں اس طرف بھاگا آ رہا تھا، تو میں نے بندرگاہ کے افسر سے گفت شنید کی تھی اور اسے مطلع کیا تھا کہ جہاز پر ہنگامہ برپا ہے، جس کی تحقیق کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔“

میں اسی اثناء میں پتلون اور قمیض پہن چکا تھا اور فونا دوسرے ملازمین کو آوازیں دے رہا تھا اور لوگ جلد ہی آ گئے۔ چونکہ فونا اور اسکے ماتحتوں کا لباس صرف موچہا پر مشتمل تھا، اس لئے انہیں تیار کرنے میں دیر نہ لگی۔

”فوا!“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”سلاویہ پر گزری ہو گئی ہے۔“

”آہ.....!“ وہ مسکرایا۔ ”یہ عجیب بات ہے کہ لیکن گزشتہ رات میرا خیال ہے، میں نے تم سے

کہا تھا۔“

”جنہم میں جائیں تمہارے خواب“ میں نے کہا۔ ”اپنے آدمیوں کو جمع کروں اور وہاں پہنچاؤں، لیکن نہیں! یہ ٹھیک نہیں ہے، وہاں خون خرابہ ہوگا، یا تو سب کچھ ہو چکا ہوگا یا پھر ٹھیک ہو جائے۔ شکار یوں سے تیار ہو جانے کو کہو۔ میں ان کے ساتھ آ رہا ہوں۔ سامان بعد میں آتا رہے گا۔“

اور ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہم اس گھاٹ پر تھے۔ جہاں سلاویہ لنگر انداز تھا اور ایک بے گروہ نظر آ رہا تھا۔ ہمارا! میں نے مکمل لباس پہن رکھا تھا اور میں سب سے آگے چل رہا تھا، چل رہا تھا، باقاعدہ مارچ کر رہا تھا، میرے پیچھے آگسٹ تھا، جس نے غیر معمولی طور پر بڑی ہیٹ جسے

اس پیشے سے اکتا کر یا شاید کسی اور وجہ سے ”جن کے متعلق کراں خاموش تھا۔ اسکول نکال دیا گیا تھا اور پھر کراں بھکتا بھکتا طورانیہ پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی زبان دانی کے مطالعہ ایک اور موڑ دے کر عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی اور وہاں کے ایک ہوٹل کا منیجر یا شاہ باورچی بن گیا۔ چند برسوں کے بعد اس کی یہ ملازمت بھی جاتی رہی اور کراں بقول اس کے اچھروں واپس کرشن آیا اور وہیں ”انگولی لینڈ“ کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی۔

عادات و اطوار میں وہ بے حد خاکسار اور امتداد طبع میں بے حد مذہبی آدمی تھا۔ وضع قطع  
پست قامت، میلی رنگت والا اور چھپلا تھا۔ بالوں میں سچ میں سے مانگ نکالتا ہوا اور کیسا ہی موٹے  
کیسی ہی حالت کیوں نہ ہو ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتا کرتا تھا۔

میں نے اس لیے اسے اپنی خدمت میں رکھ لیا کہ وہ بالکل مفلس ہو رہا تھا۔ بہت عرصہ ہوا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہمیں ایک دوسرے سے انیت ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مجھے ہنسا کرتا تھا۔ چنانچہ طویل سفر میں اس کا ساتھ ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ کیونکہ کرا ل کی وجہ میرے سفر کی تحکیم دور ہو جاتی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا، تو میں نے دیکھا کہ اس کے لباس سے پانی ٹپک رہا تھا۔ چنانچہ نے اس سے پوچھا کہ باہر بارش ہو رہی تھی یا پھر وہ شراب پینے کے بعد باہر گھاسا پرسو گیا تھا۔ ”نہیں مسز ہنس راج!“ اس نے جواب دیا۔ ”صبح بے حد شفاف و خوبصورت و شاندار اور اس بوڑھے آگس کی طرح میں نے بھی نشہ کرنا ترک کر دیا ہے۔ حالانکہ ہم دونوں کے خیال میں زمین آسمان کا فرق ہے اور ہم دونوں میں کوئی بات مشترک نہیں۔ لیکن اس ایک معاملے میں دونوں میں اتفاق ہو گیا ہے۔“

”تو پھر ہوا کیا آخر.....؟“ میں نے اس کی تقریر کی روانی کے آگے بندھ باندھنے کی اسے کہا۔

”ہوا تو یہ کہ جہاز پر گڑبڑ ہو گئی۔“ فونا کی پشت کو مجھے یاد آگئی اور میں چونکا۔ ”جہاز میں نے گزشتہ رات بسر کی تھی۔ مسٹر لیوشن کی درخواست پر (حقیقت میں کرا ل کی درخواست پر) نے وہ رات جہاز پر گزاری تھی۔“ آج علی الصبح، پوچھنے سے شاید کچھ پہلے یہ سمجھ کر کہ سبھی

۱۰۔ ان بد معاشوں کی باتیں سن لیں۔ ان کی سازش سے مجھے خبردار کیا اور جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، مانے عملاً احتجاج کیا۔“

بہر حال اب ڈکا گو سے اس جھگڑے کے متعلق پوچھا گیا، اس نے کہا۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی، اصرار اٹھانا نہ چاہتا تھا، بلکہ جہاز کو گھاٹ کے قریب لانا چاہتا تھا اور وہیں ہماری آمد کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس نے جھوٹ کہا تھا اور خود اسے بھی احساس تھا کہ ہم اس کے اس ارادے سے واقف کہ وہ مع سامان کے فرار ہو جاتا اور آگے جا کر لیوشن اور کراٹل کو قتل کر دیتا یا پھر انہیں سمندر میں لک دیتا چاہتا تھا۔ کہ وہ ہمارے قیمتی سامان کو کسی بندرگاہ پر فروخت کر سکے۔ لیکن چونکہ اس کا جرم نہیں کیا جاسکتا تھا، اس کے علاوہ اب ہماری تعداد بھی زیادہ تھی، اور اب ہم خود اپنی اور سامان کی قتل کر سکتے تھے، اس لئے میں نے اس معاملے کو اب یہیں پر ختم کر دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ میں ڈکا گو کا یہ جھوٹ مسکرا کر قبول کر لیا اور ہر ایک کو ناشتے پر مدعو کیا۔

بعد میں لیوشن نے مجھے بتایا کہ گزشتہ رات جب میں فونا سے جھگڑے میں پوچھ رہا تو کراٹل نے جو سلاویہ پر ہمارے سامان کی حفاظت کر رہا تھا، کسی کے ہاتھ لیوشن کو یہ پیغام بھیجا کہ مناسب ہو گا کہ وہ بھی جہاز پر آجائے، کیونکہ کراٹل تنہائی سے اکتا رہا تھا۔ لیوشن چونکہ کراٹل بودے پن سے واقف تھا، اس لیے خوش قسمتی سے اس نے کراٹل کے بلاوے پر لبیک کہا۔ اور صبح یہ گڑبڑ ہوئی، جیسا کہ کراٹل نے مجھے بتایا تھا، البتہ جو بات اس نے مجھے نہ کہی تھی، وہ یہ کہ کسی نے کراٹل کو اٹھا کر نہیں پھینکا تھا، بلکہ کراٹل نے خود سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی۔

”صورتحال میں سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بہر حال خیریت گزری کہ معاملہ رفع ہو گیا، لیکن لیوشن میں سمجھتا ہوں کہ قسمت یاوری کر رہی ہے، اس لئے تو کراٹل نے تمہیں بلایا اور راجے بھی آئے۔“

اس کے بعد صورتحال ہمارے قابو میں رہی، بقیہ سامان جو گھر پر بندھا پڑا تھا، لانے کے لئے نے لیوشن کو چند آدمیوں کے ساتھ بھیج دیا، یہ سامان بھی بحفاظت جہاز پر پہنچ گیا اور اس شام یہ نے لنگر اٹھا دیا۔

ہمارے کرٹن سے روانہ ہونے کے ساتویں دن ہمارا جہاز جزیرہ چٹاری کے اس گھاٹ پر لنگر تھا، جو ایک قدیم افریقی قلعہ سے زیادہ دور نہ تھا، ڈکا گو نے جس سے ہماری ملاقاتیں زیادہ نہ تھیں، اوپری عرشے پر کھڑے ہو کر جھنڈیوں سے عجیب چکرا دینے والے اشارے کیے ان کے جواب میں ایک کشتی جہاز کی طرف آتی ہوئی نظر آئی، اس کشتی میں جو لوگ سوار تھے، وہ

وہ عموماً پہننا کرتا تھا اور جو اس قدر گندی تھی کہ اس کا رنگ بھی پتہ نہ چلتا تھا لگا رکھی تھی اور کارڈرال کی چٹلون۔ اسی رنگ کا کوٹ، قمیض، پائین رکھی تھی اور ان چیزوں پر تیل کے بڑے بڑے داغ تھے۔ اس کے پیچھے مکمل ترین یورپی لباس میں کراٹل تھا۔ عمدہ سوٹ، عمدہ قمیض اور سرخ ٹائی میں جس پر لٹل رنگ کی دھاریاں تھیں۔ اگر ابھی ابھی سمندر میں غوطہ لگا کر نہ آیا ہوتا، تو اس لباس میں وہ واقعی ”پھلما“ معلوم ہوتا۔

اور اس کے پیچھے غضبناک فونا اور اس کے ساتھی تھے اور ان لوگوں کے سروں پر حلق تھا۔ ”شو“ ”سی کوکو“ کہتے ہیں۔ یعنی ان کے بالوں میں بٹی ہوئی موم کی چمکدار سی بڑے جنگجو نظر آ رہے تھے۔ یہ لوگ! لیکن چونکہ ان لوگوں کو مسلح ہو کر شہر میں نکلنے کی حکومت نے ممانعت کر دی تھی، اس لئے ان کی بندوبست جہاز پر پہنچ چکی تھیں اور ان کے بھالے چٹائیوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ان کے چوڑے پھلوں پر گھاس لپیٹ دی گئی تھی۔

تاہم ان میں سے ہر ایک ہاتھ میں ایک ایک ڈبڑا تھا، جس کے ایک سرے پر بڑی سی گیند لٹو بیٹا ہوا تھا اور یہ لوگ چار چار آدمیوں کی صف بنائے ہوئے تھے۔ بہر حال..... جب ہم سلاویہ تک جانے کے لئے ایک بڑی کشتی میں سوار ہوئے، تو ان کافروں کی بہادری کو جھجکا کر گئی اور ان کے بشرے سے خوف و ہراس ٹپکنے لگا، کیونکہ یہ لوگ جو خشکی پر کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اس بے مانوس عنصر سے ڈرتے ہیں، جسے ساری دنیا پانی کہتی ہے۔

ہم سلاویہ پر پہنچ گئے اور وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے جس پر میری نظر پڑی وہ لیوشن تھا۔ ۸ لنگر کی چرخی پر پستول ہاتھ میں لیے بیٹھا ہوا تھا۔ قریب ہی جہاز کی دیوار پر کھینچا لیجے جہاز کا کپتان ڈکا گو کھڑا تھا۔ جسے غلیظ ملاحوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ ملاح بھی ڈکا گو کی طرح بد معاش نظر آ رہے تھے۔ سامنے بندرگاہ کا افسر زنگار اپنے چند ماتحتوں کے ساتھ بیٹھا پائپ پی رہا تھا، اس کی نگاہیں لیوشن پر مرکوز تھیں اور کبھی کبھی ڈکا گو کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

”اچھا ہوا تم آگئے ہنس راج۔“ زنگار نے کہا، یہاں جھگڑا ہو گیا ہے۔ لیکن میں ابھی یہاں آ ہوں اور افریقی زبان سمجھتا نہیں ہوں اور یہ صاحب جو پستول لیے بیٹھے ہیں کچھ بھی بتاتے نہیں۔“

”کیا ہوا لیوشن؟“ زنگار سے مصافحہ کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

”یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟“ لیوشن نے جواب دیا۔ ”یہ بد معاش“ اور اس نے ڈکا گو کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہمارا سامان لے کر بھاگ جانا چاہتا تھا، رہے میں اور کراٹل اور میں سمجھتا ہوں کہ جہاز دور نکل جاتا تو یہ ہم دونوں کو سمندر میں پھینک دیتا۔ بہر حال! کراٹل نے جو افریقی زبان جا

ہا ہے، چنانچہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا خون میری گردن پر ہو۔ چنانچہ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسی جہاز میں شیزولے چلے جائیں، جہاں آپ کو قیام کے لئے ایک عمدہ اور پر آسائش ہوٹل مل جائے گا۔ یا آپ وہاں جانا نہیں چاہتے تو کہیں اور چلے جائیں۔ لیکن یہاں نہ اترئے، میں کہہ چکا ہوں کہ یہ علاقہ شریفوں اور مہذب لوگوں کے قیام کے قابل نہیں ہے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”مسٹر ڈیوڈ! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں آپ کون سے عہدے پر فائز ہیں کہ ہماری طاقت کو اپنی ذمہ داری سمجھ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جناب میں ایک مہم کا سربراہ ہوں اور اس علاقے میں آیا، تو ان لوگوں سے انسیت ہوگئی اور یہاں کے لوگ مجھے اپنے سردار کی حیثیت دیتے اور میرا بہت احترام کرتے ہیں۔“

”تو پھر اے شریف سردار یقیناً آپ کی وجہ سے ہمیں کوئی کچھ نہیں کہے گا اور ہم ان وحشیوں میں سے صحیح سلامت گزر جائیں گے، جن کا ذکر آپ نے کیا ہے، ہم صلح پسند شکاری ہیں۔ چنانچہ امید ہے، آپ ہمیں اپنے علاقے سے گزر جانے دیں گے۔“

شکاگو اور ڈیوڈ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی اور ادھر میں نے فونا کو حکم دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو اہلے آئے اور وہ سب کے سب بندوبست لئے ہوئے ہوں۔“

”جناب عالی! میں آپ کو یہاں اترنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”مسٹر ڈیوڈ! کل علی الصبح میں اپنے آدمیوں اور گدھوں اور سامان کے ساتھ یہاں اترنے کا ملکہ کر چکا ہوں، اگر آپ نے بخوشی ہمیں یہاں اترنے کی اجازت دے دی، تب تو ٹھیک ورنہ.....“

اور میں نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے غضبناک نظر آنے والے افریقی شکاریوں کی طرف بھاگا۔

”اگر مجھے اپنی طاقت استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا، تو مجھے اس کا افسوس ہوگا، لیکن میں آپ کو اطلاع دے دوں کہ میرے اس امن پسند گاؤں میں کم سے کم سو آدمی ایسے موجود ہیں، جو رائفلوں سے مسلح ہیں اور آپ کے ساتھ میں سے زیادہ آدمی نہیں دیکھ رہا۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

میں نے چند ثانیوں کے غور پر لیوشن سے مشورہ کرنے کے بعد کہا۔ ”مسٹر ڈیوڈ یہ بتائیے! کہ میں نے اپنے من پسند ساحل پر سے اس جہاز کو تو نہیں دیکھا، جس کا نام ”ڈولفن“ ہے، یہ انگریزوں کی جہاز ہے اور بد معاش و ظالم بردہ فروشوں کی کشتیاں تلاش کر رہا ہے اور اس کے کپتان کے خط سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس جہاز کو گزشتہ کل چناری کے آس پاس ہی ہونا چاہیے تھا، ممکن ہے کہ ”ڈولفن“ اس کی وجہ سے یہاں ایک دو دن دیر سے پہنچے۔“

شکاگو کے بقول بندرگاہ کے افسر و محافظ تھے، لیکن یہ دراصل سفاک اور خونی نظر آتے ہوئے فاموں کا خوفناک گروہ تھا، جس کے افسر کو ہم سے ”مسٹر ڈیوڈ“ کے نام سے متعارف کرایا گیا۔

یہ شخص آدھا عرب اور آدھا افریقی تھا، میرا مطلب ہے، اس کی جزا فریقہ میں ہی تھی، لیکن اس میں عربی خون کی آمیزش تھی، شاید اس کی ماں یا پھر باپ عرب رہا ہوگا۔ ڈیوڈ کے ساتھی بھی دولہلہ کے تھے، اس کے ساتھیوں میں چند عرب تھے، لیکن وہ بھی خالص عرب نہ تھے۔ یعنی ان کے خون بھی افریقی یا پھر انگریز خون کی آمیزش تھی۔

ڈیوڈ کو اس جہاز پر ہماری موجودگی ذرا بھی پسند نہیں آئی اور اسے تو یہ کسی طرح منظور ہی نہ کہ ہم چناری کے ساحل پر قدم رکھیں۔ شکاگو سے کچھ پوچھنے کے بعد ڈیوڈ میرے پاس آیا اور مر زبان میں مجھے مخاطب کیا۔ میں ظاہر ہے کہ عربی نہیں جانتا تھا، لیکن خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ انا ایسا شخص بھی تھا، جو ہفت، زبان تھا، میری مراد ہمارے باورچی کراں سے ہے۔ شکاگو بھی مترجم خدمات سرانجام دے سکتا تھا۔ چنانچہ کراں کو طلب کر لیا گیا۔

”کراں!..... یہ مسٹر ڈیوڈ کیا فرما رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کراں ڈیوڈ کی طرف گھوم گیا اور چند ثانیوں تک اس سے باتیں کرنے کے بعد مجھے یوں کیا گیا۔

”یہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دوست شکاگو سے سن لیا ہے کہ آپ کتنے عظیم انسان! اور یہ کہ انہیں بتایا گیا ہے کہ آپ اور مسٹر لیوشن انگریز ہیں اور انگریز قوم ان صاحب کو بہت پسند ہے بلکہ وہ اس پر دل و جان سے فدا ہیں۔“

”واقعی!“ میں نے کہا۔ ”بشرے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ڈیوڈ کو ہم سے قلبی لڑ ہے۔ بہر حال ان سے کہو کہ ہم ان کے ہمدردانہ الفاظ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان سے کہو کہ ہم یہ سب سے ہمیں اتر رہے ہیں اور ہمیں سے ہم شکار کرنے کی غرض سے آگے چلے جائیں گے۔“

چنانچہ چند ثانیوں تک کراں، ڈیوڈ سے گفتگو کرتا رہا اور پھر میرے اور اس شخص ڈیوڈ کے درمیان کراں کی وساطت سے جو گفتگو ہوئی، وہ یوں تھی۔

”میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ یہاں جہاز سے نہ اتریں، یہ علاقہ آپ جیسے شریک آدمیوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ یہاں خور و نوش کی کمی ہے اور کئی برس سے یہاں کوئی شکار نہیں دیکھا گیا۔

اندروں ملک جو وحشی آباد وہ بڑے خونخوار ہیں اور غذا کے فقدان اور بھوک نے انہیں آدم خور

اگر میں نے ڈیوڈ کے قدموں میں بم پھینک دیا ہوتا اور وہ بھٹ جاتا، تو اس کا اثر بھی ایسا ہو جیسا کہ میرے اس سوال کا ہوا۔ اس کا رنگ سفید نہیں بلکہ چمکی کے پیٹ کی طرح پیلا ہو گیا اور ا نے حیرت سے کہا۔

”جنگی جہاز.....“ ڈولفن ”میرا تو خیال تھا کہ یہ جہاز مرمت کے لیے مدین چلا گیا ہے اور مہینوں تک واپس نہیں آئے گا، اس کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی تھی۔



کافی دیر تک وہ اسی پریشانی میں مبتلا رہا۔ پھر میں نے کہا۔  
”میرے محترم دوست آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے، یا پھر آپ نے غلط اندازہ قائم کیا ہے اکوبر تک وہ مرمت کے لیے نہ جائے گا۔ آپ کہیں تو ڈولفن کے کپتان کا خط پڑھ کر سنا دوں؟“ ا میں نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا لفافہ نکالا۔

”آپ کے لیے یہ خط دلچسپ ہوگا، کیونکہ میرے دوست کپتان نے جس کا نام سینڈوز ہے اپنے اس خط میں آپ کا ذکر بھی کیا ہے۔  
ڈھٹا ڈیوڈ نے یا تو ہاتھ ہلا کر کہا۔

”بس ٹھیک ہے، معلوم ہوا کہ آپ ایک فولادی انسان ہیں۔ جسے توڑنا اور موڑنا آسان نہیں بہر حال تم چاہو تو یہاں اتر سکتے ہو۔ چنانچہ اترو اور جہاں بھی چاہو چلے جاؤ۔“

”میرے خیال میں تو مناسب ہوگا کہ ہم ڈولفن کی آمد کا انتظار کریں۔“ میں نے طعنیہ کہا۔  
”ارے نہیں اترو..... اترو..... کپتان شکاگو! سامان کشتیوں میں لا دو اور میری کشتی بھی از صاحبوں کی مدد کیلئے حاضر ہے۔ کپتان! مناسب ہوگا کہ تم آج رات ہی کو لنگر اٹھا دو۔ کیونکہ جس سمندر میں جذر شروع ہوگا، تو تمہارا جہاز یہاں پھنس جائے گا۔ مسٹر انس راج! ابھی کافی دن باقی ہیں۔ آپ خشکی پر قدم رنجہ فرمائیے، میزبانی کیلئے میں حاضر ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔“

وہ جب آپ نے یہ کہا تھا کہ آپ ہمیں یہاں اترنے نہ دیں گے۔ تو اسی وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں۔ بہر حال آپ کی اس دعوت کا شکریہ آپ کے کہنے کے مطابق ہم آج شام کو خشکی پر آجائیں گے اور کپتان شکاگو سے درخواست ہے کہ لنگر اٹھانے سے پہلے اگر انہیں ڈولفن نظر آجائے، تو وہ راکٹ چھوڑ کر ہمیں مطلع کر دیں۔“

”بیشک، بیشک!“ شکاگو نے کہا۔ جواب تک یوں ظاہر کر رہا تھا۔ جیسے وہ انگریزی زبان جس

میں اپنے مترجم کمرال سے باتیں کر رہا تھا۔ سمجھتا ہی نہیں۔“  
اس کے بعد اس نے گھوم کر اپنے ملاحوں کو نیچے سے ہمارا سامان لانے اور سلاویہ کی کشتی نے کا حکم دیا۔

ان لوگوں نے پہلے کبھی، سامان ایسی پھرتی سے کشتی میں نہ لا دیا ہوگا، آدھے گھنٹے کے اندر اندر بے تمام بیکٹ اور گھڑی جن کا حساب لیوٹن رکھ رہا تھا۔ اس جہاز پر سے اتارے جا چکے تھے۔ اذاتی سامان سلاویہ کی کشتی میں لا دیا گیا، لیکن دوسرا سامان مع گدھوں کے جنہیں رسی سے باندھ کر ا گیا تھا۔ ڈیوڈ کی لمبی اور گہری کشتی میں پہنچا دیا گیا۔ خود مجھے بھی اس کشتی میں سوار کرایا گیا۔ بے ساتھ ہمارے آدھے ملازم بھی سوار ہو گئے۔ بقیہ ملازم سلاویہ میں لیوٹن کے ساتھ بیٹھے، آخر شتیاں چل پڑیں۔

کشتی ساحل کی طرف جاری تھی، تو میں نے دیکھا۔ کہ آگس گدھے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا جھک کر کشتی کی دیواریں اور پیئریں سوکھ رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔ آگس؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کشتی میں واہیات ہو ہے۔ باس!“ اس نے سرگوشی کی۔ ”سلاویہ کے سب سے نچلے حصے ی ابھی بوسنی ہوئی تھی، افریقی غلاموں کی بو۔ میرے خیال میں اس کشتی میں غلام سوار کئے جاتے

”خاموش رہو۔“ میں نے کہا۔ ”اور تختوں کو یوں سوکھو نہیں۔“

لیکن میں نے سوچا کہ یہ آگس غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ بردہ فروشوں کے اڑے میں تھے اور ان کا سردار تھا۔

ہماری کشتی جزیرے کے قریب سے نکلی چلی گئی اور میں نے دیکھا کہ جزیرے پر ایک قدیم قلعہ اور پھوس کی جھٹ والی چند لمبی جھونپڑیاں تھیں۔ میں نے سوچا ان جھونپڑیوں میں غلاموں ا وقت تک رکھا جاتا ہوگا۔ جب تک کہ انہیں لے جانے والا جہاز نہ آ جاتا ہوگا، میں ان یوں کی طرف چونکہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس لئے ڈیوڈ نے کمرال کے ذریعے مجھے سمجھاتے لہا۔ کہ وہ جھونپڑیاں دراصل کھال اور مچھلیاں رکھنے کے گودام تھے۔ بلکہ ان ہی گوداموں میں درمچھلیاں سکھائی جاتی تھیں۔“

”بے حد دلچسپ!“ میں نے کہا۔ ”دوسرے مقامات پر تو کھالیں، دھوپ میں سکھائی جاتی

لہجہ میں رکھ لی۔ اس کے علاوہ دیوار پر اب بھی ایک حسین اور جوان لڑکی کی تصویر لٹک رہی تھی۔ اس کے بال بھورے اور آنکھیں حیرت انگیز تک نیلی تھیں۔ تصویر کے کونے پر اسی خط میں، جو اب پر تھا۔ لکھا ہوا تھا۔

”جوزیفائن۔ عمر بیس سال۔“

یہ تصویر بھی میں نے اس خیال سے اپنے قبضے میں کر لی کہ ممکن ہے، آئندہ یہ بطور ثبوت کے آئے۔“

”ہنس راج!“ لیوٹن نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ اس عمارت کے مالک بڑی افراتفری میں خالی کر گئے ہیں۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ بلکہ شاید وہ اسے خالی نہیں کر گئے۔ شاید وہ یہیں رک گئے، یعنی ہمیشہ۔“

”قتل کر دیئے گئے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا دوست ڈیوڈ جس کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ ان لوگوں اور لے انجام کے بارے میں ہمیں بتا سکتا ہے۔ چونکہ ابھی کھانا تیار ہونے میں دیر ہے۔ اس لئے ہم ذرا گر جا دیکھ آئیں۔“

”چنانچہ ہم نارنگی اور کھجور کے جھنڈ میں سے گزر کر گرجا کے سامنے پہنچ گئے۔ جو ایک بلند نیلے دا تھا۔ گرجا کی عمارت پتھروں سے بنائی گئی تھی اور ایک ہی نظر میں معلوم ہو گیا کہ اس گرجا کو نے تباہ کر دیا تھا۔

بے رنگ جمالی ہوئی دیواریں، خود اپنی کہانی سناری تھیں۔ گرجا کے اندر جھاڑیاں اور بیلبلں ی تھیں اور ایک گھناؤنا پیلا سانپ اس پتھر پر ریک رہا تھا جو کبھی قربان گاہ کا کام دے چکا ہو ٹوٹی ہوئی جہاد یواری میں قبرستان تھا۔ البتہ اس قبرستان میں کہیں بھی کوئی قبر کا نشان نظر نہ آ رہا نہ پھاٹک کے قریب ایک بے ڈھنگا سائیل تھا۔

”اگر اس ٹیلے کو کھودا جائے؟“ میں نے کہا۔ ”تو مجھے یقین ہے کہ اس سے ہمیں اس مکان کی ہڈیاں مل جائیں گی۔ اس سے کیا اندازہ لگا سکتے ہو تم لیوٹن؟“

”نہی کہ شاید ان لوگوں کا قتل کر دیا گیا ہے۔“

لیوٹن جہیں نتیجہ اخذ کرنا سیکھنا چاہیے۔ افریقہ میں یہ فن بے حد کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ایک تنگ آبنائے سے گزر کر ہماری کشتی چوٹی پلیٹ فارم سے جا لگی یہاں ہم اتر گئے اور اہم ہمیں ایک شکستہ حال عمارت میں لے آیا۔ جو ساحل سے ایک سو گز دور تھی۔ یہ بات مجھے واقعی ہمہ معلوم ہوئی کہ ڈیوڈ ہمیں اس بستی میں لے گیا تھا، جو بائیں طرف آ رہی تھی۔

اس عمارت میں کوئی خاص بات تھی، جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ یہ عمارت بردہ فروشوں نے نہیں بنائی ہے۔ کیونکہ اس کا دالان اور باغ اعلیٰ ذوق اور تہذیب کا نمونہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ایک اور گنوار بردہ فروشوں نے نہیں بلکہ مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں نے یہ عمارت بنوائی تھی اور وہ اس میں رہ رہے تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، تو نارنگی اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں ایک گر جا کے کھلا دکھائی دیئے۔ اس کے گر جا ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ تھا۔

کیونکہ چوٹی پر ٹوٹی ہوئی، صلیب اور اس کے نیچے پتیل کا ایک گھنڈہ اب تک لٹک رہا تھا۔ کم زمانے میں یہ گھنڈہ عبادت گزاروں کو بلانے کے لئے ٹٹا ہوا گا۔

”مسٹر ہنس راج! سے کہو۔“ ڈیوڈ نے کرا ل سے کہا۔ کہ یہ عمارت عیسائی مبلغوں کی مستقر تھی کوئی بیس برس پہلے مبلغ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

چنانچہ جب سے میں یہاں آیا ہوں، یہ مکان خالی پڑا ہوا ہے۔

”اور ان لوگوں کے نام کیا تھا جو یہاں مقیم تھے۔؟“ میں نے پوچھا

”یہ میں نہیں جانتا!“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”کیونکہ میرے یہاں پہنچنے سے بہت پہلے وہ لوگ

یہاں سے جا چکے تھے۔“

اس کے بعد کوئی ایک گھنٹہ تک ہم اپنا سامان، جس کا انبار اجڑے ہوئے باغ میں لگا دیا تھا، الگ کرنے اور قرینے سے رکھنے میں مصروف رہے۔ میں نے اپنے افریقی شکاریوں سے کہا کہ وہ اپنے خیمے ٹھیک ان کمروں کے سامنے لگائیں، جو ہمارے قیام کے لئے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔

یہ کمرے اپنے طور پر عمدہ تھے، وہ کمرہ جو مجھے دیا گیا تھا۔ یقیناً نشست گاہ تھا۔ کیونکہ اس میں امریکی طرز کا ٹوٹا پھوٹا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ لیوٹن کا کمرہ کبھی خواب گاہ رہا ہوگا۔ کیونکہ اس میں آہنی سہرا اب بھی موجود تھی، اس کے علاوہ کتابوں کی چند ٹوٹی پھوٹی الماریاں اور چند پھٹی ہوئی کتابیں بھی تھیں۔ البتہ ایک کتاب بالکل محفوظ تھی۔ غالباً اس لیے کہ اس کی جلد مراکشی چمڑے کی تھی اور دیکھ

اس کا ذائقہ پسند نہ آیا تھا اور یہ کتاب بھی۔ ”عیسائیوں کے روز و شب“ اس کے پہلے صفحے پر لکھا ہوا تھا۔

”اپنی پیاری جوزیفائن کو اس کی سالگرہ پر اس کے شوہر کی طرف سے تحفہ۔“ میں نے یہ کتاب

صالح چند سوالات پوچھے، حالانکہ شراب ڈیوڈ کے دماغ پر چڑھ گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ میرے سوالات کو ٹال گیا۔ اس نے صرف یہ بتایا کہ میں برس پہلے اس قبیلے کے لوگوں نے جو ہولوں کہلاتا ہے۔ مستقر پر حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا۔ البتہ ایک سفید قام مرد اور ایک سفید قام عورت اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور پھر انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔

”گر جا! کے قریب جو ٹیلا ہے۔ اس میں کتنے سفید قام دفن ہیں۔“ میں نے دفعتاً پوچھا۔  
 ”تم سے کس نے کہا کہ وہ لوگ وہاں دفن ہیں؟“ ڈیوڈ نے چونک کر پوچھا۔ لیکن اسے اپنی لٹلی کا احساس ہوا، تو وہ سنبھل کر بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تمہارا مطلب کیا ہے، میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ یہاں کے کینوں کو دفن کیا گیا ہے۔ یا کیا ہوا ان کا۔“

”شب بخیر! میں چلتا ہوں۔ اب کیونکہ سلاویہ پر سامان چڑھانا ہے۔“ چنانچہ وہ سلام کر کے لڑکھڑاتے قدموں سے رخصت ہوا۔

”تو سلاویہ اب تک روانہ نہیں ہوا۔“ میں نے کہا اور ایک خاص انداز سے سیٹی بجائی۔ فوراً اندھیرے میں سے آگس نکل کر سامنے آ گیا۔ کیونکہ یہ سیٹی اسی کو بلانے کا اشارہ تھی۔

”آگس!.....!“ میں نے کہا۔ ”جڑیے پر سے چند آوازیں آرہی ہیں، جنہیں میں سن رہا ہوں۔ ساحل پر پہنچ جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اگر تم نے احتیاط سے کام لیا تو کوئی تمہیں دیکھ نہ پائے گا۔“

”ہاں باس!..... کوئی مجھے دیکھ نہ پائے گا۔“ آگس مسکرایا۔ ”خصوصاً رات کے وقت کوئی آگس کو دیکھ نہیں سکتا۔“

وہ اسی خاموشی سے چلا گیا۔ جس خاموشی سے آیا تھا۔ میں نے بھی باہر آکر فونہ کو آواز دی۔  
 ب وہ آگیا، تو میں نے کہا۔ ”آج رات پہرے کا انتظام ہونا چاہیے اور اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دو۔ وہ اپنی اپنی ہندوق تان رکھیں۔ یہ لوگ بردہ فروش ہیں، چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ہم پر شب خون برسے۔“

”واہ!..... بیٹا واہ!“ وہ بولا۔ ”تب تو یہ بڑا مبارک سفر ہے۔ یہ بات تو میرے خواب و خیال، ابھی نہیں تھی کہ جنگ کا موقع اتنی جلدی آجائے گا۔ میرا سنا ہے یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا۔ بس آج بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ چلے والا کوئی بھی جا عدا تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔“

”اس بھرم میں نہ رہنا۔ فونہ!“ میں نے جواب دیا اور ہم خوابگاہ میں جا کر اس طرح لیٹ گئے پورا لباس پہنے ہوئے تھے اور رائفلیں پہلو میں رکھی ہوئی تھیں۔

سنو!..... میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ واقعی یہاں رہنے والوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ تو پھر یہ کا افریقیوں کا نہیں ہے۔ کیونکہ افریقی اپنے مردے کو دفن نہیں کرتے۔ چنانچہ یہ کام تو عیسائیوں عربوں کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ مردوں کو دفن کرتے ہیں۔ لیکن عرب اور عیسائی ایک مردہ ایک قبر میں دفن کرتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک ٹیلے میں گویا ایک قبر میں پورا کتبہ دفن ہے۔

چنانچہ یہ کام کسی ایسے شخص کا ہے، جو پورا عرب ہو، نہ پورا عیسائی۔ بلکہ دوغلا ہو اور کسی مذہب کا پیرو نہ ہو۔“ بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ اسے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔“  
 اور میں نے اس خود رو درخت کی طرف اشارہ کیا، جو اس ٹیلے پر آگ آیا تھا اور اس درخت آ عمر کسی صورت میں برس سے کم نہ تھی۔

واپس قیام گاہ پہنچے تو کھانا تیار تھا۔ ڈیوڈ نے رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی لیکن چند وجوہات کی بناء پر ہم نے اپنا کھانا کراں سے پکویا تھا اور خود ڈیوڈ کو ہم نے مدعو کیا تھا چنانچہ جب وہ آیا، تو بظاہر احترام سے جھکا جا رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جو شک اور نفرت تھی میں اسے دیکھ بھیر نہ رہ سکا اور ہم اس بھنی ہوئی بیٹھ پر ٹوٹ پڑے۔ جو ہم نے خود ڈیوڈ سے خرچہ تھی۔ کیونکہ میں اس شخص سے ایک تھکا بھی تھک نہیں لینا چاہتا تھا، کھانے کے ساتھ عمدہ شراب تھی۔ ہم میں ہم پانی ملا کر پی رہے تھے اور یہ پانی بھی خود آگس جا کر اس چشمے سے لایا تھا، جو ہماری قیام کے قریب ہی بہہ رہا تھا، یہ احتیاط اس لئے لازمی تھی کہ مجھے خوف تھا، کہیں پانی میں زہر نہ ملا دیا ہو۔

ابتداء میں ڈیوڈ شراب پینے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن آخر کار گویا اخلاقیات پینے کے لئے تیار ہو گیا چنانچہ میں نے بڑی دیر دلی کا ثبوت دیتے ہوئے، اس کا جام لبالب بھر دیا اور پھر وہ جام پر ہا چڑھانے لگا۔ تیسرے ہی جام کے بعد اس کی زبان کھل گئی۔ موقع غنیمت جان کر میں نے کراں کو بھیجا اور اس کے ذریعے ڈیوڈ سے کہا۔ کہ ہمیں اپنا سامان اٹھانے کے لئے کم از کم بیس بار برداروں، ضرورت تھی اور یہ کہ یہ بار بردار ہم اجرت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان پر ڈیوڈ نے اعلان کیا کہ میل کے اطراف میں ایسا کوئی ”جانور“ نہ مل سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے اسے زیادہ شراب پلائی اور آخر ہم ڈیوڈ سے سودا کرنے میں کامیاب ہو گئے یہ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے درمیان کتنی اجرت ملے ہوئی تھی۔ بہر حال ڈیوڈ نے وعدہ کیا کہ اس کے م کردہ بار بردار ہمارے ساتھ رہیں گے۔ جب تک ہم خود انہیں رخصت نہیں کر دیتے۔  
 اس کے بعد میں نے اس سے مبلغوں کی موت اور مستقر جو ہماری قیام گاہ تھا کی بتائی۔



کر کہا۔ ”اے! شولوڈ تم اپنے آپ کو بہت بہادر اور ہوشیار سمجھتے ہو۔ ہاں تم جنگی نعرہ لگا سکتے ہو، بالا بینک کر مار سکتے ہو اور کلہاڑے سے جنگ کر سکتے ہو۔ لیکن ایک بے حقیقت کرنٹائی کتا، بہر حال جب جنگ کا وقت آئے گا، تو وہ معاملہ میں تم پر چھوڑ دوں گا۔ لیکن جب معاملہ خبر گیری اور جاسوسی کا تو تم اسے آگسٹس پر چھوڑ دو یہ دیکھو فونا۔“

او اس نے اپنی مٹھی کھولی، تو اس میں سینک سے بنی ہوئی نساور کی ڈبیہ تھی۔ جیسی کہ شولوڈ استعمال کرتے تھے۔ تم لوگوں میں سے کس کی ہے یہ ڈبیہ؟“

”میری ہے۔“ فونا نے کہا۔ ”اور تم نے چرائی ہے۔“

”بے شک آگسٹس مسکرایا۔ یہ تمہاری ہی ہے اور جب میں تمہارے قریب سے گزر رہا تھا۔ تو مانے اسے تمہارے کان میں سے نکال لیا تھا۔ یاد کرو! فونا! جب میں نے یہ ڈبیہ تمہارے کان سے لی تھی، تو تم نے یہ سوچ کر اپنے گال پر تھپڑ مارا تھا کہ شاید یہ مجھ پر ہے۔“

”ہاں..... یہ سچ ہے!“ فونا عموماً ”اور اے آگسٹس زور سانپ! تم بے شک اپنے طور پر بے حد نیار اور اپنے غی کام میں ماہر ہو۔ لیکن آئندہ کبھی مجھے کسی پھمکیزے نے کاٹا تو میں اسے تھپڑ سے مارا ہلکے بھالے سے مار دوں گا۔“

میں نے ان دونوں کو رخصت کر دیا اور لیوٹن سے کہا کہ بہادری اور عیاری کے درمیان اے آفریش سے کشش جاری ہے اور یہ آگسٹس اور فونا کا معاملہ اس کشش کا بہترین نمونہ ہے۔ چونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ سلاویہ پر غلام چڑھانے میں مصروف ہے۔ اس لئے ہماری متوجہ نہ ہوگا، چنانچہ میں اور لیوٹن بھی بے فکر ہو کر سو گئے۔



خدا جانے میں کب سو گیا، صرف اتنا یاد ہے کہ کوئی میرا شانہ پکڑ کر مجھے آہستہ آہستہ جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ لیوٹن ہوگا۔ جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ چند گھنٹوں تک جاگتا رہے گا اور پھر ایک بجے مجھے بیدار کرنے کے بعد خود سو جائے گا اور لیوٹن واقعی جاگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے پائپ میں دھاتی ہوئی تیرا کو اندھیرے میں سُرخ تارے کی طرح نظر آرہی تھی۔

لیکن مجھے بیدار کرنے والا لیوٹن نہیں، بلکہ آگسٹس تھا۔ ”باس!“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے، سلاویہ پر غلام سوار کرائے جا رہے ہیں۔ ان غلاموں کو جزیرے کے کنارے پر سے بڑی کشتی میں سوار کر کے سلاویہ تک لے جایا جاتا ہے۔“

”تو میرا خیال غلط نہ تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن آگسٹس! تم یہاں کیسے آ گئے؟ باہر پہرہ دیتے ہوئے شکاری سو گئے۔“

وہ ہنسا۔ ”نہیں! باس وہ سوئے نہیں جاگ رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں وہ جاگ رہے ہیں اور رن رہے ہیں۔ اس کے باوجود بوڑھا آگسٹس ان کے بیچ میں سے نکل آیا اور کسی کو پتا نہ چلا۔ حتیٰ کہ

باس لیوٹن نے بھی مجھے کمرے میں آتے نہ سنا۔“

”واقعی!“ لیوٹن نے جواب دیا۔ ”ہلکی سی آواز البتہ سنی تھی اور سوچا تھا کہ چوہا ہوگا۔“

میں کمرے سے دالان میں اور وہاں کے دروازے میں سے نکل کر باہر آیا۔ باہر ہمارے افریقی شکاریوں نے الاؤ روشن کر رکھا تھا اور اس کی روشنی میں میں نے فونا کو بیٹھے دیکھا وہ پوری طرح سے جاگ رہا تھا۔ بددوق اس کے گھٹنوں پر دھری ہوئی تھی اور اس کے یعنی فونا کے پیچھے دو سنتری مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے فونا کو آواز دی۔ تو وہ فوراً اٹھ کر دوڑا آیا۔

”یہ دیکھو!“ میں نے آگسٹس کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیسا پہرہ دے رہے ہو۔ تم جب کہ ایک آدمی تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر میرے کمرے میں آ جاتا ہے۔“

فونا! نے آگسٹس کی طرف دیکھا اور اس کے لباس اور جوتوں پر ہاتھ پھیرا اس کے کپڑے اور جوتے بھی شبنم سے نم ہو رہے تھے۔

”اوہ.....!“ فونا نے بڑے یقین سے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ ہر وہ جاندار جو چلتا ہو تم تک نہ پہنچ پائے گا۔ لیکن یہ پہلا سانپ رینگ کر ہمارے درمیان سے نکل گیا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ یقین نہ آئے، تو اس کچڑ کی طرف دیکھ لو۔ جو اس کی واسکٹ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ کچڑ تازی ہے۔“

”لیکن! سانپ ڈس سکتا ہے اور کسی کی جان بھی لے سکتا ہے۔“ آگسٹس نے بدتمیزی سے ہنس

خوراک تھا اور درخت کی ”ہوا خوری“ کے بعد تو اس کی بھوک اور بھی بڑھ گئی تھی۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ڈیوڈ آگیا اور میں نے دیکھا کہ وہ آج گزشتہ کل کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی بد معاش اور عیار ہو رہا تھا۔ مے نوشی کی وجہ سے شاید اس کے سر میں درد تھا اور غالباً اسی وجہ سے اس کا دماغ بگڑا ہوا تھا۔ یا پھر اس کے مزاج میں تبدیلی کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے خیال میں ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ سلاویہ پر غلام چڑھائے گئے تھے اور یہ کہ سلاویہ محفوظ تھا۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ گزشتہ رات وہ ہم سب کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا، لیکن فوٹا اور اس کے ساتھیوں کی مستعدی نے اس کی ساری تدبیریں الٹ دی تھیں۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ بہر حال یہ حقیقت تھی کہ ڈیوڈ کا مزاج بگڑا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے خشونت عیاں تھی۔

ہم نے اسے سلام کیا، تو اس نے ہمیں اس کا جواب دیئے بغیر کرا ل کی وساطت سے پوچھا کہ ہم کب آگے روانہ ہو رہے ہیں، کیونکہ ہم نے اس کے گھر پر قبضہ جمار کھا ہے اور یہ کہ اسے باہر سونا پڑ رہا ہے۔

”تم لوگوں کی موجودگی نے مجھے گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔“ اس نے آخر کہہ یہ دیا۔ ”ڈیوڈ“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے میں بار بردار مہیا کر دیئے کا وعدہ کیا تھا، چنانچہ جب تک وہ بار بردار نہیں آجاتے ہم یہیں ٹھہرے رہیں گے۔“

”تم جیتے ہو۔“ وہ گرجا۔ ”میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ یہاں بار بردار ہیں ہی نہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ گزشتہ رات غلاموں کے ساتھ تم نے بار بردار بھی سلاویہ پر چڑھا دیئے؟ میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ ششدر رہ گیا۔ پھر برہمی کی حالت میں ات کچکا کر رہ گیا۔ میرے الفاظ سن کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ڈیوڈ غصے کی شدت سے پھٹ جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ اتنی پھیل گئیں، معلوم ہوتا تھا، حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ وہ ہمیں کوسنے لگا اور اس نے اپنا ہاتھ اس خنجر کے دتے پر رکھ دیا۔ جو اس کے پٹکے میں اڑسا ہوا۔ پھر جھلا کر فرش پر تھوک دیا۔

لیوشن میرے قریب کھڑا ہوا تھا، وہ پرسکون تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ بڑی ہی سے ڈیوڈ کو دیکھ رہا تھا۔ اتفاقاً لیوشن مجھ سے ایک دو قدم آگے کھڑا تھا۔ چنانچہ ڈیوڈ سے قریب نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیوڈ کی اس بدتمیزی کا نشانہ وہی بنا۔ ”میرے خدا!“

لیوشن نے ایک جھرجھری لی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے منہ سے گالی نکلی اور دوسرے ہی

دوسری صبح میں بیدار ہوا۔ تو لیوشن مجھ سے پہلے نہ صرف بیدار ہو چکا تھا، بلکہ کہیں چلا بھی گیا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور لیوشن کا انتظار کرنے لگا اور جب وہ نہ آیا، تو میں مجبوراً ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ آدھا ناشتہ میرے پیٹ میں پہنچ چکا تھا کہ لیوشن آگیا۔

”کہاں گئے تھے۔“ میں نے پوچھا! اور دیکھا کہ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا اور نرم کالی میں لتھڑا ہوا تھا۔

”کچھور کے سب سے بلند درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ فس راج! ڈیوڈ کے ایک ساتھی کو میں نے رے کے ذریعے پکڑ چڑھتے دیکھا، تو مجھے شک ہوا اور میں نے بھی ایک بلند درخت پر چڑھ کر دور بین سے دیکھا کہ سلاویہ جزیرے کی اوٹ میں لشکر اعزاز تھا، اس کے علاوہ دور پرے مجھے دھواں نظر آیا۔ دور بین سے دیکھا تو وہ بھی جہاز تھا، انگریزی جنگی جہاز پھر کھتر آیا اور وہ جہاز نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”خدا کی قسم“ میں نے کہا۔ ”وہ یقیناً ڈولفن ہوگا۔ چنانچہ میں نے ڈیوڈ سے جو کچھ کہا تھا، وہ فلفلا نہ تھا۔ مسٹر ڈنگار نے یعنی کرٹن کے افسر نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈولفن بردہ فروشوں کے جہازوں کی تلاش کے بعد کم سے کم پندرہ دن میں وہاں پہنچنے والا تھا۔ اب اگر اس کی ٹڈ بھیر سلاویہ سے ہوگئی اور ڈولفن کے کپتان نے شکار کو سلاویہ کے سامان تجارت کے متعلق پوچھا۔ تو شکار گوسلاخوں کے پیچھے نظر آئے گا۔“

”میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہ ہوگی، کیونکہ میرے خیال میں ایک آدھ گھنٹے بعد ہی ڈولفن اپنا راستہ بدل دے گا۔ یہ شکار گوبڑا ہی کائیاں ہے اور اس کی اس بد معاشی کو میں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ اس سؤرنے ہمارا سامان لے کر بھاگ جانے کی کوشش کی تھی۔ کافی کی پیالی بڑھاا اس طرف۔“

چنانچہ آئندہ دس منٹوں تک ہم خاموشی سے ناشتا کرتے رہے، کیونکہ لیوشن یوں بھی خور

لے وہ اس دو غلے بردہ فروش کے سامنے تھا اور اس سے پہلے کہ کوئی سمجھ سکتا لیونش کا زور دار گھونہ ڈیوڈ کی ناک پر پڑ چکا تھا۔ ڈیوڈ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور ساتھ ہی اس نے پٹکے میں سے خنجر نکھینٹ لیا لیکن لیونش نے بائیں ہاتھ کا دوسرا گھونہ اس کی آنکھ پر رسید کیا۔ تو ڈیوڈ کے ہاتھ سے خنجر چھوٹا اور خود ڈیوڈ بھی گر میں لپک کر خنجر پر کھڑا ہوگا اور اب چونکہ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں اس دست بدست جنگ میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ڈیوڈ اٹھا اور اپنا سر جھکا کر بھرے ہوئے پھینے کی طرح لیونش کی طرف دوڑ پڑا۔ ڈیوڈ مقابلے میں لیونش دہلا اور ہلکا تھا۔ چنانچہ جب اس نے اپنے سر سے لیونش کے سینے پر ٹکر ماری تو چت گرا لیکن اس سے پہلے کہ ڈیوڈ گرے ہوئے دشمن کے سینے پر سوار ہو سکتا۔ لیونش حیرت آگ پھرتی سے کھڑا ہو چکا تھا اور پھر واقعی ایک عجیب اور دلچسپ لڑائی کا آغاز ہوا۔ ڈیوڈ ہاتھوں، ناگوں اور سر سے لڑ رہا تھا اور لیونش صرف گھونسوں سے وہ ڈیوڈ کے وار بچا بچا کر اس کی کمر، سر اور جڑوں گھونے مار رہا تھا اور رفتہ رفتہ اس کے سکون پر غصہ اور جوش غالب آنے لگا تھا۔

ایک دفعہ ڈیوڈ کے ایک گھونے نے اسے لڑکا دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ڈیوڈ کو صحیح منہ میں سر کے بل گرا چکا تھا۔ اس پر ہمارے ساتھیوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور خود میں بھی خوشی ناچ اٹھا۔

ڈیوڈ اٹھ کر لیونش کی طرف آیا اور میں نے دیکھا کہ بردہ فروش نے اپنے کئی ایک ٹوٹے ہو دانت تھوک دیئے اور اس دفعہ انے نیا داؤ آزمایا۔ اس نے لپک کر لیونش کی کمر پکڑ لی وہ لیونش کو کی کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ تو چٹان کی طرح جما ہوا تھا۔ یوں زور نہ چلا تو اس نے لیونش کو کاٹنے کوشش کی، لیکن اس کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درد نے اس کی یہ کوشش بھی بے کار کر دی۔ آخر جب لیونش کے قدم اکھڑ گئے، لیکن وہ گرا نہیں۔

چنانچہ ڈیوڈ نے اس کا کالر پکڑ لیا اور اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن لیونش کی قہر کا لڑاس کھینچا تانی میں پھٹ گیا۔

آخر کار لیونش کو موقع مل گیا۔ اس نے دایاں بازو ڈیوڈ کی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور دائیں کے کتے بڑی بے رحمی سے اس کے چہرے پر برسرانے لگا۔ یہاں تک کہ ڈیوڈ بے تاب ہو کر آگ بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اعلان شکست کر دیا۔

”میں ہار گیا..... میں ہار گیا!“ ڈیوڈ نے کہا۔

”معافی مانگ!“ لیونش نے چیخ کر کہا اور جھک کر زمین پر سے مٹی بھر کچڑ اٹھالی۔

مانگ ورنہ میں یہ کچڑ تیرے حلق میں ٹھونس دوں گا۔“

لیونش کے لہجے سے ڈیوڈ نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ چنانچہ وہ اپنے فاتح حریف کے سامنے ٹھنوں کے بل جھک گیا اور بہت دیر تک معافی مانگتا رہا۔

”اب یہ معاملہ چونکہ ختم ہو گیا۔“ میں نے بڑی بشاشت سے کہا۔ ”اس لئے اب بار بردار کے متعلق کیا کہتے ہو؟“

”میرے پاس بار بردار نہیں ہیں۔“ وہ بولا۔

”کینے جموٹے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا ایک آدمی گاؤں میں گیا تھا اور اس کا کہنا ہے کہ گاؤں لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔“

”تو تم خود جا کر بار بردار حاصل کر لو۔“ ڈیوڈ نے بڑی عیاری سے جواب دیا۔ کیونکہ بستی کے پاروں طرف فیصل تھی اور دروازہ بند تھا۔

”اب یہ ایک نئی مصیبت تھی، بردہ فروش کو پیٹ دینا۔ کیونکہ وہ اس کا مستحق تھا، تو ٹھیک تھا۔“ بن اگر اس کینے شخص نے اپنے آدمیوں کو سمیٹ کر ہم پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر ہمارا خدا ہی اظہار ہوگا۔ ڈیوڈ اپنی سالم آنکھ سے، کیونکہ ایک آنکھ تو لیونش نے گھونے سے سُجا کر کپا کر دی تھی۔

ری طرف دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے میری دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔

”اس وقت میں مفتوح ہوں اور مجھے اس طرح چٹا گیا ہے، جس طرح کتے کو پیٹا جاتا ہے۔“ بولا اور اس کا غصہ عود کر آیا۔ ”لیکن یہ نہ بھولو کہ گرے ہوئے بھی سنبھل کر اٹھ کھڑے ہوتے۔“

ڈیوڈ کی زبان نے یہ الفاظ ادا کئے ہی تھے کہ دفعتاً سمندر کی طرف ایک لڑھکتی ہوئی گرج کی زلزلہ آئی..... یہ قوپ کی آواز تھی۔ عین اسی وقت ڈیوڈ کا ایک ہواس باختہ ساتھی بھاگتا ہوا آیا۔

”سردار!“ آنے والے نے خوفناک آواز میں کہا۔ انگریزی جہاز سلاویہ کا تعاقب کر رہا ہے۔

”اور وہ انگریزی جہاز ڈولفن ہے۔“ میں نے بڑے سکون سے کہا اور کراں کو اشارہ کیا کہ وہ جو کچھ کہوں اس کا ترجمہ کرتا جائے۔

پھر میں نے اپنی جیب سے وہ جھنڈا نکال لیا، جو میں نے اسی وقت جیب میں رکھ لیا تھا۔ جب نے کہا تھا کہ ڈولفن دیکھا گیا ہے۔“

”لیونش!“ میں نے جھنڈا ہلایا۔ ”اگر تم تھکے نہیں ہوئے ہو تو ذرا اسی درخت پر چڑھ جاؤ۔

پر صبح چڑھے تھے اور وہاں سے ڈولفن کے کپتان کو اس جھنڈے سے اشارہ کرو۔ کہ وہ یہاں

آجائیں کیونکہ شکار یہاں ہے۔“  
”خدا کی قسم بہت عمدہ خیال ہے۔“ لیوٹن مسکرایا۔ حالانکہ اس کا منہ سو جا ہوا تھا۔ ”آرگس

ایک لمبی اور سیدھی لکڑی اور ڈوری لے آؤ.....“  
لیکن ڈیوڈ کے نزدیک یہ عمدہ خیال نہیں تھا۔ ”انگریز لوگو!“ وہ بولا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ تمہیں بار بردار مل جائیں گے۔“

”ہاں..... اب آئے راہ پر“  
”میں بار برداروں کو بلانے جا رہا ہوں۔ ابھی آیا۔“

”نہیں ڈیوڈ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“  
”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم بطور یغمال بیٹھیں رہو گے، چنانچہ اپنے اس آدمی کو بھیج دو۔“  
”ڈیوڈ نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ لیکن پھر اپنے آدمی کی طرف گھوم کر اس سے کچھ کہا۔“  
سر ہلا کر پلٹا اور بستی کی طرف جو دائیں طرف تھی، بھاگ پڑا۔  
پہلے آدمی کے جا چکنے کے بعد دوسرا آدمی آیا، اس نے بھی حیرت سے ڈیوڈ کی طرف دیکھا۔  
”سر دار!“ آنے والے نے مٹھوک نظروں سے ڈیوڈ کی طرف دیکھا، کیونکہ اس عرصہ میں“  
کا چہرہ سوچ کر ناقابل شناخت بن گیا تھا۔ ہم نے دور بین سے دیکھا ہے کہ انگریزی جہاز نے سلاوا کو روک لیا ہے اور انگریزی جہاز سے ایک کشتی سلاویہ کی طرف روانہ ہوئی ہے۔ جس میں بہت۔  
آدمی سوار ہیں۔“

”آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔“ بے چین اور شکست خوردہ ڈیوڈ نے کہا۔  
”شکا گو پیدائشی چور اور غدار ہے۔ چنانچہ وہ سچ کچھ دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کینٹ اگر یہاں آجائیں گے، کھیل ختم ہوا اور اب ہمارے لیے فرار کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔ لوگو! سے کہوں کہ وہ جنگل کی طرف فرار ہو جائیں اور غلاموں کو بھی میرا مطلب ہے، اپنے ملازموں کو ساتھ لے جائیں میں ان سے وہیں ملوں گا۔“  
”تم ایسی کوئی بات نہیں کرو گے۔“ میں نے کراہ کے ذریعے اسے مطلع کیا۔ ”کم سے کم الحال نہیں تم ہمارے ساتھ چلو گے۔“

ڈیوڈ چند ثانیوں تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

”ہنس راج!“ اگر میں بیس بار بردار مہیا کروں اور کئی منزلوں تک تمہارے ساتھ ہی چلاؤں

کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ انگریزی جنگی جہاز کے کپتان کو پیغام بھیج کر یہاں نہ بلاؤ گے؟“  
”کیا خیال ہے۔ میں نے لیوٹن سے پوچھا۔“

میرے خیال میں تو اس میں حرج نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس بد معاش کی دھول میں نے ایسی جھاڑی ہے کہ وہ اسے ایک عرصہ تک یاد رکھے گا۔ اس کے علاوہ اگر ڈولفن یہاں آگیا۔ تو پھر ہماری یہ مہم بس! یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔“  
”وہ کیسے.....؟“

”وہ اس طرح کہ ڈولفن والے ہمیں بطور گواہ طورانیہ سے کہیں اور لے جائیں گے۔ کیونکہ یہاں غلاموں کی تجارت کے معنی شاہد ہم ہی لوگ تو ہیں۔ اگر ہم نے ڈولفن کو بلایا، بھی تو اس سے کوئی اندہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ بستی والے مع غلاموں کے جنگل میں پناہ گزین ہوں گے۔ صرف ڈیوڈ رہ جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان لوگوں نے ڈیوڈ کو پکڑ بھی لیا تو کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے چھائی تو نہ سے سکیں گے، اس کے لئے یہ دوسری حکومت کی رعایا ہے۔ پھر وہ عالمی قانون کا احترام اور براہ است ثبوت کا فقدان وغیرہ بلکہ بہت ممکن ہے کہ ڈیوڈ بھی کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب اچائے۔ چنانچہ نقصان اگر ہوا بھی تو ڈیوڈ کا ہوگا اور نہ کسی اور کو بلکہ ہم ہی لوگوں کو ہوگا۔ کہ ہماری مہم لری کی دھری رہ جائے گی۔“

”ظہر دیار۔ مجھے سوچنے دو۔“ اور میں اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا۔

اور جب میں یوں معروف تھا، تو کئی باتیں ہوئی۔ ایک تو یہ کہ میں نے دیکھا کہ گاؤں کی ف سے بیس آدمیوں کو ہماری قیام گاہ کی طرف لایا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ بار بردار والے تھے، جن کا رہ کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ میں نے دوسرے لوگ بھی دیکھے جو کافروں کے ساتھ افریقیوں کے نھ اپنے گاؤں سے نکل کر جنگل کی طرف فرار ہو رہے تھے اور آخر میں ایک تیسرا بیابا خبر لے کر آیا، سلاویہ آگے روانہ ہو رہا تھا اور یہ کہ انگریزی جہاز اس کے ساتھ تھا۔ مطلب یہ کہ سلاویہ انگریزوں قبضے میں تھا۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ وہ جنگی جہاز اس طرف سے آنے والا تھا۔ چنانچہ لیوٹن کا مشورہ ماکر لیا گیا۔ کیونکہ بظاہر آسان طریقہ یہ ہی تھا۔

”باس!“ آرگس نے بعد میں کہا۔ ”میرے خیال میں ڈولفن کو یہاں نہ بلا کر تم نے سخت غلطی ہے۔ تم یہ بھول گئے، کہ سفید لباسوں میں لیوٹن یہ زرد شیطان فرار ہو گئے ہیں۔ واپس آ سکتے ہیں۔ چنانچہ! جب تم اس مہم سے لوٹ رہے ہو گے۔ تو یہ شیطان تمہارے منتظر ہوں گے۔ اب جنگی والوں نے ان کے اور غلاموں کے باڑے اجاڑ دیئے ہوتے تو یہ لوگ کسی اور طرف نکل جاتے۔“

پانچ مسلح افراد کی معیت میں بیس بار بردار آگئے، تو ہم ڈیوڈ اور اپنے افریقی شکاریوں کے ان کا معائنہ کرنے لگے۔ بار بردار کمزور نہ تھے۔ البتہ ٹکڑے بھی نہ تھے اور بے حد خوفزدہ معلوم تھے۔ ان کے بدن کی ساخت اور بال بنانے کے طریقوں سے پتہ چلتا تھا کہ یہ بار بردار کسی ن بلکہ مختلف قبائل سے تھے۔

ان لوگوں کو ہمارے سپرد کرنے کے بعد مسلح افراد میں سے ایک ڈیوڈ سے ایک پرجوش انداز میں کہنے لگا۔ کیونکہ اس وقت کرا ل ہمارے ساتھ نہ تھا۔ اس لئے میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ اس میں ا کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔ البتہ میرا اندازہ تھا کہ ڈیوڈ کی رہائی کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اگر ایسا تو پھر انہوں نے فی الحال یہ ارادہ ترک کر دیا اور پھر یہ افراد بھی اپنے ساتھیوں کی طرح جنگل میں بھاگنے لگے۔ لیکن ان میں سے ایک کچھ زیادہ بہادر تھا۔ چنانچہ وہ بھاگتے بھاگتے رکا پلٹا اور ری طرف گولی چلا دی۔

اس کی بندوق کی گولی کئی گز دور تک نکلتی چل گئی۔ اس کے باوجود اس شخص کی اس کوشش نے نہ دلا دیا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں وہ چھوٹی رائفل تھی، جسے آگس! انڈی کہتا تھا اور جس نے شولو کے ایک کرا ل میں گدھوں کو مارا تھا۔ میں نے انڈی کی گولی اس کے بازو میں کہنی اوپر پھوست کر دی۔

”ہت تیری کی۔“ میں نے شولوؤں سے کہا۔ ”اب وہ کبھی کسی پر گولی نہیں چلائے گا۔“ اس کے بعد میں بار برداروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بے چارے سمجھ رہے تھے کہ انہیں ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ بار بردار غلام ہی تھے۔ لیکن بکاؤ نے، بلکہ وہ تھے، جنہیں ڈیوڈ کے باغوں میں کام کرنے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

خوش قسمتی سے مجھے معلوم ہوا۔ اس گروہ میں دو بار بردار ہولون تھے۔ جن کی رگوں میں شولو۔ حالانکہ کئی نسلوں پہلے ان کے اجداد کے خون میں ملاوٹ ہو گئی تھی۔ یہ ہولون زبان جو بولتے

بہر حال! اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھ کر اضافہ کیا۔ ”ان کا سردار تو ہمارے پاس ہے۔“ یقیناً اسے پھانسی دینا چاہتے ہو اور اگر تمہیں یہ کام پسند نہیں ہے تو پھر اسے میرے سپرد کر دو۔ آدمیوں کو بڑی قابل تعریف مہارت سے پھانسی دیتا ہوں۔ ایک دفعہ جب میں جوان تھا۔ تو میں ایک قید خانے میں جلاد کا ہاتھ بنایا تھا۔

”نکل جاؤ یہاں سے۔“ میں گرجا۔ ”لیکن دل ہی دل میں نے اعتراف کیا کہ آگس نے کچھ کہا۔ وہ غلط نہیں تھا۔“



۱، کھانا پکانے کے برتن اور سونے کی چٹائیاں بھی لا دوی گئیں۔ یہ چٹائیاں خدا جانے کہاں سے ملے آیا تھا..... غالباً یہ چٹائیاں وہ اجاڑ پڑی بستی میں سے چرا لایا تھا۔

لیکن چونکہ یہ کام کی چیز تھی۔ اس لئے مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے متعلق آرگس سے بس پوچھا۔ آخر میں وہ چھ سات بھیڑیں بھی پکڑ کر ہمارے سامان میں شامل کر لی گئیں جو ادھر الٹک رہی تھیں۔ کیونکہ جب تک شکار نہ ملے ہمیں ان ہی بھیڑوں کو ذبح کر کے اپنے پیٹ کی بھائی تھی۔ میں نے سوچا کہ ان بھیڑوں کی قیمت تو بہر حال ادا کر دی جائے۔

لیکن جب میں نے مناسب رقم ڈیوڈ کو دی۔ تو اس نے غصے میں آ کر سکے زمین پر دے دیے۔ چنانچہ میں نے وہ سکے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے اور اس پر میرے ضمیر نے ذرا بھی نہ کی۔

رحم دل، لیوشن چاہتا تھا کہ ڈیوڈ آزاد کر دیا جائے اور اس تجویز پر عمل کرنے کا سب سے بڑا یہ تھا کہ ہمیں ڈیوڈ کی نگہبانی سے نجات مل جاتی۔ چند منٹوں کے غور کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ کوکم سے کم ایک دو دن کے لئے بطور ریغمال اپنے ساتھ ہی رکھا جائے۔ کیونکہ کیا خبر کہ اس بیوں کے دماغ میں کیڑا ریگنے لگے اور ہم پر حملہ کر دیں۔ ابتداء میں ڈیوڈ نے ہمارے ساتھ بھی انکار کر دیا، لیکن جب ایک شلو کے بھالے کی نوک ڈیوڈ کے لباس سے گزر کر اس کی جلد ۱، تو آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہم چل پڑے۔

۲، ہولون راہبروں کے ساتھ میں آگے تھا، ہمارے پیچھے بار بردار تھے۔ ان کے پیچھے بقیہ ارڈیوڈ اور سب کے آخر میں فونا..... اور لیوشن تھے، غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری قس بھری ہوئی تھیں اور ہم کسی بھی ناگہانی مصیبت اور حملے کے لئے تیار تھے۔ راہبروں کے ساتھ ایک راستہ تھا جس پر ہم چل رہے تھے۔ یہ راستہ چند سو گز تک ساحل کے متوازی چلتا ہوا دن علاقہ اور اس گاؤں کی طرف مڑ جاتا تھا۔ جہاں ڈیوڈ رہتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ پرانا اس ہمارا قیام تھا، کسی زمانے میں بھی ڈیوڈ کی قیام گاہ نہ رہا تھا۔



گزر آگے بڑھ کر راستہ ایک چٹان پر چڑھ گیا تھا۔ یہ چٹان دس فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی ان اور جزیرے کے درمیان کوئی پچاس گز چوڑی ایک کھاڑی تھی اور یہ ہی کھاڑی جزیرے کو جدا کرتی تھی۔

۳، اتارنے کے بعد سلاویہ اسی کھاڑی میں آگیا تھا اور اسی جگہ سے غلاموں کو چڑھایا گیا

تھے۔ اسے میں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن تھوڑی سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس بولی کی بنیاد تو شلور تھی۔ لیکن اس میں مختلف زبانیں مل گئی تھیں۔

جن کی عورتوں کو ہولون لوگوں نے اپنی زوجیت میں لے لیا تھا۔

اس کے علاوہ ایک بار بردار ایسا بھی تھا، جو بگڑی ہوئی عربی بول لیتا تھا، چنانچہ میں اس ۲، گفتگو کر سکتا تھا۔

میں نے ہولون بار برداروں سے پوچھا کہ وہ اپنے علاقے تک کا راستہ جانتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بیشک وہ اپنے گھر کا راستہ جانتے تھے۔ لیکن ان کے علاقے تک کم سے کم ایک مہینے کا ۲، تھا۔

”بہت اچھا!“ میں نے کہا ”اب اگر تم اپنے علاقے تک میری راہبری کی تو ہم نہ صرف ہمیں اس کی اجرت دیں گے۔ بلکہ تمہیں آزاد بھی کر دیں گے اور اگر ان دوسرے بار برداروں نے ۱، شکایت کا موقع نہ دیا، تو انہیں بھی وقت آنے پر آزاد کر دیا جائے گا۔

یہ سن کر وہ لوگ مسکرائے اور انہوں نے ڈیوڈ کی طرف دیکھا۔ جو ایک خالی بکس پر بیٹھا ۱،۱۱، برداروں کو اور مجھے گھور رہا تھا۔ لیکن کچھ نہ سکتا تھا، کیونکہ فونا اس کے پیچھے موت کے فرشتے کی طرح مستعد کھڑا تھا۔ مگر اس نے پوچھا۔

”یہ میرے آدمی ہیں اور انہیں آزاد کرنے کا حق تمہیں کس نے دیا ہے؟“

”اس نے.....“ میں نے جھنڈے کی طرف اشارہ کیا۔ جو آزادی کا نشان ہوتا ہے۔

”اس کے علاوہ جب ہم واپس آئیں گے، تو ان غلاموں کی قیمت چکا دیں گے۔ بلکہ.....“ ۱،

”بیشک..... وہ بڑوایا۔“ جب تم واپس آؤ گے تو ان کی قیمت چکا دو گے۔ بلکہ شاید اس ۲،

پہلے ہی چکا دو گے۔“

”اور سہ پہر کے تین بجے ہم روانہ ہو سکے۔ انتظامات اتنے بہت سے کرنے تھے کہ اگر ۱،۱۱، جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ رداگی کو دوسرے دن پر ملتوی کر دیتا، لیکن ہم چاہتے یہ تھے کہ جلد از جلد ۱، منحوس مقام سے نکل جائیں اور اگر ممکن ہو، تو مزید ایک رات اس جگہ قیام نہ کریں۔

۲، بار برداروں میں کبل تقسیم کیے گئے اور وہ نچکے بھوکے لوگ ہماری سخاوت پر ششدر رہ گئے۔

اس کے بعد بار برداروں میں سامان تقسیم کر دیا گیا۔ یہ سامان ہم کرشن سے ہی الگ تھا

بکسوں میں پیک کر کے لائے تھے اور ہر بکس صرف اتنا ہی بڑا اور اتنا ہی وزنی تھا جتنا کہ ایک آدا آسانی سے اٹھا سکتا ہے۔ دوسرا سامان گدھوں پر لا دیا گیا اور انہی پر اور سامان کے ساتھ پانی کی ۱،

گاؤں میں سے گزرنا مناسب نہ سمجھا۔ کافی بڑا گاؤں تھا۔ جس کے چاروں طرف باڑ بنی ہوئی تھی اور زمین کے ایک ابھار کی وجہ سے یہ گاؤں ساحل پر سے اور سمندر سے بھی نظر نہ آتا تھا۔

گاؤں کے عین بیچ میں ایک کافی بڑا مکان تھا۔ جو یقیناً ڈیوڈ کا گھر تھا۔ اسی عمارت میں وہ برہہ فروش اپنی بیویوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ میں نے حیرت سے دیکھا۔ کہ ڈیوڈ کے مکان کی پھوس کی چھت سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس وقت تو میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ آگ کیسے لگی تھی۔

لیکن ایک دو دن کے بعد جب میں نے آرگس کے کانوں میں سونے کے بندے اور ایک کلائی میں سنہرے ننگن دیکھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آرگس اور ایک شولو شکاری کے پاس دفعتاً بہت سے انگریزی سکے آگئے ہیں، تو مجھے شک ہوا۔ توڑی دیر کے بعد ہی حقیقت واضح ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ آرگس اور وہ شولو شکاری جو بڑا جیالا تھا۔ ہماری نظریں بچا کر گاؤں میں گھس گئے۔ گاؤں خالی پڑا تھا۔ وہ دونوں ڈیوڈ کے گھر پہنچے وہ بھی خالی تھا۔ چنانچہ ان دونوں کو جو زیور ملا اور جتنی رقم ملی اپنے قبضے میں کی اور واپس آتے وقت گھر کو آگ لگا دی۔

”باس.....! اس آٹو کے پٹھے نے عمدہ شراب کی بوتل ضائع کر دی تھی، چنانچہ ہم نے اس کا مٹہ ہی ضائع کر دیا۔ اسے ہی شاید انتقام کہتے ہیں۔“ آرگس نے کہا۔ آرگس کے اس کارنامے پر نے غصہ آنا چاہئے تھا۔ لیکن ابتداء دشمن نے کی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اس نے ہم پر گولیاں چلائی تھیں۔ ناچہ یوں سمجھئے کہ ہمارے اور ڈیوڈ کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی اور آپ جانئے جنگ میں سب کچھ نر ہے۔ چنانچہ آرگس اور اس شولو نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ جنگ ہی کا ایک حصہ تھا۔ چنانچہ میں نے رگس اور اس کے ساتھی سے کہا کہ وہ مال غنیمت میں سے اپنا حصہ نکال لیں اور بقیہ رقم دوسرے لوگوں میں برابر تقسیم کر دیں اور میں کراں کو بھی نہ بھولا تھا۔

بہر حال! ہر ایک کے حصے میں آٹھ آٹھ پونڈ آئے اور اس پر وہ لوگ خوش ہو گئے۔ اس کے وہ میں نے بار برداروں کو بھی فی کس ایک پونڈ یا اتنی ہی قیمت کی کوئی چیز دے کر خوش کر دیا۔

ڈیوڈ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ فن زراعت کا ماہر تھا۔ کیونکہ اس کے باغات جن میں غلام کام کیا تھے۔ واقعی بہت خوبصورت تھے اور ان سے اسے خاصی آمدنی ہو جاتی ہوگی۔ ان باغات سے رکر ہم اس ڈھلانی خطے میں پہنچ گئے جو جھاڑیوں اور درختوں سے پُر تھا اور یہاں سے راستہ دشوار اترتا۔ کیونکہ موٹی موٹی بیلیں راہ میں حائل تھیں۔

چنانچہ جب ہم یہ ڈھلان چڑھ کر اس کی چوٹی پر پہنچ گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو

تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گدھوں نے ہماری مشکلات میں اضافہ کر دیا۔ ایک گدھے نے خوا کر کے سامان پھینک دیا اور دوسرا چاروں ٹانگوں پر اچھلنے لگا اور یوں آگے بڑھنے لگا۔ کہ معل تھا۔ وہ سامان سمیت سمندر میں چھلانگ لگا دے گا۔ پیچھے آتے ہوئے ہمارے شولو شکاری اس گدھے کو سنبھالنے اور آرگس اور کراں کی مدد کو دوڑ پڑے۔

لیکن عین اسی وقت کھاڑی میں کسی وزنی چیز کے گرنے کا چھپا کا سنائی دیا اور مجھے بتایا ڈیوڈ نے چٹان سے کھاڑی میں چھلانگ لگا دی ہے۔ ڈیوڈ یقیناً ماہر بھراک تھا۔ چنانچہ جب گ نے اپنی شرارتوں سے شولوؤں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، تو ڈیوڈ کو وہ موقع مل گیا۔ جس کا وہ منتہ اس نے کھاڑی کے گہرے پانی میں چھلانگ لگا دی اور فوراً ہی غوطہ مار گیا۔ ساحل سے کوئی بیس گ وہ سطح پر ابھرا۔ لیکن پھر فوراً ہی غوطہ مار کر جزیرے کی طرف تیرنے لگا۔ بے شک میں ایک گ میں ڈیوڈ کی کھوپڑی اڑا سکتا تھا۔

لیکن خدا جانے کیوں مجھے اس شخص کی جان لینا مناسب نہ معلوم ہوا، جو اپنی زندگی کی ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کے علاوہ ڈیوڈ کے جرأت مندانہ عمل نے میرے دل پر ایک خاص ا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر گولی نہ چلائی اور اپنے ساتھیوں کو بھی گولی چلانے سے منع کر دیا اور بلا تاخیر کے آگے بڑھ گئے۔

اور یہ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے تاخیر نہ کی، کیونکہ ابھی ہمارا کارواں چلا ہی تھا کہ جزیرے گولیاں چلنے لگیں، خوش قسمتی سے ایک بھی گولی کسی کے نہ لگی۔ اس کے علاوہ چند گز آگے بڑھ بعد ہم ایک موڑ مڑ کر اوٹ میں ہو گئے۔ البتہ ایک گولی ایک گدھے پر لدے ہوئے سامان پر گ عمدہ شراب کی ایک بوتل ٹوٹ گئی اور کھن کا ایک ڈبہ بھی اس گولی نے بے کار کر دیا۔

اس معمولی سے نقصان نے مجھے غصہ دلا دیا۔ میں نے دوسروں کو تو آگے بڑھنے کا اشارہ لیکن میں خود ایک درخت کے پیچھے چھپ کر انتظار کرنے لگا اور مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا جزیرے کے ساحل کی ایک چٹان کے پیچھے سے ایک ہیٹ ابھری اور یہ ہیٹ غلیظ تھی اور اس کے بڑے بڑے داغ تھے۔ یہ ہیٹ میں نے فوراً پہچان لی کہ ڈیوڈ کی تھی۔ میں نے بندوق سہم کے گولی چلا دی اور ڈیوڈ کے سر پر سے ہیٹ صاف اڑ گئی۔ یہ ہماری بد قسمتی تھی یا شاید میری حما تھی کہ گولی ڈیوڈ کے سر میں پیوست نہ ہوئی تھی۔

اس کے بعد میں درخت کے پیچھے سے نکل آیا اور بھاگ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا، کچھ آ بڑھنے کے بعد ہم گاؤں کے قریب سے گزرے اس خوف سے کہ دشمن گھات میں نہ ہو۔ میں

کے قریب پہنچا، تو معلوم ہوا کہ وہ پرندہ نہیں بلکہ لپٹا ہوا کاغذ تھا۔ جو دو شاخہ ٹہنی میں رکھا ہوا تھا۔ ٹہنی لمبی سی تھی، جیسی سیاہ قام ہر کارے لے جانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ میں نے وہ کاغذ نکال کر کھولا بڑی کوششوں کے بعد کیونکہ اس خط کی تحریر ایسی زبان میں تھی، جسے میں پڑھ پایا۔ لکھا تھا۔

”اے شیطانو!

اس مجرم میں نہ رہنا کہ تم مجھ سے بچ نکلے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ اگر تم اپنے اس سفر میں زندہ رہے، بھی تو یاد رکھنا میرے ہاتھوں مارے جانے کے لئے زندہ رہو گے۔ میں بتا دوں کہ میرے پاس پورے تین سو آدمی ایسے ہیں۔ جو ہندوق سے مسلح ہیں اور میرے ادنیٰ مارے پر یہ لوگ آگ میں پھاند سکتے ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ یہ لوگ سفید خون کے پیاسے ہیں۔ ان دنوں کے ساتھ میں تمہارا تعاقب کروں گا اور اگر تم میرے ہاتھ آگئے تو میں تمہیں زندہ جلا دوں گا یا ردکڑوں سے ٹانگ دوں گا اور تب تمہیں معلوم ہوگا کہ آگ میں مرنا کیسا ہوتا ہے اور چیونٹیوں سے جسم کھوکھلا کر دینے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے اور پھر ہم دیکھیں گے کہ تمہارا وہ جنگی جہاز ڈولفن کس طرح تمہاری مدد کرتا ہے۔

”اے لیریا! خدا تمہیں عافیت کرے۔“

یہ مکتوب بے نام تھا۔ لیکن اس کے مصنف کو پہچاننا مشکل نہ تھا، یہ خط میں نے لیوشن کو دکھایا، تو اس کے انداز مخاطب پر اسے اس پر اتنا غصہ آیا کہ اس تیل کے جیسے وہ اپنی آنکھوں کے ارد گردوں کے کانٹے پر چڑھ رہا تھا۔ چند قطرے اپنی آنکھوں ہی میں ٹپکا دیئے اور پھر جلن سے بے تاب اس طرف بھاگا جہاں پانی رکھا ہوا تھا۔ بہت دیر تک اپنی آنکھوں کو دھوتا رہا اور جب اسے سکون ہونے لگا تو اس خط کا جواب لکھا۔

”ظالم جلا، جس کا نام ڈیوڈ ہے!“

واقعی ہم سے غلطی ہوگئی کہ ہم نے تمہیں اس وقت چھانی نہ دے دی۔ جب تو ہمارے اختیار اے۔ اے بھڑیئے کہ تو معصوموں کا خون چوس چوس کر مونا ہو گیا ہے۔ یاد رکھ کہ آئندہ ہم سے ملی نہ ہوگی۔ تیری موت اب زیادہ دور نہیں ہے اور ہم کہتے ہیں کہ تو ہمارے ہاتھ مارا جائے گا۔ لی جی چاہے۔ اپنے بد معاش ساتھیوں کے ساتھ ہمارے مقابلے میں آجا۔ تو ہمیں تیار پائے بتئے زیادہ آدمی اپنے ساتھ لائے گا۔ اتنی زیادہ ہمیں خوشی ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں ہم زیادہ دہ بد معاشوں کے وجود سے دنیا کو پاک کر سکیں گے۔

لیوشن، انس راج۔

بندرتی بلند ہوتا چلا گیا تھا اور بہت دور جا کر جیسے افق سے مل گیا تھا۔ درختوں سے پڑا اس ڈھلانی غلے میں جس میں سے گزر کر ہم آئے تھے۔ ہم پر حملہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کھلے علاقے میں مجھے حملے کا خوف اتنا زیادہ نہ تھا۔ کیونکہ دشمن اپنے بہت سے آدمیوں کو گنوانے کے بعد ہی ہم تک پہنچ سکتا اور ہمیں شکست دے سکتا تھا اور حالانکہ کئی دنوں تک ڈیوڈ کے جاسوس ہمارے ساتھ ساتھ چھپ کر چلتے رہے۔ لیکن ہم پر حملہ نہ ہوا، دشمن اس کی جرأت ہی نہ کر سکا۔

اس رات ایک چشمے کے کنارے مناسب جگہ تلاش کر کے پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ چونکہ رات بہت خوبصورت تھی اور آسمان صاف تھا، اس لئے خیمے نہ لگائے گئے بعد میں مجھے اس بات کا افسوس ضرور ہوا کہ ہم نے چشمے کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا۔ کیونکہ چشمے کے کنارے کے زرسوں اور دلدل میں گھر اتنے بہت سے تھے کہ وہ رات ہمارے لئے عذاب کی رات ثابت ہوئی۔ ان چمچروں کی مہربانی لیوشن پر خصوصیت سے نازل ہوئی۔ غالباً اس لئے کہ وہ حال ہی میں یورپ سے آیا تھا۔

چنانچہ اس کا خون بیٹھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہم صبح بیدار ہوئے ہیں تو لیوشن دیکھنے کی چیز بن گیا تھا۔ اول تو ڈیوڈ کے ساتھ ہاتھ پائی نے اس کے چہرے کو بگاڑ دیا تھا اور اب رہی سہی کسر چمچروں نے پوری کر دی تھی۔ اسی خیال سے کہ مردہ فروش رات کے اند میرے میں ہم پر ٹوٹ نہ پڑیں۔ صبح تک چہرہ دینا ضروری ہو گیا تھا۔ پہرے کا انتظام اس لئے بھی ضروری تھا کہ کہیں ہمارے بار بردار ہمارا سامان چرا کر بھاگ نہ جائیں۔ یہ سچ ہے کہ اس سے پہلے بار بردار پڑ کر سو رہے ہیں۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی بھاگ گیا، تو ہم اسے تلاش کر کے بلا تکلف گولی مار دیں گے، اس کے برخلاف اگر انہوں نے وفاداری کا ثبوت دیا، تو ان سے اچھا سلوک کیا جائیگا۔ ان بار برداروں نے ان دو ہولوں کے ذریعے جو ہماری راہبری کر رہے تھے کہا۔ کہ ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ دوبارہ ظالم ڈیوڈ کے ہاتھوں میں پڑنا نہ چاہتے تھے۔

ڈیوڈ کا نام لیتے وقت وہ لوگ کانپ گئے اور انہوں نے اپنی پیٹھ کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر کوڑوں کی مار کے نشانات تھے اور اپنے شانے دکھائے جن پر غلامی کے جوئے نے نیل ڈال دیئے تھے، یہ لوگ واقعی وفادار ثابت ہوئے۔

+++

صبح بیدار ہونے کے بعد میں سامان کا جائزہ لے رہا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کہ ہمارے گدھے تو نہیں بھاگ گئے کہ میری نظر کسی چیز پر پڑی۔ ہمارے پڑاؤ سے کوئی پچاس گز دور زمین میں ایک ٹہنی گڑی ہوئی تھی اور اس ٹہنی پر کوئی سفید چیز بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ کوئی پرندہ ہوگا۔ اس ٹہنی



ان میں سے ہر اک کی داستان قریب ایک جیسی تھی۔

برودہ فروشوں نے اپنی عیاری سے قبیلوں کو آپس میں لڑا دیا اور پھر برودہ فروشوں نے اس قبیلے کا ساتھ دیا جو پر قوت تھا۔ اپنی بندوقوں کی مدد سے کمزور قبیلے کو شکست دی۔ بوڑھے اور نا کارہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جوان مردوں اور عورتوں، بچوں کو غلام بنا کر لے گئے۔ کہ انہیں فروخت کر دیا جائے۔ معلوم ہوا کہ یہ تجارت تقریباً بیس برس پہلے شروع ہوئی۔ جب ڈیوڈ چٹاری میں وارد ہوا تھا اور وہاں مبلغوں کو مستقر سے نکال دیا تھا۔

ابتدا میں تجارت آسان اور منافع بخش تھی، کیونکہ تجارت کا خام مال آس پاس سے ہی مل جاتا تھا اور کثرت سے مل جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ آس پاس کے قبائل ختم ہونے لگے بے شمار سیاہ قام تو مارے گئے اور آبادی کا عمدہ حصہ بلکہ یوں کہیے کہ عطر غلامی کے جوتے تلے آگیا اور اس میں سے بھی جو مرنے سے بچ رہے تھے۔ انہیں جہازوں میں سوار کر کے نامعلوم ممالک کی طرف بھیج دیا گیا۔

چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ برودہ فروشوں کو غلاموں کی تلاش میں اندرون ملک میں جانا پڑا اور وہ چھاپے مارتے ہوئے، ہولوں لوگوں کے علاقے کی سرحد میں پہنچ گئے۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ ہولوں لوگ عظیم قبیلے شلو کی نسل سے تھے۔ ہمارے اطلاع دینے والوں کے بقول برودہ فروش بڑی قوت کے ساتھ، جلد ہی خود ہولوں لوگوں پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، انہیں یقین تھا کہ وہ لوگ اپنی بندوقوں کی وجہ سے ہولوں کو شکست دے دیں گے اور اس طرح مال تجارت حاصل کرنے کے لئے انہیں نیا علاقہ مل جائے گا۔

چنانچہ فی الحال تو یہ برودہ فروش ان چھوٹے قبائل کو صاف کر رہے تھے، جو گھنے جنگل یا پہاڑوں میں بے ہونے کی وجہ سے اب تک برودہ فروشوں کی دست و برد سے محفوظ رہے تھے، جس راستے ہر ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ وہی راستہ تھا۔ جس پر سے غلاموں کے قافلے گزرتے رہتے تھے۔ کیونکہ راستے کے کنارے کی لانی گھاس میں ہمیں اکثر جگہ انسانی خنجر پڑے مل گئے اور ان میں سے کئی ایک کی کلائیوں میں اب بھی غلامی کے چوٹی حلقے یا کڑے موجود تھے۔ یہ لوگ شاید حکم سے مرے۔ لیکن دوسروں کو برودہ فروشوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ کیونکہ ان کی کھوپڑیاں یا تو پھٹی ہوئی تھیں یا پھر پھٹی ہوئی تھیں۔

روانگی کے آٹھویں دن ہم اس راستے پر تھے۔ جہاں سے غلاموں کا ایک قافلہ غالباً چند دنوں پہلے ہی گزرا تھا۔ علامتوں اور نشانات سے پتہ چلتا تھا کہ یہ قافلہ ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن کسی جہ سے وہ یکا یک واپس پلٹ گیا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ شاید اس لئے کہ اس قافلے کے سالار کو ہماری

”بہت عمدہ!“ خط پڑھنے کے بعد میں نے کہا۔

”عمدہ تو ہے۔“ لیونٹن بولا۔ ”لیکن اس کا طرز ذرا بڑائی لئے ہوئے ہے اگر وہ اٹوکا پٹھا ڈھرا اپنے تین مسلح بد معاشوں کے ساتھ آگیا تو.....؟“

”تو پھر لیونٹن!“ میں نے جواب دیا۔ ”کسی نہ کسی طرح ہم اسے شکست دے ہی دیں گے۔ مجھے الہام تو نہیں ہوا لیکن اس وقت ہو رہا ہے اور وہ یہ کہ مسٹر ڈیوڈ کی زندگی کے دن اب زیادہ نہیں رہ گئے ہیں اور یہ کہ اس کی موت سے ایک یا دوسرے واسطے سے ہمارا تعلق ہوگا، انتظار کرو۔ لیونٹن! اس وقت تک جب تک ہمیں غلاموں کا کارواں نظر نہیں آجاتا اور پھر تم میرے یہ احساسات سمجھ سکو گے۔ اس کے علاوہ میں ان برودہ فروشوں کے مزاج سے بہت حد تک واقف ہوں۔ چنانچہ ہماری یہ پیشگوئی ہمارے دوست کو اعصابی ہيجان میں مبتلا کر کے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دے گی۔“

اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ چند دنوں بعد واقعی ہمیں غلاموں کا کارواں نظر آیا اور یہ ہمارے دوست ڈیوڈ کا سامان تجارت تھا۔

ہم لوگ ایک شاداب علاقے سے گزر رہے تھے اور ہماری رفتار اطمینان بخش تھی۔ ہم شمال مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ علاقہ غیر آباد لیکن حیرت انگیز حد تک شاداب تھا۔ جگہ جگہ پتے ہوئے جیشے اس علاقے کو سیراب کر رہے تھے اور ان چشموں کے کنارے کنارے گنجان جھاڑیوں کی جھال تھی۔ بلند مقامات کھلے تھے۔ یعنی وہاں میدان تھے۔ جو عمدہ پارک کی طرح تھے۔ جن میں یہاں وہاں درخت کھڑے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی زمانے میں اس خطے کی آبادی گنجان رہی ہوگی، کیونکہ اس جگہ ہمیں دیہاتوں کے آثار نظر آئے۔ ہر گاؤں کے بیچ بازار کا چوک بھی تھا۔ اب یہ گاؤں اجاڑ پڑے تھے۔

انہیں یا تو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ یا پھر گاؤں والے بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ البتہ کسی کسی گاؤں میں چند بوڑھے موجود تھے۔ جو جنگل کے پھل کھا کھا کر اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہے تھے۔ یہ بوڑھے یا تو اداس سے دھوپ میں بیٹھے ہوئے ہوتے یا پھر اجاڑ پڑے ہوئے کھیتوں میں جو کبھی سرسبز ہو رہے ہوں گے، کام کر رہے ہوتے۔ ہمیں دیکھ کر بے تحاشہ چیختے ہوئے بھاگ پڑے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہر وہ شخص برودہ فروش تھا۔ جس کے ہاتھ میں بندوق ہو۔

اس کے باوجود کبھی کبھی ان لوگوں میں سے چند کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے اور ہمارے سیاہ قام ساتھیوں میں سے ایک آدمہ مترجم کی خدمات سرانجام دیتا اور ہم ان ستم رسیدہ بوڑھوں سے ان کی داستان معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ان لوگوں میں سے جتنے بھی ہمارے سامنے لائے گئے

ام سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ یا شاید انہیں معلوم ہوا تھا کہ دوسرا کارواں جو کسی دوسرے علاقے میں لام پکڑ رہا ہے۔ مال تجارت کو ہٹا کا ہوا قریب آ رہا تھا۔

چنانچہ یہ پہلا کارواں جس جگہ اس دوسرے کارواں کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ یہ دونوں کارواں مل جائیں، تو ان کی قوت میں اضافہ ہو جائے اور پھر وہ دونوں قافلے ایک ہو کر آگے بڑھیں۔ اس قافلے کا تعاقب کرنا مشکل نہ تھا۔ کیونکہ یہ لوگ جگہ جگہ اپنی نشانیاں چھوڑ گئے تھے پہلے تو ہمیں ایک لڑکے کی لاش ملی۔ اس لڑکے کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔

اس کے بعد چیخے اور آہیں میں جھگڑتے ہوئے گدھوں نے دو لاشوں کا پتا دیا۔ دونوں ہی لاشیں نو جوانوں کی تھیں۔ ان میں سے ایک کو تو گولی ماری گئی اور دوسرے کا خاتمہ کھانسی سے کیا گیا تھا۔ دونوں لاشیں بے پروائی یا شاید ناڑی پن سے یا غالباً جلدی میں گھاس میں چھپائی گئی تھیں۔

ایک دو میل اور آگے بڑھے تو کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ہم اس طرف چل پڑے اور اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کی آواز تھی۔ وہ ایک چار سالہ لڑکی تھی۔ جو کبھی تندرست اور قبول صورت رہی ہوگی۔ لیکن اب وہ ہڈیوں کی مالا تھی، جب اس نے ہمیں دیکھا، تو بندر کی طرح چاروں ہاتھوں ٹانگوں پر چلتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ لیونٹ اس کے پیچھے چلا اور میں اپنے سامان میں سے دودھ کا ڈبہ لینے دوڑ گیا۔

فوراً ہی لیونٹ نے مجھے خوفزدہ انداز میں آواز دی۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس نے کوئی اور لرزہ خیز نظارہ دیکھ لیا ہے۔ چنانچہ میں بادل نخواستہ ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جن میں سے لیونٹ کی آواز آئی تھی۔ دو منٹ بعد میں لیونٹ کے قریب کھڑا تھا اور وہاں ایک جوان عورت ایک درخت کے تنے سے بندھی ہوئی بیٹھی تھی۔ یہ عورت یقیناً اس لڑکی کی ماں تھی کیونکہ وہ لڑکی اس کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی تھی۔

خدا کا شکر تھا کہ عورت زندہ تھی۔ ہم نے اس کے بندھن کاٹ دیے اور شولو شکاری اسے اٹھا کر پڑاؤ میں لے آئے۔ یہ شولو لوگ جب میدان جنگ میں نہیں ہوتے تو اکثر بے رحم ثابت ہوتے ہیں۔ آخر ہم ماں بیٹی کی زندگی بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے دونوں ہولوں راہبروں کو بلا بھیجا ان سے اب میں آسانی اور روانی سے گفتگو کر سکتا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ برودہ فروش غلاموں سے ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں۔

ہولوں نے اپنے شانے اچکائے اور ان میں سے ایک نے زوردار ہتھکڑیاں لگایا اور پھر جواب دیا۔ ”اس لئے سردار کہ یہ انسانوں کے تاجر بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کو جو چل سکتے

یا تو مار ڈالتے ہیں یا پھر مر جانے کے لئے درختوں سے باندھ دیتے ہیں۔ اب اگر وہ غلاموں کو بردہ چھوڑ دیں، تو شاید یہ لوگ سنبھل جائیں اور تندرست ہو کر بھاگ جائیں اور یہ بات بردہ فروشوں نے لئے بڑی افسوسناک ثابت ہوتی ہے اور وہ اس خیال سے کڑھتے رہتے ہیں کہ وہ جوان کے غلام تھے، اب آزاد ہیں اور مرے میں ہیں۔

”ذلیل، کہیئے“ لیونٹ پھسکا اور کہا۔ ”بہر حال اگر موقع ملا، تو میں ان بردہ فروشوں سے انتقام لے گا اور تب وہ اس بات پر افسوس کریں گے کہ وہ پیدا ہی کیوں ہوئے تھے؟“

لیونٹ بڑے غصے مزاج کا آدمی تھا اور اسے کبھی کبھار ہی غصہ آتا تھا، تو وہ استقدر خوفناک بنا تھا اور یہ کہ پھر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اڑتا لیس گھنٹے بعد ہی لیونٹ کو انتقام لینے کا موقع مل گیا۔

دو وجوہات کی بناء پر اس دن ہم نے مقررہ وقت سے پہلے ہی پڑاؤ ڈال دیا۔ پہلی وجہ تو وہ رات اور اس کی بچی تھی، جسے ہم نے بچایا تھا۔ وہ دونوں اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ چل نہ سکتے تھے۔ ہمارے پاس زائد آدمی نہ تھے کہ وہ ان دونوں کو اٹھالیتے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم رات اس جگہ پہنچے تھے جو رات گزرنے کے لئے بے حد مناسب بلکہ مثالی تھی اور یہ حسب معمول خالی پڑاؤ ہوا گاؤں۔ جس کے بیچ میں سے ایک چشمہ گزر رہا تھا۔ اس گاؤں کے کنارے کی جمو پڑیوں پر ہم نے قبضہ لیا۔ جمو پڑیوں کے چاروں طرف باڑ تھی۔ اس دن فوٹا نے ایک ٹکڑا جیتل اور اس کا ٹکڑا مار لیا۔ چنانچہ باقاعدہ نیافت کا انتظام بھی تھا۔

کرمال، عورت اور اس کے بچے کیلئے بنی بنا رہا تھا۔ میں اور لیونٹ بیٹھے پائپ پھونک رہے تھے کہ کانٹوں دار باڑ کے ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے آگس اندر رینگ آیا اور اعلان کیا کہ بردہ ش آ رہے ہیں۔ جن کے دو گروہ تھے اور جن کے ساتھ بہت سے غلام تھے۔

ہم جس حال میں تھے اسی حال میں اٹھ کر باہر دوڑ گئے اور ہم نے دیکھا کہ آگس نے غلط نہ تھا۔ بردہ فروشوں کے دو قافلے آ رہے تھے۔ جہاں کبھی گاؤں کا بازار رہا ہوگا۔ ان میں سے قافلہ تھا۔ جس کے نشانات ہم نے راستے میں دیکھے تھے۔ حالانکہ پچھلے دو دنوں سے ہم نے اس قافلے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ محض اس لئے کہ اس راستے پر بردہ فروش اپنی لرزہ خیز نشانیاں چھوڑ گئے تھے اور نظاروں کی ہم تاب نہ لاسکتے تھے۔ اس قافلے میں تقریباً اڑھائی سو غلام اور چالیس کے قریب غلام تھے۔ جو بندو قوں سے مسلح تھے۔ یہ محافظ بھی سیاہ فام تھے اور ان میں کچھ دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ جو غالباً ڈیوڈ کی طرح دوغلی نسل سے تھے۔ دوسرے کاررواں میں جو مخالف سمت سے آ رہا تھا، سو

سے زیادہ غلام نہ تھے اور میں یا شاید تمیں وہ تھے، جنہوں نے ان سیاہ قاموں کو پکڑا تھا۔



”اچھا۔“ میں نے کہا۔ ”اب رات کا کھانا کھالیں چل کر اور اس کے بعد تمہاری رائے ہوئی تو ہم ان لوگوں کی خیریت دریافت کرنے جائیں گے۔ اور انہیں بتا دیں گے کہ ہم ان سے ڈرتے نہیں۔ آگرس جھنڈا لے کر اس کو سامنے والے درخت سے بائیں دو۔ تاکہ ان لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم اس ملک کے باشندے ہیں۔“

چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہی جھنڈا درخت کی چوٹی پر لہرا رہا تھا اور ہم نے دو ٹہنیوں کی مدد سے دیکھ کر بردہ فروش ”جو اسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے ہم نے یہ بھی دیکھا کہ غلاموں نے گردنیں گھما گھما کر لہراتے ہوئے جھنڈے کی طرف دیکھا اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان غلاموں میں سے اکثر جھنڈے کو دیکھ چکے تھے۔ یا تو کسی افریقی کے پاس یا پھر کسی جہاز کے متول پر یا پھر انہوں نے سن رکھا تھا کہ یہ جھنڈا جس جہاز پر لہراتا ہے وہ بردہ فروشوں کی تلاش میں رہتا ہے اور غلاموں کو آزاد کرتا ہے۔ یا پھر بدحواس بردہ فروشوں کے چند الفاظ غلاموں کے کانوں میں پڑ گئے تھے اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ انہیں پکڑنے والے ایسے خائف کیوں تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو۔

بہر حال وہ جھنڈے کی طرف دیکھ رہے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ محافظ سچا مبوک یعنی دریائی گھوڑے کی کھال کے بنے ہوئے کوڑے بلند کر کے ان کے درمیان دوڑ گئے اور مار مار کر انہیں خاموش کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ لوگ پڑاؤ اٹھا کر فوراً آگے روانہ ہو جائیں گے اور انہوں نے رواں گی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ لیکن پھر رواں گی کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ غالباً اس لئے کہ غلام تحسین سے چور تھے اور پھر راستے میں کوئی ایسا جگہ بھی نہیں جہاں انہیں پانی مل سکتا۔ البتہ وہ رات بھر چلے رہے تو ایک چشمے کے کنارے پہنچ جاتے۔ قصہ مختصر انہوں نے رواں گی ملتوی کر دی اور الاؤ روشن کر لئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے چاروں طرف پہرہ بھی لگا دیا اور مزید احتیاط کیلئے غلاموں کو پڑاؤ کے گرد باڑ بنانے کے کام پر لگا دیا۔

”ہاں بھئی۔“ جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو لیوٹن نے کہا۔ ”تو اب تیار ہو ان سے

ملاقات کیلئے۔“

”میں صورتحال پر غور کر رہا تھا اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مناسب ہوگا کہ ہم ان لوگوں

کے حال پر چھوڑ دیں۔ ڈیوڈ کے قاصد اب تک ان لوگوں کے پاس پہنچ چکے ہوں گے اور انہیں دم ہو ہی چکا ہوگا کہ ہم نے ان کے سردار کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟

چنانچہ ہم اگر ان کے پاس گئے تو ممکن ہے وہ ہمیں دیکھتے ہی گولی مار دیں یا اگر انہوں نے ہمارا نبال کیا اور بڑے اخلاق و احترام سے پیش آئے تو اس کے بعد وہ یا تو ہمیں زہر دے دیں گے یا ہم پا کر ہمیں ذبح کر دیں گے۔ چنانچہ مناسب ہوگا کہ ہم یہیں رکے رہیں اور دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔“

لیوٹن منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ لیکن میں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ البتہ یہ رکھا کہ آگرس کو بلا بھیجا وہ آگیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک ہولون اور ایک بار بردار کو لے اندر آئے تو ہی دشمن کے پڑاؤ کے نزدیک پہنچ جائے۔ دونوں ہولون کو آگرس کے ساتھ بھیجنے کی امت نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ ہمارا بڑا سہارا تھا۔ دو سے جس بار بردار کا میں نے انتخاب کیا تھا وہ بڑا تھا اور مقامی بولیاں جانتا تھا۔ آگرس اور اس کے دونوں ساتھیوں کو ہدایت کر دی کہ وہ بردہ فروشوں کی تلاش میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں اور اگر ممکن ہو تو غلاموں سے مل کر انہیں بتائیں کہ ان کے دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں۔ آگرس نے اثبات میں سر ہلایا۔ کیونکہ جاسوسی کا کام اسے پسند تھا۔ تیاریاں کرنے چلا گیا تھا۔

میں نے اور لیوٹن نے بھی اپنی طرف سے پھاؤ کے انتظامات کر لئے اور یہ انتظامات کیا تھے؟ یہ کہ جگہ جگہ سنتری مقرر کر دیئے اور الاؤ چلا لئے۔

رات کا اندھیرا اتر آیا اور آگرس اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ سانپ کی سی خاموشی سے کے پڑاؤ کی طرف چلا گیا۔ چاروں طرف گہری خاموشی طاری تھی اور کبھی اس خاموشی میں ما کے ماتم کرنے کی دل ہلا دینے والی آوازیں ابھر آتی تھیں۔ ”لا۔ لا۔ لا۔ لا۔“ اور پھر یہ با ڈوب جاتیں۔ اور جب کوئی محافظ کسی غلام پر کوڑے برساتا تو ایک فلک شکاف جھج خاموشی اف ڈال دیتی تھی۔ ایک دفعہ بندوق کا دھماکہ بھی سنائی دیا۔

”میرے خدا!“ لیوٹن نے کہا۔ ”ان لوگوں نے آگرس کو دیکھ لیا ہے۔“

”میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر ان لوگوں نے آگرس کو دیکھ لیا ہوتا تو بندوق کے تین دھماکے سنائی دیتے۔ تو پھر اس کا کیا ہے؟“

”یا تو کسی کی بندوق اتفاقاً چل گئی تھی یا پھر ان لوگوں نے کسی غلام کو کسی وجہ سے قتل کر دیا

پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔“

”تو پھر تم انکے حملے کا انتظار کرنا چاہتے ہو؟“

”تیسرا راستہ بھی تو ہے۔ ہنس راج۔“

”مثلاً.....؟“

”تجویز بری نہیں، لیکن فونا سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔“

چند ثانیوں کے بعد ہی فونا ہمارے سامنے پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔

”ہمارے قبیلے والے حملے کا انتظار نہیں کرتے، بلکہ حملہ کر دیتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”اس کے باوجود بیٹا! میرا دل مجھے الٹی بات بتا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ میں حملہ کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ آگرس کہتا ہے کہ وہ کتے تعداد میں سات کے قریب ہیں اور سب کے پاس ہندو قیں ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے پاس پندرہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم بار برداروں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ آگرس کے بقول وہ لوگ مضبوط ہاڑ کے اندر ہیں۔ پھر جاگ رہے ہیں اور پھر ان کے جاسوس باہر ہیں۔ چنانچہ ہم بے خبری میں ان پر حملہ نہیں کر سکتے اور ہاس وہ لوگ بزدل ہوتے ہیں جو عورتوں اور بچوں کو قتل کرتے ہیں۔“

چنانچہ اگر ہمارا اور ان کا مقابلہ ہوا تو وہ مارے جائیں گے یا شکست کھائیں گے۔ چنانچہ میں کہتا ہوں انتظار کرو۔ اس وقت تک جب تک کہ ہمیں حملہ نہیں کرنا یا بھاگ نہیں جانا۔ لیکن ہنس! اے پاسان شب فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ تم نے بہت سی جنگیں دیکھی ہیں۔ چنانچہ فیصلہ کرو۔ حکم داور میں اس کی تعمیل کروں گا۔“

”فونا.....! تمہارے دلائل بڑے زوردار ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ ایک تیسری بات بھی میرے ذہن میں آئی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ظالم غلاموں کو آگے کر دیں اور خود ان کی اوٹ لے آگے بڑھیں۔ اس صورت میں پہلے ہمیں بے گناہ اور نہتے غلاموں کو ہی خاک و خون میں لٹانا پڑے گا اور ان کی لاشوں پر سے گزرنے کے بعد ہی ہم بردہ فروشوں تک پہنچ پائیں گے۔ چنانچہ لیوشن! رے خیال میں تو مناسب یہ ہی ہے کہ ہم یہیں بیٹھ کر انتظار کریں۔“

”جیسی تمہاری مرضی، ہنس راج!“ لیوشن بولا۔ ”البتہ یہ ضرور چاہوں گا کہ خدا کرے فونا کا یہ ازہ غلط ہو کہ بردہ فروش فرار ہو جائیں گے۔“

”تو جو ان تم تو بڑے جنگجو بننے جا رہے ہو۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔“

ہے۔“

”اس کے بعد بہت دیر تک کچھ نہ ہوا، یہاں تک کہ عین میرے سامنے آگرس زمین میں سا نکل آیا اور اس کے پیچھے مجھے دو دوسرے سائے نظر آئے۔ یہ آگرس کے دونوں ساتھی تھے۔ یعنی ہولون اور بار بردار جنہیں میں نے آگرس کے ساتھ بھیجا تھا۔

”کہو۔ آگرس کیا خبر لائے؟“ میں نے پوچھا۔

”خبر یہ ہے ہاس! کہ ہم تینوں نے بہت سی بلکہ ساری باتیں معلوم کر لی ہیں، وہ غلاموں سے جو پاری تمہارے متعلق ساری باتیں جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارے کتنے آدمی ہیں۔ انہوں نے انہیں حکم بھیجا ہے کہ تمہیں ٹھکانے لگا دیں، یہ اچھا ہی ہوا ہاس کہ تم ان سے ملاقات کرنے نہ گئے ورنہ پھر تمہیں قتل کر دیا جاتا۔ ہم ان کے بہت قریب تک ریک گئے تھے اور ہم نے ان کی ہانگ اپنے کانوں سے سنی تھیں اور وہ لوگ کل علی الصبح ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ البتہ اگر ہم یہ مقام سے پہلے خالی کر گئے تو بات دوسری ہے اور ہماری روانگی کی خبر انہیں مل جائے گی۔“

ہاس! میرے یہ دو ساتھی غلاموں میں پہنچے اور ان سے گفتگو کی غلام بھارے بہت اداس ہیں اکثر تو ٹوٹا ہوا دل لے کر اس کے صدمے سے مر گئے، کیونکہ انہیں ان کے لوگوں سے اور ان آہستہ سے چھڑا دیا گیا ہے اور یہ نہیں جانتے کہ کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

میرے دو ساتھیوں نے اپنے چاقو، جو ہاس نے انہیں دیئے تھے وہ ایسے غلاموں کو مستعار دے دیئے ہیں۔ جو سب سے زیادہ بہادر اور صحت مند ہیں تاکہ وہ جوتے سے بندھی ہوئی رسیاں کاٹ لیں اور پھر یہ چاقو ایک ایک غلام تک باری باری سے پہنچاتے رہیں تاکہ وہ سب کے سب اپنے اس بندھن کاٹ کر آزاد ہو جائیں، لیکن ممکن ہے۔ غلاموں کے جو پاری انہیں آزاد ہوتے دیکھ لیں اور وہ دونوں چاقو میرے دونوں ساتھیوں کو واپس نہ لیں۔“

”لیوشن!“ آگرس کے جا چکنے اور ساری باتیں لیوشن کے سامنے کر دینے کے بعد میں نے کہا۔ اب ہمارے لئے دو ہی راستے رہ گئے ہیں یا تو یہ کہ ہم راتوں رات بوریا بستر اٹھا کر فرار ہو جائیں۔ اس صورت میں اس عورت اور اس کی بچی کو ہمیں یہیں چھوڑنا ہوگا۔ یا پھر یہ کہ ہم یہیں طم کر دشمن کے حملے کا انتظار کریں۔“

”میں فرار نہ ہوں گا۔ ہنس راج!“ لیوشن نے کہا۔ ”اس بے چاری عورت اور اس کی بچی کو ہم، فروشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جانا تو انسانی ہمدردی کے خلاف ہے اور پھر یہ بڑی بزدلی بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہم اگر روانہ ہو بھی گئے تو شاید بچ نہ سکیں گے۔ کیونکہ آگرس بتا ہی چکا ہے کہ ان کے آدمی“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”بہر حال جہاں تک میرا تعلق میں چاہتا ہوں کہ فونا کا اعزاز غلط نہ ہو اور اگر ہوا تو یقین کر لو لیوٹن ہم بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“

”اب تک میں بڑا صلح پسند تھا۔“ لیوٹن نے کہا۔ لیکن غلاموں کی سر پھٹی لاشیں اور وہ بچی اور اس درخت سے بندھی ہوئی عورت کے نظارے.....“

”وہ نظارے واقعی کسی کے دل میں بھی جوش اور غصے کے جوا لا بھڑکا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ بہر حال چونکہ اب بات طے ہو ہی چکی ہے۔ اس لئے آؤ۔ ہم اپنے کام میں لگ جائیں۔ تاکہ کل صبح جب وہ بردہ فروش ہماری مزاج پرسی کو آئیں تو انہیں ناشتہ تیار ملے۔“

بہر حال ہم جو کچھ احتیاطی تدابیر کر سکتے تھے۔ وہ حتی الامکان کر لیں۔ جب جب ہم یوٹا کو جہاں تک ممکن تھا مضبوط بنا چکے اور جگہ جگہ کئی ایک بڑے بڑے الاؤ روشن کر چکے تو میں نے پھر ایک ہولون شکاری کو ایک ایک جگہ بطور سنتری مقرر کر دیا اور یہ دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا کہ ان کی بندوقیں تیار تھیں اور ان کے پاس کافی بارود اور کارتوس تھے۔ اس کے بعد میں نے لیوٹن سے کہا کہ وہ سو جائے بعد میں میں اسے جگا دوں گا۔ وہ اس کیلئے تیار نہ تھا۔ لیکن میرے اصرار پر آخر کار وہ لیٹ گیا۔ تاہم میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے بیدار نہ کروں گا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ جب وہ صبح بیدار ہو تو تازہ دم ہو۔

تھوڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ سو گیا۔ اور میں سامان کے ایک بکس پر بیٹھ کر صورتحال پر غور کرنے لگا اور سوچ تو یہ ہے کہ میں قطعی مطمئن نہ تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں جانتا نہ تھا کہ جب لڑائی ہوگی اور گولیاں چلیں گی تو اس وقت ہمارے بیس بار برداروں کا رویہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ ایک دم سے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگ جائیں اور اگر ایسا ہو تو میں انہیں باہر نکل جانے دوں گا۔ پھر جو کچھ ان کی قسمت میں ہوگا ہو کر رہے گا۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ ہمارے ناموزوں مورچے کا تھا۔ ہمارے پڑاؤ کے ارد گرد کافی سے زیادہ درخت تھے اور حملہ آور ان جھنڈوں میں پناہ لے کر حملہ کر سکتے تھے اور ہم انہیں دیکھ نہ سکتے تھے۔ لیکن مجھے اس سے بھی زیادہ ایک دوسری بات کا خوف تھا۔ حملہ آور ریگ کر جھٹے کے کنارے اگے ہوئے زرسلوں میں چھپ سکتے تھے اور ہماری گولیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ اس ٹیلے کی طرف سے بھی خطرہ تھا جو ہمارے پڑاؤ کے عقب میں اور کوئی دو سو گز دور تھا۔ یہ ٹیلا گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اب اگر دشمن کسی طرح اس ٹیلے کے پیچھے اور وہاں سے اس چوٹی پر پہنچ گیا تو وہ ٹھیک ہمارے پڑاؤ میں گولیاں برسا سکتا تھا اور پھر اگر ہوانے بھی ان کا ساتھ دیا۔ یعنی ان کی طرف سے ہماری طرف پہنچے

لہذا وہ ہمارے پڑاؤ میں آگ لگا کر ہمیں زندہ جلا سکتے ہیں۔ یا دھوئیں کی چادر میں بڑے اطمینان دہنی سے ہماری طرف بڑھ سکتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ خدا کی مہربانی سے ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی اس کی وجہ میں مناسب موقع پر بیان کروں گا۔

رات یا علی الصبح کے حملے کا وقت کم سے کم میرے لئے بڑا ہی آزمائشی ہوتا ہے۔ یعنی آسمان پر وہ صبح نمودار ہونے سے پہلے کا وقت اس وقت تک ہر وہ چیز جو وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے۔ ام اور ہر بات پوری ہو چکی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس وقت انسان پر سستی اور کاہلی کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب مانی اور اخلاقی کیفیات قہر یا میٹر کے پارے کی طرح سب سے نچلے نقطے پر ہوتی ہیں۔

کئی علامتوں نے پتہ دیا کہ رات مر رہی تھی اور صبح قریب تھی۔ بار بردار نیند میں کسے اور ائے کہیں دور دھاڑتا ہوا شیر خاموش ہو کر اپنے بھٹ کی طرف چلا گیا۔ کہیں کوئی مرغا بولا اور سے گدھے جمر جمری لے کر اٹھے اور وہ رے کھینچنے لگے۔ جن سے وہ بندھے ہوئے تھے۔ لیکن ابھی اندھیرا گہرا تھا۔ کہیں سے آگس ریک کر میرے قریب آیا۔ الاؤ کی مری ہوئی روشنی میں کے زرد چہرے کی جھریاں میں دیکھ سکتا تھا۔

”باس میں صبح کی یوسوگمہ رہا ہوں۔“ وہ بولا اور پھر غائب ہو گیا۔

فونا نمودار ہوا۔ اندھیرے کے پس منظر میں اس کا چوڑا چمکا جسم مہیب معلوم ہو رہا تھا۔ ”نفس رات ختم ہو گئی ہے۔“ وہ بولا ”اگر ان لوگوں کو کو حملہ کرنا ہی ہے تو وہ آ رہے ہوں گے۔ اور سلام کے وہ بھی رخصت ہوا۔

چند عانیوں بعد میں نے بھالوں کے پھلوں کے آپس میں ٹکرانے کی جھکار اور بندوقوں کے بے چڑھانے کی آواز سنی۔

میں نے جا کر لیوٹن کو جگایا اور وہ جمائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ پر آسائش اور سرسبز و شاداب باغات مکان کے متعلق کچھ بڑا بڑایا اور پھر دفعتاً اسے یاد آیا کہ وہ کہاں تھا۔ چنانچہ پوچھا۔ ”وہ بردہ آ رہے ہیں کہ نہیں؟“

آخر کار جنگ کا وقت آ ہی گیا۔ نفس راج تم بڑے عمدہ آدمی ہو۔“

”اور تم بڑے بیوقوف ہو۔“ میں نے جواب دیا اور غصے سے جیر پٹنا ہوا چل دیا۔

اس نا تجربہ کار نوجوان کی طرف سے میں بہت بے چین تھا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اپنے معاف نہیں کر سکتا تھا۔

اور آپ کی نصرت و فتح کی دعا کرتا رہوں گا۔“

”اور اگر وہ لوگ اس کھڈ میں آ گئے تو۔ کراں؟“

”تو پھر جناب! اپنی ٹانگوں کی تیزی و طراری پر بھروسہ کروں گا۔“

”اب میں برداشت نہ کر سکا میری دائیں ٹانگ ایک دم سے اُپر اُٹھی اور میری لات کراں  
اس حصہ جسم پر لگی جسے میں نے نشانہ بنایا تھا۔ وہ اچھلا اور پلٹ کر بھاگ گیا۔

تین اس وقت بردہ فروشوں کے پڑاؤ میں جواب تک خاموش تھا شور ہوا۔ یہ بھی ہوا کہ صبح کی  
کارن ہماری بندوؤں کی ٹالیوں پر چپکنے لگی۔

”ہوشیار!“ میں نے کافی کا آخری گھونٹ لینے کے بعد چیخ کر کہا۔ ”دشمن کے پڑاؤ میں کچھ ہو  
ہے۔“

شور دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ فضا گالیوں اور چیخوں کی آوازوں سے پر ہو گئی۔ ان  
روں سے غصے اور خوف کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر بندوق کے دھماکے سنائی دیئے۔  
وہی درد و تکلیف کی چیخیں اور پھر بہت سے بھاگتے ہوئے پیروں کی چاپ۔ اس اثناء میں روشنی  
سرعت سے پھیلنے لگی تھی۔ تین منٹ اور گزر گئے اور ہم نے صبح کی دھند میں دیکھا کہ بہت سے  
لام ڈھلان سے اتر کر ہماری طرف بھاگے آ رہے ہیں۔ کئی ایک کے پیچھے موٹے موٹے لکڑی  
نڈے بندھے ہوئے تھے اور وہ انہیں کھینچتے بھاگ رہے تھے۔ جینہ اپنے ساتھ بچوں کو کھینچے لا  
تھے اور وہ سب کے سب گلا بھاڑ کر چلا رہے تھے۔

”غلام ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔“ لیوٹن نے کہا اور بندوق اٹھالی۔

”گولی نہ چلانا“ میں نے جلدی سے کہا۔ میرے خیال میں وہ لوگ بندھن توڑ کر ہمارے پاس  
بے آ رہے ہیں اور میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔

ان غلاموں نے ان چاقوؤں کا بڑا عمدہ استعمال کیا تھا۔ جنہیں ہمارے ساتھی ان کے پاس  
گئے تھے۔ یا بقول انہیں مستعار دے آئے تھے۔ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر غلاموں  
پہنچے اپنے بندھن کاٹ لئے تھے اور اب وہ پناہ لینے کیلئے ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے  
ب منظر تھا وہ اکثر غلاموں کی گردنوں میں اب بھی جوئے پڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں کو  
نے اتار پھینکنے کا وقت یا موقع شاید نہ ملا تھا اور ان کا تعاقب بردہ فروش کر رہے تھے۔ جو برابر  
چلا رہے تھے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ صورتحال نازک تھی۔ کیونکہ اگر غلام ایک  
ہمارے پڑاؤ میں گھس آئے تو ہم خود ان کے ریلے میں پھنس کر بردہ فروشوں کی گولیوں کا

بہر حال اس معاملے کا تو یہ ہے کہ خود مجھے بھی کچھ ہوسکتا تھا۔ ممکن تھا کہ ایک گھنٹے کے بعد  
ہم دونوں کی لاشیں یہاں پڑی ہوئی ہوں۔ کم از کم میں تو ان ظالم بردہ فروشوں کے ہاتھوں ا  
گرفتار ہونا نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ ڈیوڈ کی وہ بات مجھے یاد تھی کہ وہ یا تو ہمیں زندہ آگ میں جلا دے  
پھر کسی دیکوڑے سے ٹانگ کر ہمیں چیونٹیوں کی خوراک بنا دے گا۔

پانچ منٹ بعد ہی ہر شخص بیدار ہو چکا تھا۔ حالانکہ چند بار برداروں کو جگانے کیلئے ان  
پسیوں میں ٹھوکریں جمانی پڑی تھیں۔ وہ بے چارے موت کے قرب کے عادی تھے۔ چنانچہ سوا  
خیال ان کی نیند نہیں اڑا سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ وہ لوگ خوفزدہ تھے اور آپس  
چہ گوئیاں کر رہے تھے۔ اگر یہ لوگ غداری کا ثبوت دیں تو انہیں قتل کر دیتا۔ میں نے فوٹا سے کہا  
اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔

البتہ ہم نے صرف اس عورت اور اس کی بچی کو نہ جگایا جسے ہم نے بچایا تھا۔ وہ دونوں  
کے ایک سرے پر چھٹکن سے چور گہری نیند سو رہے تھے اور انہیں بیدار کر کے بے چین اور خوفزدہ کر  
نے کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کراں جو بہت گھبرایا ہوا اور بے چین معلوم ہوتا تھا۔ میرے اور لیوٹن کیلئے کافی لے کر آ  
جب اس نے کافی کے پیالے ہماری طرف بڑھائے تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے  
تھے۔

”آج سردی کا زور کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس نے اپنی خالص فصاحت و بلاغت کی حسب معمول  
نمائش کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اسے احساس تھا کہ اس کے ہاتھوں کی کچھلی میں نے دیکھ لی ہے۔

”جناب ہنس راج صاحب! آپ کیلئے تو زمین پر ٹاپ مارنا اور جنگ و جدل کے ہنگامے  
دور سے ہی سونگھ لینا ٹھیک ہے لیکن صاحب! میری پرورش چونکہ بالکل ہی الگ ماحول میں ہوئی ہے  
اس لئے میں ان ہنگاموں کا عادی نہیں ہوں۔ قسم ہے پاک پروردگار کی میں سوچ رہا ہوں کہ ا  
کاش اس وقت میں یہاں ہونے کے بجائے کیمپ میں ہوتا۔“

”کراں! جنگ شروع ہو گئی تو اس وقت تم کیا کروں گے۔“ لیوٹن نے پوچھا۔

”جناب لیوٹن صاحب!“ وہ بولا۔ ”گزشتہ شب بیداری کر کے اور چند گھنٹوں کی کرا  
مشقت کے بعد اس سامنے والے درخت کے قریب میں میں نے ایک کافی بڑا کھڈا کھود لیا ہے  
امید ہے کہ بندوق کی گولیاں درخت کے تنے کو چیر کر مجھ تاچہ تک نہ پہنچ پائیں گی میری طبیعت  
پسند ہے اور یہ جنگ و جدل کی بہ نسبت امن و سکون پسند کرتی ہے۔ چنانچہ میں اس کھڈ میں بیٹھ جاؤں

نے اب تک حملہ نہیں کیا تھا۔ یہ تو گویا ہماری طرف سے اعلان جنگ ہے۔ ”اور لیوشن“ کی دھوپ کی ٹوپی اس کے سر پر سے صاف اڑ گئی تو میں نے اضافہ کیا۔ ”یہ ہے۔ اس کا جواب جھک جاؤ سب کے سب اور بوما کے سوراخوں میں سے گولیاں چلاؤ۔“ اور پھر جنگ شروع ہو گئی۔



اس مہم کے بعد ایک دو جنگیں جو بعد میں ہمیں لڑنی پڑیں۔ یہ جنگ معمولی سی تھی، البتہ اس کا آخری حصہ بڑا ہی اہم اور شاندار تھا۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ اس جنگ کی ہمارے لئے امتیازی خصوصیت نہ تھی۔

ابتداء میں بردہ فروشوں نے پر جوش حملہ کیا اور دفعتاً ہمارے بوما کی طرف آئے۔ لیکن اس کوشش کے بعد انہوں نے دوبارہ ایسی جرأت نہ کی۔ حالانکہ ان لوگوں کو خود اپنی جانوں کی پروا نہ تھی۔ اسے اتفاق کہئے یا ہماری خوش قسمتی یا پھر لیوشن کی عمدہ نشانے بازی کہ اس نے پہلے ہی حملے میں دو بردہ فروشوں کو مار گرایا۔ خود میں نے بھی اپنی ہاتھی مار بندوق بردہ فروش کے گروہ پر خالی کر دی اور ہمارے ہولون شکاریوں میں سے چند ایک کے نشانے بے نتیجہ نہ رہے۔

اس کے بعد بردہ فروش بھاگ کر درختوں کی اوٹ میں چلے گئے اور جیسا مجھے خوف تھا۔ اکثر نرسوں کے جھنڈ میں جا چھپے اور وہاں سے ان لوگوں نے ہمیں حقیقت میں پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ان بردہ فروشوں میں سے چند واقعی عمدہ نشانے باز تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم نے احتیاطاً بوما کی بنیادوں میں چند فٹ بلند مٹی کا پشتہ سانا نہ بنالیا ہوتا تو پھر ہمارا جانی نقصان افسوسناک ہوتا۔ کسی بردہ فروش کی گولی اس سوراخ میں سے جو خود ہم نے اپنی بندوقوں کیلئے بوما میں بنائے تھے۔ گزر کر ایک ہولون شکاری کے گئی اور اس کا حلق چیر گئی۔ ادھر بدقسمت بار برداروں پر ایک مصیبت نازل ہوئی اور نسبتاً بلند جگہ پر تھے۔ چنانچہ ان میں سے دو تو بردہ فروشوں کی گولیاں کا نشانہ بن کر فوراً مر گئے اور چار زخمی ہوئے۔

اس کے بعد میں نے بار برداروں سے کہا کہ وہ بوما کے قریب آ جائیں اور منہ کے بل لیٹ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اب ہم ان لیٹے ہوئے بار برداروں کے اوپر سے گولیاں چلا سکتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ثابت ہو گیا کہ بردہ فروشوں کی تعداد ہماری توقع سے زیادہ تھی۔ کیونکہ کوئی پچاس بردہ فروش مختلف پناہ گاہوں سے ہمارے پڑاؤ پر گولیاں برس رہے تھے۔ اس کے علاوہ لوگ آہستہ آہستہ آگے بھی بڑھ رہے تھے اور ان کی یہ پیش قدمی ایک خاص مقصد کے تحت تھی۔ وہ کسی نہ

نشانہ بن جائیں گے۔

”نہیں۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ان دونوں آدمیوں کو جو گزشتہ رات تمہارے ساتھ تھے۔ جاؤ اور کوشش کر کے غلاموں کو ہمارے عقب میں لے آؤ۔ جلدی کرو ورنہ ہم اس بے تحاشہ ہما ہوئے ہجوم کے پیروں تلے پھنک کر چٹنی بن جائیں گے۔“

اور دوسرے ہی لمحے آگرس اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ غلاموں کی طرف بھاگ رہا اس عرصہ میں وہ غلام جو سب کے سب آگے تھے۔ دفعتاً رک گئے۔ انہیں ہماری بندوقوں کی ناظر آ گئی تھیں۔

”رحم کرو۔ ہمیں بچاؤ۔“ وہ چلائے۔

اور یہ واقعی ہماری خوش قسمتی تھی کہ غلام یوں رک گئے تھے۔ ورنہ آگرس اور اس کے دو ساتھیوں کی کوششیں انہیں شاید نہ روک سکتی تھیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا ایک سفید قمیض م بانس مڑ رہی تھی اور ہمارے بوما کا چکر کاٹ کر اس خطے کی طرف جا رہی تھی جو ہمارے پڑاؤ کے ا تھا اور جہاں گھاس اور جھاڑیاں اگ رہی تھیں اور اس سفید قمیض کے پیچھے غلاموں کی ایک قطار اس طرف جا رہی تھی۔ غلاموں کے نزدیک آگرس کی سفید قمیض آزادی کی علامت تھی۔ چنانچہ یوں ٹل گیا۔

چند غلاموں کو گولیاں لگ گئیں یا آزادی کی اس اندھا دھند دوڑ میں وہ روندے گئے تھے ان میں سے اب تک جو زندہ تھے ان پر بردہ فروش گولیاں چلا رہے تھے۔ ایک عورت جو زنی جو کا بوجھ نہ سہار کر گر پڑی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کے بل رینگ رہی تھی۔ ایک بردہ فروش نے ار گولی چلا دی جو عورت کے پیٹ کے عین نیچے زمین میں پھوست ہو گئی۔ گولی عورت کے نہ لگی قم چنانچہ اب وہ تیزی سے رینگنے لگی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ وہی بردہ فروش اس عورت پر پھر دوبارہ گولی ضرور چلائے گا۔ میں خطر روٹنی اب کافی پھیل چکی تھی۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ایک لمبا ترنگ دشمن کا آدمی درخت کے ا سے نکل آیا اور بندوق اٹھا کر رینگتی عورت کا نشانہ لینے لگا۔ وہ شخص مجھ سے ڈیڑھ سو گز دور تھا اور وقت میری بندوق نے گرج کر گولی اگل دی اور وہ شخص ایک دوفٹ تک ہوا میں اچھلا اور پھر الٹ گرا۔ میری بندوق کی گولی اس کی کھوپڑی اڑا لے گئی تھی۔

ہمارے ہولون شکاری چلائے۔ ”او۔“ اور لیوشن نے کہا۔ ”خدا کی قسم کیا نشانہ تھا؟“

”ہاں برا نہ تھا۔ لیکن مجھے گولی نہیں چلانی چاہئے تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیونکہ ان لوگو

لیئے تیار ہو گیا تھا۔ کیونکہ نہ چاہتا تھا کہ میں اور خصوصاً لمبوشن غلام بردہ فروشوں کے ہاتھوں میں پڑاؤں۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے اور سے ہی میرا دل لرز رہا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ اس فیصلہ پر عمل کرتا دفعتاً آگس اپنی سفید قمیض تار ہوا نمودار ہوا اس کے پیچھے ننگ دھڑنگ لوگوں کا گروہ تھا۔ یہ وہی مغرور غلام تھے جو جوئے لے لے اور پتھر اور درختوں کے ٹپنے ہلاتے بھاگے آرہے تھے۔ تو وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں یہ بتا دوں کہ غلام تعداد میں تقریباً دو سو تھے۔ ایک گروہ تو ہمارے بائیں طرف سے نکلا چلا اور اس گروہ کی کمان وہ ہولون کر رہا تھا۔ جسے میں نے گزشتہ رات آگس کے ساتھ دشمن کے ڈ میں بھیجا تھا اور آج صبح بھی وہ بھاگ کر آتے ہوئے غلاموں کی طرف گیا تھا اور اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا۔ دوسرا گروہ ہمارے دائیں طرف سے نکلا چلا گیا اور اس گروہ کے آگے خود آگس

مجھ پر کچھ ایسی حیرت ہوئی کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا! البتہ میں نے سوالیہ نظروں فونا کی طرف دیکھا۔

”ہنس راج!“ وہ بولا۔ ”تمہارا وہ چلتیوں والا سانپ اپنے طور پر عقیم اور ہوشیار ہے کہ اس غلاموں کے دلوں میں بھی ہمت اور جوش پیدا کر دیا۔ اتنی سی بات نہیں سمجھے بابا کہ وہ لوگ بردہ ہاں پر حملہ کر کے انہیں بچھاڑ دینے والے ہیں جس طرح کہ شکاری کتے حملہ کر کے دُخی بھینسے کو مارا ہیں۔“

فونا نے یہ غلط نہ کہا تھا۔ بیشک یہ آگس کا منصوبہ تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ کامیاب ٹیلے پر سے وہ جنگ دیکھ رہا تھا اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ چنانچہ نے مترجم کے ذریعے جو اس کے ساتھ تھا۔ غلاموں کے سامنے ایک دھواں دھار تقریر کی اور کہا اُ جو غلاموں کے دوست تھے شکست کھانے والے تھے۔ چنانچہ اس نے کہا۔ اب یا تو وہ یعنی اپنی آزادی کی خاطر بردہ فروشوں پر حملہ کر دیں یا پھر غلامی کا جو اپنی گردنوں میں ڈال لیں۔ میں چند لوگ ایسے تھے جو اپنے قبائل کے سپاہی رہے تھے اور ان کے ذریعہ آگس نے بقیہ کو جوش دلایا نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں نے وہ جوئے جن سے ان کی گردنیں آزاد ہوئی تھیں۔ کے ٹپنے پتھر اور وہ چیز اٹھالی جو ان کے ہاتھ آگئی اور عورتوں اور بچوں کو وہیں چھوڑ کر بردہ پر یلغار کر دی۔

انہیں یوں بھاگ کر آتے دیکھا تو بکھرے ہوئے بردہ فروشوں نے ان پر گولیاں چلائیں اور

کسی طرح ہمارے پہلو کی طرف سے گزر کر اس بلند مقام تک پہنچ جانا چاہتے تھے جو ہمارے پڑاؤ کے عین پیچھے تھا۔ ان پیش قدمی کرنے والوں میں سے چند کو ہم نے بھون دیا۔ جب وہ ایک سے دوسری طرف پناہ گاہ میں بھاگ کر جاتے تو ہماری بندوقوں کی گولیاں ان کا نام ضرور پوچھ لیتی تھیں۔

ایک ہی گھنٹے بعد صورتحال نازک ہو گئی اس قدر نازک کہ یہ سوچنا اور فیصلہ کرنا ضروری ہو گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ ہمارے پاس آدی زیادہ نہ تھے۔ اس کے علاوہ دشمن کے آدی نہ صرف بکھرے ہوئے تھے بلکہ ہمیں گھیرے میں لے رہے تھے۔ چنانچہ بوما سے نکل کر اس بکھرے ہوئے دشمن پر حملہ کرنا ایک حد تک ممکن تو تھا۔ لیکن اس کی صورت میں ہمیں جو جانی نقصان برداشت کرنا پڑتا وہ ظاہر تھا۔ اس کے برخلاف اگر ہم بوما میں ہی بیٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرتے تو پھر یہ بات بھی ظاہر تھی کہ ہم شام تک بوما کو بچا نہ سکتے تھے۔ بردہ فروش اگر پڑاؤ کے عقب میں بلند مقام پر پہنچ گئے تو پھر وہاں سے اور ہماری پشت کی طرف سے ہم پر گولیاں کی بوچھاڑ کر سکتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ پچھلے آدھے گھنٹے سے ہماری کوشش یہی تھی کہ دشمن کو بوما کے قریب سے گزرنے نہ دیں اور ہماری یہ کوشش اب تک توبار آور تو ثابت ہوئی تھی۔

خصوصاً اس لئے کہ بوما کے ایک طرف چشمہ تھا اور دوسری طرف کھلا میدان دشمن کے اس میدان یا چشمے کو عبور کرتے وقت ہم دشمن کی بہت سی لاشیں گرا سکتے تھے۔ ہم مشورہ کر رہے تھے کہ دشمن کی بندوقیں خاموش ہو گئیں۔ شاید وہ بندوقیں بھر رہے تھے یا یہ بات تھی کہ ان کے پاس کارٹوس ختم ہو گئے تھے اور وہ منتہر تھے کہ ان کے پڑاؤ میں سے کارٹوس آجائیں تو پھر وہ نئے سرے سے نئے حملے کریں۔

”میرے خیال میں تو اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔“ اس عارضی جنگ بندی کے دوران میں نے کہا۔ اور یہ کہ ہم نہ صرف پڑاؤ۔ بلکہ ہر چیز کو چھوڑ کر ٹیلے کی طرف بھاگ لیں بردہ فروش تھکے ہوئے ہوں گے اور ہم سب کے سب تیز بھاگنے والے ہیں۔ اسی صورت میں ہم اپنی زندگی بچا سکتے ہیں۔“ میں نے فونا کو طلب کر کے اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس سے مشورہ طلب کیا۔

”ہنس راج! ہمیں بھاگ جانا چاہئے۔“ وہ بولا۔ ”حالانکہ مجھے بھاگنا پسند نہیں کیونکہ اس طرح ہماری زندگیاں طویل ہو جائیں گی اور جو جتنا زیادہ جئے گا اتنے ہی زیادہ اسے دکھ برداشت کرنے ہوں گے تاہم میں کہتا ہوں کہ بھاگو۔“

میں بڑی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اعتراف کر رہا ہوں کہ میں فونا کا یہ مشورہ قبول کرنے



بھی جب وہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اس نے ہوا کا رخ دیکھ لیا تھا اور جان لیا تھا کہ جنگ کا خاتمہ کس کے حق میں ہوگا۔

”ہاں۔ ہاں! تمہارے اسی بوڑھے آگرس نے دیکھا تھا کہ وہ مردہ فروش کتے جتنے پرہل بنانے کیلئے ایک درخت کاٹ رہے تھے کہ اسے گہرے جتنے پر رکھ کر اسے عبور کر جائیں اور پھر بوما کا چکر کاٹ کر اس کے پیچھے ٹیلے پر پہنچ جائیں اور پھر وہ وہاں سے گولیاں برسا کر صرف پانچ منٹ میں تمہیں اس دنیا میں پہنچا دیں جہاں زبردست آگ جلتی ہے اور ہاں! اب میرے پیٹ میں سے عجیب عجیب آوازیں اٹھ رہی ہیں کیونکہ وہاں جھاڑیوں میں ناشتے کیلئے کچھ نہ تھا اور سورج میں بڑی گرمی ہے۔“

چنانچہ اب اگر ایک گھنٹہ براہِ ٹی مل جائے تو کیا حرج ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ لیکن چونکہ براہِ ٹی تم خود مجھے دو گئے اس لئے گناہ تمہارے سر ہوگا۔ میرے نہیں۔“

واقعی اس نے کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں نے براہِ ٹی کا ایک پیگ اسے دیا اور وہ اسے خالص ہی چڑھا گیا۔ بعد میں میں نے بوتل صندوق میں بند کر دی اور نقل لگا دیا۔ اس کے علاوہ میں نے اس سے معاوضہ کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جس پر اس نے کہا کہ شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اگر وہ غلاموں کو ساتھ لے کر مردہ فروشوں پر حملہ نہ کرتا تو میں مارا جاتا اور جب میں مارا جاتا تو خود آگرس بھی زندہ نہ رہتا۔ چنانچہ جو کچھ میں نے کیا تھا وہ میرے لئے تھا۔ میں بلکہ خود اپنی جان بچانے کی غرض سے کیا تھا اور پھر دو موٹے موٹے آنسو اس کی گومڑی ناک کے دائیں بائیں بہنے لگے۔

بہر حال ہم فاتح تھے اور خوش تھے۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ وہ مردہ فروش جو فرار ہو گئے تھے دوبارہ ہم پر حملہ آور نہ ہوں۔ سب سے پہلا احساس ہمیں بھوک کا ہوا کیونکہ دوپہر ہو چکی تھی اور ہم نے اب تک کچھ نہ کھایا تھا۔ لیکن کھانا تیار کرنے کیلئے باورچی کی ضرورت تھی اور باورچی کا خیال آتے ہی ہمیں کراں یاد آ گیا۔ لیہوش جو خوشی سے حقیقت میں ناچ رہا تھا اور وہ ہیٹ بڑی شان سے اپنے سر پر رکھے ہوئے تھا۔ جس میں بندوق کی گولی کا یہ بڑا سوراخ تھا۔ کراں کی تلاش میں چلا اور کچھ ہی دیر بعد اس نے خوفزدہ لہجے میں مجھے آواز دی۔ میں دوڑ کر لیہوش کے قریب پہنچا۔ وہاں ایک درخت کی جڑ میں تیر نما کھڈ تھا اور اس کھڈ میں ایک شخص گھڑی بنا پڑا تھا۔ یہ کراں تھا۔ ہم نے اسے پکڑ کر باہر نکالا وہ نیم بے ہوش تھا۔

اس کے اعضاء اٹھ سے گئے تھے۔ لیکن وہ اب بھی اپنے سینے سے موٹی جلد والی کتاب مقدس

چند کو مار گرایا، لیکن ان کی بندوقیں چلانے سے غلاموں کو پتا چل گیا کہ مردہ فروش کس طرف اور کہاں چھپے ہوئے تھے۔ وہ مردہ فروشوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے مردہ فروشوں کے پرچے اڑا دیے۔ ان کی کھوپڑیاں توڑ دیں۔ غلاموں کا یہ حملہ ایسا سخت تھا کہ پانچ ہی منٹ کے اندر اندر دو تہائی مردہ فروش مارے جا چکے تھے اور باقی بدحواس ہو کر بھاگ رہے تھے اور ان مفردوں میں سے بھی کئی ایک کو انے مار گرایا۔ انتقام خوفناک تھا۔

پہلے کبھی میں نے کسی کو ایسا لرزہ خیز انتقام لیتے نہیں دیکھا جیسا کہ یہ غلام مردہ فروشوں سے لے رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بہت سے مردہ فروش مارے گئے اور صرف چند اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے تو صرف ایک مردہ فروش میدان جنگ میں باقی رہ گیا۔ وہ خشک نرسوں کے ایک جھنڈ میں چھپ گیا اور غالباً وہ مردہ فروشوں کے گردہ کا سردار تھا۔ غلاموں کو اس کا پتا چل گیا اور انہوں نے ط جانے کس طرح نرسوں میں آگ لگا دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی آگرس کا ہی کارنامہ تھا۔

خشک نرسوں نے ایک دم سے آگ پکڑ لی اور تھوڑی دیر بعد ہی ان میں چھپا ہوا مردہ فروش گھبرا کر باہر نکل آیا۔ غلام اس پر یوں ٹوٹ پڑے جس طرح حیوٹیاں تل چنے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مردہ فروش معافی مانگتا اور رحم رحم چلاتا رہا لیکن پھر اسے ہوئے غلاموں نے اس کے گلے اڑا دیے اور اس میں انہیں الزام نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ بہر حال وحشی ہی تھے اور پھر ستائے ہوئے تھے۔ اگر ہمارے سامنے ہمارے والدین کو قتل کر دیا جائے۔ ہمارے گھروں کو آگ لگا دی جائے۔ ہمارا عورتوں اور بچوں کو کشاں کشاں غلاموں کی منڈی کی طرف لے جایا جائے تو کیا ہم بھی غلاموں سے ایسا ہی انتقام نہ لیں گے؟ بے شک لیں گے! حالانکہ ہم وحشی نہیں ہیں۔“

چنانچہ اس طرح ہماری زندگی ان لوگوں نے بچائی جن کی زندگی بچانے کی کوشش خود ہم نے کی تھی اور اس طرح اس تاریک براعظم میں بھی یہ قول سچ ثابت ہوا کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ سے اگر ہمارے پاس آگرس نہ ہوتا، اگر اس نے غلاموں کو جوش نہ دلایا ہوتا تو رات کا یہ اندھیرا اترے سے پہلے مردہ خور گلدھ اور درندے ہماری لاشوں پر قیامت اڑا رہے ہوتے۔

”ہاں!“ بعد میں آگرس نے اپنی چندی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب کا کہنا کہ مجھے اپنے ساتھ لا کر تم نے ٹھنڈی کی ہے یا نہیں۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہ لاتے تو کیا ہوتا۔ اس وقت؟ بے شک بوڑھا آگرس شرابی ہے بلکہ تھا بوڑھا آگرس جواری ہے اور شاید بوڑھا آگرس مرنے کے بعد کھڈ میں جائے گا۔ جس میں بہت بڑی آگ جلتی ہے۔ لیکن ہاں! بوڑھا آگرس ہوا! رخ دیکھ اور پہچان سکتا ہے۔ اس نے پہلے بھی ہوا کا رخ دیکھا تھا اور تمہیں صحیح مشورہ دیا تھا اور آزا

بچنے ہوئے تھا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ کتاب مقدس کی جلد میں بندوق کا سوراخ تھا۔ گولی جلد کو چھیدتی ہوئی کتاب مقدس کے صفحات میں دفن ہو گئی تھی۔

رہا کراںل تو اسے خراش تک نہ آئی تھی۔ چنانچہ جب ہم نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے تو اسے فوراً ہی ہوش آ گیا اور پھر خود اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ ہوا تھا۔ ”صاحبو“ اس نے کہا۔ ”میں اپنی پناہ گاہ میں بیٹھا تھا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں صلح پسند انسان ہوں اور خون خرابوں اور ہنگاموں سے طبیعت بولا تی ہے۔ خیر تو میں وہاں بیٹھا دعاؤں کے ذریعے روحانی سکون حاصل کر رہا تھا۔ (ایسے موقع پر کراںل کٹر مذہبی انسان بن جاتا تھا) کہ میں نے سنا کہ بندوق اب زیادہ نہ بڑھا رہی تھیں بلکہ تقریباً خاموش تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید دشمن فرار ہو گیا ہے۔

چنانچہ میں کتاب مقدس کو اپنے چہرے کے سامنے کر کے اپنا سر آہستہ آہستہ کھڈ کے کنارے سے باہر ابھارا کہ جھانک کر دیکھو کہ جنگ کی ترازو کا پلڑا کس طرح جھکا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا میں نہیں جانتا۔“

”ظاہر ہے کہ نہیں جان سکتے۔“ لیوٹن نے کہا۔ ”کیونکہ بندوق کی گولی کتاب کے لگی اور خود کتاب تمہارے سر پر لگی اور تم بے ہوش ہو گئے۔“ اور یہ حقیقت ہے کہ کراںل کی جان واقعی حیرت انگیز اتفاق سے بچ گئی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے گویا مجلس مشاورت طلب کر لی۔ ہم مسئلہ غلاموں کا تھا کہ اب ان کا کیا کیا جائے۔ غلام بوما سے باہر پالتی مارے بیٹھے تھے اور عجیب نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر کے بشروں سے حالیہ جنگ کی جھمکن کے آثار ہویدا تھے اور پھر دفعتاً وہ ایک آواز ہو کر کھانے طلب کرنے لگے۔

”اب اتنے سارے آدمیوں کے کھانے کا انتظام کہاں سے کیا جائے؟“ لیوٹن نے کہا۔ ”برہہ فروشوں نے انتظام کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ ان غلاموں کو کچھ نہ کچھ تو کھلاتے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”آؤ ان کے پڑاؤ کی تلاشی لیں۔“

چنانچہ ہم ان کے پڑاؤ کی طرف چلے۔ ہمارے پیچھے بھوکے غلاموں کا گروہ چلا اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ برہہ فروشوں کے پڑاؤ میں سے ہمیں اور بہت سی چیزوں کے علاوہ چاول، مکئی اور دوسری قسم کے غلے کا کافی ذخیرہ مل گیا۔ اس میں سے کافی حصہ ہم سے نمک کے ساتھ غلاموں کو دے دیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چلوں پر ہنڈیاں چڑھی ہوئی تھیں اور کھانا پک رہا تھا اور جب کھانا تیار ہو گیا

تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ لوگ کس طرح اس پر ٹوٹ پڑے میں سمجھتا ہوں کئی ہفتوں بعد آج پہلی دفعہ انہیں پیٹ بھر کر غذا ملی تھی۔ جب وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو میں نے کھڑے ہو کر ان کی بہادری کی تعریف کی، ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ آزاد ہیں اور پوچھا کہ اب وہ کیا کرنا اور کہاں جانا چاہتے ہیں اور میری اس بات کا ان سب کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ یعنی انہوں نے کہا کہ ہم ان کے نجات دہندہ تھے چنانچہ وہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔

اس کے بعد ایک طویل اور عظیم الشان ”انڈیا“ ہوا۔ اس کی تفصیلات درج کرنے کا نہ وقت ہے نہ اس کی ضرورت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس بات پر رضامند ہو گئے۔ ان میں سے صرف وہی لوگ جو ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہیں ہمارے ساتھ چلیں اور جب وہ ان راستوں کے علاقے میں پہنچ جائیں جس کے راستوں سے وہ واقف تھے تو پھر وہاں سے الگ ہو کر اپنے اپنے قبائل اور گھروں کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد برہہ فروشوں کے پڑاؤ سے حاصل کئے ہوئے کھل اور تھوڑا سا ضروری سامان ان لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا اور غلے کے ذخیرے پر چند سنتری مقرر کرنے کے بعد ان غلاموں کو بلکہ یوں کہنے کے آزاد شدہ غلاموں کو خود ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو یہ ی دعا مانگ رہا تھا کہ جب ہم دوسری صبح بیدار ہوں تو وہ لوگ جا چکے ہوں۔ اس کے بعد ہم بوما پہنچے۔ وہاں ہمارے اس ہولون فکاری کے دفن کی غمناک رسم ادا کی جا رہی تھی جس کے سر گولی لگی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے بوما کے قدموں میں جہاں وہ گرا تھا اس سے چند گز دور قبر کھود دی تھی۔ اس قبر میں ہولون کی لاش کو اس طرح بٹھا دیا گیا کہ اس کا منہ ہولون لینڈ کی طرف رہے۔ مرنے والے کے سر کو دو برتن تھے۔ ایک برتن میں پانی بھر کر اس کے دائیں طرف اور دوسرے میں مکئی بھر کر قبر میں رکھ دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کے کھل کے دو ٹکڑے کر کے لاش کے ساتھ قبر میں رکھ دیئے گئے۔ بل کو پھاڑ کر اور بھالے کو توڑ کر انہوں نے بقول ان کے ان دونوں چیزوں کو بھی ماری دیا تھا۔ اس کے روہ بڑی خاموشی سے قبر میں مٹی ڈالنے لگے اور قبر کے دہانے پر بڑے بڑے پتھر رکھ دیئے کہ لکڑی لے کر قبر کھود کر لاش نہ نکال سکیں۔

قبر بند کر دی گئی تو پھر باری باری سے ایک ایک آدمی قریب سے گزرتا اور مرنے والے کا نام بکرا سے الوداع کہتا سب سے آخر میں فونا آیا۔ اس نے قبر کے سامنے کھڑے ہو کر ایک مختصر سی بریکی اور مرنے والے سے کہا کہ نامبا کا چلے۔ ”یعنی روجوں کی دنیا میں اطمینان سکون اور آسانی چلا جائے۔“ فونا نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ بہادری کی موت مرا تھا۔ اس کے علاوہ فونا مرنے والے سے درخواست کی کہ اگر وہ روح بن کر واپس کر آئے تو فونا نے اسے دھمکی دی کہ

اس کے بعد کے ایک مہینے کے سفر کے واقعات کی تفصیلات بیان کرنا اگر ناممکن نہیں تو وقت ضرور ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کی غذا کا انتظام کرنا ایک اہم مسئلہ بنا ہوا تھا۔ کیونکہ چاول اور وہ ذخیرہ جو ہم نے بردہ فروشوں کے پڑاؤ میں سے حاصل کیا تھا۔ یہ لوگ جلد ہی ہضم کر گئے و ش قسمتی سے یہ موسم بہاراں کا اختتام تھا۔ چنانچہ جس علاقے سے ہم گزر رہے تھے وہ شکار تھا۔

اس لئے اس سفر کے دوران اور ہماری رفتار ظاہر ہے کہ سست تھی ہم نے آزاد شدہ غلاموں کا ہار کے گوشت سے بھر اور چونکہ اس مقصد کیلئے مجھے بہت زیادہ شکار کرنا پڑا تھا۔ اس لئے یہ چیز کے بجائے ضرورت بن گئی اور رفتہ رفتہ میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگے اور اس کیلئے کار توں اور بارود خرچ ہوتے تھے۔ اس کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ آہستہ آہستہ ہمارے شکاریوں نے دبی زبان میں اس کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا۔ وجہ اس کی یہ تھی چونکہ میں ان پڑاؤ میں ہی انتظامات میں لگے ہوئے رہتے تھے۔ اس لئے غلاموں کی غذا کے انتظام کی ی ہولون شکاریوں پر آ پڑی تھی۔ یہ ایک نیا مسئلہ تھا لیکن خوش قسمتی سے مجھے جلد ہی ایک تجویز

میں نے غلاموں میں سے تیس چالیس قابل اعتماد اور نسبتاً ذہین آدمیوں کو منتخب کر کے انہیں اکا استعمال سکھایا۔ پھر بردہ فروشوں کی بندوقوں میں سے ایک بندوق اور کار توں کا مناسب میں دے کر کہا کہ اب وہ خود اپنی غذا کا انتظام کر لیں۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چند ہوئے۔ مثلاً ایک بندوق شکار حاصل کرنے کی کوشش میں غلطی سے خود اپنے ساتھی کو گولی مار دوسرے تین کا خاتمہ ایک بھری ہوئی ہتھی اور ایک ڈھی بھینسے نے کر دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک سے چلانا سیکھ گئے اور اب اس قابل تھے کہ پورے پڑاؤ کیلئے شکار مار لاتے تھے۔ اس ہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے رہے غلاموں کے چھوٹے چھوٹے گروہ ہم سے رخصت ہو کر چلے

خود فونا روح بن کر اس سے مقابلہ کرے گا۔ آخر میں وہ بولا کہ کرشن میں فونا کا سانپ اسے مرنے والے کی موت سے آگاہ کر چکا تھا اور خود فونا اس کی پیش گوئی کر چکا تھا اور اب مرنے والے کو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ فونا نے یعنی نے جھوٹی پیش گوئی نہ کی تھی۔

چنانچہ فونا نے اس پیش گوئی کے عوض مرنے والے سے فیس ایک شلنگ وصول کی تھی اور وہ حرام کی کمائی نہ تھی۔

ہاں۔ ہولون شکاریوں میں سے ایک بولا۔ لیکن فونا! تم نے تو کہا تھا کہ ہم میں سے چھ آدمی مارے جائیں گے۔

بے شک یہ ہی کہا تھا۔ میرے سانپ نے ”فونا نے چنگی بھرنسوار اپنے اس نتھنے میں چڑھاتے ہوئے کہا۔ جو کٹا ہوا نہ تھا اور ہمارا یہ بھائی ان چھ مرنے والوں میں سے پہلا ہے۔ فکر نہ کرو۔ بقیہ پانچ بھی وقت آنے پر اس سے جا ملیں گے۔ کیونکہ میرا سانپ جھوٹ نہیں بولتا۔ لیکن اگر کسی کو دوسری دنیا میں پہنچنے کی جلدی ہو اور اس نے دائرہ بنا کر کھڑے ہوئے ہولون کی طرف دیکھا تو پھر اسے چاہئے کہ مجھ سے اکیلے میں گفتگو کرے شاید میں انتظام کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ اس کی باری۔“

وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ حالانکہ ہولون خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔

دوسری صبح جب ہم روانہ ہوئے تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ روائگی میں جو یہ تاخیر ہوئی تھی۔ وہ بلا وجہ نہ ہوئی تھی۔ ہمیں بہت کچھ کرنا تھا۔ بردہ فروشوں کی بندقیں اور بارود اکٹھی کرنی تھیں۔ وہ لوگ ہاتھ دانت کا کافی ذخیرہ چھوڑ گئے تھے اور چونکہ اس ہاتھی دانت کو ہم اپنے ساتھ نہ لے جاسکتے تھے۔ اس لئے اسے وہیں دفن کرنا تھا اور سامان الگ الگ گٹھر باندھ کر اور بکس اٹھانے کیلئے آدمیوں میں تقسیم کرنے تھے۔ اس کیلئے زبیں کیلئے اسٹرپر بنانے تھے۔ ادھر غلام عورتوں کے ساتھ عیاشیوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ انہیں ان عیاشیوں اور مردہ بردہ فروشوں کا گوشت کھانے سے باز رکھنا تھا۔

میں نے غلاموں کو شمار کیا تو معلوم ہوا کہ زیادہ تر لوگ رات کے وقت بھاگ گئے تھے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئے تھے۔ اس کے باوجود کوئی سوکا گردہ جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے باقی رہ گئے تھے اور ان کا ارادہ معلوم یہ ہی ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی چلیں گے۔ چنانچہ اس گردہ کو اپنے جلو میں لے کر آخر کار ہم روانہ ہو گئے۔

تو شروع ہی سے اپنی ڈور خدا کے اور مقدر کے ہاتھ میں دے دی تھی اور تقریباً ہونی سے ہمیشہ پروا رہا ہوں اور ”مستقبل“ کے متعلق زیادہ غور نہیں کیا۔

”میں نے کہا ناں۔ ہونی ہو کر رہتی ہے اور مستقبل کے بطن میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے لئے آ جاتا ہے اور کل کو ہمارے لئے جو بھلا براتھ لانا ہوتا ہے، لے آتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ایسا ہی ہوا اور کل ہمارے لئے کچھ لے آئی۔

دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے آرمس نے جو وفادار کتے کی طرح شاید راتوں کو سوتا نہ تھا مجھے لے ہوئے چھوڑا۔ اور جب میں نے آنکھیں کھول دیں تو اس نے مجھے یہ لرزہ خیز اطلاع دی کہ نے وہ آواز سنی ہے جو مارچ کرتے ہوئے سینکڑوں آدمیوں کے قدموں کی چاپ سے پیدا ہوتی

میں نے غور سے سنا۔ کوئی آواز سنائی نہ دی۔ اندھیرا گہرا تھا۔ چنانچہ کچھ نظر آنے کا سوال ہی نہ ہوتا تھا۔

”کہاں.....؟“ میں نے عاجز آ کر پوچھا۔

آرمس نے زمین سے اپنا کان لگا دیا اور کہا۔ ”یہاں۔“

میں نے بھی اپنا کان زمین سے لگا دیا۔ لیکن میں کوئی آواز نہ سن سکا اور حالانکہ میری قوت تیز تھی لیکن میں کوئی آواز نہ سن سکا۔ پھر میں نے سنتریوں کو بلا بھیجا، لیکن وہ بھی کچھ نہ سن۔ چنانچہ میں نے آرمس کو برا بھلا کہا کہ اس نے میری نیند خراب کی تھی اور پھر سو گیا۔

بہر حال جلد ہی ثابت ہو گیا کہ آرمس نے غلط نہیں کہا تھا۔ ایسے معاملات میں عموماً وہ جو کچھ کہتا ثابت ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کی حس جنگلی جانوروں کی طرح تیز تھی۔

علی الصبح مجھے پھر جگا دیا گیا اور اس دفعہ مجھے جگانے والا فون تھا۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ ہمیں نے گھیر لیا ہے۔ میں اٹھ بیٹھا اور میں نے دھند کی چادر میں سے جھانک کر دیکھا۔ فونانے غلط نا۔ ہمارے پڑاؤ سے ذرا فاصلے پر بہت سے لوگ صف در صف بتوں کی طرح خاموش اور بے اکڑے تھے اور پھر وہ لوگ مسلح تھے۔ کیونکہ ان کے بالوں کے ہل اندھی روشنی میں چمک رہے

”اب کیا کیا جائے۔ ہنس راج! فونانے پوچھا۔

”میرے خیال میں ناشتہ کیا جائے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر ہمارا آخری وقت آ ہی گیا ہے ہوگا کہ ہم خالی پیٹ لے کر دوسری دنیا میں نہ جائیں۔“

جاتے تھے۔ شاید اپنے قبائل اور گھروں کی تلاش میں۔ چنانچہ طویل سفر کے بعد ہم ہولون لوگوں سرحد میں داخل ہوئے تو ان آزاد شدہ علاقوں میں سے صرف پچاس ہمارے ساتھ رہ گئے تھے اور میں چودہ وہ تھے جنہیں ہم نے بددوق کا استعمال سکھایا تھا۔

ہولون علاقے کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد تین دنوں کا سفر بڑا آزمائشی رہا۔ کیونکہ ہٹا گھنا تھا اور راستہ دشوار گزار ایک دن ایک شیر آزاد شدہ غلاموں میں سے ایک عورت کو اٹھالے پھر ایک گدھے کو مار گیا اور دوسرے کو اس بری طرح زخمی کر گیا کہ ہم نے مجبوراً اس دوسرے گدھے گولی ماری۔ آخر کار ہم اس جنگل سے گزر کر ایک سطح مرتفع پر نکل آئے جو کافی وسیع و عریض تھی پوری پوری گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔

اور میرے اندازے کے مطابق سطح سمندر سے ایک ہزار چھ سو چالیس فٹ بلند تھی۔ یہ.....

”کیا جگہ ہے۔ یہ؟“ میں نے ان دو ہولون باشندوں سے پوچھا۔ جنہیں ہم نے ڈھپا

حاصل کیا تھا اور جو ہمارے راہبروں کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ اس ہمارے گھر ہیں۔“ وہ پر جوش لہجے میں بول اٹھے۔ میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی ویران بلندیوں دیکھا جو آگے جا کر نیچے اترتی نظر آتی تھیں اس زبردست میدان میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سوائے گا کے ریوڑوں کے بڑا ہی بے کیف اور اداس سا منظر تھا۔ کیونکہ ہلکی ہلکی بارش گر رہی تھی اور ساتھ دھند اتر رہی تھی اور سرد ہوا سرسرا رہی تھی۔

مجھے نہ تو تمہارے لوگ نظر آ رہے ہیں اور نہ ان کے گھر۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کچھ نظر آ رہا

تو گھاس اور چھیتل۔“

”ہمارے لوگ آئیں گے سردار“ انہوں نے جواب دیا۔ وہ دونوں کچھ بے چین اور غما دکھائی دیتے تھے۔ یقیناً ان کے جاسوس اب بھی لائی لائی گھاس میں سے کسی کھڈ سے ہمیں رہے ہوں گے۔“

”تو دیکھنے دو۔ کچھوں کو۔“ میں نے کہا شاید ایسے ہی کچھ الفاظ کہے تھے۔

اور پھر ان دیکھنے والوں کی طرف سے بے پروا ہو گیا اور اس کے متعلق کچھ نہ سوچا کہ زندگی آوارہ گردی میں گزر رہی ہے اور میرا شروع سے ”جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ کا دانا اصول رہا اور جب کوئی شخص اس اصول کو اپناتا ہے تو یہ سوال اسے پریشان نہیں کرتا کہ ”کیا ہوگا۔“ یہ ہی میرا بھی تھا۔ اس کے علاوہ میں کسی قدر قناعت و قدر پر یقین رکھتا ہوں۔ اور یہ میرا ایمان ہے کہ ہر مقدر میں لکھ چکا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ خواہ ہم کتنی ہی احتیاطی تدابیریں کیوں نہ کریں۔ چنانچہ

لوگوں نے جواب پنے یا دوسرے قبائل میں پہنچ گئے تھے تجربات بڑے دلچسپ رہے ہوں گے اور یہ کارنامے روایت بن کر دو تین نسلوں تک بیان کئے جاتے رہیں گے۔ چنانچہ آزاد شدہ اور ان بار برداروں کو جو ہم نے ڈیوڈ سے حاصل کئے تھے نفی کرنے کے بعد ہم کل سترہ آدمی تھے۔ فوناسمیت گیارہ شلو شکاری میں اور لیوشن آگس اور کراٹ اور وہ دو ہولون جنہوں نے ساتھ رہنا پسند کیا تھا اور ہمارے پڑاؤ کے گرد بے شمار وحشی تھے۔ جو دم بدم اپنا دائرہ تنگ کر تھے۔

آہستہ آہستہ صبح کی روشنی بڑھی اور دھند چھٹ گئی اور اب میں ان لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ یہ انہوں نے ہمارے پڑاؤ کو گھیرے میں لے رکھا تھا قد و قامت میں شولوں سے زیادہ بلند تھے۔ سہ چھیرے اور ان کا رنگ بھی ہلکا تھا۔ شولوں کی طرح ان کے ہاتھ میں بڑی چرمی ڈھال اور بے میں چوڑے پھل والا بھالا تھا۔ پینک کر مارے جانے والے بھالے ”اسگائی“ ان کے تھے۔ ممکن ہے ان کا رواج نہ ہو۔ ان کے بجائے ان وحشی سپاہیوں کے پاس چھوٹی چھوٹی تھیں جو ترکشوں کے ساتھ ان کی پیٹھ پر پڑی ہوئی تھیں۔

وہ لوگ آہستہ آہستہ اور حیرت انگیز خاموشی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر شخص خاموش تھا اور ہم دیئے گئے تھے تو بھینا اشاروں میں دیئے گئے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لیکن کسی کے بھی دوی ہتھیار نظر نہیں آئے۔

”اب“ میں نے لیوشن سے کہا۔ ”اگر ہم نے بندوق سے ان میں سے چند کو مار گرایا تو یہ نژدہ ہو کر بھاگ جائیں گے یا شاید نہ بھی بھاگیں اور اگر بھاگ گئے تو شاید پھر آئیں گے۔“ وہ بھاگ جائیں یا رکے رہیں ہنس راج! لیوشن نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”البتہ یہ دگا اس کے بعد کہ وہ اپنے علاقے میں ہماری موجودگی پسند نہ کریں گے۔ خوش آمدید کہنا تو کی بات ہے چنانچہ میرے خیال میں تو ہم اس وقت تک کچھ نہ کریں۔ جب تک مجبور نہ ہوں اور بندوق چلانے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ رہ جائے۔“

”میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ یہ تو بہر حال صاف بات تھی کہ ہم سترہ آدمی سینکڑوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر میں نے کراٹ سے ناشتہ لانے کو کہا۔ وہ غریب خوف سے نیلا ہو کر اس کا یہ خوف بے بنیاد بھی نہ تھا۔ اول تو اس لئے کہ خطرہ حقیقت میں زبردست تھا اور دوم یہ کہ یہ ہولون لوگ جنگجو اور ظالم مشہور تھے۔ چنانچہ اگر انہوں نے حملہ کرنے کی شان لی تو چند میں ہی ہم سب کو کاٹ کر رکھ دیں گے۔

چنانچہ کراٹ کو طلب کر لیا گیا۔ وہ لرزتا کانپتا آیا۔ میں نے اسے کافی تیار کرنے کو کہا اور پھر لیوشن کو چگا کر اسے حالات سے آگاہ کیا۔

”بہت عمدہ۔“ وہ بولا۔ ”یہ لوگ بھینا ہولون ہی ہیں اور ہم نے انہیں خلاف توقع آسانی سے لیا ہے۔ ورنہ خدا جانے اس لعنتی علاقے میں ہمیں کتنے ہفتوں تک خاک چھانی پڑتی اور تب کہیں کر ہم انہیں تلاش کر سکتے۔“

”حالات کو اس انداز سے دیکھنے کا طریقہ واقعی برا نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اب ا مناسب سمجھو تو پڑاؤ میں ایک چکر لگا کر ہر شخص کو ہدایت کر دو کہ کچھ بھی ہو جائے کوئی اس وقت تک گولی نہ چلائے جب تک کہ اس کا حکم نہ دیا جائے۔ ہاں..... ٹھہرو ان آزاد شدہ غلاموں سے بندوبست واپس لے لو۔ کیونکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اگر یہ لوگ سر اسیمہ ہوئے تو کیا کریں گے۔ ان بندو کا۔“

لیوشن نے سر ہلایا اور تین چار شلو شکاریوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ اس کے جا چکنے کے بعد میں نے فوناسمیت سے مشورہ سے ذاتی طور پر چند چھوٹی چھوٹی تیاریاں کر لیں۔ اور یہ تیاریاں اسی سلسلے میں تھیں کہ اگر مرنا ہی ہے تو پھر آسانی سے نہیں بلکہ حملہ آور کو بقول چھٹی کا دودھ یا دولا کر مرنا ہے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم وحشی دشمن کو بہر حال مرعوب کر دیں تاکہ بعد میں آنے والوں کی منزلیں آسان ہو جائیں۔“

تھوڑی دیر بعد لیوشن شلو شکاری تمام یا زیادہ تر بندوقیں لے کر آگئے اور انہوں نے بتایا آزاد شدہ غلام بے حد خوفزدہ تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھاگ جائیں گے۔

”تو بھاگ جانے دو۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ وہ لڑائی میں ہماری مدد تو کیا کریں گے۔ ہمارے لئے مشکلات پیدا کر دیں گے۔ ان شولوں کو فوراً اندر بلا لو۔ جو باہر پھرا دے رہے ہیں۔“

لیوشن سر ہلا کر چلا گیا۔ دھند اتنی گاڑھی تھی کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ میں نے چند منٹوں ہی بہت سی آوازیں سنیں اور اس کے فوراً بعد پیروں کی چاپ سنائی دی۔ آزاد شدہ غلام اور ہمارے بار بردار بھی جا چکے تھے اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی لے گئے تھے جو زخمی تھے۔ وہ مسلح وحشی جو ہمیں گھیرے میں لئے ہوئے تھے اپنا دائرہ مکمل کر رہے تھے۔ کہ یہ آزاد شدہ غلام اور بار برداران۔ دونوں سروں کے درمیان سے نکل گئے اور بھاگ کر اس جنگل میں چلے گئے جس میں سے گزر کر آئے تھے۔ میں آج تک سوچ رہا ہوں کہ ان مفردوں کا کیا بننا؟“

بھینا اکثر تو راستے ہی میں مر گئے ہوں گے اور بقیہ یا تو اپنے قبائل میں مقیم ہو گئے ہوں۔

لر مجھے ام وادی کا زہر پلانا چاہتا ہے۔“

یہاں میں بتا دوں کہ ام وادی ایک قسم کا عرق ہوتا ہے۔ جو ایک قسم کے درخت کے گودے بنایا جاتا ہے اور اس کا استعمال صرف وح ڈاکٹر کرتے ہیں اور اس شخص کو پینے کیلئے دیتے ہیں پر کسی جرم کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ یہ عرق پینے کے بعد اگر طرہم کو قے ہو جائے تو پھر اسے بے یقین کر لیا جاتا ہے لیکن پینے والے پر قح طاری ہو جاتا ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتا ہے یا اس کے دانتھ جاتے ہیں تو اسے مجرم یقین کر لیا جاتا ہے اور پھر یا تو وہ اس عرق کے اثر سے ہی مر جاتا یا اگر زندہ رہتا ہے تو دوسرے طریقے سے اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔“

سر لوگاٹ! یہ ام وادی نہیں ہے۔ ”جونہی نے کہا۔“ اس کے برخلاف یہ آسانی مشروب ہے۔ کا اثر یہ ہے کہ یہ پینے کے بعد نفس راج! سوگزدور سے کسی بھی جاندار کو ایک دمہا کے کی آواز کے مار گراتا ہے۔ دیکھو! میں خود پیتا ہوں۔“ اور جونہی نے کافی کی ایک چسکی لی۔ حالانکہ گرم گرم نے اس کی زبان جلا دی ہوگی۔“ لیکن وہ مسکرایا۔

اب آفسر کو قدرے اطمینان ہوا۔ چنانچہ اس نے پکڑا سی ناک کافی میں گھسیڑ کر کافی سوکھی، خوشبو اسے مفرح معلوم ہوئی۔ پھر اس نے ایک شخص کو اپنے قریب بلایا! اس دوسرے شخص کا عجیب و غریب تھا۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ یہ وح ڈاکٹر تھا۔

لوگاٹ نے پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ایک چسکی لی تو لوگاٹ اس کے اثر کا منتظر رہا وح ڈاکٹر پر اس کا یہ اثر ہوا کہ اس نے پیالہ خالی کر جانے کی کوشش کی۔ لیکن لوگاٹ نے اس کے سے پیالہ کھینٹ کر خود اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ چونکہ میں نے اس خاص پیالے میں شکر بہت ڈال دی تھی۔ اس لئے بوڑھے کو کافی بے حد لذیذ محسوس ہوئی۔

”واقعی یہ مقدس مشروب ہے.....؟“ وہ جھٹکارے لے کر بولا۔ ”اور ہوگا۔ یہ مشروب؟“

”ہاں۔ ان کے پاس یہ کافی مقدار میں موجود ہے۔“ جونہی نے جواب دیا۔ ”وہ تمہیں اپنے لمبے پر مدعو کر رہے ہیں۔“

لوگاٹ نے اپنی شہادت کی انگلی پیالے میں ڈال دی۔ پینے میں اب بھی شکر موجود تھی۔ اس راہی انگلی پر لی اور اسے چاٹ گیا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

”اب فکر کی کوئی بات نہیں۔“ میں نے لیہوشن سے کہا۔ ”ہماری کافی پینے کے بعد وہ میرے میں ہمیں قتل نہ کرے گا۔ بلکہ شاید ہمارے ساتھ ناشتہ کرنے آ رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے یہ ہمارے لئے جال بچھایا گیا ہو۔“ لوگاٹ نے پیالے میں کمی ہوئی شکر چائے

اس چھوٹے سے خیمے کے سامنے جو ہم نے بارش سے بچنے کیلئے لگا لیا تھا۔ چھوٹی سی سٹری لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ کرا ل نے ہمارا ناشتہ اسی میز پر چن دیا اور ناشتہ کیا تھا.....؟

کافی اور چیتل! کا ٹھنڈا گوشت! میں اور لیہوشن ناشتہ کرنے لگے۔ شولو دکاری نے بھی کئی کا تیار کر لیا تھا اور وہ ایک طرف بیٹھے ہوئے چوبی اور مٹی کے پیالوں میں سے دلے کے بڑے ۴ لٹے اپنے منہ میں ٹھونس رہے تھے۔ ان کی بندوقیں ان کے گھنٹوں پر تیار رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے اطمینان یا ناشتہ کے عمل نے ہولون لوگوں کو بہت زیادہ گڑبڑا دیا۔ وہ لوگ بہت قریب آ گئے اور سے کوئی چالیس گز دور تک کراہی بڑی بڑی آنکھوں سے فکر کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں اس کو کبھی نہ بھولوں گا جو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب کا منظر ہو۔

معلوم ہوتا ہے ہماری ہر بات اور ہر چیز انہیں حیرت زدہ کر رہی تھی۔ مثلاً ہماری ہڈی میری لیہوشن کی رنگت! ہمارا خیمہ اور ہمارے وہ دو گدھے جو زندہ بچ گئے تھے۔ اتفاقاً اسی وقت ا گدھا رینگنے لگا تو میں نے دیکھا کہ ہولون خوفزدہ ہو گئے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور قدم پیچھے ہٹ گئے۔ آخر کار میرے اعصاب تن گئے۔ خصوصاً اس لئے کہ میں نے دیکھا کہ ہولون کے ہاتھ کمانوں کی طرف اٹھ گئے تھے اور ان کا جرنیل جو ایک آنکھ والا طویل قامت بوڑھ کچھ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا میں نے ہولون راہبروں میں سے ایک کو آواز دی۔ وہ آ گیا۔ تو کا پیالہ اسے دیتے ہوئے میں نے کہا۔

”جونہی! ہماری نیک تمناؤں کے ساتھ یہ کافی افسر کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ اس نے ہمارے ساتھ ناشتہ کرنا پسند کر لیا تو ہمیں مسرت ہوگی۔“

”جونہی بڑا ہی بہادر اور باہمت شخص تھا۔ چنانچہ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ وہ بھاپا کافی کا پیالہ دونوں ہاتھوں پر اٹھائے افسر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اسے افسر کی ناک کے سین تک لے گیا۔ جونہی بھینا افسر کا نام جانتا تھا کیونکہ میں نے اسے کہتے سنا۔

”سر لوگاٹ! مسٹر نفس راج! اور لیہوشن پوچھ رہے ہیں کیا تم ان کے ساتھ مقدس مشروب پسند کرو گے.....؟“

”جونہی نے جو کچھ کہا تھا اور بعد میں جو کچھ کہا گیا میں نے اس کا ایک ایک لفظ آسانی سے لیا۔ کیونکہ یہ لوگ جو بولی بولتے تھے وہ شولو زبان سے اتنی لمبی جلتی تھی کہ میں نے جلد ہی اس مہارت حاصل کر لی تھی۔

”مقدس مشروب!“ بوڑھے آفسر نے حیرت سے کہا۔ ”یہ تو گرم لال پانی ہے کیا یہ سلا



واپس جمع ہو رہے تھے۔

”دیکھو لوگاٹ دیکھو! تم نے ان کی آنکھوں کو نشانہ بنایا ہے۔ تم عظیم ساحر ہو اور دیکھو وہ بھاگ رہے ہیں۔“ اور وہ واقعی پیٹھ پھیر کر بھاگے۔

ان لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہے جو تمہیں پسند نہ ہو۔“ میں نے پوچھا۔ ”ہاں..... بہہ ہیں.....“ لوگاٹ نے کہا۔ درخصوصاً وہ دیو ڈاکٹر جس نے وہ مقدس مشروب پی جانے کی کوشش کی تھی۔“

”بہت اچھا۔ میں بتاؤں گا کہ تم جلا کر اس کے جسم میں کس طرح سوراخ پیدا کر سکتے ہو۔ لیکن اس جادو سے ابھی نہیں فی الحال سورج کا یہ رقیب مر گیا ہے۔ یہ دیکھو.....“ اور میں نے آئینہ میز کے نیچے کر کے پھر نکال لیا اور اس طرح کہ اب اس کا دوسرا رخ لوگاٹ کے سامنے تھا۔ اب تم کچھ ٹھہر دیکھ رہے یا دیکھ رہے ہو کچھ.....؟“

”واقعی کچھ نہیں دیکھ رہا۔ سوائے لکڑی کے ایک تختے کے۔“ لوگاٹ نے حیرت سے کہا۔ اس کے بعد میں نے قاب کا سر پوش آئینے پر ڈال دیا۔ اور موضوع تبدیل کرنے کی غرض کا ایک اور پیالا اس کی طرف بڑھا دیا اور ساتھ اس کے بیٹنے کیلئے ایک تپائی بھی پیش کر دی۔

بوڑھا لوگاٹ ڈرتے ڈرتے تپائی پر بیٹھ گیا، جو فولڈنگ تھی۔ بھالے کا پھل زمین پر گاڑ دیا اور پیالہ اٹھا لیا اور یہ اس نے غلط اٹھایا تھا۔ اس پیالے کی کافی پینے کے بعد اسی نے ایسا معجزہ خیر منہ ہوا کہ لیوشن جو خطرے کو بھول کر پچھلی ایک دوفٹ سے اپنی ہنسی دبائے ہوئے تھا برداشت نہ کر سکا اور اپنا پیالہ میز پر پٹخ کر خیمے میں بھاگا اور پھر میں نے خیمے سے اس کی جتاہانہ ہنسی کی آواز سنی یہ غوا لیوشن کی کافی تھی۔ جو کراہنے لگا بڑا کر لوگاٹ کو دے دی تھی۔ اب کراہنے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ وہ بولا۔

”مسٹر لیوشن! مجھے انسوس ہے کہ یہاں سخت لغزش ہو گئی ہے۔ آپ اس کپ سے کافی پی رہے ہیں۔ جسے ابھی ابھی اس بدبودار وحشی نے اپنی زبان سے چاٹ کر صاف کیا تھا۔ کراہنے کی اس اطلاع کا اثر فوری ہوا کیونکہ اس جگہ لیوشن نے تے کر دی۔

یہ تمہارا سردار ایسا کیوں کر رہا ہے؟ لوگاٹ نے کہا۔ ”ہاں۔ اب چا چلا کہ تم لوگ مجھے دھوکہ دے رہے ہو اور یہ کہ جو تم نے مجھے پینے کو دیا ہے وہ گرم امروادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی یہ خاصیت ہے کہ اسے پینے کے بعد بے گناہ تے کر دیتا ہے اور گتہا گتہا مر جاتا ہے۔“

”لیوشن خدا کیلئے سنبھلو۔“ میں نے دانت نہیں کر کہا اور ساتھ ہی اس کی پنڈلی میں ایک ٹھوکر

ماری۔ ”ورنہ ہم سب کو ذبح کر دیا جائے گا۔

اس کے بعد میں نے بڑی کوششوں سے اپنی بے چینی کو دبا کر لوگاٹ سے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے سردار دراصل یہ میرا ساتھی۔ مقدس مشروب کا کاہن ہے اور یہ جو تم دیکھ رہے ہو یہ اصل میں مذہبی رسم ہے۔“

”اچھا اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ رسم مجھے بھی ادا کرنی پڑے۔“

”فکر نہ کرو۔ ایسی بات تمہارے ساتھ نہ ہوگی۔ میں نے اسے ایک بسکٹ دیتے ہوئے کہا۔ اچھا اب یہ بتاؤ لوگاٹ کہ تم پانچ سپاہی لے کر ہمارے پاس کیوں آئے ہو؟“

”تمہارا خاتمہ کرنے۔ سردار لیکن یہ اس قدر گرم ہے۔ یہ مقدس مشروب لیکن مزیدار ہے اور تم نے کہا ہے کہ اس کا اثر مجھ پر نہ ہوگا۔ لیکن میں یوں محسوس کر رہا ہوں۔

”یہ کھالو۔“ میں نے بسکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور تم ہمارا خاتمہ کس لئے کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو۔ سچ کہنا کیونکہ اگر تم نے جھوٹ کہا تو میں اس جادوئی ڈھال سے سچائی معلوم کر لوں گا۔ کیونکہ انسانوں کا ظاہری نہیں بلکہ باطن بھی اس میں نظر آتا ہے“ اور آئینے پر سے کپڑا اٹھا کر میں اس میں دیکھنے لگا۔

”سردار! اگر تم اس جادوئی ڈھال میں میرے خیال پڑھ سکتے ہو تو میری زبان کو کیوں تکلیف دے رہے ہو؟“ لوگاٹ نے بڑی عقلمندی کی بات کہی۔ اس کا منہ بسکٹ سے بھرا ہوا تھا۔ ”لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ روشن ڈھال تمہیں غلط بات بتائے۔ چنانچہ میں ہی بتاتا ہوں۔ ہمارے بڑے سردار جوی نے میں بھیجا ہے کہ تمہیں قتل کر دیں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ خبر آئی ہے کہ تم غلام پکڑنے آئے ہو اور بندوقیں لے کر آئے ہو کہ مولوں لوں کو پکڑ کر لے جاؤ اور پھر انہیں ان ڈوگوں میں سوار کرادو جو زبردست کالے پانیوں پر اپنے آپ اچلتے ہیں۔“

”ڈیوڈ نے بھیجی ہوگی یہ خبر۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ پیغام برامی کے تھے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ خبر غلط نہ تھی کیونکہ گزشتہ رات تمہارے تھ بہت سے غلام تھے۔ جو کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہمارے بھالوں سے ڈر کر بھاگ گئے۔“

اور اب میں نے غور سے آئینے میں دیکھا اور بڑے سکون سے کہا۔

”لیکن یہ جادوئی ڈھال تو مجھے کچھ اور ہی بتا رہی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ بڑے سردار جوی نے



کہ شاید ہم اسے زہر دے دیں گے۔

اور پھر لوگاٹ نے رک رک کر اور قدرے بے چینی سے کیونکہ صاف ظاہر تھا کہ وہ بوڑھے ساحر سے ڈرتا ہے۔ معاملہ اس کے سامنے بیان کیا۔ وچ ڈاکٹر لوزی سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا اور جب لوگاٹ نے کہا کہ بڑے سردار کے حکم کے بغیر ہم جیسے جادو گروں کو قتل کر دینا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے تو لوزی نے پہلی دفعہ زبان کھولی اور پوچھا۔

”تم انہیں جادوگر کیوں کہہ رہے ہو؟“

”چنانچہ لوگاٹ نے جادوئی ڈھال“ کے متعلق بتایا کہ اس میں تصویریں نظر آتی ہیں۔“  
 ”واہیات۔“ لوزی نے کہا۔ ”ٹھہرا ہوا پانی اور چمکتی ہوئی دھات بھی تصویریں دکھاتی ہے۔“  
 ”لیکن یہ ڈھال آگ پیدا کر سکتی ہے۔“ لوگاٹ بولا۔ ”ان لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ آدی کو جلا کر خاک کر سکتی ہے۔“

”تو پھر اسے مجھے جلانے دو۔ ہاں کیونکہ وہ ڈھال مجھے جلا دے۔“ لوزی نے بڑی حقارت سے کہا۔

میں پھر کہوں گا کہ یہ لوگ حقیر اور معمولی غلام پکڑے والے نہیں بلکہ حقیقت میں وہ عظیم جادوگر ہیں اور اس قابل ہیں کہ انہیں رکھا جائے۔“  
 ”تم ان لوگوں سے ڈرتے ہو۔“

”جلادو اسے اور دکھا دو اسے کہ میں سچ کہتا ہوں“ سردار“ لوگاٹ نے غضبناک ہو کر کہا۔  
 اور اس کے بعد لوگاٹ اور لوزی میں تو“ تو“ میں“ میں“ ہونے لگی۔ صاف بات تھی کہ وہ دونوں رقیب تھے اور اس وقت دونوں کا ہی مزاج بگڑا تھا۔

سورج اب کافی بلند ہو چکا تھا اور اس کی کرنوں میں اتنی تمازت ضرور آگئی تھی کہ ہم لوزی کو اپنے جادو کا مزہ چکھا سکتے اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس کجنت بوڑھے کو مزہ ضرور چکھاؤں گا۔ مجھے یقین تھا کہ معمولی سا آئینہ اتنی گرمی پھینک سکے گا کہ جلد جلنے لگے۔

چنانچہ میں نے اپنی جیب سے وہ محب شیشہ برآمد کیا۔ جو بہت زیادہ تیز تھا۔ اور جس سے میں کبھی کبھی دیا سلائی کی تیلیاں بچانے کیلئے آگ جلا یا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک ہاتھ میں آئینہ اور دوسرے میں محب شیشہ لے کر میں اپنے تجربے کیلئے مناسب زاویے سے کھڑا ہو گیا۔ لوگاٹ اور لوزی ایسی گرما گری میں تھے کہ انہوں نے میرے اس عمل کو نہ دیکھا۔ شعاعیں محب شیشے میں سے گزار کر میں نے اس گرم روکی زد میں لوزی کی کھوپڑی کے اس حصے کو لیا جہاں سینک کھڑا ہوا تھا۔

جس کیلئے ہم بہت سے تحائف لائے ہیں۔ تم سے کہا ہے تم ہمیں عزت و احترام کے ساتھ اس کے پاس لے جاؤ تا کہ ہم دونوں آپس میں بات چیت کر کے کوئی فیصلہ کر سکیں۔

”یہ میں نے اندمیرے میں تیر چلا دیا تھا۔ جو اتفاقاً نشانے پر بیٹھا“ لوگاٹ الجھ گیا۔

”یہ۔ یہ۔ یہ تم نے غلط کیا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”وہ میرا مطلب ہے بڑے سردار نے یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میں وچ ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہوں۔“

”اگر اس نے معاملہ تم پر چھوڑ دیا تھا تو پھر فیصلہ ہو گیا۔“ میں نے کہا۔ تم سردار ہو اور شریف ہو۔ چنانچہ یقیناً ان لوگوں کو قتل کرنے کی کوشش نہ کرو گے جن کا مقدس مشروب تم پی چکے ہو اور اگر تم نے ایسا کیا۔ میں نے بڑے سکون سے اضافہ کیا۔ ”تو پھر خود تم زیادہ زندہ نہ رہ سکو گے“ ایک منتر اور یہ مقدس مشروب تمہارے پیٹ میں ام وادی بن جائے گا۔

”ہاں سردار فیصلہ ہو چکا۔“ لوگاٹ نے کہا۔ ”بے شک ہو چکا“ منتر کہنے کی زحمت نہ کرنا میں تمہیں بڑے سردار کے پاس لے جاؤں گا اور پھر تم اس سے بات چیت کر لیتا میں اپنے سر کی اور اپنے باپ کی روح کی قسم کھاتا ہوں کہ میری طرف سے تم محفوظ ہو۔ میں وچ ڈاکٹر کو تلاتا ہوں۔ اس کے سامنے میں اس معاہدے کی تصدیق کروں گا اور اسے یہ جادوئی ڈھال بھی دکھا دوں گا۔“

چنانچہ وچ ڈاکٹر کو طلب کیا گیا۔ لوگاٹ نے اسے بلانے کیلئے جونی کو بھیجا“ تھوڑی دیر بعد ہی وہ عظیم وچ ڈاکٹر آ گیا۔ یہ شخص بڑا ہی عیار اور پاجی معلوم ہوتا تھا جس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کی کوب نکلی ہوئی تھی۔ جسم خشک لکڑی کی طرح تھا اور آنکھیں بھیگی تھیں۔ اس کی وردی عام وچ ڈاکٹر کی سی تھی جو سانپ کے کچلیوں، مچھلی کے شانوں، لنگور کے دانٹوں اور جادوئی جڑی بوٹیوں کا دواؤں کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں پر مشتمل تھی۔ اپنے اثر کو اور بھی زور دار بنانے کیلئے اس نے اپنے چہرے پر پہلی مٹی سے ایک لکیر کھینچ رکھی تھی۔ جو اس کے ماتھے کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتی، ناک سے گزر کر ہونٹوں اور ٹھوڑی کو قطع کرتی اس جگہ جا کر ختم ہو گئی تھی جہاں گردن سینے سے ملتی ہے۔

اس کے چھوٹے ہتھکریا لے بال نیلے رنگ سے رنگے ہوئے تھے اور پکھلی ہوئی جڑی سے چپ چپے ہو رہے تھے۔ بالوں میں گوند کا چھوٹا سا حلقہ گندھا ہوا تھا۔ جو ٹھیک اس کی چند یا پریٹنگ کی طرح کوئی پانچ انچ تک اٹھا ہوا تھا۔ یہاں تک خیر ٹھیک تھا۔ لیکن ستم ہالائے ستم یہ کہ اس مہوت کا حصہ بھی شیطانی تھا۔ چنانچہ آتے ہی وہ ہم پر برس پڑا کہ ہم نے مقدس مشروب پینے کیلئے لوگاٹ کے ساتھ مدعو نہ کیا تھا۔

ہم نے کہا کہ اس کیلئے مقدس مشروب فوراً تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا

میرا خیال تھا کہ اس کا وہ سینک سلگ نہ اٹھے گا۔ میرا ارادہ اس میں صرف سوراخ پیدا کر دینے کا تھا۔ لیکن اتفاقاً یہ سینک کسی آتش گیر چیز کے غالباً نزل یا ایسی ہی کسی لکڑی کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ بہر حال تیس سیکنڈ بعد ہی لوزی کا سینک عمدہ مشکل کی طرح جل رہا تھا۔

”واہ۔“ سیاہ فام جودیکھ رہے تھے چلائے۔

”خدا کی قسم“ لیوٹن نے کہا۔ ”یہ تو کمال ہو گیا۔“

”دیکھو دیکھو“ لوگاٹ خوشی سے جھوم کر بولا۔ ”اے آدمی کے پھولے ہوئے شانے اب بھی تسلیم کرتے ہو یا نہیں کہ دنیا میں تم سے بھی بڑے جادوگر موجود ہیں۔“

”اے کتے کے نطفے کیا ہوا تو مجھ پر ہنس رہا ہے۔“ غضب ناک لوزی چلایا، صرف وہی اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کا سینک یا چٹیا سلگ رہی تھی۔

لیکن پھر فوراً ہی اس کے دل میں کچھ شک پیدا ہوا، چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر سر پر پھیرا، لیکن پھر فوراً ہی ایک چیخ کے ساتھ جھکا لیا۔ پھر وہ گھٹی کا ناچ ناچنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ شعلے کو ہوا لگی اور اس نے لوزی کے بالوں پر چڑی ہوئی چربی کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔

شولوز نے خوشی کے نعرے لگائے، لوگاٹ تالیاں پیٹنے لگا۔ لیوٹن پر ہنسی کا دودھ پڑا لیکن میں گھبرا گیا۔ قریب ہی ایک چربی برتن پڑا ہوا تھا، جس میں سے پانی لے کر کافی پٹائی گئی تھی۔ خوش قسمتی وہ اب بھی نصف کے قریب بھرا ہوا تھا۔ میں نے وہ ڈول اٹھایا اور لوزی کی طرف بھاگا۔

”ہنس راج سردار مجھے بچاؤ۔“ وہ چیخا۔ ”تم بے شک ایک عظیم جادوگر ہو۔ میں تمہارا غلام ہوں۔“

”میں نے نہ صرف ڈول اس کے سر پر اوندھا دیا بلکہ اسے پہنا لیا۔“ گھنٹن سے شعلہ بجھ گیا اور اس پانی سے دھواں اور بدبو کے بجائے نکلنے لگے جو لوزی کے جسم پر بہہ رہا تھا۔ خود لوزی نے جس و حرکت اور خاموش کھڑا تھا۔ جب مجھے یقین آیا کہ آگ بجھ چکی ہے تو میں نے اس کے سر پر سے ڈول اٹھا لیا اور اب جو اس خوفزدہ لوزی کا چہرہ نمودار ہوا تو اس کے سر پر اب سینک نہ تھا۔ اس کی کھوپڑی نہ چلتی تھی۔ کیونکہ میں نے عین وقت پر اس کے سر پر ڈول اوندھا دیا تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ عمر بھر کیلئے گنجا ہو گیا۔ کیونکہ جب اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو جلے ہوئے بال جھڑ گئے۔

”میری چٹیا غائب ہو گئی؟“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ میں نے جواب دیا۔ بالکل غائب ہو گئی۔ اس جادوئی ڈھال نے خوب کام کر دکھایا

ہے ناں؟“

”تم پھر بھی آگ لگا سکتے ہو۔ سردار؟“ اس نے پوچھا۔

اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ میں نے جواب دیا۔ چنانچہ وہ کچھ کہے بغیر پلٹ کر سپاہیوں کی طرف چل رہا اور انہوں نے قہقہوں سے اس کا استقبال کیا، صاف ظاہر تھا کہ لوزی ہر دلعزیز نہ تھا اور اس کی بدخواہی شکست اور ذلت نے ہر کس و ناکس کو خوش کر دیا تھا۔

لوگاٹ بھی بہت خوش تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے جادو کی تعریف کیلئے اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بہر حال وہ ہمیں فوراً ہی اپنے بڑے سردار کے پاس لے جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ سردار اپنی سلطنت میں تھا اور اس خاص بستی کا نام ”فیزا“ تھا لوگاٹ! نے قسم کھا کر ہمیں یقین دلایا کہ اس کی اور اس کے آدمیوں کی طرف سے ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ صرف ایک شخص ایسا تھا، جس نے ہمارے جادو کو نہ سراہا اور وہ تھا لوزی۔ اور جب وہ پلٹ کر سپاہیوں کے پاس جا لیا تھا تو اس کی آنکھوں میں شدت نفرت کی جھلک میں نے دیکھ لی تھی۔

اور میں نے سوچا کہ میں نے محذب شیشے کا استعمال کر کے حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ حالانکہ اس کی چٹیا جلانے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔

”بیٹا! بعد میں فونانے مجھ سے کہا۔“ اچھا ہوتا کہ تم نے اس سانپ کو جلا کر راکھ بن جانے دیا ہوتا۔ کیونکہ اس طرح اس کے زہر کا بھی خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

بیٹا! میں خود بھی ڈاکٹر ہوں اور جانتا ہوں کہ ہمارے ہم پیشہ کبھی اس بات کو معاف نہیں کرتے کہ ان کا مذاق اڑایا جائے اور ان پر ہنسا جائے۔

ہنس راج! ہم نے لوزی کو ان سب لوگوں کے سامنے ذلیل کیا ہے اور وہ اس بات کو کبھی نہیں بولے گا۔“



دوپہر کے وقت ہم نے اپنا پڑاؤ اٹھایا اور سردار جوسی کے کراں فیزا کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم دوسرے دن شام کو وہاں پہنچ جائیں گے۔ کئی گھنٹوں تک ہولون رجمنٹ ہمارے عین گے بلکہ یوں کہیے کہ ہمارے چاروں طرف مارچ کرتی رہی۔ ہم نے لوگاٹ سے شکایت کی کہ ان زمروں کی آواز اور ان کے چلنے سے اٹھتی ہوئی دھول ہمارا دماغی سکون درہم برہم کر رہی تھی۔ یہ شکایت ہم نے ایسی سنجیدگی سے کی تھی کہ اس نے رجمنٹ کو آگے روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا، لیکن بلے اس نے کہا کہ ہم اپنی ماں کی قسم کھائیں۔ ماں کی افریقی قبائل میں بڑی مقدس قسم تسلیم کی جاتی

لو ایک گوریلے اور ایک پھول کی پرستش کرتے تھے اور ہمیں اس وقت تک آگے بڑھتے رہنا چاہئے تھا۔  
اب تک کہ حالات ہمیں پسپائی پر مجبور نہ کر دیتے۔

بہر حال خطرات تو ہر طرف ہوتے ہی ہیں اور وہ لوگ جو خطرات سے خائف ہو کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں وہ زندگی کے کسی شعبے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

”فونا“ میں نے اپنے باپ سے لیوشن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیوشن فرار ہونا  
میں چاہتے بلکہ وہ انگوٹی لوگوں کے علاقے میں جانا چاہتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ ممکن ہو اور یہ نہ بھولو فونا  
نہ جتنا بھی روپیہ خرچ ہوا ہے وہ ان لیوشن نے ہی ادا کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان کے تنخواہ دار ملازم  
ما۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم بھاگ گئے تب بھی وہ اکیلے ان ہولون لوگوں کے  
تھ آگے بڑھتے جائیں گے۔ اس کے باوجود اگر تم لوگوں میں سے کوئی بھاگ جانا چاہتا ہے تو نہ تو  
اٹن اسے روکیں گے اور نہ میں ہی روکوں گا۔ اب کہو فونا تم کیا کہتے ہو۔“

”میں یہ کہتا ہوں۔ ہنس راج! حالانکہ لیوشن کم عمر ہے، لیکن وہ عظیم سردار ہے اور بہت بہادر  
۔ چنانچہ جہاں تم جاؤ گے اور وہ جائے گا۔ وہاں میں بھی جاؤں گا اور میرے خیال میں ہمارے شولو  
ری بھی جائیں گے۔ ہنس راج! یہ ہولون لوگ مجھے پسند نہیں ہیں۔ ممکن ہے ان کے باپ شولو  
ہوں، لیکن ان کی ”مائیں“ سچ ذات تھیں۔

چنانچہ یہ لوگ دوڑنے میں ہیں۔ ”دلدارنا“ ہیں اور ایسے لوگوں پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ہے۔ رہے  
ان تو ان کے متعلق میں نے بھی کبھی کوئی اچھی بات نہیں سنی ہے۔ بلکہ جو بات بھی سنی ہے برائی ہی  
سنی ہے۔ تاہم ہنس راج! اگر ایل بیل کی راہ میں کچھ کا کھڑا آجائے تو وہ واپس نہیں لوٹ جاتا۔  
پہنسن راج! بس آگے بڑھو کیونکہ اگر ہم دلدلوں میں غرق ہو بھی گئے تو اس سے کیا فرق پڑ جائے  
؟“

لیکن میرا سانپ کہہ رہا ہے کہ ہم غرق نہ ہوں گے، کم سے کم ہم غرق نہ ہوں گے۔ چنانچہ طے  
فرار ہونے یا پلٹ پڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔“

یہ سچ ہے کہ کراٹ البتہ پلٹ جانا چاہتا تھا لیکن جب اس کے ارادے کو جامہ عملی پہنانے کی  
اٹن کی گئیں اور اسے ایک گدھا، بندوق اور اسے کارٹوس اور اشیاء خوردنوش کا ذخیرہ جتنا کہ وہ اٹھا  
تھا دیا گیا تو اس نے بھی اپنا ارادہ بدل دیا۔

مسٹر ہنس راج! بولا۔ ”میرے خیال میں یہ مناسب رہے گا کہ میں بجائے اس کے کہ جنگل  
ی خوفناک حصے میں زندگی کے آخری سانس لوں اور کوئی میرے قتل میں پانی پکانے والا نہیں

تھی کہ ہم فرار ہونے کی کوشش نہ کریں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ قسم کھانے سے پہلے میں ذرا ہچکچا رہا  
تھا۔

اڈل تو اس لئے کہ ہولون لوگوں کی طرف سے میں مطمئن نہ تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ جونی نے  
مجھے مطلع کیا تھا کہ شکست خوردہ لوگاٹ ہمارے ساتھ نہ تھا بلکہ وہ کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے آگے  
روانہ ہو گیا تھا۔ اگر فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا جاتا تو میں ہولون لوگوں کی بستی میں جانے کے بجائے چپکے  
سے جنگل میں گھس پڑتا اور وہاں چند مہینے سیر و شکار میں گزار دیتا۔ ہمارے شولو شکاری اور آگس بھی  
یہ ہی چاہتے تھے۔ لیکن جب میں نے اپنا ارادہ لیوشن کے سامنے ظاہر کیا تو وہ گڑگڑانے لگا کہ میں یہ  
ارادہ ترک کر دوں۔

”دیکھو۔ یار! ہنس راج۔“ اس نے کہا۔ ”اس لعنتی ملک میں میں ایک خوبصورت شے کی تلاش  
میں آیا ہوں۔ اب یا تو میں اسے حاصل کر کے رہوں گا یا پھر اسے تلاش کرنے کی کوشش میں مر جاؤں  
گا۔“

اس نے ہمارے جذبات سے غاری چھروں کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔  
”تمہاری زندگیوں سے کھیلنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اب اگر تمہارے خیال میں یہ ہم واقعی  
بہت زیادہ خطرناک ہے تو پھر میں اکیلا ہی لوگاٹ کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ کم از کم ہم میں سے کسی  
ایک کا تو جیسی کے کراٹل میں جانا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ قطع نظر اور باتوں کے بہت ممکن ہے۔ وہ  
صاحب وہاں آجائیں جنہیں تم جھگڑا کہتے ہو۔

ہنس راج! بہر حال میں تو ارادہ کر چکا ہوں۔ چنانچہ مجھے سمجھانا یا روکنا فضول ہے، البتہ تم اپنی  
مرضی کے مالک ہو۔“

میں نے اپنا باپ جلا یا۔ بہت دیر تک اس ضدی نوجوان کی طرف دیکھتا رہا اور اس معاملے  
میں ہر پہلو پر غور کرتا رہا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ لیوشن ٹھیک ہی کہہ رہا تھا اور میں نے جو کچھ  
سوچا تھا وہ مناسب نہیں تھا۔ بے شک ہم لوگاٹ کو رشوت دے کر یا کسی اور ذریعے سے آسانی سے  
واپس لوٹ سکتے تھے اور بہت سی دشواریوں اور مصائب سے اپنا دامن بچا سکتے تھے، لیکن دوسری طرف  
یہ بات تھی کہ ہم واپس لوٹ جانے کیلئے ان بیانون میں نہ آئے تھے اور پھر اس ہم پر وہیہ کس نے  
لگایا تھا۔ لیوشن نے اور وہ آگے بڑھنے پر مصر تھا۔ جنگل سے ”فیڑا“ میں اتفاق سے ہونے والی  
ملاقات کو اگر نظر انداز کر بھی دیا جائے تب بھی کم سے کم میں بزدلی اور بوسے پن کا ثبوت دے کر  
اپنی ہار ماننے کیلئے تیار نہ تھا۔ ہم لوگ ان پر اسرار و حشیوں کا کھوج لگانے کے ارادے سے چلے تھے۔

لے کاروبار کو چلاتی تھی اور اپنے ارادوں اور فیصلوں کو وچ ڈاکٹروں کے ذریعے ظاہر کرتی تھی۔ اس لیم قوت کے متعلق ان کے خیالات بہر حال مبہم تھے اور آخر میں یہ کہ ہولون جنگجو قوم تھی اور بھینا ہ بھی ہیں۔ یہ لوگ جنگ پسند کرتے تھے اور ہمسایہ قبائل پر کس نہ کسی بہانے سے حملہ کیا کرتے تھے۔ مردوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں اور مویشیوں کو ہٹکا لے جاتے۔ ہولون لوگوں کی چند خوبیاں بھی ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اپنے دشمن کے معاملے میں بڑے ظالم تھے۔ لیکن ویسے فطرتاً رحم دل مہمان اڑاس کے علاوہ نہ صرف انہیں غلاموں کی تجارت سے بلکہ بردہ فروشوں سے بھی نفرت تھی۔ ان لوں میں مثل مشہور تھی:

”کہ انسان کو قتل کر دینا بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ اس سے اس کی آزادی چھین لی جائے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ آدم خوری کو جو ان دنوں افریقہ کے قبائل میں عام تھی، نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اسی لئے انہوں نے لوگوں کا نام حقارت سے لیتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے آدم خور تھے۔

بے حد سرسبز و شاداب علاقے میں سے گزرنے کے بعد ہم دوسرے دن ”فیرا“ میں تھے۔ یہ تھی ایک وسیع میدان میں تھی اور میدان کے چاروں طرف پہاڑیاں تھیں اور بستی کے باہر کئی کے رے بھرے کھیت تھے۔ جن میں تیار فصل لہلہا رہی تھی۔ بستی کی قلعہ بندی بھی کی گئی تھی۔ یعنی موٹے دیوے شہر کی دیوار کے بلند کائنات دار جھاڑیاں اور نمودار گراسے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔

باڑ کے اندر بستی کو مختلف حصوں یا کوارٹروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک حصہ لوہا کوارٹر، دوسرا سپاہی کوارٹر، تیسرا کاشکار کوارٹر اور پھر بڑا زون کا کوارٹر اور کمال چھیلنے والوں کا کوارٹر وغیرہ تھے۔

سردار اس کی بیوی اور اس کے عزیزوں و مشیروں کی قیام گاہیں میں شمالی دروازے کے قریب میں۔ نیم دائرے میں بنی ہوئی جمونپڑیوں کے بیچ میں وسیع و عریض میدان چھٹا ہوا تھا کہ وقت رورت یا ناگہانی حملے کے وقت مویشی اس میدان میں لے آئے جائیں۔ بہر حال جس زمانے میں ”فیرا“ میں پہنچے اس وقت یہ میدان کارزار اور سپاہیوں کی قواعد کیلئے استعمال کیا جا رہا تھا۔

ہم جنوبی دروازے سے بستی میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ خاصا مضبوط نظر آتا تھا۔ سورج رو بہ ہورہا تھا کہ ہم ان جمونپڑیوں کے سامنے تھے جو مہمانوں کیلئے تھیں۔ یہ مہمان خانے سپاہیوں کے کوارٹر میں تھے اور سرداروں کی جمونپڑیوں سے زیادہ دور نہ تھے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم بھڑ میں سے گزر رہے تھے ہر شخص خاموش تھا۔ کیونکہ ہولون فطرتاً کم گو واقع ہوئے تھے۔ اس بھڑ میں جو سپاہی تھے انہوں نے ہمالے بلند کر کے ہمیں سلام کیا ورنہ پوری بھڑ خاموش تھی

ہو۔ آپ جیسے بہادروں کے ساتھ اپنی اجل کو لبیک کہوں گا۔  
”خوب کہا کراں۔“ میں نے کہا ”لیکن چونکہ ابھی اجل کو لبیک کہنے کا وقت نہیں آیا ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ تم جا کر کھانا تیار کرو۔“

چنانچہ اپنے شکوک کو بالائے طاق رکھ کر ہم آگے بڑھتے رہے اور ہماری رفتار اطمینان بخش تھی۔ کیونکہ ہمارے جو بار بردار بھاگ گئے تھے ان کی جگہ نئے بار برداروں نے لے لی تھی۔ لوگات اپنے ایک اردلی کے ساتھ ہمارے شانہ بشانہ سفر کر رہا تھا۔ چنانچہ اس سے ہم بہت سی باتیں معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہولون بڑا زبردست قبیلہ تھا۔ جس کے سپاہیوں کی تعداد پانچ سے سات ہزار تھی۔ روایت تھی کہ یہ لوگ جنوب کی طرف سے آئے تھے اور اسی نسل سے تھے۔ جس سے کہ شلوو تھے۔ البتہ شلووؤں کے متعلق ان لوگوں کی معلومات یوں ہی سی تھیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اگر ان کی بولی کا نظر انداز کر بھی دیا جائے تب بھی ان کے اس دعوے کی تصدیق اس بات سے ہوتی تھی کہ ان کی بہت سی رسومات شلووؤں سے ملتی جلتی تھیں۔ البتہ ان کا فوجی نظام زلووؤں کی طرح مکمل نہ تھا اور چند دوسری باتیں بھی ایسی تھیں جو ہولون لوگوں کو کسی کم درجہ نسل سے ثابت کر رہی تھیں۔ مگر یہ لوگ فوجیہ میں افریقہ کے دوسرے قبائل سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔

افریقہ کے تقریباً تمام قبائل کی جمونپڑیاں بھڑوں کے چھتے کی شکل کی ہوتی ہیں اور دروازہ انہیں نچا ہوتا ہے کہ آدی چوپالوں کی طرح چاروں ہاتھوں اور ناگوں پر چل کر اندر داخل ہو سکتا ہے۔ اگر کے برخلاف ہولون لوگوں کی جمونپڑیاں جن کے کراں اب ہماری راہ میں پڑ رہے تھے بے ڈھنگی تھیں اور دروازہ بھی اتنا بلند تھا کہ معمولی قد و قامت کا آدی سر بلند کر کے اور اپنی ناگوں پر چل کر ان میں داخل ہو سکتا تھا۔

اس سفر کے دوران ہم نے اسی قسم کی ایک جمونپڑی میں رات کے وقت قیام کیا اور اگرچہ ہولون کی افراط نہ ہوتی اور انہوں نے ہمیں آخر کار باہر محن میں نہ بھگا دیا ہوتا تو جمونپڑی بڑی آرام دہ ثابت ہوتی۔ رہی دوسری باتیں تو ہولون بہت حد تک شلووؤں سے ملتے جلتے تھے ان کے کراں اور یہ لوگ مویشی رکھتے اور ان کی نسل بڑھاتے تھے۔ ہر کراں کا ایک سردار تھا جو عظیم سردار یا بادشاہ ماتحت ہوتا تھا۔ یہ لوگ جادو اور سحر پر یقین رکھتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کی رگوں کے نام پر قربان پیش کرتے تھے۔

اس کے علاوہ یہ لوگ کسی عظیم قوت پر بھی یقین رکھتے تھے۔ جو ان کے اعتقاد کے مطابق

اور سب کے سب حیرت اور دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ لوگاٹ سے ہمارے تعلقات تقریباً دوستوں کے بے ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے جن جھوپیڑیوں میں ہمیں پہنچایا وہ صاف ستھری اور آرام دہ تھیں۔ یہاں یہ بتا دواں کہ ان جھوپیڑیوں کے ارد گرد بھی باڑ بنی ہوئی تھی کہ مہمانوں کو گھلیہ حاصل رہے۔

ایک جھوپیڑی میں ہمارا کل سامان جن میں وہ بندوقیں بھی تھیں جو ہم نے پردہ فروشوں کے پڑاؤ میں سے بطور مال غنیمت حاصل کی تھیں۔ بڑے سلیقے سے رکھ دیا گیا تھا اور وہاں ایک ہولون پہرہ دے رہا تھا۔ گدھے ذرا قاصلے پر باڑ سے بندھے ہوئے تھے۔ اس باڑ کے باہر ایک اور ہولون مستعد کھڑا تھا یہ بھی پہرہ دے رہا تھا۔

”ہم یہاں قید ہیں؟“ ہمیں نے لوگاٹ سے پوچھا۔

”سردار خود اپنے مہمانوں کی خبر گیری کرتا ہے۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔

”آج رات مجھے سردار کے حضور طلب کیا گیا ہے۔ چنانچہ کیا سردار انس راج! اسے کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اپنے سردار سے کہو۔ کہ ہم اس کے ساتھی ہیں جس نے سردار کے جسم کے ایک حصے پر سے سو جن کاٹ کر الگ کر دی تھی۔ اور ہم نے اس سے اس بستی میں ملاقات کرنا پہلے سے طے کر لیا ہے۔ میری مراد لمبی داڑھی والے آدی سے ہے جو تم لوگوں میں روتا نوا کے نام سے مشہور ہے۔“

لوگاٹ چونکا۔ ”تم روتا نو کے ساتھی ہو! تو پھر یہ کیا بات ہوئی کہ تم نے پہلے اس کا نام نہ لیا اور وہ کب تم سے یہاں ملے آئے گا؟ جان لو کہ روتا نو عظیم ہے اور محترم ہے۔ کیونکہ تمہارا اسی کو ہمارے سردار نے اپنا خون بدل بھائی بنایا ہے۔ چنانچہ ہولون! لوگوں میں جو مقام سردار کا ہے وہی روتا نو کا حاصل ہے۔“

”بے شک ہم نے پہلے اس کا نام نہیں لیا اور اس لئے نہیں لیا لوگاٹ کہ ہم ہر بات کے متعلق ایک ہی وقت میں نہیں کہہ دیتے۔ رہی بات یہ کہ روتا نو یہاں کب آ رہا ہے تو اس کے متعلق سے ہم نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ یقین سے کہتا ہوں کہ وہ آئے گا ضرور!“

”ہاں انس راج! سردار لیکن کب؟ کب؟ یہ بات سردار معلوم کرنا چاہے گا اور یہ ہی بات جہیں مجھے بتانا ہے۔ سردار۔“ اس نے آواز دبا کر اضافہ کیا۔ ”یہاں تمہارے بہت سے دشمن ہیں۔ یہاں تمہیں خطرہ لاحق ہے۔ کیونکہ کسی بھی غیر علاقائی شخص کی اس علاقے میں آمد خلاف قانون ہے۔

چنانچہ اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو تو سردار کو کل یہ بتانے کیلئے تیار رہو کہ روتا نو جس سے سردار بے حد محبت کرتا ہے یہاں کب آ رہا ہے اور یاد رکھو کہ روتا نو کو بہت جلد اور ٹھیک اسی دن یہاں پہنچنا ہے۔ جس دن کا نام تم سردار کو بتاؤ گے۔ اگر ایسا نہ ہوا اور روتا نو ایک دن کی تاخیر سے بھی یہاں پہنچا تو تم اس قابل نہ ہو گے کہ اس کی باتیں سن سکو اور اس سے کچھ کہہ سکو۔

انس راج! میں تمہارا دوست ہوں اور اسی لئے تمہیں یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ بس لوگاٹ تمہارا دوست وہ کہہ چکا جو اسے کہنا تھا۔ ”پھر لوگاٹ اٹھا اور مزید کچھ کہے بغیر جھوپیڑی سے اور پھر باڑ کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر پہرہ دیتے ہوئے سنتری نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دے دیا۔ میں بھی اٹھا اور غصے سے جھوپیڑی میں ٹپٹپٹے لگا۔

”جانتے ہو۔ وہ بڑھا بندر کیا کہہ رہا تھا؟“ میں نے لیوشن سے کہا۔ ”وہ کہہ گیا ہے کہ ہمیں سردار کو یہ بتانے کیلئے تیار رہنا چاہئے کہ وہ بے وقوف بڑھا جھگر یہاں کب پہنچ رہا ہے اور اگر ہم نے یہ نہ بتایا اور مقررہ دن وہ بے وقوف بڑھا یہاں نہ آیا تو پھر جمع سب کو ذبح کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ بھینا ان لوگوں نے پہلے سے طے کر رکھا ہے۔“

”یہ واقعی برا ہوا۔“ لیوشن بولا۔ ”ظاہر ہے کہ فیذا“ میں کوئی ایکسپریس ریلیں نہیں چلتیں اور اگر چل رہی ہوتیں تب بھی یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ جھگر کب ریل میں سوار ہو جائے گا۔ لیکن میں سوچتا ہوں۔ جھگر کا وجود ہے بھی کہ نہیں۔“

”وجود تو ہے یا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں کہتا ہوں کہ اس کرشن نے ہمارا انتظار کیوں نہیں کیا اور کیوں وہ سؤز تیلیوں کی تلاش میں شمال کی طرف چلا گیا اور اپنی ٹانگ یا گردن توڑ بیٹھا۔ بشرطیکہ ایسی کوئی بات ہوئی ہو.....؟“

اس کیوں کا جواب تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ تم جانو جھگر یا کسی بھی آدی کے ارادے کہنا بہت مشکل تھا۔

اس کے بعد ہم دونوں اپنی اپنی تپائی پر بیٹھ گئے اور خاموشی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ عین اس وقت آرگس جھوپیڑی میں رینگ آیا اور سامنے پالٹی مار کر بیٹھ گیا۔ جھوپیڑی کا دروازہ لند تھا اور آرگس اپنی دونوں ٹانگوں پر چل کر اندر آ سکتا تھا۔ لیکن وہ چاروں ہاتھوں اور ٹانگوں پر چل کر جھوپیڑی میں داخل ہوا تھا۔ خدا جانے اس میں اس کی کیا مصلحت تھی۔

”کیا بات ہے بد صورت مینڈک؟“ میں نے پوچھا کہ پوچھا۔ کیونکہ اس وقت وہ مینڈک کی طرح ہی دکھائی دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے جیڑوں کے نیچے کی جلد بھی مینڈک کی طرف ال رہی تھی۔

کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ سچ کہا تھا۔“

”آرگس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔

”ہیں۔ فونا کی پیش گوئی بکواس! اس کا سانپ جھوٹا! آہ باس بہت زیادہ عیسائی بننے سے پہلے ہی اگلے سیدھے خیالات آدمی کا دماغ خراب کر دیتے ہیں! اب میں تمہارے والد شلوکا کرائی کا مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے عیسائی تو بنایا، لیکن اتنا بہت سا عیسائی نہیں بنایا کہ میں اچھے برے جادو میں تمیز کرنا بھول جاؤں۔ ہیں! فونا کا سانپ جھوٹا اور وہ بھی اس کے بعد کہ ہم اپنے ایک شکاری کو اس سفر فون کر چکے ہیں؟ ہاں اس کو جس کا نام فونا کے سانپ نے اسے بتا دیا تھا۔“ وہ مسکرایا۔

بہر حال باس معاملہ یوں ہے یا تو تم بڑے اخلاق سے فونا سے پوچھو یا ہم سب مارے جائیں گے۔ مجھے تو مرنا اتنا برا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ میں بوڑھا ہوں۔ لیکن مرنے کے بعد دوسری دنیا میں جو ان بن کر اپنی زندگی شروع کر دوں گا۔

لیکن باس! تمہیں کراں خیال کرنا چاہئے وہ غریب ویسے ہی ادھ موا ہو رہا ہے اور پھر جب اسے قتل کیا جا رہا ہوگا تو وہ کیسا زبردست شور چائے گا کہ ہمارے کان پک جائیں گے۔ بشرطیکہ اس کا شور سننے کیلئے ہم زندہ رہے۔“ اور جس طرح اندر ریگ آیا تھا اسی طرح باہر ریگ گیا۔

”یہ عجیب مصیبت ہے۔“ میں نے لیوٹن سے کہا۔ ”چند اتفاقات سے قطع نظر میں جانتا ہوں کہ ان سیاہ قاموں کا جادو محض ڈھکوسلا ہے۔ اس کے باوجود مجھے مشورہ دیا جاتا ہے کہ میں ایک وحشی سے درخواست کروں کہ مجھے وہ بات بتائے جو یقیناً خود اسے بھی معلوم نہیں یہ تو بڑی ذلیل بات ہے۔ عیسائی اصول کے سراسر خلاف ہے۔“

لیوٹن نے اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ہنس راج یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ یہ ڈھکوسلا ہے۔ ہمارے سامنے بہت سے معجزات کا ذکر کیا گیا ہے اور اگر معجزات کا دور گزرنا نہیں ہے تو پھر وہ اس تاریک براعظم میں بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں جو تمہارے دل میں ہے۔ چنانچہ بحث فضول ہے۔ لیکن اگر تم فونا سے پوچھنے میں ذلت سمجھتے ہو تو میں اس سے پوچھوں گا۔ اس کا پتھر دل میں موم کر دوں گا۔ کیونکہ تم جانو ہم دوست ہیں اور اسے اپنا جادو کا پلندہ کھولنے پر مجبور کر دوں گا۔“

اور لیوٹن بھی چلا گیا۔

+++

”باس کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں؟“ بولا۔

”شاید۔“ میں نے جواب دیا اور میرے خیال میں جلد ہی تم بھی پھنس جاؤ گے۔ اور ہولوں بھالے کی نوک پر تڑپ تڑپ کر کر دیکھیں بدلتے نظر آؤ گے۔“

”افو! بڑے چوڑے پھل ہیں ان کے بھالوں کے چنانچہ وہ جسم میں کافی لمبا چوڑا سوراخ پیدا کر دیں گے۔“ وہ سر ہلا کر بولا اور میں اس ارادے سے اٹھا کہ اس کے ایک لات رسید کر دوں کیونکہ اس کی باتیں اور خیالات ہمیشہ کی طرح لرزہ خیز تھا۔

”باس!“ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”میں سن رہا تھا۔ جھونپڑی کی دیوار میں ایک بہت اچھا سوراخ ہے اور اگر کوئی آدمی اس کے قریب لیٹ کر آنکھیں بند کر لے اور یوں ظاہر کرے کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے تو پھر وہ ساری باتیں بڑے حرے سے سن سکتا ہے۔ تو باس! میں نے وہ تمام باتیں سنیں اور زیادہ تر بھی ہیں جو تمہارے اور ایک آکھ والے جنگلی اور پھر تمہارے اور باس لیوٹن کے درمیان ہوئیں۔

”اچھا تو پھر کیا بات تیری سمجھ میں آئی؟“

پھر یہ باس کہ اگر ہم نہیں چاہتے کہ اس منحوس علاقے میں جہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں مارے جائیں تو پھر باس! تمہارے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ ٹھیک کون سے دن اور ٹھیک کس وقت روتا نو یہاں پہنچ رہا ہے۔“

”زرد گدھے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم نے پھر وہی کھیل شروع۔“

لیکن میں دفعتاً خاموش ہو گیا۔ کیونکہ مجھے خیال آیا کہ مجھے بلاوجہ ہی غصہ آ رہا تھا اور یہ کہ آرگس کیا کہتا ہے؟“

”باس! فونا زبردست وحش ڈاکٹر ہے۔ اس کا استاد عظیم ترالی تھا اور کہتے ہیں کہ ترالی کے بعد شلووؤں میں صرف فونا ہی وہ وحش ڈاکٹر ہے جس کا سانپ ایک دم سیدھا اور سب کے سانپوں سے زیادہ پرتوت ہے۔ اس نے تم سے کہا تھا کہ روتا نو! اپنی زخمی ٹانگ لے کئی جگہ پڑا ہائے دائے کر رہا ہے اور یہ کہ وہ تم سے یہاں آئے گا۔ چنانچہ بے شک فونا یہ بھی بتا سکتا ہے کہ روتا نو کب آئے گا۔ میں خود اس سے پوچھتا لیکن میری وجہ سے وہ اپنے سانپ کو تکلیف نہ دے گا۔

چنانچہ باس خود تمہیں اس سے پوچھنا چاہئے اور شاید وہ بھول جائے گا کہ تم نے اس کے جادو کا مذاق اڑایا تھا اور یہ کہ اس نے قسم کھائی تھی کہ اب وہ تمہارے لئے اپنا جادو نہ جگاے گا۔“

”بے وقوف اندھے میں نے جیس بہ جیس ہو کر کہا میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ فونا نے روتا نو

ریہ ہی سانپ اسے بتا سکتا ہے کہ روتا نو! یہاں کب تک پہنچ رہا ہے۔ وجہ اس نے یہ بتائی ہے کہ مسٹرئس راج نے اس کا اور اس کے جادو کا مذاق اڑایا تھا۔

چنانچہ اس نے اس وقت قسم کھائی تھی کہ وہ مسٹرئس راج اور ان کے کسی بھی ساتھی کیلئے اپنا دونہ جگائے گا۔ چنانچہ یہ اپنی قسم توڑنے کے بجائے مرجانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ بس تو یہ کہا ہے اس نے اور میرے خیال میں مسٹر لیوٹن اس نے جو کچھ کہا ہے وہ کافی سے زیادہ ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ لیوٹن نے کہا۔ ”سردار فونا سے کہو کہ میں سمجھتا ہوں اور اس کا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے ساری باتیں ایسی تفصیل سے مجھے سمجھائیں اور پھر اس سے پوچھو کہ معاملہ بہت اہم ہے۔ چنانچہ اس مصیبت سے نکلنے کی کیا کوئی راہ نہیں.....“

کراں نے اس کا ترجمہ فونا کو سنایا۔ وہ بہت شلو زبان بول لیتا تھا۔ ”صرف ایک راستہ ہے۔ فونا نے اپنے تفتوں میں سوار کی چنگی چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ اور وہ یہ کہ خودئس راج مجھ سے خواست کریں۔ ئس راج! میرے دوست ہیں۔ چنانچہ ان کی خاطر میں وہ باتیں بھلا دوں گا جو کسی برے کی زبان نے ادا کی ہوتیں۔ تو میں کبھی نہ بھلا سکتا۔ اگر ئس راج آئے اور میرا مذاق اڑائے مداخلتوں نے مجھے سے جادو جگانے کی درخواست کی تو میں سب کی خاطر ایسا کروں گا۔ حالانکہ میں متا ہوں کہ ئس راج! اس پورے عمل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ان کے نزدیک تو یہ ایک ہوا کے ٹوٹنے کی طرح ہے۔ جو خاک و دھول کو بے مقصد اٹھائے بے معنی طور پر ادھر ادھر دوڑاتا ہے اور پھر ک دھول بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن ایسا سمجھتے وقت غلط فہمی قائم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ہی ہوا ہے جو ک اڑاتی ہے۔ ہمیں زعمہ رکھے ہوئے ہے اور اس کے نزدیک ہم بھی خاک اور دھول کی طرح ہی ہیں۔“

اور اب ایک سوچ میں پڑ گیا۔ فونا کے ان الفاظ نے جن کا صرف ترجمہ میں نے کراں کی زبانی سنا اور حاشیوں کے ساتھ سنا تھا۔ میرے دل میں ایک خاص اثر کیا۔ مجھے کیا حق تھا۔ فونا کے فلق کوئی فیصلہ کرنے کا کون ہوتا ہوں میں اس کے وحشیانہ عطیے کے متعلق رائے قائم کرنے والا بے کیا حق کہ میں اس کا مذاق اڑاؤں اور یہ ثابت کر دوں کہ وہ خود اور اس کا جادو ڈھکوسلا ہے؟

چنانچہ میں باڑ کے دروازے میں سے گزر کر اسے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”فونا..... میں نے کہا۔“ اتفاقاً میں نے تمہاری باتیں سن لی ہیں مجھے افسوس ہے کہ کرشن میں نے تمہارا اور تمہاری باتوں کا مذاق اڑایا تھا میں نہیں جانتا کہ تمہارا جادو سچا ہے یا جھوٹا تاہم میں ہارا احسان مند رہوں گا۔ اگر تم یہ بتا سکتے ہو کہ روتا نو یہاں آ رہا ہے یا نہیں اور اگر آ رہا ہے تو کب

تھوڑی دیر بعد ہی مجھے آواز دے کر باہر بلایا گیا۔ سردار ہولون جوی نے ہمارے لئے ایک بھیڑ، دودھ، غلہ، مقامی شراب اور چند دوسری چیزیں اور گدھوں کیلئے چارہ بھیجا تھا۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ جب تک ہم ہولون لوگوں میں رہے ہمیں قربانی کے بکروں کی طرح کھلایا پلایا جاتا رہا۔ کیونکہ ہولون علاقہ افریقہ کا تھا علاقہ تھا۔ جہاں بھوک اور قحط کے نام سے کوئی واقف نہ تھا۔

یہ چیزیں قبول کرنے کے بعد میں نے سردار کا شکر یہ ادا کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ ہم دوسرے دن تحائف لے کر اس کے دربار میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اس طرح فرصت پا کر میں کراں کی تلاش میں چلا کہ اس سے کہوں کہ وہ بھیڑ ذبح کر کے گوشت پکانے کا انتظام کرے۔ تھوڑی سی تلاشی کے بعد میں نے اس کی آواز سنی جو زسوں کی اس باڑ کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ جو دو جھوپڑیوں کے درمیان حد فاصل قائم کرتی تھی۔ اس وقت کراں، لیوٹن اور فونا کے درمیان حترجم کی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔

”مسٹر لیوٹن! کراں کہہ رہا تھا۔“ یہ شلو شخص اعلان کر رہا ہے کہ اس نے ہرزہ بات سمجھ لی ہے جو آپ سمجھا رہے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ہم سب کے سب اس وحشی شخص جوی کے ہاتھوں ذبح کر دیئے جائیں گے۔ حالانکہ ہم نے اسے بتایا کہ وہ غیر ملکی شخص جس کا نام روتا نو ہے اور جس سے وحشی جوی کو بہت محبت ہے۔ یہاں کب پہنچ رہا ہے۔ یہ شلو یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنے جادو کے زور سے یہ بھی بتا سکتا ہے کہ یہ واقعہ کب وقوع پزیر ہوگا۔“

مسٹر لیوٹن! حالانکہ یہ بات کہتے ہوئے میں شرم سے سرخ ہوا جا رہا ہوں۔ لیکن سیاہ فام وحشی آپ کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئی تو یہ شخص آپ پر قربان ہو جائے گا۔ یعنی آپ کی زندگی بچانے کیلئے اور یہ کہ آپ کی درخواست رد کرتے ہوئے اس کا دل دو ٹوکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کیلئے تمہاری درخواست ٹھکراتا ضروری ہو گیا تھا اور وہ اپنے اس جانور کو نہ بلانے کا جسے یہ اپنا سانپ کہتا ہے۔ حالانکہ میں نہیں جانتا کہ اس سے اس سیاہ فام کا کیا مطلب ہے

آ رہا ہے۔ فوٹا اب تمہیں اختیار ہے کہ یہ بات معلوم کرو یا نہ کرو میں کہہ چکا۔“

”بیٹا ہنس راج! تم نے کہا اور میں نے سنا“ آج رات میں اپنی سانپ کو بلاؤں گا! البتہ یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا جواب دے گا یا جواب دے گا بھی یا نہیں۔“

اور اس رات اس نے ضروری رسومات ادا کرنے کے بعد اپنے سانپ کو بلایا۔ میں اس دم میں شریک نہ تھا۔ البتہ لیوٹن تھا۔ چنانچہ فوٹا کے پراسرار سانپ نے اعلان کیا کہ اس رات کے تیسرے دن اور ٹھیک سورج غروب ہونے کے وقت روتانو“ فیرو“ ٹاؤن میں پہنچ جائے گا۔ چونکہ یہ پیش گوئی جمعہ کے دن کی گئی تھی اس لئے ہمیں امید کرنی چاہئے کہ روتانو عرف جگر پیر کے دن اور شام کے کھانے کے وقت اس ہستی میں پہنچ جائے گا۔“

”بہت اچھا“ میں نے لیوٹن سے کہا اور اب خدا کیلئے اس واہیات پیش گوئی کے متعلق مزہ کچھ نہ کہو! کیونکہ اب میں سونا چاہتا ہوں۔“

دوسرے دن علی الصبح ہم نے اپنے بکس کھولے اور سردار جوسی کیلئے چند عمدہ اور خوبصورت تحائف اس امید کے ساتھ منتخب کئے کہ اس کا شاہی دل نرم پڑ جائے اور تحائف یہ تھے۔ کپڑے کا ایک تھان چند چاقو، ایک میزک بکس، ایک سستا امریکی پستول اور بہت سے خلال اس کے علاوہ اس کی بیویوں کیلئے۔ بہترین اور فیشن ایبل موتیوں کی مالائیں۔ ہم نے جونی اور ٹوٹی کے ہاتھ جوسی کو بھجوائے۔

ٹوٹی اور جونی کے ساتھ چند سنتری بھی روانہ ہوئے۔ مجھے امید تھی کہ ٹوٹی اور جونی چونکہ ہولون ہی تھے۔ اس لئے وہ اپنے ہم وطنوں کے دماغوں میں بہت سی باتیں اتار دیں گے کہ ہم کتنے سیدھے اور کتنے شریف اور صلح پسند انسان ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خود میں نے ٹوٹی اور جونی کو ہدایت کردی تھی کہ وہ یہ بات ہولون سردار اور اس کے مشیروں کے ذہن نشین کر دیں۔

چنانچہ آپ ہماری حیرت اور خوف کا اندازہ نہیں لگا سکتے جبکہ تحائف روانہ کرنے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد ٹوٹی اور جونی کے بجائے ہولون سپاہیوں کی ایک لمبی قطار دروازے میں داخل ہوئی۔ جونی اور ٹوٹی تو کہیں غائب تھے اور اس قطار میں ہر ایک سپاہی ان چیزوں میں سے ایک ایک تحائف اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ قطار کا سب سے آخری سپاہی تین تین انچ کے خلال اپنے سر پر یوں رکھے ہوئے تھا۔ جیسے وہ ایندھن کا گتھا ہو۔ یکے بعد دیگرے یہ تحائف ہمارے سامنے رکھ دیئے گئے اور پھر ان سپاہیوں کے اسر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”عظیم سیاہ فام جوسی کو آپ لوگوں کے تحائف کی ضرورت نہیں۔“

”اچھ۔ چھا۔“ میں نے کہا۔ کیونکہ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اب اگر وہ سرخ کر بھی مر جائے گا تب بھی یہ تحائف حاصل نہیں کر سکے گا۔

چنانچہ یہ لوگ مزید کچھ کہے بغیر چلے گئے اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی لوگات نمودار ہوا اور اس دفعہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ پچاس مسلح سپاہی تھے۔“

”سردار تمہارا منتظر ہے۔“ اس نے مصنوعی بناشت سے کہا۔ اور میں تمہیں سردار کے پاس لے جانے آیا ہوں۔“

”سردار نے ہمارے تحائف کیوں لوٹا دیئے؟“ میں نے سامنے رکھے ہوئے تحائف کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”اس لئے کہ لوزی نے اس جادوئی ڈھال کے بارے میں سردار کو بتا دیا ہے۔“

”تو اس سے کیا؟“

”چنانچہ سردار نے کہا ہے کہ وہ اس طرح کے تحائف نہیں چاہتا جن سے ان کے ہال جل جائیں۔ لیکن چلو چلو وہ خود تمہیں سب کچھ سمجھا دے گا۔ جلدی چلو اگر عظیم ہاتھی کو زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے تو اسے غصہ آ جاتا ہے اور چنگھاڑتا ہے۔“

”واقعی وہ چنگھاڑتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”اور ہم سے کتنے آدمیوں کو چلنا ہے۔“ سب نے انس راج سردار وہ تم میں سے ہر ایک سے ملنا چاہتا ہے۔“

”لیکن مجھ سے تو ملنا نہ چاہتا ہوگا۔“ قریب کھڑے ہوئے کرا ل نے کہا۔ ”اس کے علاوہ مجھے کھانا بھی تو تیار کرنا ہوگا اور اس لئے میرا یہیں ٹھہرنا ضروری ہے۔“

”ہاں..... تم سے بھی۔“ لوگان نے جواب دیا۔ ”سردار اس شخص سے تو خصوصاً ملنا چاہتا ہے جو قدس مشروب بناتا ہے۔“

”چونکہ ہم مجبور تھے اور اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس لئے ہم سب کے سب باہر گئے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم پوری طرح سے مسلح تھے۔ باہر آئے تو ہولون سپاہیوں نے میں اپنے حلقے میں لے لیا۔ ہمارے اس کوچ کو اثر انگیز بنانے کیلئے میں نے اسے ڈرامائی رنگ سے دیا اور وہ اس طرح کہ سب کے آگے آگس تھا۔ جس نے اپنے سر پر وہ میزک کیس اٹھا رکھا۔ جو سردار جوسی نے لوٹا دیا تھا۔ میزک بکس ”وطن وطن پیارے وطن۔“ کی اثر انگیز دھند بجا رہا۔ اس کے پیچھے لیوٹن تھا۔ جس نے جھنڈا اٹھا رکھا تھا اور جھنڈا ایک ہانس کے سرے سے بندھا ہوا اور اس کے پیچھے میں تھا اور میرے ساتھ شلو و شکاری تھا۔ پیچھے لرزتا کانپتا کرا ل چل رہا تھا۔



اس طرف ایک وسیع و عریض میدان تھا جس کے سامنے والے سرے پر چند سایہ دار درخت لے ہوئے تھے اور ان درختوں کے پیچھے ایک غیر معمولی طور پر بڑی جمو پیڑی بلکہ جمو پیڑا تھا اور پیڑے کے دروازے سے آگے ایک تپائی پر ایک ادھیڑ عمر کا موٹا شخص بیٹھا ہوا تھا جس کے ماتھے پر حاجی اور غضبناکی کی سلوٹیں تھیں اور اس کے گلے میں دانوں کی ایک مالا تھی اور کمر کے گرد کسی رے کی کھال کا موچھا بندھا ہوا تھا۔ بس یہ ہی تھا اس کا کل لباس۔

”سردار ہولون جوی۔“ لوگاٹ نے سرگوشی میں مجھے مطلع کیا۔

جوی کے پہلو میں ایک کبڑا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ لوزی تھا۔ اس دفعہ اپنی کھوپڑی پر بھی سرخ رنگ چڑھ رکھا تھا۔ سردار کے دائیں بائیں اور اس کے پیچھے سردار شیر تھے۔

کسی قسم کا اشارہ پا کر یا شاید مقررہ حد تک پہنچنے ہی سارے ہولون سپاہی لوگاٹ سمیت ہاتھوں بندوں پر گر گئے اور چوپایوں کی طرح آہستہ آہستہ آگے ریگٹے لگے۔ وہ لوگ ہمیں بھی یوں ریگٹے کر رہے تھے۔ لیکن میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر ایک دفعہ ہم جھکے تو ہمیشہ جھکے ہی رہیں گے۔

چنانچہ میں نے حکم دیا اور ہم لوگ سینہ تان کر سر بلند کر کے اور بڑی تمکنت سے سردار کی طرف لے اور آخر کار ہولون لوگوں کے سردار ”عظیم ہاتھی“ اور حسین کا لے جوی کے سامنے تھے۔

بہت دیر تک سرداری جوی ہمیں اور ہم جوی کو گھورتے رہے اور اس دوران کسی نے کچھ نہ کیا۔

کار ہولون سردار ہماری مکمل ترین خاموشی سے مرعوب ہو گیا اور تب اس نے اپنی زبان کھولی اور کہا۔

”میں جوی سردار ہوں اور میں چٹھاڑتا ہوں۔ چٹھاڑتا ہوں۔“ ہولون سردار جب بھی اس سے گفتگو کا آغاز کرتے اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ میرے خیال میں گفتگو شروع کرنے کا یہ طریقہ نہ صرف بے حد قدیم تھا بلکہ محترم و مقدس بھی سمجھا جاتا تھا۔

چند ثانیوں تک خاموش رہنے کے بعد میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہم انسان ہیں۔ مہذب دنیا سے آئے ہوئے انسان ہم نہ دھاڑتے ہیں اور نہ دھاڑیں گے، لیکن ہم کسی بھی کا مقابلہ بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔“

”میں روند سکتا ہوں۔“ جوی نے کہا۔

تو ہم بھی اپنے بچاؤ کیلئے بڑی سے بڑی قوت سے لڑ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا اور

اور سب سے آخر میں ہولون سپاہی ہمارے دونوں گدھوں کو کھینچنے لارہے تھے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ سردار نے خصوصی طور سے حکم دیا تھا کہ گدھوں کو ضرور لایا جائے۔

بڑا ہی عجیب اور انوکھا دستہ تھا۔ یہ جو بادشاہ کے دربار کی طرف جا رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا۔ بہر حال ہماری اس ترتیب نے ہولون لوگوں کو بھی بے حد متاثر کیا۔ غالباً ”وطن پیارے وطن“ کے نغمے نے لیکن جس نے انہیں سب سے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ گدھے تھے اور جب ان میں سے ایک نے ریگٹنا شروع کیا تو ہولون لوگوں کی جو ہمیں دیکھنے کیلئے راستے کے دونوں کناروں پر کھڑے ہوئے تھے حیرت اور خوف کی انتہا نہ رہی۔

”ٹوٹی اور جونی کہاں ہیں؟“ میں نے لوگاٹ سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے جواب دیا۔ شاید انہیں انکے دوستوں کے پاس جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ہی ہم سرداری پاڑ کے دروازے کے سامنے تھے اور یہاں جب ہولون سپاہیوں نے ہم سے ہمارے ہتھیار لے لئے تو کم سے کم میری مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ ہندوؤں کے علاوہ انہوں نے وہ خنجر بھی اپنے قبضے میں کر لئے جو نیاموں میں تھے۔

میں نے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان ہتھیاروں کے بغیر ہم کسی بھی جگہ جانے کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن میری یہ صدائے احتجاج صدا لہجہ اثابت ہوئی۔ جواب یہ دیا گیا کہ سردار کے حضور کوئی بھی ہتھیار حتیٰ کہ معمولی سا ڈنڈا لے کر بھی جانا سخت گستاخی ہے۔ فونا اور شولو سپاہی اپنے ہتھیار دینے کیلئے تیار نہ تھے اور وہ مقابلے کیلئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ مجھے خوف تھا کہ کہیں جھگڑا نہ ہو جائے اور پھر اس جھگڑے کا خاتمہ خود ہمارے قتل عام پر ہوتا۔ بے شک ہولون ہندوؤں سے ڈرتے تھے۔ لیکن سینکڑوں دھشیوں کا مقابلہ کب تک کر سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں کو ہتھیار دے دینے کا حکم دیا۔

لیکن آج پہلی مرتبہ فونا میری حکم عدولی کا ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے ایک خیال آ گیا اور میں نے فونا کو یاد دلایا کہ اس سانپ کے بقول روتاؤ! یہاں پہنچ رہا اور یہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور پھر میں نے دیکھا کہ ہولون ہماری ہندو قیوں لے جا رہے تھے خدا جانے کہاں؟

اس کے بعد ہولون سپاہیوں نے بھی اپنے بھالے دروازے کے باہر رکھ دیئے اور ہم صرف جھنڈا اور میوزک لے کر سرداری کراں میں داخل ہوئے۔

سوچنے لگا کہ ہم تو نیتے ہیں۔ کس طرح چہرہ چاڑھ کو سکتے ہیں۔

”یہ کیا چیز ہے۔“ جوی نے جھنڈے کی طرف اشارہ کیا۔

”جو دنیا پر سایہ کئے ہوئے تھے۔“ میں نے بڑے فخر سے جواب دیا۔ میرے اس جواب سے مرعوب کر دیا۔ حالانکہ وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکا تھا۔ تاہم اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ کئے ٹکلوں کا چھاتا جوی کے سر پر کھول دے۔ مبادا اس جھنڈے کا سایہ اس پر بھی پڑ جائے۔

”اور وہ کیا چیز ہے؟“ اس نے میوزک بکس کی طرف اشارہ کیا۔ ”جو زندہ نہیں ہے لیکن!

رہی ہے۔“

”یہ چیز ہمارا جنگی ترانہ گا رہی ہے۔ میں نے جواب دیا۔“ ہم نے ہر چیز جہیں تختہ بھیجی تم لیکن تم نے لوٹا دی۔ اے سردار جوی! تم نے ہمارے تحائف کیوں قبول نہ کئے اور یکا یک بغیر تمہید کے اس کو غصہ آ گیا۔

”اے اجنبی سردار! وہ گرجا۔“ تم بغیر بلائے یہاں کیوں آئے ہو۔ کیا تم جانتے نہیں میرے علاقے میں گھس پڑنا خلاف قانون ہے؟ کیا تم جانتے نہیں کہ یہاں صرف ایک ہی اجنبی آئے کی اجازت ہے اور وہ ہے میرا دوست! میرا بھائی روتا تو! جس نے چاقو کی نوک سے مجھے م عطا کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم انسانوں کے تاجر ہو۔ تم یہاں اس لئے آؤ ہو کہ میر قبیلے کے لوگوں کو چرا کر لے جاؤ اور پھر انہیں بیچ دو۔ جب تم میرے ملک کی سرحد پر پہنچے تو تمہار ساتھ بہت سے غلام بھی تھے۔ لیکن تم نے انہیں کہیں بھیج دیا۔

تم قتل کروئے جاؤ گے۔ ہاں۔ تم تو اپنے آپ کو..... بہت بہادر کہتے ہو۔ شیر کہتے ہو! رنکا ہوا جھنڈا بقول تمہارے دنیا پر سایہ کر رہا ہے۔ تمہاری ہڈیوں کے ساتھ سڑک لگ جائے گا۔ رہا پو جو جنگی گیت گاتا ہے تو اسے میں توڑ پھوڑ کر پھینک دوں گا اور پھر وہ حیرت انگیز تیزی سے اٹھا۔ مونے شخص کو اتنی تیزی سے اٹھتے کم سے کم میں نے تو آج تک نہیں دیکھا اور تھپڑ مار کر آگسے پر سے میوزک بکس گرا دیا۔ بکس زمین پر گرا اور چند ثانیوں تک ”ٹین مٹاں“ کرنے کے بعد خا ہو گیا۔

”واہ..... واہ..... لوزی ٹرایا۔“ اے عظیم سردار! روند کر رکھ دو ان کے جادو کا خاتمہ کر دو۔ اجنبی اور جادوگروں کا۔ انہوں نے میرے بال جلا دیئے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ صورتحال ا نازک تھی۔

کیونکہ جوی خطرناک لگا ہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ سپاہیوں کو حکم دینے

لہ ہمارا خاتمہ کر دیں۔ چنانچہ میں نے بڑی جرأت سے کام لے کر جلدی سے کہا۔

”اے سردار تم نے روتا نو کا ذکر کیا ہے۔ اس روتا نو کا جو دج ڈاکٹروں کا بھی باپ ہے اور جس جہیں چاقو کی نوک سے نئی زندگی بخشی ہے اور تم کہتے ہو کہ وہ تمہارا بہت اچھا دوست ہے اور لہ بھائیوں کی طرح۔ اے سردار یہی روتا نو! ہمارا بھی اچھا دوست ہے اور اس کے کہنے سے ہم ل آئے ہیں۔ وہ بہت جلد ہم سے ملنے کیلئے یہاں آنے والا ہے۔“

”اگر روتا نو تمہارا دوست ہے تو پھر تم بھی میرے دوست ہو۔“ جوی نے جواب دیا۔ کیونکہ اس میں وہ بھی حکومت کرتا ہے جس طرح کہ میں کرتا ہوں کیونکہ اس کی رگوں میں میرا اور میری ماں میں اس کا خون ہے۔ لیکن تم جھوٹ بکتے تھے۔ روتا نو انسانوں کے تاجروں کا دوست نہیں تا۔ کیونکہ اس کا دل چمکدار اور صاف ہے۔ لیکن تمہارا دل غلیظ اور کالا ہے۔ تم کہتے ہو کہ وہ تم ہمیں ملاقات کرے گا۔ بہت اچھا۔ کب ملاقات کرے گا وہ تم سے؟ بتاؤ مجھے اور اگر وہ جلد ہی لے والا ہو تو میں اپنا ہاتھ روک رکھوں گا۔

اور تمہارے متعلق اس سے پوچھوں گا اور اگر اس نے تمہاری برائی نہ کی تو بے شک تم زندہ رہو

اور اب میں شش و پنج میں پڑ گیا اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ جوی کا غصہ نہ تو بے قاعدہ نہ ہی خود بخود جوی کو انہیں کو لازم دیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنے طور پر ہمیں پردہ فروش یقین کر لیا چنانچہ وہ ہم سے جتنی نفرت کرتا اور جتنا غصہ کرتا وہ حق بجانب تھا۔ جب میں اپنے دماغ پر زور رہا تھا کہ شاید کوئی ایسا جواب سوجھ جائے جو مناسب و موزوں اور جوی کیلئے ناقابل قبول اور خود ے لئے گویا حفاظت کا پردانہ ہو تو یہ دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا کہ فونانے آگے بڑھ کر سردار یام کیا۔

”تم کون ہو؟“ جوی چٹکھاڑا۔

”اے سردار میں سپاہی ہوں جیسا کہ میرے جسم کے زخموں سے ظاہر ہے اور فونانے اپنے پر زخموں کے نشانات اور اپنے کئے ہوئے نکتے کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں ان لوگوں کا سردار ہوں گوں کی کمر کے قطروں سے تمہارا قبیلہ چھوٹا ہے اور میرا نام فوننا ہے۔ فوننا تم سے اور تمہارے جیسے بھی شخص سے دودھ ہاتھ کرنے کیلئے تیار ہے۔ اس سے بھی جسے تم مقابلے کیلئے منتخب کرو فوننا اس کا۔ اور پسند کرو۔ تو تمہارا بھی خاتمہ کرنے کیلئے بھی تیار ہے۔ کوئی ماں کا لالہ جو زندگی پر موت کو دیتا ہو اگر ہے تو میدان میں آئے؟“

”کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ یہ چوڑی چھاتی والا شولواں وقت بڑا ہی خونخوار نظر آ رہا تھا۔“

اور میں وچ ڈاکٹر ہوں۔ ان عظیم ترین وچ ڈاکٹروں میں سے ایک جو مستقبل کے بنا دروازے کھول دیتے ہیں اور وہ پڑھ لیتے ہیں جو مستقبل کے بطن میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا۔ جو تم نے ہنس راج سے پوچھا۔ اس ہنس راج سے جو ایک انسان ہے۔ جو بیک ہے اور میں جس کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ ہاں میں ہنس راج کی زبان ہوں! میں جواب دوں گا۔ سنو سردار وہ شخص جو تمہارا خون بدل بھائی ہے۔

ہاں۔ وہی۔ روتانو آج سے دوسرے دن سورج غروب ہونے کے وقت یہاں آئے گا۔ میں کہہ چکا ہوں۔“

جوسی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”بے شک“ میں نے کہا۔ کیونکہ اس وقت میرا کچھ نہ کچھ کہنا ضروری تھا۔

”روتانو! آج سے دوسرے دن سورج غروب ہونے کے آدھے گھنٹے بعد یہاں پہنچ جا گا۔“

کسی غیبی قوت نے یہ آدھے گھنٹے بعد کے الفاظ میری زبان سے ادا کروا دیئے تھے اور نے آخر کار ہماری جانیں بچائیں۔

جوسی چند خاموشیوں تک لوزی سے جس سے مجھے نفرت ہو گئی تھی اور ایک آنکھ والے بڑے لوگات سے مشورہ کرتا رہا اور ہم لوگ خاموش کھڑے جوسی کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر کار جوسی نے ہمیں مخاطب کیا۔

”اے مہذب دنیا کے لوگو! ہمارے وچ ڈاکٹر لوزی جس کے بال تم نے اپنے جادو دے دیئے ہیں۔ یوں کہتا ہے کہ اس وقت قتل کر دینا مناسب ہوگا۔ کیونکہ تمہارے دل صاف نہیں ہیں! میرے اور میرے لوگوں کے خلاف سازش یا شرارت کرنے والے ہو۔ میں لوزی سے متفق ہوں لیکن میری فوج کا افسر لوگات کچھ اور ہی کہتا ہے۔ لوگات سے میں خفا ہوں! کیونکہ اس نے میری کفیل نہ کی یعنی تمہیں ہمارے ملک کی سرحد پر قتل نہ کر دیا۔“

بہر حال لوگات مجھ سے درخواست کرتا ہے کہ میں اپنا ہاتھ روک رکھوں۔ اول تو اس نے اس پر سحر کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ تم کو پسند کرنے لگا ہے اور دوم اس لئے کہ اگر تم نے جھوٹ بولا ہے۔ حالانکہ میں تو اسے جھوٹ ہی سمجھتا ہوں اور میرے بھائی روتانو کے کہنے سے یہاں آئے۔

پھر جب روتانو یہاں آئے گا تو تمہاری لاشیں دیکھ کر اسے افسوس ہوگا اور پھر وہ تمہیں زندہ بھی نہ کر سکے گا۔ چنانچہ معاملہ یوں ہے کہ تو میرے خیال میں آج قتل کئے جاؤ یا چند دنوں بعد اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

تو سنو یہ ہے میرا فیصلہ تم لوگوں کو آج اور کل دوسرے دن کے سورج غروب ہونے تک قید میں رکھا جائے گا اور اس کے بعد تم کو چوک میں لا کر زمین میں گڑے ہوئے ڈنڈوں کے ذریعے ہانڈہ دیا جائے گا اور تم وہاں بندھے انتظار کرو گے اندھیرا اترنے کا اور روتانو کے آنے کا۔ تمہارے بتائے ہوئے وقت پر وہ آگیا اور اس نے اعلان کیا کہ تم اس کے بھائی ہو تو ٹھیک ہے۔ اگر وہ نہ آیا یا اس نے کہا کہ وہ تم کو نہیں جانتا تو پھر تیر دن سے تم سب کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور یہ ان آدمی چوروں کیلئے ایک عبرت کا سبق ہوگا۔ جو ہولوں علاقہ میں آنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔“

اپنے پورے بدن میں قہر قہری محسوس کر کے میں یہ ظالمانہ فیصلہ بلکہ حکم سزا سناتا رہا اور پھر میں نے کہا۔

”جوسی! ہم لوگ آدمیوں کو چرانے والے نہیں ہیں بلکہ انہیں آزاد کرانے والے ہیں اور اس کی تصدیق ”ٹوٹی اور جونی کریں گے۔“

”کون ہیں ٹوٹی اور جونی؟“ اس نے بے تعلقی سے پوچھا۔ ”بہر حال کچھ بھی ہو وہ تمہاری ہی طرح جھوٹے ہیں! لیکن میں کہہ چکا ہوں۔ لے جاؤ انہیں خوب کھلاؤ انہیں آرام دو یہاں تک کہ آج کے بعد دوسرے دن کا سورج غروب ہونے میں ایک ایک گھنٹہ باقی رہ جائے۔“

اور ہمیں مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر جوسی اٹھا اور لوزی اور اپنے مشیروں کے ساتھ بڑے بھونپڑے میں چلا گیا۔ ہم بھی پلٹ کر اپنی قیام گاہوں کی طرف چل دیئے اور اس دفعہ سپاہی ہمیں رنے میں لئے ہوئے تھے اور ان کا سربراہ ایک انجینی ہولون تھا۔ جسے ہم نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مردار کے کمال کے باہر کھڑے ہو کر ہم نے اپنے ہتھیار طلب کئے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ سوائے اس کے کہ سپاہیوں نے ہمیں شانوں سے پکڑ کر آگے دھکیل دیا۔



”یہ تو بڑا برا ہوا یاد“ میں نے لمبوشن کے کان میں کہا۔

”کوئی بات نہیں“ اس نے جواب دیا۔ جھونپڑیوں میں بہت سی بندوقیں پڑی ہوئی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہولون گولیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ دفعتاً قید توڑ کر ل پڑیں اور گولیاں چلاتے ہوئے بھاگ پڑیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ یہ لوگ

برداشت نہ کر سکیں گے اور فرار ہو جائیں گے۔“ میں نے لیوٹن کی طرف دیکھا تو سہی، لیکن منہ سے کچھ نہ کہا، کچ تو یہ ہے کہ اس وقت بحث کرنے کا موڈ نہ تھا۔

ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر پہنچے اور ہمیں اندر دھکیل کر سپاہیوں نے باہر ڈیرے ڈال دیئے۔ لیوٹن پر تو جنگ کا بھوت سوار تھا۔ چنانچہ وہ اس جموینڈی میں جا کھسا جس میں ہمارے سامان کے ساتھ بردہ فروشوں کی بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بات!“ اس کی آواز میں آج پہلی دفعہ مایوسی کی جھلک تھی۔ ”بات صرف یہ ہے کہ مردود ہولون ساری بندوقیں اور بارود اٹھالے گئے ہیں۔“

چنانچہ اب ہماری جو حالت تھی وہ خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ اڑتالیس گھنٹوں بعد ہمیں افریقہ کے ایک دور دراز اور گمنام خطے میں ستونوں سے بانہہ کرتیروں سے اڑا دیا جائے گا۔ اگر وہ مجھوں شخص نہ آیا جس کا نام جنگل یاروتا تو تھا۔ جو میرے خیال میں تو مر چکا ہو تو کیا ہوگا؟“

فونا کی پیش گوئی پر بھروسہ کر کے بیٹھا رہنا حقیقت تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے متعلق سوچنا ترک کر دیا اور فرار کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ کئی گھنٹوں کی دماغی پوٹی کے بعد بھی کوئی راہ بھائی نہ دی۔ حتیٰ کہ آگس بھی اپنی تمام بافوق الفطرت عیاری اور تجربات کے باوجود کوئی ترکیب نہ سوچ سکا۔ ہم لوگ نہتے تھے اور وحشیوں میں گھرے ہوئے تھے اور یہ وحشی سوائے لوگاٹ کے ہمیں بردہ فروش سمجھے ہوئے تھے۔ اور بردہ فروشوں سے ان لوگوں کو قلبی نفرت تھی۔ کیونکہ وہ ان کے بیوی بچوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے۔ رہا ان کا سردار جوی جو بے حد متعصب تھا۔ ہمیں قتل کر دینے کیلئے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی حماقت سے ہولون لوگوں کے عظیم کاہن لوزی کو دشمن بنا لیا تھا اور اب مجھے اس بات پر بھی افسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے کرن میں جنگل کا انتظار نہ کیا اور اس کے بغیر ہی روانہ ہو گئے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتا تو ظاہر ہے ہم اس مصیبت میں نہ پھنس جاتے۔ اب کوئی معجزہ ہی ہماری جان بچا سکتا تھا۔

چنانچہ اب ہم اس کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے کہ خدا کو یاد کریں اور موت کو لبیک کہنے کیلئے تیار رہیں۔

البتہ فونا بٹاش رہا۔ اپنے سانپ پر اس کا اعتقاد واقعی اثر انگیز تھا۔ بلکہ اس نے ایک بار پھر اپنا جادو چگانے کی پابلیش کی تھی۔ تاکہ ہمیں یقین ہو جائے کہ اس نے مستقبل دیکھنے میں کوئی غلطی کر

تھی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں اس کے سانپ پر اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ لیوٹن نے اس لئے انکار کر دیا کہ اسے خوف تھا۔ فونا کا سانپ بات بتا کر رہی سہو امید کا بھی خاتمہ کر دے گا۔ پھر وہ مدت بھی ختم ہوگئی جو ہماری آخری صبح کی گویا۔ قیاب تھی۔

اس دن سویرے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ چنانچہ میں طلوع آفتاب کا نظارہ کرنے لگا۔ آج سے پہلے مجھے احساس ہی نہ ہوا تھا کہ طلوع آفتاب کا منظر کتنا مسرور کن ہوتا ہے یا کم از کم کوئی صبح مجھے اتنی حسین معلوم نہ ہوئی تھی۔ شاید اس لئے کہ یہی میری آخری صبح تھی اور میں اسے ہمیشہ کیلئے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

میں واپس جموینڈی میں آیا۔ لیوٹن جس کے اعصاب غالباً گینڈے کے اعصاب کی طرح تھے۔ بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے صبح کی دعا مانگی سچے دل سے توبہ کی اپنا ایک ایک گناہ یاد کر کے اس کا اعتراف کر کے بخشش کی دعا مانگتا رہا۔ لیکن میرے گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہوگئی تھی کہ آخر کار میں نے انہیں یاد کرنا چھوڑ دیا اور پھر کتاب مقدس کو پڑھنے لگا۔

صبح گزر گئی اور بقول کرمال کے ایک منٹ میں گزر گئی۔ ”تین بجے اور فونا اور اس کے شلو ساتھیوں نے اپنے اجداد کی روحوں کے نام پر ایک بھیڑ بھینٹ چڑھائی اور کرمال نے کہا۔

”ان سیاہ فاموں کی انہی سیاہ فامی رسومات کی وجہ سے تم ہم پر قہر خداوندی نازل ہوا ہے۔ یہ رسم ختم ہوئی تھی کہ لوگاٹ آگیا، وہ ایسا بٹاش نظر آ رہا تھا اور اس طرح مسکرا رہا تھا کہ میں نے بڑی غلٹ میں یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ ہمارے لئے دنیا کی بہترین خبر لے کر آیا ہے۔ یعنی یہ کہ شاید جوی نے ہمیں معاف کر دیا یا شاید کہ جنگل ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت سے پہلے ہی آگیا ہے۔

لیکن نہیں۔ ہم ایسے خوش قسمت کہاں؟ چنانچہ وہ صرف یہ کہنے آیا تھا کہ اس نے اپنے آدمی دوڑا دیئے ہیں۔ ساحل کی طرف اور چاروں طرف اور یہ کہ سوسومیل تک تو روتا نوکا پتا نہیں۔ اب چونکہ لوزی کے کان بھرنے اور اکسانے کی وجہ سے ”جوی سردار“ لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ خطرناک ہوتا جا رہا ہے اس لئے شام کی رسم ادا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ چونکہ اس نے کہا کہ زمین میں ستون گاڑنے اور ہماری قبریں کھودنے کا کام خود اس کی زیر نگرانی کئے جانے والا تھا۔ اس لئے اس وقت وہ ہمیں شمار کرنے آیا تھا کہ کہیں ایک آدھ ستون اور ایک آدھ قبر کم ہو اور پھر بعد میں گڑبڑ ہو جائے۔

”اس کے علاوہ ہنس راج“ وہ بولا۔ جو چترم اور تمہارے ساتھی اپنے ساتھ قبر میں دفن کروانا چاہتے ہو تو مجھے بتا دو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ چیز تمہاری لاشوں کے ساتھ دفن کر دی جائے گی۔“

”فکر نہ کرو۔ ہنس راج! اس نے اضافہ کیا۔“ معاملہ جلد اور آسانی سے ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ

اسے انتقام لے سکتا تو پھر خوشی سے اپنی قبر میں سو جاتا، لیکن میں اس سے انتقام لوں گا، پھر اس مجھے بھوت بن کر ہی دنیا میں کیوں نہ آتا پڑے۔ بہر حال باس تمہارے والد شلو کا کرائی نے کہا ہم آگ کی طرح سرے سے غائب نہیں ہو جاتے بلکہ کسی دوسری دنیا میں جلتے رہیں۔“

”خدا نہ کرے۔“ میں نے کہا۔

اور وہ بھی اس طرح باس کہ ہمیں ایندھن کا خرچ بھی برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ چنانچہ باس امید نہ دوسری دنیا میں ہم دونوں ساتھ ساتھ ہمیشہ جلتے رہیں گے اور باس میں کچھ لایا ہوں تمہارے اور اس نے گھوڑے کی لید کے رنگ کی ایک چھوٹی سی گولی کہیں سے برآمد کی۔

”باس یہ نگل جاؤ اور پھر تم کچھ محسوس نہ کرو گے۔ بہت عمدہ دوا ہے جو میرے لکڑ داوانے کے قبیلے کی روح سے حاصل کی تھی۔ اس کے کھانے کے بعد تم یوں مزے سے سو جاؤ گے جیسے تم بہت ساری شراب پی رکھی ہو اور جب تمہاری آنکھ کھلے گی تو تم اس دنیا میں ہو گے جہاں بہت آگ بغیر ایندھن کے جلتی ہے۔ بس جلتی ہے اور ہمیشہ جلتی رہے گی۔ آمین۔“

”نہیں“ میں نے کہا۔ میں اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر مرنے چاہتا ہوں۔“

”میں خود یہ ہی چاہتا ہوں۔ لیکن باس آنکھیں کھلی رکھ کر مرنے میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اس وقف فوٹا کے سانپ پر مجھے ذرا بھی مجبور نہ نہیں اگر وہ عمدہ اور سچا سانپ ہوتا تو اس نے فوٹا سے بیا ہوتا کہ خرداز ”فیرا“ گاؤں میں نہ جانا۔ چنانچہ باس ایک گولی میں نگل جاؤں گا اور دوسری باس ہا کو دے دوں گا۔“

اور اس نے وہ گولی اپنے منہ میں ڈال لی اور اسے بڑی کوششوں کے بعد حلق سے نیچے اتار

اور پھر وہیں بیٹھ کر وہ لوزی کی ماں بہن اور بیویوں سے اپنے عجیب و غریب رشتے جوڑنے لگا لیاں بک ہی رہا تھا کہ میں نے لیوٹن کی آواز سنی۔

فنس راج! ہمارا دوست لوگاٹ کہتا ہے کہ چلنے کا وقت آ گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ اس کی آواز ی تھی اور پھٹی ہوئی تھی۔ آخر کار حالات کا تناؤ اس کے اعصاب پر بھی اثر انداز ہوا تھا۔ میں نے اکر دیکھا سانے لیوٹن اور اس کے ساتھ لوگاٹ کھڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں مل کر مسکرا رہے تھے جیسے ن قتل میں نہیں بلکہ شادی کے منڈوے میں لے جا رہے ہوں۔“

”ہاں.....“ فنس راج! وقت آ گیا ہے اور میں جلد ہی آ گیا ہوں کہ تمہیں انتقام نہ کرنا پڑے“

راج یہ یادگار رسم ہوگی کیونکہ وہ کالے ہاتھی جیسا جوسی بہ نفس نفیس تشریف لائے گا اور پوری

میں نے تمہارے لئے جو تیر انداز منتخب کئے ہیں وہ فن کے استاد ہیں اور انسان کے پیچھے میں بھی تیر کر پورا اتار دیتے ہیں۔“ اس کے بعد وہ چند ٹائمنوں تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مجھ سے پوچھا کہ: ”وہ جادوئی ڈھال کہاں ملتی ہے۔“ فوٹا کے ساتھ بیٹھ کر سوار سے لطف اندوز ہوا اور پھر یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ.....“ وہ ٹھیک وقت پر مجھے لینے آ جائے گا۔“

چار بج چکے تھے اور چونکہ کرا ل تو بالکل بدحواس ہو کر کسی کام کا نہ رہا تھا۔ اس لئے خود لیوٹن نے چائے تیار کی اور بہت عمدہ سی چائے بنائی تھی۔ اس لئے اس کا ذائقہ میں نے اس وقت تو محسوس نہ کیا۔

البتہ بعد میں مجھے ضرور یاد آیا۔

اب بچنے کی کوئی امید نہ تھی موت کا وقت قریب تھا۔ چنانچہ میں اکیلا ہی داخل ہوا کہ بہادروں کی موت مرنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کرلو۔ جھونپڑی کی نیم تاریکی اور خاموشی نے میری روح کو قدرے سکون بخشا۔ میں آخر کیوں زندگی سے چپکا رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا میں اس دنیا سے رخصت ہو کر جس دنیا میں پہنچنے والا تھا وہاں وہ ہستیاں تھیں جنہیں ایک نظر دیکھنے کیلئے بے تاب تھا اور جن کی کمی میں اس دنیا میں محسوس کرتا آیا تھا۔ یعنی میرے والدین۔

چنانچہ مناسب تھا کہ میں اس دنیا کو الوداع کہہ دوں۔ کیونکہ میں نے سوچا جتنا زیادہ زندہ رہوں گا اتنے ہی زیادہ مجھے مصائب برداشت کرنے ہوں گے۔

چنانچہ یوں سوچ کر میں نے چند الوداعی خطوط اس امید کے ساتھ لکھے کہ یہ شاید ان لوگوں تک پہنچ جائیں گے۔ جن کے نام لکھے گئے تھے۔ اس طرف سے فرصت پا کر میں جھگر کے متعلق سوچنے لگا کہ خدا جانے وہ زندہ بھی تھا یا مر گیا اور یہ کہ اگر زندہ تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اسے بتا سکوں کہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے تھے اور یہ کہ سب اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ کس طرح میں اسے اس کی بے پروائی پر سرزنش کر سکتا تھا؟

میں انہی خیالات میں غلطاں و پچاں تھا کہ ہمیں قتل میں لے جانے کیلئے لوگاٹ! سپاہیوں کے ساتھ آ گیا اور اس کی آمد کی اطلاع دینے کیلئے آگس میرے پاس آیا۔ بوڑھے آگس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھنجھوڑا اور اپنے کوٹ کی آستین سے آنکھیں پونچھ کر بولا۔

”باس! یہ ہمارا آخری سفر ہے اور باس تم مارے جانے والے ہو اور قصور میرا ہے کیونکہ میں تم کو اس مصیبت سے بچانے کا کوئی راستہ تلاش نہ کر سکا۔ حالانکہ تم نے اس غرض سے مجھے اپنی خدمت میں رکھا ہے۔ لیکن میں کوئی راستہ تلاش نہ کر سکا کیونکہ میرا بیجا گدھے کا بیجا بن گیا ہے۔ اگر میں

شولو شکاری باز کے باہر بیٹھے گپ لگا رہے تھے اور نسوار کے سزا کے لے رہے تھے۔ میں دپتے لگا ان کی بے پروائی اور سکون کی وجہ کیا ہے۔ یہ کہ وہ فونا کے سانپ پر یقین رکھتے ہیں یا یہ کہ اہقیت میں بہادر ہیں اور موت سے نہیں ڈرتے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے االے بلند کر کے مجھے سلام کیا۔

”ہنس راج سردار..... ہم آپ کو سردار ہی مانتے ہیں اپنا۔“

”اور پھر فونا کا اشارہ پا کر وہ کوئی اور شولو جنگی گیت گانے لگے اور اس وقت تک گاتے رہے اب تک کہ ہم قتل میں گڑے ستونوں تک نہ پہنچ گئے۔ کرا ل بھی گانے لگا۔ لیکن اس کا گیت مختلف ام کا تھا۔ یعنی وہ رو رہا تھا۔

”خاموش رہو.....“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”مردوں کی طرح نہیں مر سکتے تم؟“

”نہیں ہنس راج سردار نہیں مر سکتا۔“ اس نے کہا اور رو رو کر کوئی بیس مختلف زبانوں میں رحم کی لوست کرتا رہا۔

میں اور لیوٹن سٹوٹ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ اس وقت بھی جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا۔ حیرت تھی کسی نے اس سے یہ جھنڈا اٹھینٹ لینے کی کوشش نہ کی۔ میرے خیال میں ہولون اس جھنڈے کو ادا پوتا سمجھے ہوئے تھے۔ ہم نے آپس میں بہت زیادہ بات چیت نہ کی۔ البتہ ایک مرتبہ لیوٹن نے ا۔

”بہر حال اس محبت نے بہت سے لوگوں کو برے انجام تک پہنچایا۔ خدا جانے ابا میرے دل کو رکھیں گے یا فروخت کر دیں گے۔“

اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ میں نہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اس کے پھولوں کا کیا کرے گا کچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی پروا بھی نہ تھی۔ چنانچہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہمیں زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو۔ اپنے محافظوں کے ہ ایک پچھلے راستے سے گزر کر یکا یک ہم میدان کے کنارے پر نکل آئے یہاں ہزاروں لوگ قتل کا تماشہ دیکھنے کیلئے جمع تھے۔ میں نے ایک بات خصوصیت سے دیکھی کہ ان لوگوں کو بڑی بپ سے گروہ گروہ کھڑا کیا گیا تھا کہ اس میدان کے دوسرے سرے پر دروازے تک کافی راستہ ہوا تھا۔

ان لوگوں نے خاموشی سے ہمارا استقبال کیا۔ البتہ کرا ل کی آہ و فغاں نے اکثر لوگوں کے ل پر مسکراہٹ ضرور پیدا کر دی تھی۔ دوسری طرف شولوؤں کا جنگی گیت ان کے دلوں پر رعب اور

آبادی اور آس پاس کے کرا لوں کے لوگ بھی موجود ہوں گے۔

”بکواس بند کرو۔ بے وقوف آدی۔“ میں نے کہا۔ ”اور مسکراؤ نہیں سوا اگر مرد ہوں ہمارے سچے دوست ہوتے تو ہمیں اس مصیبت سے نکال لیتے کیونکہ تم جانتے ہو کہ ہم غلاموں سودا گر نہیں بلکہ غلاموں کو آزاد کرانے والے ہیں اور پردہ فروشوں کے دشمن ہیں۔“

”اے ہنس راج سردار“ لوگاٹ نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

”یقین کرو میں اس لئے مسکرا رہا ہوں کہ خود تم کو مرتے وقت تک خوش رکھ سکوں۔“ یہ ہونٹ مسکرا رہے ہیں لیکن میرا دل رو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اچھے آدی ہو اور یہ ہی بات نے جوسی سے کہی۔ لیکن اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے تم رشوت لی ہے۔

ہنس راج‘ وج ڈاکٹروں کے سردار لوزی کے مقابلے میں میری کیا چل سکتی ہے۔ اسے تم سخت نفرت ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ تمہارا جادو اس کے جادو سے بڑا ہے اور پھر وہ جوسی کان میں کھسر پھسر کیا کرتا ہے اور اسی نے جوسی سے کہا ہے کہ اگر ان لوگوں کو قتل نہ کیا گیا تو ہمارے سارے آدی یا تو مار ڈالے جائیں گے یا غلام بنا کر بیچ دیے جائیں گے۔ کیونکہ اس۔ تم اس زبردست فوج کا صرف ایک دستہ ہو جو آ رہی ہے۔ ابھی گزشتہ رات کو ہی لوزی نے ما روحوں سے مشورہ کیا تھا اور میں اس کے پیچھے ہی کھڑا ہوا تھا اور مجھے پانی میں خود لوزی کے چہرے کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔

اس کے علاوہ لوزی نے قسم کھا کر کہا کہ سردار کا خون بدل بھائی روتا نو مر چکا ہے۔ چناؤ ”فیرا ناؤن“ میں کبھی آئے گا ہی نہیں۔ ہنس راج اپنی طرف سے تمہارا دل صاف رکھنے کی میں ہر ممکن کوشش کی ہے۔

چنانچہ میری درخواست ہے کہ تم بھوت بن کر مجھے پریشان نہ کرنا۔ اگر مجھے موقع مل گیا تو لوزی سے انتقام ضرور لوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے یہ موقع ملے گا ہی نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی زہر دے دے گا۔ ہاں وہ اتنی آسانی سے نہ مرے گا۔ جتنی آسانی سے تم مرو گے۔“

”کاش کہ لوزی سے انتقام لینے کا مجھے موقع مل جائے۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

بہر حال لوگاٹ کے خلوص سے متاثر ہو کر میں نے اس سے مصافحہ کیا اور وہ خطوط جو میں لکھے تھے اسے دیتے ہوئے کہا کہ وہ انہیں ساحلی بستی پہنچانے کی کوشش کرے اور پھر ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

”اے سردار! لوزی کے یہ الفاظ یاد رکھنا۔ اے لوگو! اپنے وچ ڈاکٹر کے یہ الفاظ یاد رکھنا تاکہ جب روتا تو آجائے تو ان پر عمل کیا جائے۔“

”میں یہ الفاظ یاد رکھوں گا۔“ جوی نے کہا۔ ”اور میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں اور لوگوں کی لطف سے وعدہ کرتا ہوں کہ روتا تو آجائے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔“

”بس ٹھیک ہے۔ فوٹا نے کہا۔ اور اس کعبے کی طرف چلا آیا۔ جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ تا جب اپنے کعبے کی طرف جا رہا تھا تو اس نے لوزی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کان ل کچک کہا، جس نے اس شیطان کے چیلے کو خوفزدہ کر دیا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ چوٹکا اور پھر اپنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر لوگوں کو ہدایتیں دینے لگا، جو ہمیں کعبوں سے ہانڈھنے لے تھے۔

یہ کام مشکل نہ تھا۔ ہمارے ہاتھ کعبوں سے پیچھے کر کے گھاس کے رسوں سے ہانڈھ دیئے۔ مجھے اور لیوٹن کو درمیان کے کعبوں یا ستونوں سے ہانڈھ دیا گیا اور خود لیوٹن کی درخواست پر نڈے کو اس کے ستون پر نصب کر دیا گیا۔ فوٹا میری دائیں طرف تھا اور دوسرے شولا پائیں طرف، ستونوں سے ہانڈھے گئے تھے۔ آگس دائیں طرف کے آخری ستونوں سے بندھا ہوا تھا۔ میں دیکھا کہ آگس پر نیند طاری ہونے لگی تھی اور ہولون اسے ہانڈھ ہی رہے تھے کہ اس کا سر ان کے سے پر جھک گیا۔ آگس کی وہ دوا واقعی زود اثر تھی اور اب مجھے انفسوس ہو رہا تھا کہ کیوں نہ میں بھی ایک گولی گل لیتی ہوتی۔

جب ہمیں ہانڈھ دیا گیا تو لوزی ہمارے معائنے کو آیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے ایک قسم کی مٹی کے ڈھیلے سے ہم میں سے ہر ایک کے سینے پر گول نشان بنا دیا۔ تیر اندازوں کو اپنے تیر انہی میں پیوست کرنا تھے۔

”ہنس راج سردار“ اس نے میرے شکاری کوٹ پر دائرہ بناتے ہوئے کہا۔ ”اب تم کبھی اپنے کے زور سے کسی کے بال نہیں جلا سکو گے۔ ہاں، کبھی نہیں۔ کیوں کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہی اسی میں تمہاری لاش پڑی ہوگی اور میں اس پر مٹی ڈال رہا ہوں گا۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا وقت آ گیا تھا۔ چنانچہ اس شیطان سے بحث کرنا فضول تھا اور ہ لیوٹن کے سامنے تھا اور اس کے سینے پر نشان بنا رہا تھا۔ لیوٹن کی مردانگی اب تک موجود تھی۔ وہ کڑک کر بولا۔

”ہٹا اپنے ناپاک ہاتھ۔“

حیرت طاری کر رہا تھا۔

میدان کے سرے پر اور سرداری کمرال کے قریب مٹی کے پندرہ ڈھیر بنے ہوئے تھے اور میں پندرہ کعبے گڑے ہوئے تھے۔ مٹی کے یہ ڈھیر اس لئے بنائے گئے کہ ہر شخص ہمارے سر۔ تماشہ دیکھ سکے اور یہ ڈھیر اس مٹی سے بنائے گئے تھے جو ان گڑھوں سے حاصل کی گئی تھی۔ یہ گڑھ ہماری قبریں تھیں۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ پندرہ نہیں بلکہ سترہ کعبے تھے۔ دو چھوٹے مگر مہم کعبے ان بلند کعبوں کی قطار کے دائیں بائیں گڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ دو چھوٹے ہمارے دو گدھوں کیلئے تھے۔ وہ بھی تیروں کا نشانہ بننے والے تھے۔ سپاہیوں کا ایک دستہ کعبوں کے سامنے کھڑا ہوا تماشہ بینوں کو آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ کعبوں کے سامنے چھپے ہوئے میدان میں جوی اس کے مشیر اور اس کی چند منتخب بیویاں جمع تھیں۔

ان کے علاوہ لوزی بھی موجود تھا۔ جس نے اپنا پورا جسم مختلف قسم کے رنگوں سے رنگ رکھا تو ایک طرف پچاس یا شاید ساٹھ منتخب تیر انداز کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک آکمان اور بہت سے تیر تھے۔ یہ ہمارے جلا دتھے۔

”جوی۔“ سردار کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے کہا۔

”تم ظالم خونی ہو اور اس جرم کی سزا تمہیں اوپر والا دے گا۔ اگر ہمارا خون بہایا گیا تو جلد ہی بھی ہم سے اس دنیا میں آلو گے۔ جہاں ہمیں تم پر اختیارات حاصل ہوں گے اور تمہارا قبیلہ بڑھ جائے گا اور اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔“

میرے ان الفاظ سے معلوم ہوتا تھا کہ جوی خوفزدہ ہو گیا۔ کیونکہ اس نے کہا تھا۔

”میں نہ ظالم ہوں اور نہ خونی۔ میں تم کو اس لئے قتل کر رہا ہوں کہ تم انسانوں کے تاجر ہو۔ ا کے علاوہ سزا کا حکم میں نے نہیں لگایا ہے وچ ڈاکٹروں کے سردار لوزی نے مجھے تمہارے متعلق سہ کچھ بتایا ہے اور اس کی روحوں نے کہا ہے کہ تم کو بہر حال مرنا ہے۔ شاید تم کو بچانے کیلئے اگر روتا آ گیا تو ٹھیک ہے حالانکہ وہ نہیں آ سکتا۔ کیونکہ وہ مر چکا ہے۔ اگر اس نے آ کر تمہارے متعلق گواہ دے دی تو ٹھیک ہے۔ مجھے معلوم ہو جائے گا کہ لوزی ایک عیار اور جھوٹا آدمی ہے اور پھر تمہاری جگہ لوزی کو مارا جائے گا۔“

”ہاں..... ہاں یہ.....“ لوزی نے کہا۔ ”اگر روتا تو آ گیا۔ جیسی کہ اس جھوٹے ساحر نے بیڑ گوئی کی ہے۔ اس نے فوٹا کی طرف اشارہ کیا۔ ”تو پھر میں ان لوگوں کے بجائے مرنے کیلئے تیار ہو جاؤں گا۔ ہاں..... ہاں پھر تم مجھے تیروں سے چھلنی کر سکتے ہو۔“

اور ساتھ ہی اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر لوزی کے پیٹ پر ایسی زبردست ماری کہ وہ الٹ کر اس قبر میں جا گرا جو لیوٹن کیلئے کھودی گئی تھی۔  
 ”اوہ شاباش..... شاباش لیوٹن.....“ شولو چلائے۔ امید ہے کہ تم نے وچ ڈاکٹر کا خاتمہ کر دیا ہوگا۔“

تماشاہیوں پر ایک بیہوش اور سنائے کا عالم طاری تھا۔ کیونکہ آج سے پہلے کسی نے اس وچ ڈاکٹر کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔ ہر شخص اس سے ڈرتا تھا۔ البتہ لوگات مسکرا رہا تھا اور سردار بھی خوش نظر آتا تھا۔

لیکن لوزی یوں آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے شاگردوں اور دوسرے وچ ڈاکٹروں کی مدد سے قبر سے گالیاں بکتا باہر آیا۔ قبر میں نمی تھی۔ چنانچہ وہ کچھز میں لت پت تھا۔ اس کے بعد میں نے لوزی اور کسی کی طرف بھی دھیان نہ دیا۔ کیونکہ میری زندگی کا صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا اور میں توبہ استغفار میں مصروف تھا۔



طلوع آفتاب کی طرح اس دن غروب آفتاب کا منظر بھی مسود کن تھا۔ طوفان کی آمد کے آثار نظر آ رہے تھے اور افریقہ میں ہمیشہ طوفان سے پہلے بادل اور روشنی کی وجہ سے افق پر عجیب حسین مناظر پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورج ایک زبردست سرخ آنکھ کی طرح غروب ہو گیا۔ اس پر بادل کا کالا بچوٹا آگیا اور پچوٹے کے کنارے پر سرخ اور لانی پلکیں تھیں۔

”اے سورج الوداع“ میں نے کہا۔ آج کے بعد پھر کبھی میں تجھے نہ دیکھ سکوں گا۔“  
 اندھیرا اترنے لگا جوی چاروں طرف اور پھر بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اسے خوف ہو کہ بارش کی دم میں ہونے لگے گی پھر اس نے لوگات کے کان میں کچھ کہا۔ جواب میں اس نے سر ہلایا اور آگے بڑھ کر میرے قریب آیا۔

”ہنس راج“ میرے دوست! اس نے کہا۔ ”جوی سردار معلوم کرنا چاہتا ہے کہ تم تیار ہو یا نہیں۔ کوئی تھوڑی دیر بعد ہی اندھیرا گہرا ہو جائے گا اور تیرا انداز نشا نہ نہ لے سکیں گے۔“  
 ”نہیں..... میں نے کہا۔“ سورج غروب ہونے سے آدھے گھنٹے بعد تک نہیں کیونکہ ہم میں یہ ہی طے پایا ہے۔“

لوگات سردار کے پاس پہنچا اور کچھ دیر بعد پھر میرے سامنے آیا۔  
 ”دوست! سردار کہتا ہے وعدہ بہر حال وعدہ ہے۔ چنانچہ وہ اپنے وعدے پر قائم ہے۔ البتہ اگر تیرا اندازوں کے تیر نشانے پر نہ بیٹھیں اور کہیں زیادہ تکلیف ہو تو سردار کو الزام مت دینا۔ وہ نہ جانتا نا کہ آج کی رات بادلوں بھری ہوگی کیونکہ اس موسم میں کبھی بادل دیکھے نہیں گئے۔“

اندھیرا زیادہ سے زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی سرد علاقے کی گہری ہند میں کھڑے ہوں۔ لوگوں کی بھیڑ ایک مسلسل تودے کی طرح دکھائی دینے لگی اور اپنی کمانیں رست کرتے ہوئے تیر انداز سایوں کی طرح نظر آنے لگے۔ ایک دو دفعہ اوپر بجلی چمک گئی اور اس کے بعد گرج کی دہی دہی آوازیں سنائی دیں فضا میں گھٹن پیدا ہو گئی۔ ہوا بند تھی اور چاروں طرف



ستون میں پیوست ہو گیا تھا۔

غالباً مشق کیلئے چلایا گیا تھا۔ دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ایک شخص جو اس گہری خاموشی اور اندھیرے میں سراسر غیر ارض معلوم ہوتا ہے۔ ایک سفید ساٹھ پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنے ساٹھ کو بھگاتا ہوا اگر راستے سے جو میدان کے شمالی دروازے سے شروع ہوتا تھا ہماری طرف آرہا تھا۔

بے شک میں یہ خواب دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ ساٹھ سوار جنگر سے مشابہ تھا۔ وہی لمبی داڑھی اس کے ایک ہاتھ میں تتلیاں پکڑنے کا وہی جال۔ جس کے لمبے بانس کے دتے سے وہ ساٹھ کو مار مار کر بھگا رہا تھا۔ البتہ اس کی گردن میں پھولوں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ ساٹھ کے سیگنوں میں بھی پھول لپٹے ہوئے تھے اور ان کے دائیں بائیں اور اس کے ساتھ لڑکیاں دوڑ رہی تھیں اور ان لڑکیوں کی گردنوں میں بھی مالائیں جھول رہی تھیں۔

بے شک یہ خواب تھا۔ خواب ہی ہو سکتا تھا۔ مرتے ہوئے دماغ کی سوچ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور اسی تیر کا انتظار کرنے لگا جو موت کا پیا مبر بن کر میرے دل میں پیوست ہونے والا تھا۔

”چلاؤ تیر۔“ لوزی چیلا۔

”مت چلاؤ تیر۔“ لوگاٹ چیلا۔ ”روتا نو آ گیا ہے۔“

خاموشی گہری خاموشی اور اس خاموشی میں میں نے تیروں کے زمین پر گرنے کی آواز سنی اور ہر موجود سپاہیوں نے ایک شور کی آواز پیدا کی اور اس شور نے الفاظ کی صورت اختیار کر لی۔

”روتا نو! روتا نو!..... ان لوگوں کو بچانے کیلئے روتا نو آ گیا۔“ اس کے بعد میرے اعصاب جو کمزور نہ تھے یکا یک اس طرح ڈھیلے پڑ گئے کہ میں چند منٹوں کیلئے بے ہوش گیا اور اپنی اس بے ہوشی میں مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میرے اور فونا کے درمیان گفتگو ہوئی ہو۔ فونا نے مجھ سے کہا۔ ”یا شاید میرا خیال ہے کہ اس نے کہا۔“

”میرے بیٹا! ہنس راج کہو اب کیا کہتے ہو؟ میرا سانپ ایک دم پرکھڑا ہوتا ہے یا نہیں؟ بتاؤ برا سانپ سچا ہے یا نہیں؟ جواب دو۔ ہنس راج۔ میں سن رہا ہوں۔“ اور میں نے جواب دیا۔ یا یوں طلوم ہوا کہ میں نے جواب دیا۔

”فونا..... معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا سانپ واقعی اپنی دم پرکھڑا ہوتا ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ سب نظر کا دھوکہ ہے۔ کیونکہ ہم مر گئے ہیں اور دوسری دنیا میں ہیں جہاں ہر چیز ایک خواب ہوتی ہے۔ جسے ہم نہ چھو سکتے ہیں اور نہ محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور میں

خاموشی طاری تھی۔ ان منٹوں میں ہر شخص خاموش اور بے حرکت رہا۔ حتیٰ کہ کرا ل نے بھی رونا کرنا بند کر دیا۔

میرے خیال میں وہ تھک گیا تھا اور شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ جیسے عناصر نے بھی سانس روک لیا ہو۔ جیسے قدرت ہمارے استقبال کی تیاریوں میں خاموشی سے مصروف ہو۔

آخر کار اس خاموشی میں میں نے ایک آواز سنی تیروں کو ترکشوں میں سے کھینچنے کی لرزہ خیز آواز اور لوزی کی ٹرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”ایک لمحہ ذرا صبر کرو۔ بادل چٹ جائیں گے اور اجالا ہوگا۔ مرنے والے ان تیروں کو دیکھ سکیں گے جو ان کیلئے موت کا پیغام لائیں گے اور تب لطف آئے گا۔“

اور واقعی بادل چٹنے لگے بہت آہستہ آہستہ اور ان کے پیچھے سے ہلکی نیلی روشنی کی لکیر نکل آئی۔

”اب چلائیں۔“ تیر اندازوں کے افسر نے پوچھا۔

”ابھی نہیں..... ابھی نہیں۔ یہاں لوگ ان جادوگروں کا تماشا دیکھنے جمع ہوئے ہیں۔ چند منٹ اور رک جاؤ تا کہ روشنی میں اضافہ ہو اور تماشاائی ان جادوگروں کو مرے بخوبی دیکھ سکیں۔“

بادلوں کا ایک کونا اور زیادہ اٹھ گیا اور نیلی روشنی سرخ ہو گئی۔ آسمان پر شفق کھل اٹھی۔ بادلوں نے ان کا عکس زمین پر ڈالا اور ارد گرد کے منظر میں آگ سی لگ گئی۔ ایک بار پھر بجلی چمکی اور اس کی روشنی میں ہمیں تماشا نیوں کے چہرے اور ہم لوگوں کی طرف دیکھتی ہوئی ہزار ہا آنکھیں نظر آ گئی تھیں کہ اس غیر معمولی طور پر بڑی چکاؤڑ کے دانت بھی نظر آ گئے۔ جو ہمارے سروں سے گزر رہی تھی۔ روشنی تیز اور زیادہ سے زیادہ سرخ ہونے لگی۔

لوزی نے سانپ کی پھنکاری آواز میں کہا۔ میں نے تیر کمان سے کھینچنے اور پھر چھوڑے جانے کی آواز سنی اور اس کے فوراً بعد ہی ایک تیر ڈھٹ کی آواز کے ساتھ میرے سر کے عین اوپر ستون میں پیوست ہو گیا۔ میں بچوں کے بل کھڑا ہوا تو میرا سر اس تیر کو چھو گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بن کر لیں اور وہ عجیب و غریب باتیں دیکھنے لگا۔ جنہیں میں کئی برسوں سے بھلا چکا تھا۔ میرا سر گھومنے لگا۔

خاموشی، گہری خاموشی اور اس خاموشی میں میں نے کئی بھاری جانوروں کے بھاگنے کی آواز سنی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ تیر اندازوں کی صف تھی۔ وہ لوگ چلوں میں تیر چڑھائے کمانیں اٹھا رہے تھے۔ وہ پہلا تیر جو میرے سر کے عین اوپر

نے دیکھا کہ واقعی جگر آگیا تھا۔ جگر آگ بگولہ ہو رہا تھا اور جوی کو اس بڑی طرح ڈانٹ رہا تھا کہ جوی اسے سامنے جھکا ہوا تھا اور شرم سے سنا جا رہا تھا اور میں بھی آگ بگولہ تھا اور میں خود جگر کو سرزنش کر رہا تھا۔

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کہا۔ البتہ جگر کے الفاظ مجھے یاد ہیں۔ اس کی لمبی داڑھی کے اکثر بال غصے کی شدت کے باعث کھڑے ہو گئے تھے اور تتلیاں پکڑنے کے جال کا دستہ جوی کے سامنے بلارہا تھا اور غصے سے کانپتی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”کتے! وحشی! میں نے تجھے مرنے سے بچایا۔ اپنا بھائی کہا اور کیا بدل دیا تو نے اس کا۔ کیا سلوک کر رہا ہے ان کے ساتھیوں کے ساتھ! انہیں قتل کر دینے والا تھا تو؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر میں اپنی قسم بھول جاؤں گا اور وہ بندھن توڑ دوں گا جو ہم نے خون بدل کر باندھا ہے اور.....“

”نہیں نہیں..... ایسا نہ کرنا۔ جوی نے کہا۔ یہ سب غلط فہمی میں ہو گیا، لیکن تصور میرا نہیں ہے۔ قصور ڈاکٹر لوزی کا ہے اور ہمارے ملک کے قدیم رسم و رواج اور قانون کی رو سے اس کے مشورے پر عمل کرنا مجھ پر فرض ہے اور لوزی نے مقدس روح سے دریافت کرنے کے بعد اعلان کیا کہ تم مر چکے ہو اور یہ بھی کہا کہ یہ لوگ دنیا کے سب سے بڑے انسان ہیں۔ جو انسانوں کی تجارت کرتے ہیں اور جن کے دل کالے ہیں۔ جو یہاں اس لئے آئے ہیں کہ جاسوسی کریں اور ہولوں لوگوں کا خاتمہ کر دیں۔“

”تو پھر لوزی نے جھوٹ کہا تھا۔“ جگر گر جا۔ ”اور قصداً جھوٹ کہا تھا۔“

”بے شک اس نے جھوٹ کہا تھا اور ثابت ہو گیا کہ لوزی جھوٹا ہے۔“ جوی نے کہا۔ ”اسے

یہاں لاؤ جو اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے معاون ہیں۔“

بادل چھٹ گئے تھے اور چاند نکل آیا۔ چنانچہ روشنی میں سپاہی دوڑ پڑے اور لوزی اور اسکے ساتھیوں کو تلاش کرنے لگے اور اسکے شاگردوں میں سے وہ آٹھ دس کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سب کے سب شکل و صورت سے شیطان نظر آتے تھے اور اپنے استاد کی طرح ان لوگوں نے بھی اپنے جسم مختلف رنگوں سے رنگ رکھے تھے۔ لیکن لوزی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ گڑبڑ میں وہ کہیں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لیکن فوراً ہی آخری ستون سے کیونکہ ہم اب تک بندھے ہوئے تھے۔ کراں کی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز اب بھی پیٹی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس میں اطمینان اور بٹاشت کی جھلک تھی۔

”مسٹر ہنس راج! انصاف کے نام پر عظیم سردار کو مطلع کر دیجئے کہ وہ عیار جادوگر جسے سپاہی

تلاش کر رہے ہیں اس قبر میں بیٹھا آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہے جو اس ناچیز کیلئے تیار کی گئی تھی۔ چنانچہ عظیم سردار کو مطلع کیا اور پلک جھپکتے میں سپاہی لوزی کو قبر میں سے تھکیٹ چکے تھے اور اسے غضبناک جوی کے سامنے پہنچا چکے تھے۔

”روتاؤ کے بھائیوں کو آزاد کر دو۔“ جوی نے کہا ”اور انہیں میرے پاس آنے دو۔“ چنانچہ میرے بندھن کاٹ دیئے گئے اور ہم اس جگہ پہنچے جہاں سردار روتاؤ اور جوی کھڑے تھے۔

”لوزی! کون ہے یہ۔“ جوی نے جگر کی طرف اشارہ کیا۔ ”دیکھو اور بتاؤ کہ یہ وہی روتاؤ نہیں ہے جس کے متعلق تم نے قسم کھا کر کہا تھا کہ مر چکا ہے۔“

لوزی نے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ جوی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”لوزی ابھی کچھ دیر پہلے کیا گیت گایا تھا تم نے۔ میرے کان میں؟“

یاد ہے نا؟ یہ ہی کہ اگر روتاؤ آگیا تو ان معصوم لوگوں کی جگہ تمہیں تیروں سے اڑا دیا جائے۔ کہا تھا کہ نہیں؟“

اب بھی لوزی نے کوئی جواب نہ دیا، حالانکہ لوگاٹ نے لوزی کے ایک لات رسید کر کے اسے جوی کے سوال کی طرف متوجہ کیا تھا۔

اور اب جوی دھاڑا۔

”اے جھوٹے!“ تو خود اپنی زبان سے اپنی سزا کا حکم لگا چکا ہے اور تجھے سزا دی جائے گی جو تو نے خود اپنے لئے تجویز کی ہے۔“ اور پھر جوی نے ”جھٹ منڈانہ لہجے میں حکم دیا۔ کیونکہ آج وہ خود لوزی کے سامنے سے آزاد ہو رہا تھا۔“ لے جاؤ ان جھوٹوں کو دیکھو ان میں سے ایک بھی بھاگنے اور بچنے نہ پائے۔ یہی فیصلہ ہے نہ تمہارا اے میرے لوگو؟“

”ہاں یہی فیصلہ ہے۔“ جم غیر نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ”لے جاؤ جھوٹے وچ ڈاکٹروں کو۔“ ”معلوم ہوتا ہے۔ لوزی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔“ لیوشن نے کہا۔ ”بہر حال اب وہ خود اپنے سلگائے ہوئے الاؤ میں جلنے والا ہے اور یہ سوار اسی سلوک کا مستحق ہے۔“

”کہو۔ اب کون جھوٹا ہے۔ وچ ڈاکٹر؟“ فونا نے لوزی سے پوچھا۔ ”اے اپنے بدن کو سفید اور لال رنگ سے رنگنے والے! بتا کہ تیرا اب کس کا خون پیئیں گے؟“ اور اس نے اس دائرے کی طرف اشارہ کیا جو لوزی نے سفید مٹی سے فونا کے سینے پر بنایا تھا۔

اب لوزی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بازی ہار گیا ہے اور یہ کہ اب اس کی موت یقینی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک دم سے جھک کر میرے پیر پکڑ لئے اور رگڑ رگڑ کر مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ کہ میرا دل جو ہماری رہائی سے یوں بھی نرم ہو گیا تھا۔ نرم ہو گیا۔

اور میں سردار جوی کی طرف گھوم گیا کہ میں لوزی کی سفارش کر کے اس کی جان بخشی کرا دوں حالانکہ اس کی امید تو نہ تھی۔ کیونکہ جوی کو وچ ڈاکٹر سے نہ صرف نفرت تھی بلکہ وہ اس سے ڈرتا بھی تھا اور اس سے چھٹکارا پانے کا اسے یہ اچھا موقع مل گیا تھا۔

چنانچہ وہ خوش تھا اور اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن لوزی نے میری اس حرکت سے کچھ اور معنی لئے کیونکہ دیشیوں میں منہ پھیرنے کا یہ ہی مطلب ہوتا ہے کہ درخواست قبول نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مایوسی اور غصہ نے اسے اندھا کر دیا وہ اٹھا۔ اپنے لباس میں سے ایک بڑا چاقو برآمد کیا اور اسے بلند کر کے میری طرف لپکا۔

”کتنے..... روجوں کی دنیا میں! میں اکیلا نہ جاؤں گا۔ بلکہ تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔“ وہ چیخا۔

اب یہ میری خوش قسمتی تھی کہ فونا لوزی کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ شلو ضرب اٹھل ہے کہ وچ ڈاکٹر کی قسمت کا فیصلہ وچ ڈاکٹر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک جھلانگ میں لوزی کے سر پر تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ یوں آسانی سے زمین پر پھینک دیا جیسے وہ بچہ ہو۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ کھیل ختم ہو گیا۔

”چلو بھئی“ میں نے لیمون اور جگر سے کہا۔ ”اب ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔“ اور ہم اپنی جھوپڑیوں کی طرف چلے کسی نے ہمیں نہ روکا نہ ٹوکا اور نہ ہی کسی نے ہماری طرف دھیان دیا۔ کیونکہ وہ سب کے سب کسی اور طرف متوجہ تھے۔ پیچھے میدان میں سے کیا ایک ایسا لرزہ خیز شور بلند ہوا کہ میں نے جلدی سے اپنی جھوپڑی میں گھس کر دروازہ بند کر لیا کہ اگر میں اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکوں تو وہ کم سے کم مدھم تو ہو جائے۔ جھوپڑی میں اندھیرا تھا اور یہ اچھا ہی تھا۔ کیونکہ اندھیرا میرے تنے ہوئے اعصاب کو سکون بخش رہا تھا اور اس وقت تو مجھے عجیب سکون ملا جب جگر نے کہا۔

”نہں راج! اور اے تو جوان جس کا نام میں نہیں جانتا آج میں تمہیں وہ بات بتا رہا ہوں۔ جو آج سے پہلے شاید میں نے تم کو نہیں بتائی۔ یعنی یہ کہ میں ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ایک پادری بھی ہوں۔ چنانچہ اب میں ایک پادری کی حیثیت سے خدا کے حضور شکر پے کی نماز ادا کرنے کی اجازت

وں گا کہ اس نے تم دونوں کو ایک اذیت ناک موت سے بچالیا۔“

”اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں بڑبڑایا۔

اور جگر نے واقعی نماز شکرانہ ادا کی۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے دماغ کی چولیں لی تھیں یا نہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ وہ بے حد عمدہ اور قابل انسان تھا۔ اب چونکہ شور اور چیخوں کی زیں سمجھ میں نہ آنے والی بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اس لئے ہم جھوپڑی میں سے باہر نئے اور اس کے آگے سائے میں بیٹھ گئے۔ میں نے جگر سے لیمون کو متعارف کرایا۔

”اب یہ بتاؤ جگر“ میں نے کہا۔ ”کہ تم قدیم اولیٰ کا بن کی طرح پھولوں سے لدے ہوئے پورہ پانا می ایک نیولی کی طرح تیل پر سوار کہاں سے نازل ہوئے اور تمہیں یہ کیا شرارت سوچتی تھی ہماری راہبری کرنے کا وعدہ کرنے کے بعد پور کرشن سے بلا کچھ کہے سنے قائب ہو گئے؟“

جگر نے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر ملامت کرنے کے سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ”میں سمجھتا ہوں۔ نہں راج۔“ اس نے کہا۔ ”کہ کہیں غلطی ہو گئی ہے۔ میں تمہارے سوال کے ی حصہ کا جواب دیتا ہوں اور وہ یہ کہ میں بقول تمہارے بلا کچھ کہے سنے کرشن سے قائب ہوا تھا۔ بے باغبان زالک کو میں نے ایک خط دے کر تاکید کر دی تھی کہ جیسے ہی تم آ جاؤ وہ خط تمہیں دے۔ چنانچہ اس بے وقوف نے یا تو خط کہیں گم کر دیا اور مجھ سے جھوٹ کہا یا پھر وہ خط سرے سے اسی گیا۔“

”ہم..... ہم..... ہم ہو سکتا ہے۔“

”بہر حال یہ بات مجھے پہلے سے ہی سوچ لینی چاہئے تھی۔ لیکن نہ سوچی۔ خیر تو اس خط میں نے لکھا تھا کہ میں تم سے اسی جگہ ملوں گا اور جہاں مجھے کم سے کم چھ ہفتے پہلے پہنچ جانا چاہئے تھا۔ کے علاوہ اس خیال سے کہ مبادا وقت پر یہاں نہ پہنچ سکوں میں نے جوی کو بھی تمہاری آمد کے ایک پیغام بھیج دیا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ پیغام بھی کسی وجہ سے جوی تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن اچھا تھا کہ تم نے ٹھنڈی کاشوت دیتے ہوئے کرشن میں میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟

حالانکہ یہ وہ موضوع ہے جس پر میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا تھا کہ تم ضرور سفر کرو راتے بہت سے سامان آدھیوں کے ساتھ صرف ایک راتے سے ہی سفر کیا جا سکتا تھا اور وہ طوم تھا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے پھر سے کہنا کیا۔

ان نے اسے انگریزوں کا جہاز سمجھ لیا تھا اور پانی حاصل کرنے کیلئے لنگر ڈال دیا تھا۔ جہاز کے چند لوگوں نے مجھے مستقر کے دالان میں پڑا پایا اور جب دیکھا کہ مرا نہ تھا۔ تو وہ مجھے جہاز میں اٹھا لئے۔ بڑھایا جو میری تیار داری کر رہی تھی انہیں کہیں نظر نہ آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان ملاحوں کو ہر بھاگ گئی ہوگی۔

ترازی میں مجھے اپنے ہی گروہ کے اندر ایک پادری کے حوالے کر دیا۔ اس وقت میں موت اور لی کے درمیان لنگ رہا تھا۔ اس پادری کے گھر میں ایک عرصے تک کھاتے سے لگا رہا۔ پورے چھ صد میرا دماغ ٹھکانے پر آیا۔ اتفاقاً ایک اچھا سرجن وہاں موجود تھا۔

چنانچہ اس نے میری کھوپڑی کی وہ کرچیاں جو ٹوٹ کر دھنس گئی تھیں بڑی مہارت سے نکال اور زخم کی مرہم پٹی کر دی اور اسکے بعد میرے ماتھے کا زخم بڑی تیزی سے مندل ہو گیا اور میری انی قوت عود کر آئی۔ پھر اس وقت کی سرکار نے میرے بارے میں تحقیق کی لیکن وہ بھی کچھ زیادہ معلوم نہ کر سکے۔ یہ پورا علاقہ گویا بردہ فروشوں کے قبضے میں تھا اور ان بردہ فروشوں کی پشت پازئی بڑی غلاموں کی منڈیوں کے تاجر کر رہے تھے اور تم جانوئیں راج! اس وقت سب ہی تجارت سے روپیہ کما رہے تھے۔ انگریز، فرانسیسی، پرنگالی اور امریکی بھی اور عرب بھی۔

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ غالباً ان یادوں سے اس کے دل پر غم کے بادل چھا گئے تھے۔

”تو تمہیں اپنی بیوی کے متعلق کچھ نہ معلوم ہوا؟“ لیوشن نے پوچھا۔

”ہاں مسٹر لیوشن معلوم ہوا۔ ترازی میں ایک آزاد شدہ غلام نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک عورت دیکھی جس کا حلیہ ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا۔ وہ عورت کہاں تھی؟

اس جگہ کا نام تو وہ غلام نہ بتا سکا البتہ اس نے یہ ضرور کہا کہ وہ مقام ساحل سے پندرہ دن کی فاصلت پر واقع تھا۔ اس وقت وہ عورت سیاہ فاموں کیساتھ تھی۔ آزاد شدہ غلام یہ بھی نہ بتا سکا کہ وہ اس قبیلہ تھا۔ بہر حال ان لوگوں نے اسے جنگل میں بھٹکتے پایا تھا۔ آزاد شدہ غلام نے ایک بات سمیت سے دیکھی کہ وہ سیاہ فام لوگ اس عورت کا بہت احترام کرتے تھے۔ حالانکہ وہ جو کچھ کہتی اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ پاتے تھے۔ دوسرے دن وہ شخص اپنی کم شدہ بکریاں تلاش کر رہا تھا کہ زردشوں نے اسے پکڑ لیا۔ معلوم ہوا کہ وہ بردہ فروش اس عورت کو تلاش کر رہے تھے۔ مجھے یہ کہ دوسرے دن اس آزاد شدہ غلام کے پیچھے چلے اچانک دم کر آئے غالباً اس لئے کہ جب وہ بردہ فروشوں کے ساتھ رہا۔ وہ اسے الٹی سیدھی اور ناکافی سی غذا کھلاتے رہے تھے۔ بہر حال نیرنہ ہوسکا اور چند دنوں بعد ہی مر گیا۔ اب غالباً تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں ترازی اور اس کے

کوئی تیس سال قبل میں اپنی جوان بیوی کے ساتھ بطور مبلغ چٹاری میں وارد ہوا۔ وہاں ایک مستقر اور ایک گرجا گھر بنایا تھا اور میں اپنی تبلیغ کے سلسلے میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ لیکن پھر ایک دن کچھ قبائلی لوگ ڈنگوں میں سوار ہو کر یہاں آئے کہ وہاں غلاموں کی تجارت کا اڈہ قائم کر لیا۔ میں نے ان کی مخالفت کی اور اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے بہت آدمی قتل ہوئے اور بقیہ کو ان ظالم لوگوں نے غلام بنا لیا۔ اس جھڑپ میں میرے ماتھے پر زخم آیا۔ دیکھو یہ ہے اس زخم کا نشان اور اپنے لائے اور سفید بال اس نے ماتھے پر سے ہٹائے تو چاند کی روشنی میں بھی ہمیں اس کے ماتھے پر ایک زخم کا نشان صاف نظر آیا۔

”تکوار کی اس ضرب نے مجھے بے ہوش کر دیا اور جب میں بے ہوش ہو کر گرا تو اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دن کافی چڑھ آیا تھا اور وہاں کوئی نہ تھا۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو میری تیار داری کر رہی تھی۔ وہ شدت غم سے نیم پاگل ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کا شوہرا دو بیٹے مارے جا چکے تھے اور اس کے تیسرے بیٹے اور بیٹی کو حملہ آور بردہ فروش اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میری جوان بیوی کہاں ہے تو اس نے جواب دیا کہ حملہ آور اسے لے گئے ہیں۔

اس نے بتایا کہ کوئی دس گھنٹے پہلے بردہ فروشوں کو سمندر میں ایک جہاز کی روشنیاں نظر آئیں۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ وہ جہاز ہوگا جو بردہ فروشوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ چنانچہ بردہ فروش بڑی عجلت میں اندرون ملک فرار ہو گئے۔ انہوں نے زنجیروں کو قتل کر دیا۔ لیکن مجھے مردہ سمجھ کر چھ گئے۔

بڑھیا ساحل پر پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں میں چھپ گئی تھی اور جب بردہ فروش لے گئے تو اپنی کمین گاہ سے نکل کر گھر میں آئی تو وہاں مجھے بے ہوش پڑے پایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میری بیوی کو کہاں لے گئے ہیں یہ بڑھیا نہ جانتی تھی۔ لیکن ہمارے چند آدمیوں نے بتایا کہ انہوں نے چند بردہ فروشوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تھا کہ وہ کوئی سو میل اندرون خطہ جارہے ہیں اور وہاں وہ اپنے سردار سے جا ملیں گے۔ معلوم ہوا کہ ان کا سردار ایک دوغلی نسل کا ڈیوڈ نامی شخص تھا اور میری بیوی کو اسی کے پاس لے جا رہے تھے کہ اس بد معاش کو تختہ نشین کر دیں۔

یہ بھی ایک خبر سی تو اس کے صدمے سے یا پھر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے میں بھرپور ہو گیا اور پورے دو دن بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک جہاز کے کمر میں پایا۔ یہ جہاز ترازی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اسی جہاز کی روشنی تھی جو بردہ فروشوں کو نظر آئی تھی ا

ملحقہ علاقوں کے راستے کیوں نہ جانا چاہتا تھا۔“

”ہاں۔ ہم نے یہ ہی نہیں بلکہ چند دوسری باتیں بھی سمجھ لی ہیں۔ جن کے بارے میں ہم پھر کبھی فرصت سے گفتگو کریں گے۔ چنانچہ اب میں موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھ رہا ہوں کہ اس وقت تم کہاں سے آئے ہو اور یہ کیسے ہوا کہ تم عین وقت پر یہاں پہنچ گئے؟“

”میں اسی طرف آ رہا تھا۔ لیکن چکر کاٹ کر اس راستے سے آ رہا تھا جو میں تمہیں نقشے میں دکھاؤں گا۔“ اس نے جواب دیا کہ اچانک ایک حادثے سے دوچار ہوا اور میری ایک ٹانگ تقریباً بے کار ہو گئی۔“

اور یہاں میں نے لیوٹن کی اور اس نے میری طرف دیکھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ میں پورے چھ ہفتے تک ایک سیاہ قام کی جھوپڑی میں پڑا رہا۔ جب میں نے بستر چھوڑا تھا اس وقت بھی میں ٹھیک سے نہ چل سکتا تھا۔ اس لئے میں ان بیلوں پر سوار ہو کر سفر کرنے لگا۔ جنہیں میں نے اس کام کیلئے سدا حیا تھا۔ اس میں وہ آخری تیل تھا۔ جس پر سوار ہو کر میں یہاں آیا تھا۔ بقیہ تیل ایک ایک کر کے راستے ہی میں مر گئے۔ انہیں ٹیسی ٹیسی نے کاٹ لیا تھا۔ ایک عجیب خوف جسے میں سمجھ نہ سکا۔ میرے دل پر مسلط تھا۔ جو مجھے مسلسل سفر کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

پچھلے چوبیس گھنٹوں میں میں کھانے پینے کیلئے بھی کہیں نہ رکا۔ جب میں ہولون علاقے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کراں خالی پڑے ہوئے ہیں اس میں کوئی نہ تھا۔ سوائے چند عورتوں اور لڑکیوں کے انہوں نے مجھے پہچان لیا اور میری گردن میں ہول ڈال دیئے۔ انہی سے مجھے معلوم ہوا کہ تمام کراں والے سرداری کراں میں گئے ہوئے ہیں۔ جہاں کوئی جشن منایا جا رہا ہے۔ یہ جشن کیا تھا۔ عورتیں نہ بتا سکیں یا پھر یہ بات انہوں نے مجھ سے چھپائی۔

چنانچہ میں نے اپنی رفتار اور تیز کردی اور خدا کا شکر کہ عین وقت پر یہاں پہنچ گیا۔ یہ بڑی طویل داستان ہے۔ جس کی تفصیلات میں پھر کبھی بیان کروں گا۔ اس وقت تو ہم سب بے حد تھکے ہوئے ہیں۔ لیکن..... لیکن یہ شور کیا.....؟



میں غور سے سننے لگا اور پہچان لیا کہ یہ شلو شکاریوں کا گیت تھا۔ وہ لوگ لوزی اور اسکے اگر دوں کے قتل ہونے کا وحشیانہ منظر دیکھنے کے بعد فتح و کامرانی کا گیت گاتے لوٹ رہے تھے۔ ندھانیوں کے بعد یہ ہی لوگ آ گئے۔ آگے آگے کراں تھا۔ بالکل ہی بدلا ہوا کراں۔ یہی وہ شخص تھا۔ ایک گھنٹے پہلے قتل کی طرف جاتے ہوئے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ لیکن اب وہ بے حد ہشاش ناش تھا اور اس نے اپنے گلے میں وہ مکروہ مالائیں ڈال رکھی تھیں۔ جنہیں میں لوزی کی گردن میں لپک چکا تھا۔

حق کی فتح ہوئی اور شیطان کی فر کردار تک پہنچ گئے۔ مسٹر ہنس راج! اس نے اعلان کیا۔ ”اور یہ ناغیمت اور اس نے مرحوم وچ ڈاکڑ کی گھناؤنی مالاؤں کی طرف اشارہ کیا۔“

”بھاگ جاؤ یہاں سے بزدل“ میں نے کہا۔ ”ہم کچھ سنتا نہیں چاہتے جاؤ جا کر کھانا بنا۔ رے لئے اور وہ خوشی سے جموتا ہوا چلا گیا۔“

شلو شکاری آگس کو اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ سوچ کر میں لرز گیا کہ شاید یہ مر گیا ہے۔ لیکن اب میں نے اس کا معائنہ کیا تو پتا چلا کہ وہ صرف بے ہوش تھا اور یہ بے ہوشی ایسی تھی جیسی کہ افیون مانے کے بعد آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔ جگر کے مشورے پر عمل کر کے اسے ایک کبل میں اچھی رح لپیٹ کر آگ کے قریب لٹا دیا گیا۔

اب فونا آ گیا اور ہمارے سامنے پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”ہنس راج!“ اس نے کہا۔ ”کہو..... اب کیا کہتے ہو؟“

”شکر ہے کے الفاظ فونا۔ اگر تم نے ایسی حاضر دماغی کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو لوزی میرا خاتمہ چکا ہوتا۔ اس کے چاقو نے میری جلد کو صرف مس ہی کیا تھا۔“

فونا نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے یہ کوئی اہم مسئلہ نہ ہو اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

بڑا حاپے میں تمہیں موت کو خوش آمدید کہنا چاہئے۔“

”آہ باس! وہ بولا۔“ کیا سچ تم دنیا میں ہیں؟“ ہائے ہائے کیوں کھالی میں نے وہ دوا۔ یہ ہوا۔ بہت برا۔ ہوا کہ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور میں نے روتا روتا کو آتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ برا ہوا کہ میری آنکھیں بند تھیں اور لوزی اور اسکے چیلوں کو ہماری جگہ ان ستونوں سے بندھے نہ رہا۔ جن سے ہمیں باعہا گیا تھا۔ ہائے ہائے..... اس کا افسوس مجھے عمر بھر رہے گا۔ یہ تو بہت ہی ہوا۔ چنانچہ باس اب میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے کتنی ہی دفعہ کیوں نہ مرنا پڑے آئندہ سے اپنی میں کھلی رکھ کر مردوں گا۔“

اور آرمس کا یہ افسوس بجا بھی تھا۔ کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے آرمس کی زندگی اجیرن کی۔ اول تو یہ شولڈ فکار یوں نے اسے ایک عظیم الشان خطاب نے نواز دیا جس کا مطلب تھا بانٹھا چوہا۔ جوالا کھا کر اڈھ جاتا ہے۔ جب کہ کالے چوہے اپنے دشمنوں کو کھا لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کا مذاق اڑانے اور اسے بزدلی کا طعنہ دینے لگا۔

اور اسے لوزی کی مالائیں دکھا کر اعلان کیا کہ یہ چیزیں اس نے ہولوں لوگوں کے زیر دست رکی گردن سے تھکیت لی تھیں اور یہ واقعی اس نے لوزی کی گردن سے تھکیت لی تھیں۔ لیکن اس جب وہ مر چکا تھا۔

اس رات میں بہت دیر سے سویا تھا۔ اس کے باوجود سویرے بیدار ہو گیا۔ خصوصاً اس لئے کہ نگر سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جیسی کہ مجھے توقع تھی۔ وہ واقعی بیدار ہو چکا تھا۔ وہ جھونپڑے میں بیٹھا ہوا تھا ایک موسم جی جل رہی تھی اور وہ اس کی روشنی میں ان پھولوں کو اپنے سا رکھ رہا تھا۔ جو اس نے سفر میں حاصل کئے تھے۔

”جنگر“ میں نے کہا۔ میں تمہاری وہ چیزیں لایا ہوں جو غالباً تم نے گم کر دی تھیں۔“

”اور میں نے اسے وہ کتاب جس کا نام تھا ”ایک پادری کے شب و روز“ اور ایک واٹر کلر تصویر لے سامنے رکھ دیں یہ دونوں چیزیں میں نے اس کے مستقر سے حاصل کی تھیں۔

پہلے اس نے تصویر اور کتاب کی طرف دیکھا اور پھر پوچھا ”ہنس راج یہ چیزیں تمہارے پاس سے آئیں۔“

چنانچہ میں نے اپنے سفر کی کہانی شروع کی اور آخر تک اسے سنا دی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

”ہنس راج! تم نے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔ چنانچہ اب مناسب ہوگا کہ میں اعتراف کر لوں کہ

”یہ نہیں ہنس راج! میرا مطلب تھا کہ اب تم کیا کہتے ہو۔ میرے سانپ کے بارے میں؟“

”صرف یہ کہ تمہارا اندازہ صحیح تھا اور میرا غلط۔“ میں نے سرخ ہو کر جواب دیا۔ ”لیکن یہ نہیں جانتا کیوں اور کیسے؟“

”اور تم یہ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ سب اس کا یہ ہے کہ تم مہذب دنیا کے لوگ اپنے آپ کو دنیا کے عقلمند ترین انسان سمجھتے ہو۔ لیکن اب تمہیں نظر آئی گیا ہے کہ تم لوگ احمقانہ خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ بس مجھے اطمینان ہو گیا۔ جھوٹ اور دج ڈاکٹر سب کے سب مر گئے اور میں سمجھتا ہوں کہ لوزی۔“

میں نے اپنا ہاتھ بلند کر کے اسے خاموش کر دیا۔ کیونکہ میں تفصیلات سننا نہ چاہتا تھا اور فوٹا اٹھا۔ مسکرایا اور چلا گیا۔

”اپنے سانپ سے اس کا کیا مطلب تھا؟“ جنگر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”میں نے پورا معاملہ مختصر بیان کرنے کے بعد پوچھا کہ کیا وہ اس کی تشریح کر سکتا ہے۔ جنگر نے سر ہلایا۔

افریقہ علم کی ایسی عجیب ترین مثال میں نے کبھی دیکھی اور نہ سنی۔“ وہ بولا بے حد کار آمد چیز ہے۔ رہی تشریح تو اس کی کوئی تشریح ممکن نہیں سوائے اس کے کہ آسمان اور زمین میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو سمجھنا ممکن نہیں اور یہ خدا نے مختلف انسانوں کو مختلف عطیے دیئے ہیں۔“

اس کے بعد کھانا کھایا گیا اور آج یہ کھانا مجھے بے حد لذیذ معلوم ہوا کھانے سے فارغ ہو کر دوسرے لوگ تو اپنے اپنے بستر میں دبک گئے لیکن میں بے ہوش پڑے ہوئے آرمس کے قریب بیٹھ رہا۔ کیونکہ اس سطح مرتفع پر ہوا سرد تھی۔ فی الحال نیند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ باہر ہولوں شور مچا رہے تھے۔ وہ لوگ غالباً دج ڈاکٹروں کے خاتمے اور روتا نو کی آمد کا جشن منا رہے تھے۔ دفعتاً آرمس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک دم سے اٹھ بیٹھا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

شعلوں کے سائے اس کے اور میرے چہرے پر ناچ رہے تھے۔

”باس!“ اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ ”لو“ تم بھی آگئے اور میں بھی پہنچ گیا اور یہ وہ آگ ہے جو ہمیشہ جلتی رہتی ہے اور کبھی بجھتی نہیں بہت اچھی آگ ہے۔ یہ باس! یہ کیا بات ہوئی۔ ہم اس آگ میں نہیں جیسا کہ دادا شلوکا کراتی نے کہا تھا بلکہ ہم اس کے باہر سردی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”اس لئے بے وقوف کہ تم اب بھی دنیا میں ہی ہو۔“ میں نے کہا اور یہ اس لئے ہوا کہ فوٹا کے سانپ کی زبان بچی زبان ہے اور روتا نو آ گیا ہے۔ جیسی کہ فوٹا نے پیش گوئی کی تھی۔ چنانچہ ہم زندہ ہیں اور ہماری جگہ لوزی اپنے شاگردوں کے ساتھ مارا گیا۔ اگر تم نے خوفزدہ ہو کر وہ بدبودار دوا نہ لگ لی ہوتی اور بے ہوش نہ ہو گئے ہوتے تو تم بھی یہ تماشہ دیکھتے۔ لیکن تم مرنے سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ

دکا کہ میں انگوٹی لوگوں میں کیوں جانا چاہتا ہوں۔ انگوٹی جو ایک سفید قام دیوی کو پوجتے ہیں۔“  
”ہاں..... سمجھ گیا۔“

اور میں جمونپڑی سے باہر آ گیا۔ کیونکہ میں نے وہ باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا اور خصوصاً اس بھی کہ اس بحث کو مزید آگے بڑھانا مجھے مناسب نہ معلوم ہوا یہ میرے لئے تو ناقابل یقین تھی کہ قانون اب تک زندہ ہو سکتی تھی اور مجھے یہ خوف تھا کہ اگر جگر کو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے تو خدا نے اس پر کیا اثر ہوگا۔

جب ہم ناشتہ کر رہے تھے تو آرگس جو اپنے سر کے درد اور غنودگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی س سے تفریح کرنے بہتی سے باہر گیا ہوا تھا۔ آیا اور اس نے اعلان کیا کہ سر لوگاٹ! بہت ”لدے“ دے ”سپاہیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ اس کے استقبال کو باہر جانے ہی والا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ اب بہتی میں جگر سے بڑا اور کوئی نہ تھا۔ چنانچہ میں جہاں تھا وہیں بیٹھ رہا اور خود اس سے کہا کہ چونکہ ہمارے گروہ میں وہی ”بڑا“ تھا اس لئے وہ خود لوگاٹ کا استقبال کرے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جگر اس قابل بھی تھا خصوصاً اس لئے کہ وہ خاصا رعب دار آدمی تھا۔ چنانچہ نے جلدی سے کافی ختم کی اور اٹھ کر ہم سے چند قدم آگے کھڑا ہو گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کمر پر کئے ہوئے تھے اور ٹانگیں قدرے پھیلی ہوئی تھیں۔ اول تو وہ بوڑھا تھا اور پھر اس طرح کھڑے نے کا انداز مرعوب کن تھا۔ چنانچہ وہ بڑا شاعر معلوم ہو رہا تھا۔ لوگاٹ اور اس کے ”لدے“ دے ”ساتھی پیٹ کے بل ریگتے ہوئے جمونپڑی میں داخل ہوئے۔

اے..... روتا نو! لوگاٹ نے کہا۔ ”تمہارے بھائی بادشاہ جوسی نے ان مہذب لوگوں کی جو مارے بھائی ہیں۔ بندوقیں واپس بھجوائی ہیں اور ساتھ ہی چند تحائف بھی بھجوائے ہیں۔

”بڑی خوشخبری ہے یہ جرنیل لوگاٹ! نس راج نے کہا۔ ”البتہ اگر جوسی نے میرے بھائیوں کو ہتھیار نہ لئے ہوتے تو یہ اور بھی اچھا ہوتا۔ بہر حال یہ چیزیں رکھ دو۔ اس طرح چلنا مجھے پسند میں۔“

اس حکم کی تعمیل کی گئی اور ہم نے بندوقوں اور بارود کا معائنہ کیا اور پستول اور ان دوسری چیزوں بھی چیک کیا جو جوسی کے دربار کے دروازے پر ہم سے لی گئی تھیں۔ کوئی چیز غائب نہ تھی اور نہ کسی چیز کو نقصان پہنچایا گیا تھا۔ چار عمدہ ہاتھی دانت ان کے علاوہ تھے۔ جو مجھے اور لیوٹن کو تحفہ میں بچے گئے تھے۔ یہ تحفہ میں نے قبول کر لیا۔ چند چغے تھے اور بہت خوبصورت ہولون پٹنگ جس کے لئے ہاتھی دانت کے تھے۔ یہ تحفہ خاص آرگس کیلئے تھا اور اس کی اس خصوصیت کے پیش نظر بھیجا گیا

یہ تصویر میری بیوی کی ہے اور یہ کتاب بھی اسی کی ہے۔  
”کیا مطلب؟“ میں چونک اٹھا۔

”ہاں۔ نس راج ہاں ہے“ حال کا مینہ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ مری نہیں میں اپنے اس یقین کی تشریح نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ٹھوڑے شولوکی اس پیش گوئی کی تشریح نہیں کر سکا تھا جو میری آمد کے متعلق تھی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم قدرت کے چند راز معلوم کر لیتے ہیں۔ خدا جانے کس طرح؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری شب و روز کی دعاؤں کے جواب میں یہ حقیقت مجھ پر ظاہر کی گئی ہے کہ میری بیوی زندہ ہے۔ ہاں آج بھی زندہ ہے۔“

میں برس بعد بھی جگر۔“

”ہاں..... میں برس بعد بھی“ اس نے کہا۔ اور پھر جوش میں آ کر پوچھا ”نس راج کیا خیال ہے۔ تمہارا کہ میں ایک مدت سے افریقہ کے جنگلوں اور خوشخوار وحشیوں میں کیوں بھٹک رہا ہوں اور اپنے آپ کو پاگل کیوں ظاہر کر رہا ہوں۔ کیا اس لئے کہ سیاہ قام مجھ سے کوئی تعرض نہ کریں۔“



میرا تو خیال تھا کہ تتلیاں اور نباتات کے نمونے جمع کرنے کیلئے جنگل جنگل بھٹک رہے ہو۔  
”یہ تو ایک بہانہ ہے۔ نس راج! میں اپنی بیوی کی تلاش میں جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھان رہا ہوں۔ تم اسے میری حماقت کہو گے خصوصاً اس وقت جب میں تم کو بتاؤں گا کہ جب بدوا فروش اسے لے گئے تو اس کی کیا حالت تھی۔“

”کیا حالت تھی؟“

”وہ حاملہ تھی۔ لیکن نس راج یہ میری نہ حماقت ہے اور نہ میں دیوانہ ہوں“ مجھے یقین ہے کہ وہ افریقہ کے جنگلوں میں کسی جگہ ان وحشیوں میں کہیں موجود ہے اور زندہ ہے۔“  
”اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہوگا کہ وہ تم کو نہ ملے۔“ میں نے کہا۔

اور یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ میں ایسی بہت سی ایسی مہذب عورتوں کے متعلق سن چکا تھا۔ جو زمانہ قدیم میں کسی حادثے کا شکار ہو کر مثلاً جہاز کی تباہی کے بعد اس کے تختے سے لپٹ کر افریقہ کے ساحل تک پہنچ گئی تھیں۔ ان کے ہاتھ پڑ گئی تھیں اور ان کی بیویاں بن گئی تھیں۔

”نہیں۔ نس راج! تم جو سوچ رہے ہو۔ میں اس طرف سے مطمئن ہوں۔ اگر خدا نے میرا بیوی کو زندہ رکھا ہے تو اسی نے اس کی حفاظت بھی کی ہوگی۔ اور اب اس نے اضافہ کیا۔“ تم نے سمجھ

کہ وہ عین آزمائشی گھڑی میں اپنی مرضی سے گہری نیند سو جاتا ہے۔ یہ سن کر شولو مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے اور آگرس کو ستا اور گالیاں بکلا وہاں سے بھاگ گیا۔ کراں کی خدمت میں ایک عجیب ہاجا پیش کیا گیا اور اس درخواست کے ساتھ کہ آئندہ وہ اپنی آواز کے بجائے یہ باجا بجائے۔

کراں تو اتنا بھی نہ سمجھ سکا۔ جتنا کہ آگرس نے سمجھا تھا۔ البتہ ہم سب ہولون لوگوں کی اس ظرافت اور خوش طبعی کی داد دینے بغیر نہ رہ سکے۔

”مسٹر ہنس راج!“ کراں بولا انگوٹھا چوسنے والے یہ کالے بچے اب بھی اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر ہمیں نقل محفل بنا رہے ہیں تو خیر یونہی سہی۔ لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ میری دعائیں تمہیں جو سات آسمان چیر گئیں اور آپ سب تیروں سے محفوظ رہے۔“

”اے روتا روتا اور اے آقا۔“ لوگاٹ نے کہا۔ ”بادشاہ جوی تم سب کو اپنے حضور مدعو کر رہا ہے تاکہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہو اور تم لوگوں سے معافی طلب کرے اور اس دفعہ تم کو مسلح ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہولون لوگوں سے اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

چنانچہ ایک بار پھر وہی تحائف لئے جو لوٹا دیئے گئے تھے۔ شاہی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے اور اب دفعہ ہماری شان و شوکت اور عظمت یہ تھی کہ لوگ ہمارے سامنے جھکے جا رہے تھے اور ہولے ہولے تالیاں بجا رہے تھے اور یہ شاہی سلام کا طریقہ تھا اور عورتیں اور بچے ہم پر پھول برسا رہے تھے۔ ہمارا راستہ اسی میدان سے گزر رہا تھا جس میں وہ ستون جن سے ہمیں باعہا گیا تھا اب بھی گڑے ہوئے تھے۔ لیکن قبریں بند کر دی گئی تھیں۔ ان ستونوں پر میری نظر پڑی تو میں کانپ گیا۔ ہم دربار میں پہنچے تو جوی اور اس کے مشیر ہمارے استقبال کو نہ صرف اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ

انہوں نے بڑے ادب سے ہمیں سلام کیا۔ بلکہ بادشاہ نے تو آگے بڑھ کر جھگر کا ہاتھ تمام لیا اور اصرار کر کے اپنی گندی کالی ناک جھگر کی ناک پر رگڑتا رہا۔ معلوم ہوا کہ یہ رسم ایسی ہی تھی جیسی کہ ہمارے یہاں بخلگیر ہونے کی رسم ہے اس کے بعد طول و طویل تقریروں کا سلسلہ چلاؤ بیچ میں مقامی شراب کا سلسلہ بھی چلا۔ جوی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب کیا دھوا لوزی اور اس کے چیلوں کا تھا اور لوگ ان لوگوں سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آسمانی روحوں سے باتیں کرتے تھے۔

جھگر نے ہم سب کی طرف سے بادشاہ کی یہ معذرت قبول کر لی اور ساتھ ہی ایک لیکچر بھی جھاز دیا جو پچیس منٹ تک جاری رہا۔ جھگر کے اس لیکچر کو دماغ کہنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ اس نے تو ہم پرستی بیان کرنے کے بعد سیدھی اور صحیح راہ کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا۔

”میرے بھائی“ جوی نے کہا۔ ”میں اس سیدھے اور سچے راستے کے بارے میں پھر کبھی سنوں گا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ اب تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔ چنانچہ تقریر کو کسی مناسب وقت کیلئے اٹھا رکھو۔ مثلاً اس وقت جب فصلیں تیار ہو جائیں اور ان کے کھلیان بھی لگ جائیں۔“

اس کے بعد ہم نے تحائف پیش کئے۔ جو اس دفعہ بڑے شوق سے قبول کر لئے گئے اور اب میں نے کہا۔

شاہ بوی! ہم عمر بھر اس علاقہ میں قیام کرنے کے بجائے جلد از جلد انگوٹی لوگوں کے علاقے کی طرف روانہ ہونا چاہتے ہیں۔

جوی اور اس کے مشیروں کے منہ لٹک گئے۔

”سنو آقا! ہنس راج! اور تم بھی سنو۔“ وہ بولا۔ یہ انگوٹی بڑے خوفناک جادوگر ہیں۔ بہت بڑا قبیلہ ہے ان کا اور بہت باقوت ہیں اور یہ لوگ کہ ولدلوں میں بستے ہیں اکیلے رہتے ہیں اور کسی سے میل ملاپ نہیں رکھتے۔ اگر ہولون یا دوسرے لوگ ان کے ہاتھ میں پڑ جاتے ہیں تو پھر انگوٹی انہیں اپنے ملک لے جاتے ہیں اور وہاں یا تو ان سے غلامی کرواتے ہیں یا پھر اپنے شیطان دیوتاؤں پر بھیجت چڑھا دیتے ہیں۔“

بادشاہ نے یہ غلط نہیں کہا۔“ لوگاٹ نے کہا۔ ”کیونکہ کم عمری میں خود میں انگوٹی لوگوں کا غلام تھا اور مجھے دیوتا پر بھیجت چڑھایا جانے والا تھا۔ وہاں سے فرار ہونے کے سلسلے میں ہی میری یہ آنکھ جاتی رہی۔“

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لوگاٹ کی یہ بات میں نے یاد رکھی کیونکہ اس وقت اس بحث کو آگے بڑھانا مناسب نہ تھا۔

”اگر لوگاٹ نے یہ غلط نہیں کہا۔“ میں نے دل میں سوچا۔ ”اگر وہ واقعی کبھی انگوٹی لینڈ میں رہا ہے تو پھر وہاں تک ہماری راہبری بذات خود کر سکتا ہے یا کم سے کم ہمیں راستہ تو بتا ہی سکتا ہے۔“

”اور اگر کبھی کوئی انگوٹی ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے تو ہم اسے قتل کر دیتے ہیں۔ اکثر دفعہ جب یہ لوگ غلاموں کی تلاش میں آتے ہیں تو چند کو ہم پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔“ جوی نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”تقریباً اسی وقت سے جب سے ہولون یہاں آباد ہو رہے ہیں۔ ہمارے اور انگوٹی کے درمیان نفرت اور جنگ کی جوالا بھڑک رہی ہے۔ اگر ایک دفعہ میں ان شیطانوں کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اس دنیا سے کوئی ارمان لے کر نہ جاؤں گا۔“

”اور جب تک یہ شیطان زندہ رہے تب تک تو ہماری یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔“ لوگاٹ نے



تین لوگوں نے تنہائی میں اس سے ملاقات کی۔

”لوگاٹ! ہمیں انگو لی لوگوں اور ان کے شیطان کے متعلق بتاؤ جس کی وہ پرستش کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہنس راج!“ اس نے کہا۔ ”پچاس سال کا عرصہ ہوا جب میں اس منوس ملک میں تھا اور میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ اس کی یاد ایسی ہی ہے جیسے کہ میں ان واقعات کو دھند کی چادر میں سے دیکھ رہا ہوں۔ ہنس راج! اس وقت میری عمر بارہ برس کی تھی۔ میں زسلوں سے پھیلیوں کا شکار کر رہا تھا کہ سفید چنے میں لمبوس طویل القامت لوگ کشتی میں بیٹھ کر آئے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ لوگ مجھے اس بستی میں لے گئے جہاں ان کے جیسے ہی اور بہت سے لوگ تھے۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ مجھے اچھی اور میٹھی چیزیں کھانے کو دیتے یہاں تک کہ میں موٹا ہو گیا اور بیری جلد چکنے لگی۔

پھر ایک شام کو وہ مجھے لے کر بستی سے نکلے ہم لوگ رات بھر چلتے رہنے کے بعد ایک غار کے سامنے پہنچے۔ اس غار میں ایک بے حد بھیاں بھیا ہوا تھا جس کے چاروں طرف سفید چنے الے آدی ناچ رہے تھے۔ یہ لوگ اس شیطان کی رسم ادا کر رہے تھے۔

اس بھیاں بھیا نے مجھے مطلع کیا تھا کہ دوسرے دن مجھے پکا کر کھالیا جائے گا۔ کیونکہ اس لئے مجھے کھلا پلا کر موٹا کیا گیا تھا۔ غار کے دہانے کے سامنے ایک ڈونگا پڑا ہوا تھا اور اس کے بعد پانی کی چادر تھی۔ جب سب سو رہے تھے تو میں ریگ کر ڈونگے کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے ڈونگے کا سہ کھولا ہی تھا کہ ایک کاہن کی آنکھ کھل گئی اور وہ میری طرف دوڑا۔ لیکن میں نے چوڑاٹھا کر ایک رب اس کے سر پر لگائی۔ حالانکہ اس وقت میں کم عمر تھا۔ لیکن بہادر اور پر قوت تھا۔ کاہن چھپاک سے پانی میں گرا۔

لیکن چند ٹانیوں بعد پھر ابھرا اور اس نے ڈونگے کی دیوار پکڑ لی۔ میں اس کی اگلیوں پر چھو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کنارہ چھوڑ دیا۔ اس رات ہوا تیزی سے چل رہی تھی اور ساحل پر لٹھے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ ہوا ڈونگے کو چکر دے رہی تھی۔ ایک نئی آکر میری آنکھ میں لگی۔ اس وقت میں نے کچھ محسوس نہیں کیا۔ لیکن بعد میں میری یہ آنکھ خشک ہو گئی یا شاید وہ بھالا یا چاقو تھا۔ جو میری آنکھ میں لگا تھا۔ بہر حال میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اچھا چلا تا رہا۔ یہاں تک کہ مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور تیز ہوا بدستور چلتی رہی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے آخری بات مجھے یاد تھی کہ ہوا ڈونگے کو زسلوں میں مچھینے لے جا رہی تھی۔

کہا۔ انگو لی لوگوں میں یہ پیش گوئی سلا چلی آ رہی ہے کہ جب تک سفید شیطان زندہ رہے گا اور جب تک مقدس پھول نکلتا رہے گا جب تک انگو لی بھی زندہ رہیں گے۔ لیکن جب سفید شیطان مر جائے گا اور مقدس پھول نکلتا ترک کر دے گا تو ان کی عورتوں کی کوکھ سوکھ جائیں گی وہ بچے نہ جنمیں گی اور پھر انگو لی کا خاتمہ ہو جائے گا۔“

”میرے خیال میں تو ایک نہ ایک دن یہ سفید دیوتا مرے گا ہی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں ہنس راج! وہ اپنے آپ نہیں مرے گا۔ اس کے شیطان کا ہن کے بقول وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہاں تک کہ کوئی اس کا خاتمہ کر دے لیکن کون ہے جو اس شیطان کا خاتمہ کر سکے؟“

”اگر موقع مل جائے تو میں خود کوشش کروں گا“ یہ میں نے سوچا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

”اے میرے بھائی روتانو اور ساتھیو!“ جوسی نے کہا۔ ”یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ تم انگو لی لینڈ میں جاؤ ہاں۔ اگر ایک زبردست لشکر لے کر جاؤ تو شاید ان کے ملک میں داخل ہو سکتے ہو۔ لیکن میں اپنا لشکر تمہارے ساتھ کس طرح بھیج سکتا ہوں؟ ہولون خشکی کے لوگ ہیں۔ چنانچہ ہمارے پاس ڈونگے ہیں نہیں کہ اس عظیم جمیل کو عبور کر سکیں اور نہ ہی درخت ہیں کہ ان سے ڈونگے بنائے جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد دربار برخواست ہوا اور ہم جنگجو جوسی کے پاس چھوڑ کر اپنی قیام گاہ کو لوٹ آئے۔ کیونکہ جوسی اپنے بھائی کی صحت کی طرف سے شکر تھا۔ چنانچہ وہ اس کے متعلق تفصیل سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لوگاٹ کے قریب سے گزرتے وقت میں نے اس سے کہا۔

”لوگاٹ! میں تنہائی میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں آج ہی شام کے کھانے کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔ ہنس راج“ اس نے کہا قیام گاہ پر پہنچے تو آگرس بیٹھا بندوقیں صاف کر رہا تھا۔ اس دوا والے واقعہ کے بعد وہ بہت کم باہر آتا تھا۔ اسے بندوقیں صاف کرتے دیکھا تو مجھے اپنا وعدہ یاد آ گیا۔ میں نے فوراً فونا کو طلب کیا اور دونوں بندوق جس کا میں نے اس سے وعدہ کیا تھا اسے دیتے ہوئے کہا۔

”اے سچے پیشگو! یہ تمہاری ہو گئی۔“

”ہاں۔ لوگاٹ کچھ دیر کیلئے یہ میری ہو گئی ہے۔ لیکن پھر تمہاری ہی ہو جائے گی۔ وہ بولا اس کا یہ جواب مجھے بڑا ہی عجیب اور الفاظ معنی خیز معلوم ہوئے۔ اس کے باوجود میں نے اس کا مطلب نہ پوچھا۔ خدا جانے کیوں اب میں فونا کی پیش گوئی سننا نہ چاہتا تھا۔

اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور پڑ کر سو رہے شام کے وقت لوگاٹ حسب وعدہ آ گیا اور ہم

”ملکہ جن“ بنایا جاسکے۔ یقیناً وہ بوڑھی کاہنہ مرچلی ہوگی۔

کیونکہ کئی برس پہلے انگوی لینڈ میں ایک زبردست جشن منایا گیا تھا اور بہت سے غلاموں کو پکا کر کھالیا گیا تھا۔ کیونکہ پجاریوں کو ایک نئی کاہنہ مل گئی تھی۔ جس کے بال سنہرے تھے اور جس کے ناخن ایسے ہی تھے جیسے کاہنہ کے ہونے چاہئیں۔“

”اور یہ کاہنہ بھی مرچلی ہے؟“ جگر کی آواز کانپ رہی تھی۔

”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ زندہ ہے۔“

”اور تمہارا یہ خیال کس بنا پر ہے؟“

”اگر وہ مرگئی ہوتی تو ہم نے مردہ ماں کو کھانے کے جشن کی افواہیں سن لی ہوتیں۔“

”مردہ ماں کو کھانے کا جشن؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... ہنس راج! انگوی لینڈ میں یہ رسم ہے کہ جب مقدس پھول کی کاہنہ مرجاتی ہے تو اس کا مقدس گوشت ان لوگوں کیلئے کھانا فرض ہو جاتا ہے۔ جو اس مقدس تبرک کے حقدار اور مستحق ہوتے ہیں۔“

لیکن وہ سفید دیوتا یا سفید شیطان کبھی نہیں مرتا اور اسے کبھی کھایا بھی نہیں جاتا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں ہنس راج! جیسا کہ میں نے کہا وہ لافانی ہے بلکہ وہ دوسروں پر موت نازل کرتا ہے۔ بیسا کہ تم کو خود معلوم ہو جائے گا۔ بشرطیکہ تم انگوی لینڈ گئے۔“ لوگاٹ نے آخری الفاظ کا اضافہ بڑی اسی سے کیا۔

اب چونکہ لوگاٹ سے ہم مزید کچھ نہ معلوم کر سکتے تھے اس لئے وہ اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ اس نے عجیب بھیا تک انکشاف کئے تھے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اگر فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا جائے میں انگوی علاقہ میں جانے کا ارادہ ترک کر دوں۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ جگر ایک خاص مقصد کیلئے ل بہر حال جانا چاہتا ہے۔

چنانچہ اک آہ بھر کر میں نے یہ معاملہ قسمت پر چھوڑ دیا اور یہ عجب اتفاق ہے کہ خود قسمت نے معاملہ کا فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ دوسرے ہی دن علی الصبح لوگاٹ ہمارے پاس آیا۔

”آقاؤ! اس نے کہا۔“ ایک حیرت انگیز بات ہوئی ہے۔ گزشتہ رات ہم انگوی کے متعلق باتیں رہے تھے اور اب دیکھو۔ انگوی لوگوں کا ایک وفد یہاں ہے۔ آج کا سورج طلوع ہوتے ہی یہی یہاں آ گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرا ڈونگا ساحل کے قریب تھا۔ میں ڈونگے سے باہر آیا تو گھنٹوں تک کچھڑ میں دھنسا رہا۔ ”چھپاک چھپاک“ میں کنارے کی طرف چلا اور اس آواز سے مگر مجھ گھبرا کر ادھر ادھر بھاگے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کئی دنوں بعد ہوش آیا ہوگا۔ کیونکہ ایک دم سے دہلا ہو گیا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر پھر بے ہوش ہو گیا۔ ہمارے قبیلے کے چند لوگوں نے مجھ کو وہاں پڑے پایا اور میرا علاج کیا۔ یہاں تک کہ میں تندرست ہو گیا۔ بس تو یہ ہے میری کہانی۔“

”کافی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا لوگاٹ! میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب صحیح دینا۔ ہولوں! علاقے میں جس جگہ تم کو پکڑا گیا اس جگہ سے وہ بستی کتنی دور ہے جہاں تم کو لے جایا گیا تھا؟“

”ڈونگے میں پورے ایک دن کا سفر تھا۔ ہنس راج! صبح مجھے پکڑا گیا تھا اور ہم شام کے وقت اس گھاٹ پر پہنچے تھے جہاں بہت سے ڈونگے بندھے ہوئے تھے اور ان میں سے چند ڈونگے تو اتنے بڑے تھے کہ اس میں بیک وقت پچاس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔“

”اور اس گھاٹ سے بستی کتنی دور تھی؟“

”بہت قریب ہنس راج!“

اور اب جگر نے سوال پوچھا۔ لوگاٹ! تم نے اس سرزمین کے متعلق بھی کچھ سنا ہو۔ پانی کی اس چادر کے جو غار کے قریب ہے۔ دوسرے کنارے پر ہے۔“

”ہاں..... روتا تو! میں نے اس وقت یا بعد میں کیونکہ انگوی لوگوں کے متعلق افواہیں ہم سننے ہی رہتے ہیں! میں نے سنا تھا۔“

”کیا سنا تھا؟“

”یہ کہ وہ جزیرہ ہے جہاں مقدس پھول اگتا ہے اور اس پھول سے تم واقف ہو۔ کیونکہ پچھلی دفعہ جب تم یہاں آئے تھے تو ایسا پھول تمہارے پھول کی رکھوالی ایک کاہنہ اور خادما میں کرتی ہیں۔ یہ تمام عورتیں کنواری ہوتی ہیں۔ وہ کاہنہ۔“ ملکہ جن“ کہلاتی ہے۔“

”یہ کاہنہ کون تھی؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن سنا ہے کہ ان لوگوں میں سے ہے جو مہذب دنیا کے لوگ کہلاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے والدین سیاہ قام ہی ہوتے ہیں۔ اب اگر انگوی لوگوں میں کوئی لڑکی ایسی پیدا ہو کہ اس کی رنگت سفید ہو یا اس کی آنکھیں پہلی ہوں یا وہ گونگی اور بہری ہو تو پھر اسے کاہنہ کی خدمت کیلئے منتخب کر لیا جاتا ہے، لیکن اب وہ کاہنہ مرچلی ہوگی۔ کیونکہ جس میں وہاں تھا تو وہ خود بہت بوڑھی تھی اور انگوی لوگ پریشان تھے۔ کیونکہ پوری ریاست میں کوئی ایسی سفید لڑکی نہیں تھی جسے اس کی جگہ

تھیں۔ میں دیوتاؤں کا منتخب کردہ ہوں اور جب وقت آئے گا اور وہ وقت دور نہیں ہے تو میں انگوٹی لوگوں کا ڈینو بنوں گا۔ یہ لوگ میرے خادم ہیں۔ میں یہاں دوستی کے وہ تحائف لے کر آیا ہوں جو باہر رکھے ہوئے ہیں اور یہ تحائف میں دیوتاؤں کے کاہن شانبو کے ایماء پر لایا ہوں۔

”میرا تو خیال تھا کہ تمہارے دیوتاؤں کا کاہن ڈینو ہی ہے۔“ جوسی نے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ ڈینو انگوٹی کا بادشاہ ہے۔ جس طرح تم ہولون کے بادشاہ ہو۔ شانبو جو گوشہ نشین ہے اور جسے کبھی کبھی ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ روحوں کا بادشاہ اور دیوتاؤں کی زبان ہے۔“

جوسی نے افریقی انداز میں سر ہلایا اور وہ اس طرح کے اس نے اپنی تھوڑی جھکانے کے بجائے اٹھادی اور شانبو نے کہا۔

”تمہارے وقار تمہاری شان اور تمہاری شرافت پر بھروسہ کر کے آیا ہوں۔ گویا اپنے آپ کو تمہارے اختیار میں دے دیا۔ تم چاہو تو مجھے قتل کر سکتے ہو حالانکہ اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ میری جگہ اور بہت سے لوگ میری جگہ ڈینو بننے کے منتظر ہیں۔“

”میں انگوٹی نہیں ہوں کہ سفیروں کو مار کر کھا جاؤں۔ جوسی نے طعنے لگا دیا کہ ان کے ان الفاظ نے انگوٹی سفیروں پر جبر جبری سی طاری کر دی۔

”شاہ ہولون یہ تم نے غلط کہا۔ انگوٹی صرف ان لوگوں کو کھاتے ہیں جنہیں دیوتا منتخب کرتا ہے۔ یہ ایک مذہبی رسم ہے۔ تم ہی کو وہ انسانوں کو کیوں کھانے لگے۔ جن کے پاس موسیوں کی کوئی کمی نہیں ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ جوسی غرایا۔ ”لیکن میرے دربار میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو اس معاملے میں ایک مختلف ہی کہانی کہے گا۔“

اور اس نے لوگٹ کی طرف دیکھا۔ جو بے چینی سے پہلو بدل کر سٹ گیا۔ گریس نے بھی اپنی شعلہ ہار آنکھوں سے لوگٹ کی طرف دیکھا۔

”یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔“ گریس نے کہا۔ ”کوئی ایسے بوڑھے کو پسند کرے جس میں کچھ نہیں سوائے کمال اور ہڈیوں کے لیکن اس بات کو ختم کرو۔“

اے بادشاہ میں تمہارا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ میں یہاں یہ درخواست لے کر آیا ہوں کہ تم ڈینو اور شانبو سے بات چیت کرنے کیلئے اپنے سفیر بھیجو تاکہ انگوٹی اور ہولون لوگوں کے درمیان دائمی امن قائم رکھنے کی شرائط طے پائیں۔“

”ڈینو اور شانبو گفتگو کرنے کیلئے خود ہی ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟“ جوسی نے کہا۔

”اچھا..... کیوں آیا یہ وفد؟“ میں نے پوچھا۔

”انگوٹی اور ہولون لوگوں کے درمیان صلح اور امن قائم کرنے۔ ہاں انہوں نے کہا کہ جوسی امن و امان قائم کرنے کیلئے اپنے سفیر انگوٹی بھیجے۔“ اس نے کہا اور پھر اضافہ کیا۔ ”گویا کوئی جائے گا وہاں۔“

ممکن ہے چند جیالے تیار ہو جائیں۔“ میں نے کہا دفعتاً ایک خیال بجلی کی سی برق سے میرے دماغ میں کوند گیا اور میں نے کہا۔ ”چلو ہم جوسی کے پاس چلتے ہیں۔“

آدھے گھنٹے کے بعد ہم شاہی رہائشگاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سے میری مراد مجھ سے اور لیوٹننٹ سے ہے۔ کیونکہ جگر تو شاہی جمونپڑے میں کھسا جوسی سے مصروف گفتگو تھا۔ لیکن شاہی رہائش گاہ کی طرف جاتے وقت ہمارے درمیان چند باتیں ہوئی تھیں۔

”جگر۔ میں نے کہا۔“ اگر تم انگوٹی لوگوں میں جانا چاہتے ہو تو قدرت نے یہ موقع فراہم کر دیا ہے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ ہولون لوگوں میں سے کوئی بھی انگوٹی لینڈ نہ جائے گا۔ کیونکہ وہ ڈرتے ہیں کہ مبادا انہیں دائمی سکون مل جائے اب چونکہ تم جوسی کے خون بدل بھائی ہو اس لئے تم سفیر کے طور پر وہاں جاسکتے ہو اور اپنے عملے کے طور پر اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔“

”یہ بات میں نے پہلے ہی سوچ لی تھی۔“ جگر نے اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ہم بادشاہ کے چند مشیروں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی جوسی اور جگر جمونپڑے سے باہر آئے۔ بادشاہ نے ہماری مزاج پرسی کے بعد حکم دیا کہ انگوٹی سفیروں کو حاضر کیا جائے ان لوگوں کو فوراً حاضر کیا گیا۔ یہ لوگ بلند قامت اور رنگت والے تھے ان کے خدوخال جاذب نظر تھے اور انہوں نے عربوں کی طرح سفید چنے اور عبائیں پہن رکھی تھیں۔ ان کی گردنوں میں سونے یا تانبے کے طوق اور کلائیوں میں اسی دھات کے کڑے پڑے ہوئے تھے۔

مختصر یہ کہ لوگ وضع قطع سے بڑے مرعوب کن تھے اور وسطی افریقہ کے باشندوں سے قطعی مختلف تھے۔ حالانکہ ان کی ذات میں کوئی خاص بات ضرور تھی کہ انہیں دیکھتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی اور مجھے گھن آنے لگی۔ ان کے بھال کمرال سے باہر ہی ان سے لے لے گئے تھے اور انہوں نے شاہ ہولون کو اس طرح سلام کیا کہ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کمر سے جھک گئے۔

”کون ہو تم؟ جوسی نے پوچھا۔“ اور کیا چاہتے ہو؟“

”میرا نام گریس ہے۔“ ان کے سردار نے کہا۔ جو نوجوان تھا اور جس کی آنکھیں شعلہ ہار

”کیونکہ اپنے علاقے سے باہر قدم رکھنا ان کیلئے خلاف قانون ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے سمجھا ہے کہ میں مستقبل کا ڈیونو ہوں۔ سنو..... کئی لسوں سے ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ چلی آ رہی ہے۔ اتنے برسوں پہلے اس جنگ کا آغاز ہوا تھا کہ اس زمانے سے کوئی واقف نہیں سوائے شانبو کے اور اسے بھی دیوتاؤں نے بتایا ہے کہ کسی زمان میں یہ پورا علاقہ انگوئی کے قبضے میں تھا اور ان کے صرف مقدس مقامات جمیل کے دوسری طرف تھے اور تمہارے اجداد آئے اور انہوں نے انگوئی پر حملہ کر دیا۔ بہت سوں کو قتل کیا۔ بہت سوں کو غلام بنایا اور ان کی عورتوں کو بیویاں بنا لیا۔ ڈیونو اور شانبو کہتے ہیں کہ بس اب جنگ کے بجائے امن ہو جائے۔ بس جس جگہ بنجر زمین ہے وہاں پھول اور گلہ لہلائے۔ بس اندھیرے کو جس میں لوگ بھٹک کر مر جاتے ہیں خوشگوار اجالے میں تبدیل کر دو کہ انگوئی ہولون اس اجالے میں ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر بیٹھیں اور بیویاں اور بولیں۔“

”خوب کہا۔ خوب کہا۔“ گریس کی اس خوش بمانی سے متاثر ہو کر میں بول پڑا۔

لیکن جوسی ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ اسے تو ان شاعرانہ تشبیہوں کی تہہ میں فریب اور دھوکہ نظر آیا۔

”ہمارے لوگوں کو پکڑ کر اپنے سفید شیطان پر بھیٹ چڑھانا ترک کر دو اور اس کے بعد شاید ایک دو برس بعد ہم تمہارے ان الفاظ پر غور کریں گے۔ جو شہد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ بولا۔

”اس وقت تو ایسے ہی ہیں جیسے کھیاں پکڑنے کا پھندا ہو۔ اس کے باوجود اگر میرے شہروں میں سے چند اپنی جانوں کی پرواہ نہ کر کے شانبو اور ڈیونو کی باتیں سننے کیلئے اور ان کے پاس جانے کیلئے تیار ہو جائیں تو میں بے شک انہیں روکوں گا نہیں۔ چنانچہ اے میرے مشیرو! اب کہو۔ لیکن ایک ساتھ نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے کیونکہ اسے ہی عزت بخشی جائے گی جو پہلے بولے گا۔“

جوسی کی اس دعوت کے بعد جو خاموشی طاری رہی۔ ایسی گہری خاموشی کا تجربہ شاید مجھے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ہر مشیر نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے مشیر کی طرف دیکھا۔ لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا۔

”ہیں۔ جوسی نے حیرت سے کہا۔“ کوئی نہیں بول رہا تھا۔ ارے تم لوگ قانون ساز ہو اور صلح پسند ہو۔ ہمارا عظیم جرنیل لوگاٹ کیا کہتا ہے۔“

”اے بادشاہ!“ لوگاٹ نے کہا۔ ”جب میں کم عمر تھا تو انگوئی لینڈ میں بالوں سے پکڑ کر لے جایا گیا تھا اور جب میں وہاں سے واپس آیا تو اپنی ایک آنکھ وہیں چھوڑ آیا اور اب میں دوبارہ اس علاقہ میں جانا نہیں چاہتا تو یوں کہتا ہے تمہارا عظیم جرنیل لوگاٹ۔“

”گریس! معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے آدمیوں میں سے کوئی بھی بطور سفیر انگوئی لینڈ جانے

بے تیار نہیں ہے۔ چنانچہ اب اگر ہمارے درمیان صلح اور امن کی شرائط طے ہونی ہیں تو پھر ڈیونو اور بوکو یہاں آنا پڑے گا۔ اس کا میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان کی جان و مال محفوظ رہے گا۔“

”یہ ناممکن ہے۔“

”اگر ناممکن ہے تو پھر معاملہ ختم ہوا۔ تم ہمارے مہمان ہو گریس۔ چنانچہ آرام کرو۔ تھکن دور رو۔ ہمارے یہاں کا کھانا کھاؤ اور لوٹ جاؤ۔“

اور اب جھگڑا کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔

”جوسی ہم دونوں خون بدل بھائی ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی کچھ کہنے کا اور فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ تمہاری اور تمہارے مشیروں کی اور انگوئی کی بھی مرضی ہو تو میں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈیونو اور انبو کے پاس جاؤں گا اور اس سے گفتگو کروں گا۔ ہم ان سے نہیں ڈرتے۔ اس کے علاوہ نئے نئے نامات دیکھنے اور نئے نئے لوگوں سے ملنے کا ہمیں شوق ہے۔ کہو اے گریس! اگر شاہ ہولون اجازت دے تو کیا تم ہمیں سفیروں کے طور پر قبول کرو گے؟“

”اپنے سفیر نامزد کرنے کا اختیار بادشاہ کو حاصل ہے۔“ گریس نے جواب دیا۔ تاہم سفید قام قاؤں کی ہولون لوگوں میں موجودگی کے متعلق سنا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ تم لوگ ہمارے ساتھ لولی لینڈ میں آنا پسند کرو گے تو پھر ڈیونو تم کو خوش آمدید کہے گا۔ البتہ جب یہ معاملہ شانبو کے سامنے پیش کیا گیا تو دیوتاؤں کی زبان نے یوں کہا۔

”اگر مہذب دنیا کے لوگ چاہیں تو آئیں اور چاہیں تو دور ہی رہیں اور اگر وہ آئیں تو پھر اپنے ساتھ وہ آہنی غلیاں خواہ چھوٹی بڑی نہ لائیں جن کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ گراج کے ساتھ جواں اگلی اور بہت دور سے موت نازل کرتی ہیں۔ گوشت وغیرہ حاصل کرنے کیلئے ان نلیوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ مہذب لوگوں کے کھانے کیلئے بہت سا گوشت دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ انگوئی لینڈ میں محفوظ ہوں گے۔ بشرطیکہ ہمارے دیوتاؤں کی توہین نہ کریں۔“

یہ الفاظ گریس نے آہستہ آہستہ اور بڑے مؤثر لہجے میں کہے اور اس تمام عرصہ میں اپنی نگاہیں مجھ پر یوں گاڑے رہا۔ جیسے میرے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے یہ الفاظ سن کر میری ساری ہمت کوچ کر گئی۔ بہر حال میں جانتا تھا کہ ڈیونو ہمیں انگوئی لینڈ میں اس لئے بلا رہا ہے کہ ہم سفید شیطان کا خاتمہ کریں۔ جس نے پورے علاقہ میں عموماً اور خود ڈیونو کو خصوصاً خوفزدہ کر رکھا ہے اور یہ سفید شیطان میں نے اعزازہ لگایا۔ ایک زبردست بلند ریلو گویا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم بددق کے بغیر اس گوریلے یا ایسے ہی کسی دوسرے خونخوار جانور کا مقابلہ کس

کرنا چاہتا ہے کہ تمہارے ملک میں سونا بھی ہے یا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر اسے بہت خوبصورت مناظر دیکھنے کو مل جائیں گے اور ہمارے پاس سونا بھی ہے۔“  
اور گریس نے اپنی کلائیوں میں پڑے ہوئے کڑے یا کنگنوں کی طرف اشارہ کیا ”اسے اتنا سونا دیا جائے گا جتنا کہ وہ اٹھا سکے گا۔ لیکن اس سفید آقاؤ! شاید اس معاملے میں تم اکیلے میں گفتگو کرنا پسند کرو گے شاہ ہولون! اجازت ہو تو ہم ہٹ جائیں؟“

پانچ منٹ بعد ہم جمونپڑے میں تھے اور جوی بھی موجود تھا اور لوگاٹ بھی اور بڑے زوروں کی بحث ہو رہی تھی۔ جوی نے جگر سے درخواست کی کہ انگو لی لینڈ نہ جائے۔ میں نے بھی کہا کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دے۔ لوگاٹ نے کہا کہ وہاں جانا پاگل پن ہے۔ اس نے کہا وہ انگو لی لینڈ میں رہ چکا ہے اور یہ کہ گریس کی باتوں سے فریب کی بو آتی ہے اور وہ فضا میں خون اور جادو کی بو پارہا ہے۔

جگر نے کہا۔ ”یہ موقع خود خدا نے دیا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس علاقہ میں جانا چاہتا ہے۔ جہاں پہلے کوئی نہیں گیا۔“ رہا لیوشن تو اس نے ایک جمائی لی اور اپنے رومال سے چہرے پر پٹکا جھلنے لگا۔ کیونکہ جمونپڑے میں خاصی گرمی تھی۔ پھر اس نے کہا کہ چونکہ وہ ایک خاص پھول کی تلاش میں آتی دور آئی گیا ہے اس لئے یہاں سے وہ واپس نہ جائے گا۔

”میرا خیال ہے روتا نو۔“ آخر کار جوی نے کہا۔ ”کہ کوئی خاص بات ہے کہ تم انگو لی لینڈ میں جانا چاہتے ہو۔ اور یہ بات تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ تاہم میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں جبراً یہاں روک لوں گا۔“

”جوی!“ اگر تم نے ایسا کیا تو ہمارا بھائی چارہ ختم ہو جائے گا۔“ جگر نے جواب دیا۔ ”اور یہ وہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرو جو میں چھپا رہا ہوں۔ لیکن انتظار کرو کہ مستقبل سب کچھ ظاہر کر دے گا۔“

چنانچہ جوی نے کراہ کر ہتھیار ڈال دیے اور لوگاٹ نے کہا کہ روتا نو اور لیوشن پر سحر کر دیا گیا ہے اور یہ کہ صرف ہنس راج کے حواس بجا ہیں۔

”تو پھر یہ طے رہا۔“ لیوشن نے کہا۔ کہ میں اور جگر سفیر بن کر انگو لی میں جائیں گے اور ہنس راج تم یہیں رہ کر شکاریوں اور سامان کی حفاظت کرو گے۔“

میرے لئے یہ صورتحال عجیب رخ اختیار کر گئی تھی۔ دیکھا جائے تو میرا اصل مقصد اسی مقدس پھول کو حاصل کرنا تھا جس کیلئے میں باقاعدہ پلاننگ کر کے روانہ ہوا تھا اور اب اگر میں ان لوگوں کا ماتھ نہ دیتا تو یہ بات میرے لئے باعث شرم ہوتی اور پھر مجھے لوگ بزدلی کا طعنہ لگ دیتے۔ چنانچہ

طرح کر سکتے تھے؟ چنانچہ میں دوسرے ہی لمحے ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

”گریس۔“ میں نے کہا۔ ”بندوق میری سب کچھ ہے۔ باپ! ماں! بیوی اور اولاد سب کچھ۔“  
چنانچہ اس کے بغیر میں یہاں سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھوں۔“  
”تو پھر اسے سفید آقا۔“ گریس نے کہا۔

”مناسب ہوگا تم یہیں اپنے لوگوں میں رہو۔ کیونکہ اگر یہ نکل اپنے ساتھ لائے تو انگو لی لینڈ پر قدم رکھتے ہی تم کو قتل کر دیا جائے گا۔“ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ جگر نے کہا۔  
”یہ تو قدرتی بات ہے کہ عظیم شکاری ہنس راج اپنی بندوق کے بغیر کہیں نہیں جاسکتا۔ کیونکہ بندوق اس کے لئے ایسی ہے جیسے اندھے کیلئے لاشی۔ لیکن میری بات دوسری ہے۔ کئی برسوں سے میں نے بندوق استعمال نہیں کی اور میں نے خدا کی مخلوق میں سے کسی کی جان نہیں لی۔ سوائے چند تیلیوں کے۔ چنانچہ میں تمہارے ملک میں آنے کیلئے تیار ہوں اور اپنے ساتھ کچھ نہ لاؤں گا۔ سوائے اس چیز کے۔“ اس نے تیلیاں پکڑنے کیلئے اس جال کی طرف اشارہ کیا۔ جو اس کے پیچھے باڑ سے لگا کھڑا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ چنانچہ ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور یقیناً دلاتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تمہارا استقبال کیا جائے گا۔“ گریس نے کہا۔

اور میرا خیال ہے کہ مجھے اس کی آنکھوں میں ناپاک مسرت کی چمک نظر آگئی۔ اس کے بعد چند ثانیوں تک خاموشی کا وقفہ رہا اور اس عرصے میں میں نے لیوشن کو سب کچھ بتا دینے کے بعد کہا کہ یہ پاگل پن تھا۔ لیکن یہاں بھی اس نوجوان کی مجنونانہ ضد اڑے آئی۔

”یار ہنس راج!“ ہم بڑے مہیاں! کو ظاہر ہے اکیلے نہ جانے دیں گے کم از کم میں تو نہ جانے دوں گا۔ تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ میں وہ پھول۔ بہر حال ہر بات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ معاملہ ذرا خطرناک ہے۔ چنانچہ اگر جگر گیا تو میں بھی جاؤں گا اور اگر نہ گیا تو اکیلا ہی رہ جاؤں گا۔“

”تم اول درجے کے گدھے ہو۔“ میں بڑبڑایا۔

”یہ نوجوان کیا کہہ رہا ہے۔“

”وہ کیا چاہتا ہے۔ ہمارے ملک میں؟“ گریس نے بڑے سکون سے پوچھا۔ یہ شخص شاید بہت تیز تھا۔ کیونکہ اس نے لیوشن کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگایا تھا۔

”یہ کہہ کر یہ خود ایک بے ضرر سیاح ہے۔ جو خوبصورت قدرتی مناظر دیکھنا چاہتا ہے اور معلوم

میں نے ان دونوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ کر موت بہر حال ایک بار آتی ہے۔ قسمت میں یہ ہی لکھا ہے تو یہی سہی۔

اس کے بعد ہم باہر آ گئے۔ گریس اور اس کے ساتھیوں کو طلب کیا گیا اور اس دفعہ وہ لوگ تحائف لے کر آئے اور یہ تحائف تھے دو عمدہ ہاتھی دانت اور ان کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ان لوگوں کے علاقہ کے چاروں طرف پانی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہاتھی جزیرے پر نہیں پائے جاتے۔ ایک برتن میں سونے کا برادہ اور سونے کے ننگن سفید کپڑے کے تھان جنہیں بڑی عمدگی سے بنایا گیا تھا اور چند خوبصورت برتن جن پر حیرت انگیز اور جاذب نظر نقش و نگار بنے ہوئے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ انگوئی لوگ آرٹسٹ بھی تھے۔ ان لوگوں میں یہ خصوصیات کہاں سے آئیں اور یہ کہ ان کی قوم کی بنیاد کیا تھی۔

ان سوالوں کا جواب مجھے کبھی اطمینان بخش طور پر کبھی نہ ملا اور میرا تو خیال ہے کہ خود انگوئی بھی نہ جانتے تھے کہ وہ کون سی قدیم متمدن قوم کی یادگار تھے۔

جوسی نے سفیروں کو مطلع کیا کہ ہم تین سفید قام اپنے ایک ایک ملازم کے ساتھ اس کے سفیروں کی خدمات انجام دینے کیلئے انگوئی لینڈ آئیں گے۔ اپنے ساتھ بندوقس نہ لائیں گے اور ہاں ہم لوگ دونوں قبائل میں دائمی امن اور خصوصاً تجارت اور دونوں قبائل کے درمیان شادی بیاہ کے امکانات کے متعلق گفتگو کر کے شرائط طے کریں گے۔ دونوں قبائل کے درمیان شادی کی بات خود گریس نے اصرار کر کے شامل کی تھی اور اس وقت میں حیران تھا کہ اس نے اس ایک بات پر اصرار کیا تھا۔ گریس نے اپنے بادشاہ ڈوینو اور روجوں کے بادشاہ شانہو کی طرف سے وعدہ کیا کہ ہمیں یہ حفاظت انگوئی لینڈ تک لے جایا اور واپس پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ ہم ان کے دیوتاؤں کی توہین نہ کریں اور اگر ہم نے ایسا کیا تو پھر وہ لوگ ہماری حفاظت سے دست بردار ہو جائیں گے۔ اس کی یہ شرط مجھے پسند نہ آئی۔ اس نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ ہولون لینڈ کے ساحل سے روانہ ہونے کے چھ دن بعد ہمیں واپس اسی ساحل پر پہنچا دیا جائے گا۔

”میں تمہارے وعدے پر اعتبار کرتا ہوں۔“ جوسی نے کہا۔ ”میں اپنے پانچ سو سپاہی بھیج دوں گا کہ وہ میرے سفیروں کو اس مقام تک پہنچا آئیں۔ جہاں سے انہوں نے ڈنگوں میں سوار ہونا ہے۔ اور جب وہ واپس آئیں گے تو یہی سپاہی ان کے استقبال کو وہاں موجود ہوں گے۔ یہ سن کر گریس نے کہ میرے سفیروں میں سے ایک کو بھی خراش آئی تو پھر میں اعلان کر دوں گا اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک انگوئی لینڈ یا ہولون سفر ہستی سے مٹ نہیں جاتے۔“ چنانچہ

دو بار درخواست ہو گیا۔ طے پایا تھا کہ دوسرے دن صبح ہم لوگ اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ جس کا انجام کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا تھا؟“

میں نے لیوشن کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے ساتھ جانے والی تین ملازموں کا انتخاب کیا۔ فونا آرمس تو خود ہی ہمارے ساتھ جانے پر ہند تھے۔ البتہ تیسرے ملازم کے انتخاب میں بڑی دشواری پیش آئی۔ کراں کو میں نہ لے جاتا۔

چنانچہ میں نے اپنے ان دو ہولون ملازم جونی اور ٹونی میں سے جونی کو منتخب کیا۔ جونی بڑا ہی تیز اور بہادر تھا۔ پھر ہم سب ضروری انتظام میں لگ گئے۔ ایک کام کے دوران تجھے آرمس کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ غائب تھا۔ اس احسن شخص نے بتایا کہ وہ جنگل سے ہانس کی قسم کے ایک درخت کی لکڑی لینے گیا تھا جو اس نے مجھے دکھائے۔ یہ ایک خوبصورت مضبوط اور موٹا عصا تھا۔ میرے استفسار پر بتایا کہ یہ اتنا لمبا اور موٹا ڈنڈا ہے اور پھر اندر سے پولا ہے اور اس میں بہت زیادہ ہوا بھری ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر ڈنڈے سفر میں کہیں الٹ گئے تو وہ اس عصا کی مدد سے تیر کر کنارے پہنچ سکتا ہے۔

میں اس ڈنڈے کو بھول کر انتظامات میں لگ گیا اور پھر دوسرے دن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ ایک خوفناک اور دل دہلا دینے والا سفر۔



میں اور لیوٹن دو گدھوں پر سوار تھے۔ جواب تک خاصے مونے اور تازہ دم ہو چکے تھے۔ جنگر اپنے سفید تیل پر سوار تھا۔ یہ جانور بے حد سدھا ہوا اور جنگر سے حیرت انگیز حد تک مانوس تھا۔ ہمارے تمام ملازم جو پوری طرح مسلح تھے ہولون لینڈ کی سرحد تک ہمارے ساتھ آئے۔ وہاں وہ ہولون رجسٹ کے ساتھ ہماری واپسی کا انتظار کرنے والے تھے۔ خود بادشاہ جوسی بستی کے مغربی دروازے تک ہمیں رخصت کرنے آیا اور وہاں اس نے ہمیں اور خصوصاً جنگر کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ اس پر بس نہ کرتے ہوئے اس نے گریس اور اس کے ساتھیوں کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان کے سامنے ایک بار پھر قسم کھائی کہ اگر ہمیں کوئی نقصان پہنچا تو وہ یعنی جوسی اس وقت تک جین سے نہ بیٹھے گا جب تک انگوئی کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دے گا۔

”شاہ ہولون اگر ہماری نیتوں میں فحش ہو تو کیا ان کی بندوقیں انہیں بچا سکتی تھیں۔ خصوصاً اس صورت میں یہ صرف گنتی کے آدی ہیں اور ہم بے شمار؟ مثال کے طور پر ہم ان کی بندوقیں چرا سکتے تھے۔ جس طرح کے خود تم نے چرائی تھیں۔ جب تم ان کے قتل کا ارادہ کر چکے تھے انگوئی لوگوں کا یہ قانون ہے کہ ایسا کوئی جادوئی ہتھیار ان کے علاقے میں نہ لایا جائے۔“ گریس نے جواب دیا۔

”کیوں“ میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا، ”کیونکہ جوسی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو چکی تھیں اور مجھے خوف تھا کہ کہیں اس کے اور گریس کے درمیان جھگڑا نہ ہو جائے۔“

اس لئے آقا نس راج کہ ہمارے ہاں روایت مشہور ہے کہ انگوئی لینڈ میں بندوق چلائی جائے تو دیوتا ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے اور دیوتاؤں کا ماہن اعظم شانوبر جائے گا۔ یہ روایت بہت قدیم ہے۔ لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے تک کوئی اس کا مطلب نہ جانتا تھا۔ کیونکہ اس روایت میں بندوق کیلئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ ”کھوکھلا بھالا جو دھواں اگتا ہے اور ایسے ہتھیار سے ظاہر ہے ہم جب تک واقف نہ تھے۔“

”آچہ..... چھا۔“ میں نے کہا اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ ہم اس پیش گوئی کو پوری

لرکیں گے اور یہ واقعی جیسا کہ آرمس نے سر ہلا کر کہا۔ بڑے افسوس کا مقام تھا۔

شکاری ٹاؤن سے جو سطح مرتفع پر واقع تھا روانہ ہو کر ہم تین دن تک ڈھلان اترتے رہے اور لیوٹن کے کنارے پہنچ گئے جو ”طوری“ کہلاتی تھی۔ طوری جمیل کی تو ایک جھلک بھی ہم نہ دیکھ سکے کیونکہ کنارے سے لے کر کوئی ایک میل آگے تک گنجان نزل رہے تھے۔ جن میں یہاں وہاں سے بنے ہوئے تھے۔ یہ راستے ان دریائی گھوڑوں نے بنائے ہوئے تھے۔ یہ راستے ان دریائی گھوڑوں نے بنائے تھے جو دھوپ سیکنے کیلئے وقتاً فوقتاً کنارے پر آ جاتے تھے۔ ایک بلند ٹیلے پر سے میل کا پانی دیکھا جاسکتا تھا اور دور بین سے دیکھنے پر بہت دور ایک بلند سبز مقام نظر آیا۔ درختوں سے ڈھکی ہوئی کسی پہاڑ کی چوٹی تھی۔ میں نے گریس سے اس کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ لیوٹن کے دیوتاؤں کا ”گھر“ تھا۔

”کون سے دیوتا؟“ میں نے پوچھا۔

”نس راج! یہ نہیں بتایا جاسکتا“ کیونکہ یہ خلاف قانون ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ میری ایک رافریقہ میں گزری ہے۔ چنانچہ میں افریقیوں کی اس فطرت سے واقف ہوں کہ ذرا سا اکسانے پر ان کی زبان کھل جاتی ہے اور وہ نہ کہنے کی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ لیکن گریس جیسے گھٹے شخص سے بے کبھی میرا واسطہ نہ پڑا تھا۔

بہر حال اس ٹیلے پر ہم نے جھنڈا نصیب کر دیا۔

گریس نے مٹھوک نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ ہم نے ایسا کیوں کیا اور یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ دنیا میں اس کے علاوہ بھی گھٹے ہیں۔“ میں نے جواب دیا یہ جھنڈا ہمارے لیے کا دیوتا ہے اور یہ کہ اس کی توہین کی تو وہ گستاخ مارا جائے گا جس طرح کہ اس کی توہین کرنے پر ہی اور اس کے ساتھی مارے گئے۔“

میری اس تقریر سے ایک دفعہ تو گریس بھی مرعوب ہو گیا بلکہ جھنڈے کے قریب سے گزرتے نہ اس نے سر بھی جھکا دیا۔

گو یہ جھنڈا اس لئے وہاں نصب کیا گیا تھا کہ اگر خدا نخواستہ ہمیں انگوئی لینڈ سے جان بچا کر اگنا پڑے تو یہ جھنڈا ہمیں دور سے نظر آ جائے اور اسے نشان منزل بنا کر ہم صحیح سلامت اس طرف نہ ساحل تک پہنچ جائیں۔ یہ تجویز ہمارے گروہ کے سب سے زیادہ لا ابالی رکن لیوٹن کی تھی اور یہ ریش ٹاؤن گا کہ ہماری یہ پیش بندی کس طرح ہمارے لئے مفید ثابت ہوئی۔

ٹیلے کے قدموں میں ہم نے رات بھر کیلئے پڑاؤ ڈالا یا لوگاٹ کے تحت ہولون سپاہی جمیل کے

”ہو۔“

”یہ تم نے جھوٹ نہیں کہا۔ ہنس راج۔ لیکن یہ معاملہ میرے لئے۔ عجیب ہے اور اگر میں اسے سمجھ نہیں سکا ہوں تو معافی چاہتا ہوں۔“

میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ مستقبل کے ڈوینو..... البتہ یہ بات تو صاف ہے کہ انگولی لینڈ میں تمہیں بہت سی باتیں سیکھنے کو ملیں گی۔“

”ہاں..... ہنس راج اور شاید تمہیں بھی سیکھنی ہیں۔“ اس نے جواب دیا کیونکہ اب اس کے حواس ایک حد تک بجا ہو چکے تھے اور اس کی طرعود کر آئی تھی۔

بندوق کی آواز سن کر آگس کہیں سے بڑے پراسرار طریقے سے نمودار ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں وہ اس خیال سے ہمارے پیچھے ہی لگا ہوا تھا کہ میرے ساتھ کوئی واقعہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ وہ آدمیوں کو لے آئے تاکہ گینڈے کو صاف کر لیا جائے۔“

اس کے بعد میں اور گرلس چند فٹ آگے بڑھے اور نرسوں کے عین کنارے پر ایک کم چوڑا گڑھا نظر آیا۔ یہ گڑھا سنگلاخ زمین میں کھودا گیا تھا اور اس میں ڈنگ آلود ٹین کا ایک ڈبہ پڑا ہوا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے بظاہر حیرت سے پوچھا۔ حالانکہ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی۔

”یہ! گرلس نے کہا۔ جس کے حواس اب تک پوری طرح بجا نہ ہوئے تھے یہ وہ جگہ ہے جہاں آگس چاندوں پہلے جوی کے خون بدل بھائی روتا نو نے اپنا کپڑے کا گھر بنایا تھا اور اس میں قیام کیا تھا۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ روتا نو یہاں آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے قبیلے کا ایک آدمی مچھلیاں پکڑنے کیلئے آیا تھا۔“ یہ مناسب ہے لیکن گرلس! مچھلیاں پکڑنے کیلئے یہ مقام مناسب معلوم نہیں ہوتا اور پھر گھر سے اتنی دور مچھلیاں پکڑنے آنا بڑی حماقت ہے۔ چنانچہ گرلس جب تم کو فرصت ہو تو مجھے بتانا کہ تم یہاں کیا کرنے آئے تھے اور کس کی تلاش تھی تمہیں؟“

”فرصت ملی تو یہ بات تم کو بخوشی بتاؤں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

اور پھر جیسے اس موضوع سے بچنے کیلئے وہ آگے کی طرف بھاگا اور دونوں ہاتھوں سے نرسوں کو دائیں بائیں ہٹا کر مجھے قریب جانے کا اشارہ کیا اور میں نے دیکھا یہ ایک ڈونگا تھا اور اتنا بڑا تھا کہ

عین کنارے پر مقیم تھے۔ جہاں ان لوگوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس کے عین سامنے دریائی گھوڑے کا ہوا ایک چوڑا راستہ تھا اور اس کی گلی میں جو نرسوں کے درمیان تھی جمیل کا پانی نظر آ رہا تھا۔

گرلس! میں نے پوچھا۔ ”یہ جمیل ہم کب اور کیسے عبور کریں گے؟“

”ہنس راج! کل صبح ہی ہم روانہ ہو جائیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیونکہ سال کے موسم میں ہوا عمدہ ساحل کی طرف بہتی ہے اور اگر ہوا موافق ہوئی تو ہم رات کا اندھیرا اترنے کا انگولی کی بستی باغری میں ہوں گے۔ رہا یہ سوال کہ ہم کیسے عبور کریں گے تو اگر ہنس راج! میرے ساتھ تھوڑی دور تک چلنا پسند کریں تو یہ میں انہیں ابھی دکھا دوں گا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا جب ہم آگے بڑھ رہے تھے تو دو باتیں ہوئیں پہلی تو یہ کہ ایک زبردست کالے رنگ کا گینڈا جو جھاڑیوں میں آرام کر رہا تھا۔ ہماری بو پا کر ایک دم اٹھا اور جیسی اس جانور کی فطرت سے کوئی ساٹھ گز دور سے سیدھا ہم پر حملہ آور ہوا۔ چونکہ اب تک ہم سے آٹھ ہتھیار رکھوائے نہ گئے تھے اس لئے اس وقت میرے ہاتھ میں ایک نالی بندوق تھی۔ گینڈا اندھا دہ سیدھا ہماری طرف آ رہا تھا۔ گرلس اسے دیکھ کر پلٹا اور بھاگ پڑا اور اس میں کوئی تعجب کی بات تھی۔ کیونکہ اس کے پاس بھالے کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہ تھا جبکہ میں نے بندوق کا گھوڑا پڑھایا موقع کا منتظر رہا۔

گینڈا مجھ سے پچاس قدم دور ہوگا اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور یہی موقع تھا۔ چنانچہ میں اس کے حلق کو نشانہ بنا کر لہلی دبا دی۔ گولی ٹمیک نشانے پر لگی اور غالباً اندر گھس کر اس کا دل چیر گئی بہر حال بھاگتا ہوا گینڈا ایک دم سے گرا۔ لڑھکتا ہوا مجھ تک آیا۔ ایک دفعہ تڑپا اور عین میرے قدموں میں دم توڑ دیا۔

گرلس بے حد مرعوب و متاثر ہوا۔ وہ لوٹ آیا۔ اس نے حیرت سے مردہ گینڈے اور اس کے حلق کے سوراخ کی طرف دیکھا اور پھر دھواں اگلتی ہوئی بندوق کی طرف دیکھا۔

”جنگل کا زبردست چوپایا محض آواز سے مارا گیا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”اس سفید آدمی نے ایک! میں اس زبردست جانور کا خاتمہ کر دیا وہ بھی اپنے جادو سے! واقعی شایو کی زبان پر اس وقت داہتے۔ جب اس نے حکم دیا تھا..... کہ!“

گرلس دفعتاً خاموش ہو گیا۔

”کیوں دوست کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ ”بھاگنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر تم ایک قدم ہٹ میرے پیچھے آگئے ہوتے تو اتنے ہی محفوظ ہوتے جتنے کہ اب ہو۔ میرا مطلب ہے بھاگنے کے،“



اس میں بیک وقت تیس چالیس آدمی سوار ہو سکتے تھے۔ یہ ڈونگا واقعی عمدہ تھا۔ اس پر گرلیں نے جواب دیا کہ ایسے ڈونگے ہانڈی ٹاؤن میں موجود ہیں۔ حالانکہ سب کے سب اس ڈونگے جتنے نہیں ہیں۔

”میرا یہ تخمینہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔“

آخر کار صبح ہوئی اور ہم چھ آدمی ڈونگے کے قریب پہنچے جسے نرسوں میں سے نکال کر کھلے پانی کے راستے میں لے آیا گیا تھا اور وہاں گرلیں اور اس کے ساتھیوں نے کشم کے افسروں کی طرح ہماری تلاشی لی۔ کیونکہ انہیں خوف تھا کہ ہم نے اپنے لباس میں آتشیں اسلحہ نہ چھپا رکھا ہو۔

”تم دیکھ ہی چکے ہو کہ بندوقیں کیسی ہوتی ہیں۔“ میں نے خفا ہو کر کہا ”چنانچہ اس قسم کی کوئی چیز ہمارے ہاتھ میں نظر آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کوئی ہتھیار غلطی سے یا اتفاق سے ہمارے سامان میں بندھا رہ گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ گرلیں بڑا ہی غیر مطمئن قسم کا انسان تھا۔ اور بڑا ہی ہنسی مزاح۔“

”آرگس! ہمارا سامان کھول کر دکھا دو۔“ میں نے کہا اور آرگس نے کچھ ایسے جوش و دلورے اور بے پروائی سے میرے حکم کی تعمیل کی کہ مجھے اعتراف ہے کہ خود میرے دل میں بھی شک نے سر اٹھایا۔

میں آرگس کے مزاح سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ بڑا پر فریب اور کائیاں تھا اور انشائے راز کا دلدادہ چنانچہ اس کی یہ فوری فرمانبرداری اور گرمی مجھے تو بڑی غیر فطری معلوم ہوئی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے اپنا گھر کھولا اس میں مختلف چیزیں لپٹی ہوئی تھیں۔ جنہیں ایک گندی چٹون میں مڑاڑا لیوان کا پیالہ ایک چوہی چچہ جس میں کوئی مٹھوک مشروب بھرا ہوا تھا۔ جڑی بوٹیاں اور دوسری مقامی دوائیں۔ ایک پرانا پائپ جو خود میں نے اسے دیا تھا اور آخر میں زرد تبا کو کے چوں کا ایک گولا جس کی کاشت نہ صرف ہولون بلکہ انگولی لینڈ بھی کرتے تھے۔

”آرگس اتنے بڑے پیمانے پر تبا کو کا تم کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”باس! ہم تین سیاہ فام ہیں۔ اسے نہیں گے۔ یا نسواڑ بنا کر سوئیکس گے یا پھر چبائیں گے۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں شاید ہمیں زیادہ کھانے کو کچھ نہ ملے اور تبا کو ایک ایسی غذا ہے جسے کھا کر آدمی کئی دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رات کو نیند بھی آتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہ کہیں آرگس تبا کو کی خوبیوں اور فوائد پر تقریر نہ بھجھا دے۔

کچھ ضروری نہیں ہے کہ یہ زرد جھوٹا آدمی چوں کا یہ بڑا گولا اپنے ساتھ ساتھ لے لے۔“

گرلیں نے کہا۔

”ایسے پتے ہمارے علاقے میں بہت مل جاتے ہیں یہ شخص کیوں اس زائد بوجھ کا اضافہ کر رہا ہے۔ اور گرلیں نے اپنا ہاتھ لبا کر دیا۔ غالباً وہ تبا کو کے چوں کی اس بڑی گیند کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عین اسی وقت فونا نے آواز دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ فونا سامان کھول چکا تھا۔ اب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اتفاق تھا یا فونا نے قصداً گرلیں کو اس وقت اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ بہر حال وہ تبا کو کے گولے کو بھول کر فونا کی طرف گھوم گیا اور آرگس نے نرت انگیز پھرتی سے کبل پیٹ کر گھر باندھ دیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں گھر ڈور یوں سے مضبوط بندھا آرگس کی پیٹھ پر لٹک رہا تھا۔ آرگس کی اس پھرتی نے ایک بار پھر میرے دل میں شک پیدا کر دیا تھا۔“

لیکن عین اس وقت جھگر اور گرلیں کے درمیان تتلیاں پکڑنے کے جال کے متعلق جھگڑا شروع ہو گیا اور میں اس طرف متوجہ ہو گیا۔ گرلیں کو شک تھا کہ لمبے بانس پر بندھا ہوا یہ جال یا تو جی قسم کی روتھ تھی یا کوئی جادوئی ہتھیار تھا۔ جو خطرناک تھا یا ثابت ہو سکتا تھا۔ اس جھگڑے سے فرصت پائی تو ہرا جھگڑا اس کرنی کے متعلق اٹھا۔ جسے لیوشن اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ کرنی وہی تھی جس سے ہارغ مٹی اور کھاد پھیلائی جاتی ہے اور جس سے کئی پودے کو جڑ سمیت اٹھایا جاتا ہے۔ ہارغبانی کی ملاح میں شاید ”مالی بیلچہ“ کہتے ہیں۔ گرلیں نے پوچھا کہ یہ چیز کس کام آتی ہے اور لیوشن نے لے کر ذریعے جواب دیا کہ اس سے پھول کھودے جاتے ہیں۔

”پھول“ گرلیں نے کہا۔ ہمارے دیوتاؤں میں ایک دیوتا پھول بھی ہے تو کیا آقا ہمارے ہتا کو کھودنا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ لیوشن نے اسی غرض سے یہ بیلچہ اپنے ساتھ لیا تھا۔ لیکن اس حقیقت کو چھپانا ہی اسب تھا۔ چنانچہ جھگڑے نے طول کھینچا یہاں تک کہ عاجز آ کر میں نے اعلان کیا کہ اگر ہماری زمرہ کی ضروریات کی چیزوں کو بھی یوں شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو بہتر یہی ہے کہ ہم اس سفر روانہ ہونے کا ارادہ ترک کر دیں۔

”ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارے پاس آتشیں اسلحہ نہیں ہے۔“ میں نے حتی الامکان مرعوب لہجہ کہا۔ ”اور تمہارے یہ بی الفاظ کافی ہیں گرلیں۔“

چنانچہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد گرلیں نے اس بحث کو ختم کیا، صاف ظاہر تھا وہ کسی خاص مقصد کے تحت ہمیں بہر حال انگولی لینڈ میں لے جانا چاہتا تھا۔ آخر کار ہم روانہ

تین گنڈے پاس۔ حالانکہ پورے چوبیس گنڈے ہونے چاہئیں تھے صرف تین رہ گئے ہیں۔  
بقیہ جیب کے اس سوراخ میں سے نکل گئے ہیں جو خود شیطان نے بنایا ہے۔ اب ہم بھوک سے نہ  
یہ گئے۔ ہمیں تیروں اور بھالوں سے نہ مارا جائے گا اور نہ ہی ہم غرق ہوں گے۔ اس میں کوئی  
ختم سے کم میرے ساتھ نہ ہوگا۔ لیکن کئی امکانات دوسرے ایسے ہیں جو ہمارا خاتمہ کر دیں گے۔  
نکل انہیں روکنے کیلئے جو گنڈے تھے میرے پاس وہ کم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ۔  
”بکومت۔“ میں نے کہا۔

اور ایک بار پھر میں اپنے خیالات میں غرق تھا۔ اس کے بعد میں خود بھی سو گیا۔ جب میں بیدار  
ہوں تو دوپہر ہو رہی تھی اور ہوا کا زور بھی ختم ہو گیا تھا۔ بہر حال جب تک ہم کھانے سے قاصر نہ  
ہوئے تب تک ہوا ڈونکے گھنٹی رسی اور اس کے بعد بالکل ہی بند ہو گئی۔ چنانچہ انگوٹھی لوگوں نے چھو  
بھال لئے۔ میری تجویز پر ہم لوگوں نے ان کا ہاتھ بنانے کی پیشکش کی کیونکہ میں نے سوچا کہ  
سب ہوگا ہم چھو چلانا سیکھ لیں۔ چنانچہ چھو ہمیں دیئے گئے اور گریس نے ہمیں ان کا استعمال سکھایا  
میں نے دیکھا کہ اب اس کا لہجہ تھمسا نہ تھا۔ ابتداء میں تو بڑے اناڑی پن سے چھو چلاتے رہے۔  
ن تین چار گھنٹہ کی مسلسل مشق کے بعد ہم بہت کچھ سیکھ گئے اور ہمارے اس بحری سفر کے خاتمہ تک  
مجھے اطمینان ہو چکا تھا کہ اگر کسی وقت آیا تو بڑی آسانی سے ایک ڈونگا چلا سکیں گے۔

سہ پہر کے تین بجے اس جزیرے کا ساحل بخوبی نظر آ رہا تھا۔ جس کی طرف ہم بڑھ رہے  
ہے۔ بشرطیکہ وہ جزیرہ ہو کیونکہ یہ میں کبھی معلوم نہ کر سکا کہ وہ جزیرہ تھا یا نہیں۔ اس کے پہاڑ کی  
ٹی تو پچھلے کئی گھنٹوں سے ہمیں نظر آ رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی دور بین کی مدد سے ان کے یہ خطوط  
بحری سفر کی تقریباً ابتداء ہی سے میں نے دیکھ لئے تھے۔

شام پانچ بجے ہم اس گہری غلیج میں داخل ہوئے جس کے دونوں کناروں پر جنگل تھے ان  
گھوں میں جگہ جگہ چھوٹے میدان تھے۔ جن میں غلہ بویا گیا تھا اور انہی میدانوں میں افریقی طرز کی  
وٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ ان میدانوں کے کناروں پر چھوٹے درخت تھے۔ چنانچہ میں نے اندازہ  
یا کہ کسی زمانے میں تقریباً نصف صدی پہلے بہت زیادہ زمین میں کاشت کی جاتی ہوگی۔

چند میل آگے بڑھ کر غلیج دھنسا نک ہو گئی اور اس کے اختتام پر صرف ایک چشمہ تھا۔ جو اس میں  
رہا تھا۔ اس چشمہ کا پت زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس چشمے پر جگہ جگہ ان گھڑسم کے ہل بنے ہوئے  
نہ اور ان کے دونوں کناروں پر وہ بستی تھی جو باڈی کہلاتی تھی۔ جو بڑی بڑی جمو پتزیوں پر مشتمل

ہو گئے۔ ہم تین افراد اپنے تین خادموں کے ساتھ ڈونکے کے نچلے حصے میں بیٹھ گئے اور اس  
ساتھی چوڑے چھوڑے سے ڈونکے کو کھینچنے اور دھکیلنے لگے ڈونگا کنارے سے ہٹ کر اب آبی گلی میں  
آ گیا جو زسوں کے گنجان جھنڈ میں دریائی گھوڑوں اور ان کی آمدورفت سے پیدا ہو گئی تھی۔ زسوں  
میں سے سینکڑوں مرغیاں پھڑ پھڑ کر اڑیں اور ان کی آواز گرج کی آواز سے مشابہ تھی۔

کوئی پون گھنٹے بعد ہمارا ڈونگا زسوں اور اٹھنے پانی سے نکل کر کھلی جھیل میں آ گیا اور دہا  
پہنچنے کے بعد ڈونکے کے سینکڑوں میں ایک ہانس کھڑا کر کے اس پر باریک بینی ہوئی چٹائی کا بادبان  
دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ساحل کی طرف بہتی ہوئی ہوا اس بادبان میں بھر چکی تھی اور ہمارا ڈونگا آٹھ یا  
نی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگا جا رہا تھا۔ عقب میں ہولوں لینڈ کا ساحل لمحہ بہ لمحہ دھندلا جاتا رہا تھا۔  
کے باوجود بہت دیر تک مجھے وہ جھنڈا نظر آتا رہا جو ہم نے ایک بڑے نیلے پر نصب کر دیا تھا۔ ر  
رفتہ رفتہ وہ بھی دھندلانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اب غلام میں ایک چھوٹے سے دھبے کی طرح نظر آنے  
لگا۔ اور پھر غائب ہو گیا تو میرا دل ڈوب گیا۔

”ہنس راج! میرے دوست! تمہاری ایک احمقانہ ہم۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”تم  
ہوں کہ تم اور کتنی مہمات سے بچ کر آؤ گے۔“

تنہائی میں میری بھی حالت ایسی تھی بلکہ میرے ساتھی بھی خوش اور مطمئن نہ تھے۔ جھگڑا وہ  
میں گھور رہا تھا اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ غالباً وہ دعائیں مانگ رہا تھا۔ لیون بھی اس  
بجھا بھاسا نظر آتا تھا۔ جونی سو گیا تھا۔ جس طرح ہر افریقی اس وقت سو جاتا ہے۔ جب فضاء گرم  
وہ خود بیکار ہو۔ فو نا کسی خیال میں غرق تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ اپنے سانپ سے مشورہ تو نہ  
کر رہا۔

بہر حال میں نے اس سے یہ بات نہ پوچھی کیونکہ ہولوں لوگوں کے تیروں سے بچنے کے  
کے بعد میں اس کے سانپ سے ڈرنے لگا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ہماری فوری موت کی پیش گوئی کر  
اور اگر ایسا ہوتا تو میں جانتا تھا کہ میں اس پر یقین کر لوں گا۔

رہا۔ آگس وہ زیادہ پریشان نظر آتا تھا اور اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیوان  
کوئی چیز تلاش کر رہا تھا۔ اس کی یہ جیکٹ تاریخی تھی کیونکہ کسی زمانے میں کسی شکار گاہ کے ختم  
ملکیتی رہی ہوگی۔

”تین“ میں نے اسے بڑبڑاتے سنا۔ اپنے سکھڑاوا کی روح کی قسم صرف تین باقی رہ گئے

”تین کیا؟“ میں نے ڈیج زبان میں پوچھا۔

جمو پٹریوں کی چھتیں، کجور کے پتوں کی تھیں اور دیواریں جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا اس چکنی مٹی میں گھاس پھوس ملا کر اس سے دیواریں کھڑی کی جاتی تھیں۔

ادھر سورج غروب ہوا اور ادھر ہم نے بانڈی کے گھاٹ پر قدم رکھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے درختوں کے بہت سے تنے کناروں کے قریب کچھڑ میں گڑے ہوئے تھے اور ان کے ڈونگوں کا ایک پورا بیڑا بندھا ہوا تھا۔ ہماری آمد بھینا دیکھی جا چکی تھی۔ کیونکہ جب ہمارا ڈونگا ایک گھاٹ کے قریب پہنچا تو کہیں قریب پھونکا گیا، وہ فوراً اور ہی جمو پٹریوں میں سے نکل کر گھاٹ پر آ گئے اور ہمارے ڈونگے کو گھاٹ سے باندھنے لگے۔

+++

میں نے دیکھا کہ یہ آنے والے لوگ بھی خدو خال اور وضع قطع میں گرلیں اور اس کے ساتھیوں سے مشابہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں اس قدر مشابہت تھی کہ ان کی عمروں کی کمی بیشی کے علاوہ ان میں سے کسی کو الگ پہچاننا ایک مشکل کام تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ لوگ کسی ایک خاندان کے ہو سکتے تھے اور میرا یہ خیال بھی غلط نہ تھا۔ کیونکہ صدیوں سے ان لوگوں میں آپس ہی میں شادیاں ہوتی آئی تھیں اور کسی انگوئی نے اپنے قبیلے کے باہر کی لڑکی سے شادی نہ کی تھی اور نہ ہی صدیوں سے انگوئی لڑکی کسی دوسرے قبیلے میں دی گئی تھی۔

طویل القامت، خستے نقوش، بے حس اور سفید چٹوں میں لمبوس لوگوں میں ایسی کوئی خاص بات تھی کہ انہیں دیکھ کر میرا خون سرد ہو گیا۔ کوئی غیر فطری اور تقریباً غیر انسانی چیز۔“

افریقہ کے مخصوص چہرے یہاں نہ تھے۔ نہ انہوں نے شور مچایا۔ نہ کوئی ہنسا اور نہ ہی کسی نے کسی کے کان میں کچھ کہا اور نہ ہی وہ لوگ ہمارے لباس کو چھو کر دیکھنے کیلئے ہماری طرف آئے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی خوفزدہ نہ تھا اور نہ حیرت زدہ۔

وہ لوگ خاموش تھے اور ایسی سرد نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے کہ کم سے کم میری ریڑھ ک ہڈی میں تو سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ ہم وہ پہلے باہر سے آئے ہوئے لوگ تھے جنہوں نے انگوئی بہتو میں قدم رکھے تھے۔ لیکن انگوئی لوگوں کی خاموشی اور بے تعلقی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم جیسے لوگ روزانہ ان کی بہت سی آتے جاتے رہتے ہوں۔

اس کے علاوہ ہماری وضع قطع بھی انہیں مرعوب نہ کر سکی۔ اس کے برخلاف وہ جھگر کی لہو داڑھی اور میرے چھوٹے بال دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور اپنی لانی لانی نگاہوں سے میری اور جھگر کا خاموشی سے اشارے کرنے لگے۔ اکثروں نے اپنے بھالوں کے دستوں سے ہماری طرف اشارے

کیا۔ یہ بات میں نے خصوصیت سے دیکھی کہ جب وہ ہماری طرف اشارے کرتے۔ بھالے کو اٹھا کر نہ کرتے۔ غالباً اس خیال سے کہ ہم بھالے کے پھل کے اشارے کو اپنی جگہ یا اعلان جنگ نہ سمجھ لیں۔ یہاں میں یہ اعتراف کئے لیتا ہوں کہ ہمارے گروہ میں سے جس شخص نے انہیں حیرت زدہ کیا یا سوچ میں ڈال دیا وہ آگرس تھا۔ اس کی بد صورتی اور چہرے کی جھریوں نے انگوئی لوگوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ یا شاید دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ کیونکہ ایسا بد صورت اور بے ڈھنگا آدمی انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ شاید آگرس سے ان کی دلچسپی اور حیرت کی دوسری وجہ تھی۔ جس کا اندازہ قارئین وقت آنے پر لگا لیں گے۔ بہر حال میں نے ایک انگوئی کو گرلیں سے یہ پوچھتے سنا کہ یہ بندر نما آدمی جنی آگرس ہمارا دیوتا ہے یا صرف کپتان۔ اس انگوئی کے اس سوال نے آگرس کو بے حد خوش کر دیا۔ کیونکہ آج تک نہ تو کسی نے اسے دیوتا سمجھا تھا اور نہ کپتان۔

جب ہم گھاٹ پر آ گئے اور ہمارا سامان بھی اتار لیا گیا تو آگرس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کو کہا اور ہم اس کے پیچھے کافی چوڑے راستے پر چلے۔ راستہ صاف سترھا تھا اور اس کے دونوں کناروں پر دی بڑی جمو پٹریاں تھیں۔ ہر جمو پٹری کے سامنے پائیں باغ اور باغ کے کنارے پر ہاڑ تھی۔ یہ چیز اپنی پائیں باغ افریقہ میں خال خال ہی نظر آتے۔ ظاہر ہوا کہ ان لوگوں کو کسی بیرونی حملے کا خوف نہ تھا۔ خود جمیل ان کی شہر پناہ تھی۔

دی دوسری باتیں تو ان کے متعلق یہ ہے کہ اول تو وہ گہری خاموشی تھی جو اس بہت سی پر مسلط تھی۔ حتیٰ میں نہ کہتے تھے۔ نہ مرغیاں۔ کیونکہ نہ تو کوئی کتابھونکا اور نہ ہی کسی مرنے کی بانگ سنی۔ موسیقی ر بھیریں ضرور تھیں اور بہت تھیں۔ لیکن چونکہ لوگوں کو کسی حملے کا خوف نہ تھا اس لئے موسیقی اور میزیں بہت سی دور اور باہر رکھی جاتی تھیں اور ان کا دودھ اور گوشت حسب ضرورت بہت سی میں لایا جاتا تھا۔

ہمیں دیکھنے کیلئے بہت سے لوگ نکل آئے۔ لیکن انہوں نے بھیڑ نہ لگائی بلکہ چھوٹے چھوٹے روہوں میں اپنے اپنے پائیں باغ کے دروازوں میں آ کھڑے ہوئے۔ ان گروہوں کی خصوصیت لی یہ تھی کہ عموماً اس میں صرف ایک مرد اور اسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی تھیں۔ عورتیں قبول ورت تھیں اور بدن سے سڈول اکٹروں کے ساتھ انکے بچے تھے لیکن وہ بھی زیادہ نہ تھے۔ کسی ایک ندان میں بہت زیادہ بچے ہوئے تو تین ہوئے بس۔ اکثروں کے تو کوئی اولاد ہی نہ تھی۔ عورتیں بچے بھی مردوں کی طرح مناسب اور شائستہ لباس پہنتے ہوئے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت بھی اس بات کو ثابت کرتی تھی کہ انگوئی افریقہ کے معمولی کافر نہ تھے۔ صاف سترے اور ہموار راستے۔ سفید

جو یقیناً دوزخ کا ہی منظر ہو سکتا تھا۔ میری روح کی بنیادوں کو لرزادیا تھا۔

چنانچہ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبالا اور سر جھٹک کر گریس کی طرف دیکھا جو ہم سے ایک دو قدم آگے تھا۔ اس کی پیٹھ کچھ اس طرح نامعلوم طور پر لرز رہی تھی کہ میں نے فوراً ہی دو باتیں سمجھ لیں۔ اول یہ کہ وہ بے حد پریشان تھا اور دوسرے یہ کہ کوئی سخت غلطی اس سے سرزد ہو گئی تھی اور دھینا بھی اس کی پریشانی کی وجہ تھی۔ ایک لمحہ تک وہ بت بنا کھڑا رہا اور پھر مرغ بادشاہ کی طرح ہماری طرف گھوم گیا اور مجھ سے پوچھا۔

”تم نے دیکھا کچھ؟“

”ہاں“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“

”ہم نے صرف یہ دیکھا کہ بہت سے آدمی ایک الاؤ کے گرد جمع تھے اور بس۔“ اس نے ہمارے بشروں سے ہماری دلی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن خوش قسمتی سے چاند ایک موٹے بادل میں چھپ گیا تھا۔ چنانچہ گریس ہمارے چہروں سے کچھ زیادہ معلوم نہ کر سکا۔ اس نے اطمینان کا لباس اس لیا اور کہا۔

”ڈوینو! اور گاؤں کے بڑے لوگ ایک بھیڑ بھون رہے ہیں جب چاند بدلتا ہے تو اس کی رات دعوت اڑانا ان کی رسم ہے۔ سفید آقاؤ۔ میرے پیچھے آؤ۔“

چنانچہ ہمیں اس لیے ساتباں کے دوسری طرف لے آیا اور ہم باغ میں سے گزر کر ان جموں پڑیوں کے سامنے پہنچ گئے۔ جن کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ وہاں پہنچ کر گریس نے تالی بجائی اور فوراً ایک عورت خدا جانے کہاں سے نکل آئی۔ گریس نے نیچی آواز میں اس عورت سے کچھ کہا۔ وہ چلی گئی۔ کئی چند ثانیوں کے بعد ہی واپس آئی تو اس کے ساتھ دوسری چار پانچ عورتیں تھیں جو مٹی کا چراغ لئے ہوئے تھیں۔ یہ چراغ پیالہ نما تھا جس میں تیل تھا اور تیل میں کھجور کے ریشوں کی بنی ہوئی جی تیر رہی تھی۔

”سفید آقاؤ!“ یہاں تم بے لگری سے آرام کر سکو گے اور مزے سے سو سکو گے۔ کچھ ہی دیر بعد تمہارے لئے کھانا لایا جائے گا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اگر تمہاری مرضی ہوئی تو پھر ڈوینو اور اس کے مشیر باہر دعوت کے ساتباں میں تم لوگوں سے ملاقات اور بات چیت کریں گے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو کسی لکڑی سے اس برتن کو بجا دیتا۔“ اور اس نے جموں پڑی کے باغ میں رکھے ہوئے اس برتن کی طرف اشارہ کیا جو تانبے کی دیگ معلوم ہوئی تھی اور کوئی تمہاری خدمت کیلئے

دیواروں اور کھجور کے چٹوں کی بھوری چھتوں والی جموں پڑیاں شاداب پائیں باغ طویل القامت اور خاموش لوگ بند ہوا میں چلہوں میں الف کی طرح کھڑے ہوئے شعلے کھجور کے بلند بالا اور دوسرے استوائی ہیڈ اور راستہ کے انتہائی سرے پر بہت دور شمال میں اسی پہاڑ کی جنگل سے ڈھکی ہوئی چوٹی جو دیوتا کا گھر کہلاتا تھا۔

ہم چلتے رہے یہاں تک کہ اس بلند بارڈ کے دروازے پر پہنچ گئے جو اوپر سے نیچے تک سرخ اور چمکدار پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور جب ہم اس بارڈ کے دروازے پر پہنچے تو افق کی سرخی پر رات کی تاریکی غالب آ رہی تھی۔ گریس نے دروازہ کھولا اور جو منظر نظر آیا اسے ہم عمر بھر نہ بھلا سکیں گے۔ ہاڑ ایک ایکڑ زمین کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔ جس کے پچھلے حصہ پر دو جموں پڑیاں باغ میں کھڑی تھیں۔

ان جموں پڑیوں کے سامنے دروازے سے کوئی پندرہ قدم دور ایک بالکل ہی مختلف عمارت تھی۔ یہ عمارت پچاس فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی تھی۔ اس کی دیواریں نہ تھیں۔ صرف چھت تھی۔ جو متش مستونوں پر تکی ہوئی تھی اور ستونوں کے درمیان جو غلاف تھا اس میں گھاس کی چلمنیں لٹک رہی تھیں۔ زیادہ تر چلمنیں گری ہوئی تھیں۔ لیکن دروازے کے عین سامنے کی چار چلمنیں اُچی ہوئی تھیں۔ اس عجیب ساتباں کے سائے میں ایک کھڈ تھا۔ کھڈ میں آگ سلگ رہی تھی۔

اور اس آگ میں تین طرف چالیس پچاس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سفید چغے تو خیر پہنے تھے لیکن عجیب شکل کی ٹوپیاں بھی لگا رکھی تھیں۔ یہ لوگ عجیب آواز میں کوئی اداس اور لرزہ خیز گیت گا رہے تھے۔ آگ کی چوٹی طرف جو دروازے کے عین مقابل تھی تھا ایک شخص ہاتھ پھیلائے اور ہماری طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔

دفعتاً اس نے ہمارے پیروں کی چاپ سنی وہ ہماری طرف گھوما اور پھر بائیں طرف ہٹ گیا تاکہ روشنی ہم پر بڑا آہنی جنگلہ یا زبردست میخدار چولہا سا جو پٹنگ کی شکل کا تھا اور اس جنگلے پر کوئی خوفناک چیز رکھی یا لپٹی ہوئی تھی۔ لیون چند قدم آگے تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر جنگلے پر رکھی ہوئی چیز کی طرف دیکھا۔ دفعتاً وہ سر سے پیر تک کانپ گیا اور پھر خوف سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

”میرے خدا! یہ تو کوئی عورت ہے۔“

دوسرے ہی لمحے چھنیں گر چکی تھیں اور گیت کی آواز خاموش ہو چکی تھی۔



”خاموش رہو۔“ میں نے کہا۔ اور سب نے میرے لہجے سے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اس منظر نے

حاضر ہو جائے گا۔ یہ دیکھو یہ ہے تمہارا سامان دیکھ لو۔ ایک چیز بھی غائب نہیں ہے اور یہ تمہارے منہ ہاتھ دھونے اور نہانے کیلئے پانی لایا جا رہا ہے اور اب میں ڈوینو کی خدمت میں تمہاری آمد کی اطلاع دینے جا رہا ہوں۔

اور وہ سلام کر کے چلا گیا۔

چنانچہ چند ثانیوں کے بعد وہ خاموش اور قبول صورت عورتیں جو ہماری خدمت پر مامور تھیں کھانا لانے چلی گئیں۔ کم از کم ان میں سے ایک کو تو میں نے یہی کہتے سنا تھا اور اب ہم اکیلے تھے اور میرے خدا لیموش نے رومال سے اپنے چہرے پر ہنکھا جھلتے ہوئے کہا۔

”تم نے دیکھا کہ وہ لوگ ایک عورت کو بھون رہے تھے۔“

آدم خوروں کے متعلق میں نے سنا تو بہت ہے۔ لیکن دیکھا آج ہے۔“

”یہاں اور کیا دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں؟“ میں نے اداسی سے پوچھا۔

”یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ بات یہ ہے۔ ہنس راج! کہ میں خوا خواہ کی توقعات سے اپنے آپ کو پریشان کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ مگر.....!“ میرا مزاج اس وقت بگڑا ہوا تھا اور طبیعت بھیجی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں بحث کرنے ہی والا تھا کہ آگس نے جمو پڑی کے دروازے میں سے اپنا سر اندر ڈال کر کہا۔

”کھانا آ رہا ہے باس۔ بہت عمدہ کھانا۔“

چنانچہ ہم جمو پڑی میں سے نکل کر باغ میں آ گئے جہاں سڈول بدن والی طویل القامت عورتیں گھاس پر چوبی قابیں رکھ رہی تھیں۔ چاند بادلوں میں سے نکل آیا تھا۔ چنانچہ اس کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ چند قابوں میں گوشت تھا۔ لیکن چونکہ اس پر کسی قسم کی چٹنی پڑی ہوئی تھی۔ اس لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ گوشت کس کا ہے۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ یہ بھیڑ کا گوشت تھا۔ لیکن کیا پتا؟ دوسری قابوں میں صریحاً سنہری ترکاری تھی۔ مثلاً کھنٹی کے ابلے ہوئے دانے ایک کافی بڑا بالابلا ہوا پیٹھا اور مجھے یاد آیا کہ جگڑا کٹر دفعہ میرے سامنے سبزی ترکاری کے فوائد بیان کر کے مجھے گوشت خوری سے ہٹانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس وقت میں نے اپنی تقریروں کا بہانہ بنا کر کہا۔

”جگڑا تمہارا خیال شاید غلط ہے۔ ان سبزیوں کو یوں تازہ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ افریقہ کی گرم آب و ہوا میں یہی غذا مناسب ہے۔ بہر حال چند دنوں کیلئے میں سبزی خور بننے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ دیکھیں کیا رہتا ہے۔ یہ تجربہ۔“

اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر میں نے مٹی بھر مٹی کے دانے اور پیٹھے کا اوپری حصہ چاقو سے

اٹ کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ میں پیٹھے کا وہ حصہ کھانا نہ چاہتا تھا جو قاب سے پینڈے میں کناروں کو ہور ہا تھا۔ کیونکہ کیا پتہ ان قابوں میں کیا رکھا گیا ہو اور پھر انہیں دھویا بھی گیا ہو یا نہیں۔

لیموش کو بھی اپنی نجات میری تقلید میں نظر آئی۔ چنانچہ اس نے بھی کئی کے چند دانوں اور پیٹھے کا ایک آدھ قاش پر اکتفا کیا۔ فوٹا نے بھی اپنے لئے یہی غذا پسند کی اور وہ پرانا گوشت خور آگس کی سبزی خور بن گیا۔

گوشت کے قاب میں ہاتھ ڈالنا تو ایک طرف رہا۔ اس نے ان قابوں کی طرف دیکھا تک بس۔ صرف جونی نے گوشت کی قابوں سے پورا پورا انصاف کرنے کا اعلان کیا کہ انگوٹی لینڈ میں رہ اور نرم گوشت ہوتا ہے۔ وہ چونکہ ہم سب کے پیچھے تھا۔ یعنی اس وقت جب ہم اپنی قیام گاہ کے وئی دروازے میں داخل ہوئے تھے اس لئے غالباً اس نے نہیں دیکھا تھا کہ اس زبردست چولہے پر ان کی چیز بھونی جا رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے پائپ جلائے اور جب جگڑا نے سرگوٹی سے کہا۔

”ہنس راج! اس زبردست آگیشی کے سامنے اور ہماری طرف پشت کئے جو شخص کھڑا تھا وہ ڈوینو تھا۔ آگ کی روشنی میں مجھے اس کی ایک ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی نظر آ گئی تھی۔“

”تو پھر اگر یہ کہیں آگے جانا چاہتے ہیں تو جگڑا تم اس شخص ڈوینو کا ذوق بدلنے کی کوشش کرو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن سوال یہ ہے کہ اس گوشت کو بھوننے کی زبردست آگیشی سے کہیں گے جا بھی سکیں گے؟“

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں دھوکہ دے کر شخص اس لئے یہاں لایا گیا ہے کہ یہ وحشی ہمیں بھون کر اٹھیں۔“

اس سے پہلے کہ جگڑا کوئی جواب دیتا، گریس آ گیا اور یہ پوچھنے کے بعد کہ ہمارے پیٹھ سے یا نہیں کہا کہ اگر ہم تیار ہوں تو ڈوینو اور اس کے شیر ہم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ سوائے جونی کے جسے ہم نے سامان کی حفاظت کیلئے قیام گاہ پر چھوڑ دیا تھا وہ تمام کھانے کر روانہ ہوئے جو ہم نے ڈوینو کیلئے تیار کئے تھے۔ گریس ہمیں اس سائبان یا دعوت گھر میں لے جہاں کھڑے اس وقت آگ نہ تھی یا شاید اسے ڈھانپ دیا گیا تھا اور وہ آگیشی اور اس پر رکھی خوفناک چیز بھی غائب تھی۔ اس کے علاوہ ساری چلمنیں اٹھا دی گئیں۔ چنانچہ سائبان میں چاندی کی دروازہ کی طرف رخ کئے ڈوینو دبلا پتلا اور طویل القامت اور ادھیڑ عمر کا شخص تھا اور ایسا ان شخص میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شدید اعصابی بھجان میں مبتلا ہو۔ اس کے چہرے کے پٹھے مسٹ اینٹھ رہے تھے اور ہاتھوں کو بھی چین نہ تھا اور چاند کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں خوف کے جذبات سے پڑھیں۔

ڈوینو نے کھڑے ہو کر اور گردن جھکا کر ہمارا استقبال کیا۔ لیکن اس کے مشیر بیٹھے رہے۔ اور وہ دیر تک ہولے ہولے تالیاں بجاتے رہے۔ معلوم ہوا کہ انگو لی لینڈ میں سلام کا طریقہ یہ ہی تھا۔ ہم نے گردنیں جھکا کر ان کے سلام کا جواب دیا۔ اور پھر ان تین تپائیوں پر جو ہمارے رکھی گئی تھیں اس طرح بیٹھ گئے کہ جگر میرے اور لیوشن کے بیچ میں تھا۔ فونا اور آگرس ہمارے بائیں کھڑے ہو گئے۔ آگرس اپنے لیے اور مولے عصا کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ جسے وہ ہولون لینڈ سے اساتھ لایا تھا۔

ڈوینو نے گریس کو اپنے سامنے طلب کیا۔ اے وہ جو دیوتاؤں سے گزر کر آیا ہے اور ہونے والے ڈوینو۔ یہ کہتے وقت اس نے ڈوینو کو کانپتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہہ کر مخاطب کیا اور اس نے ہولون لینڈ کے متعلق اور پھر یہ پوچھا کہ یہ کیسے ہوا کہ وہ لوگ باہر کی دنیا کے لوگ دیکھنے کا شرم حاصل کر رہے ہیں؟

چنانچہ اب گریس نے ڈوینو کو مختلف القاب سے مخاطب کیا۔ ”آقا جن کے قدم میں چاہوں۔“ جس کی آنکھیں آگ اور زبان نکوار ہے وہ جس کے ایک اشارے پر لوگ مرجاتے ہیں قربانی کا آقا اور مقدس غذا کا پہلا کھنے والا دیوتاؤں کا چہیتا وہ جوشابو کے بعد ملک میں سب عظیم ہے۔ شانبو جو سب سے مقدس ہے سب سے زیادہ قدیم ہے جو آسمانوں سے آیا ہے اور آسمانوں کی آواز میں بولتا ہے وغیرہ..... وغیرہ القاب کا سلسلہ ختم کر کے اس نے اپنے سفر اور شائون میں اپنی کارگزاری کی تفصیلات بیان کیں۔

یہ اس نے خصوصیت سے اور بڑی تفصیل سے کہا کہ اس نے شانبو کے پیغام کے مطابق گریس تک پہنچایا گیا تھا ان سفید قاموں کو انگو لی لینڈ میں آنے کی دعوت دی اور جب جوی آدمیوں میں سے کوئی بطور سفیر انگو لی لینڈ میں آنے کیلئے تیار نہ ہوا تو اس نے سفید قاموں کو جوی سفیروں کے طور پر قبول کر لیا۔ البتہ گریس نے کہا۔ شانبو کی ہدایت پر عمل کر کے اس نے یہ شرط لگا دی کہ سفید قام اپنے ساتھ وہ جادوئی ہتھیار نہ لائیں جو دھواں اور موت لگتے ہیں۔ گریس اس اعلان پر ڈوینو کے بشرے سے اس کے دماغی خلفشار کے آثار ہویدا ہو گئے اور وہ اور بھی زہ پریشان نظر آنے لگا۔ ہماری طرح گریس نے بھی ڈوینو کی یہ حالت دیکھ لی۔ تاہم اس نے کچھ کم

بتہ چند ٹائون کے توقف کے بعد اس نے ڈوینو کو بتایا کہ ایسے کوئی ہتھیار سفید قام اپنے ساتھ نہیں لے ہیں۔ اس نے ڈوینو کو مطلع کیا کہ ہمارے وعدے کے باوجود اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ہمارا سامان کھلو کر اور اس کا معائنہ کر کے اپنا اطمینان کر لیا تھا۔

چنانچہ اس نے آخر میں کہا۔ اب اس بات کا خوف نہ تھا کہ ہم انگو لی لینڈ کی قدیم پیش گوئی کو برا کر دیں گے۔ جب انگو لی لینڈ میں بندوق چلائی جائے گی تو دیوتا چلے جائیں گے اور یہ کہ قبیلہ بیلہ نہ رہے گا۔

اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد گریس بڑی خاکساری سے ہمارے پیچھے بیٹھ گیا۔ اب ڈوینو نے میں شاہ ہولون جوی کے سفیروں کے طور پر قبول کرنے کے بعد دونوں قبائل میں امن و صلح کے فوائد ایک تقریر کی اور آخر میں اس کی شرائط پیش کیں۔ یہ صلح اور آشتی کی باتیں تو محض بہانہ تھا۔ ناچہ صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ ایک شرط تو یہ تھی کہ ہولون اور انگو لی کے درمیان شادی بیاہ کا سلسلہ جاری کر دیا جائے اور دوسری یہ کہ تجارت کیلئے دونوں ملکوں کی سرحدیں کھول دی جائیں۔ خون کا رشتہ قائم کر لیا جائے۔

جب وہ خاموش ہوا تو ہم چند ٹائون تک بظاہر آپس میں مشورہ کرتے رہے اور پھر میں تقریر کرنے کیلئے اٹھا اور کہا کہ جگر! چونکہ عظیم انسان ہے اس لئے اس کی طرف سے میں بول رہا ہوں کہ یہ شرائط اچھی اور قابل ہیں اور یہ کہ یہاں سے واپس جا کر ہم یہ شرائط جوی اور اس کے شیروں کے سامنے پیش کر دیں گے۔“

ڈوینو نے میرے اس بیان پر اطمینان کا اظہار کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ پورا خانہ شانبو کے سامنے پیش کر کے اس کی رائے معلوم کی جائے گی۔ کیونکہ اس کی رائے کے بغیر کوئی فی قدم اٹھانا انگو لی لینڈ میں بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر ہم رضامند ہوں اور پسند لیں تو دوسرے ہی دن خود جا کر مقدس کاہن سے مل آئیں۔ اس نے کہا کہ ہمیں اس وقت روانہ دنا ہوگا۔ جبکہ ”سورج کی عمر تین گھنٹے کی ہو چکی ہوگی“ کیونکہ شانبو باڈی سے ایک دن کی مسافت پر ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک بار پھر ہم نے تحائف پیش کئے گئے جو گویا اخلاقی قبول کر لئے گئے۔ یعنی اس سے پہلے کہ ہم انگو لی لینڈ سے رخصت ہو جائیں اس کے بعد ڈوینو نے ایک لکڑی اٹھا کر توڑ دی۔ مطلب تھا کہ کانفرنس ختم ہو گئی۔“ چنانچہ ہم اسے اور اس کے مشیروں کو شب بخیر کہہ کر اپنی جھونپڑی کی طرف بٹ آئے۔

”چنانچہ اب سو جاؤ۔ اور میرے خیال میں ہماری یہ آخری رات ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ خوب چیر پھیلا کر اور بقول گھوڑے بچ کر سویا جائے۔“

”واہ..... واہ!“ لیوٹن نے کہا اور اپنا کوٹ اتار کر اور اسے تہہ کر کے چار پائی کے سرہانے رکھ دیا کہ نیچے کا کام دے سکے۔

میں مدہم روشنی میں دیواروں کا معائنہ کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی چنانچہ دھول اور چوہوں کو بھول کر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے آگرس کھڑا تھا۔

”کیا ہے؟“

”باس آدم خور شیطانوں میں ایک شیطان تم سے ملنا چاہتا ہے۔ فونانے اسے باہر روک رکھا ہے۔“

”اندر آنے دو اسے۔“ میں نے کہا۔ کیونکہ اس جہنمی ملک میں بے خونہ ہماری بہترین چال ثابت ہو سکتی تھی۔ ”لیکن جب تک وہ اندر رہے تم ہوشیار رہنا۔“

آگرس نے گردن کھما کر سرگوشی میں کچھ کہا اور دوسرے ہی لمحے ایک غصص جمونپڑے میں اگیا۔ آگیا گیا۔ باقاعدہ اندر گھس آیا۔ اس نے اپنے آپ کو سر سے پیر تک ایک سفید چادر میں پیٹ رکھا تھا۔ چنانچہ وہ انسان سے زیادہ بھوت معلوم ہوتا تھا۔

”کون ہو۔ تم؟“ میں نے پوچھا۔

جواب میں اس نے اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دی اور میں نے دیکھا کہ ہمارے سامنے کوئی نہیں بلکہ ڈیونو کھڑا ہوا تھا۔

”میں آقا۔ روتا نو سے تمہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“ ڈیونو نے کہا۔

”اور یہ بات چیت ابھی اور اسی وقت ہوگی۔ کیونکہ بعد میں میرا تمہائی میں ملنا ناممکن ہوگا۔“

جنگر اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

”ڈیونو! میرے دوست کیسے ہو؟“ جنگر نے کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہاتھ کا زخم اطمینان بخش طور پر مندمل ہو گیا ہے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ لیکن روتا نو مجھے اکیلے میں تم سے کچھ کہتا ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“ جنگر نے جواب دیا۔ ”اگر تم کو کچھ کہتا ہی ہے تو ہم سب کے

ماننے کہو اور یہ منظور نہیں تو پھر نہ کہو یہ سفید آقا ایک ہی نہیں چنانچہ جو میں سنوں گا یہ بھی سنیں گے۔“

”میں ان پر اعتبار کر سکتا ہوں؟“ ڈیونو بڑبڑایا۔

چونکہ بعد کے واقعات کا اس ایک بظاہر معمولی بات سے گہرا تعلق تھا۔ اس لئے میں یہاں یہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیں جمونپڑیوں تک پہنچانے اس دفعہ گریس نہیں بلکہ ڈیونو کے دو مشب آئے۔ جب ہم ڈیونو اور اس کے مشیروں کو شب بیکر کہنے کیلئے اٹھے تو میں نے پہلی دفعہ دیکھا آ گریس وہاں موجود نہ تھا۔ یہ میں نہیں جانتا کہ وہ کب وہاں سے چلا گیا تھا۔ کیونکہ اس کی نشہ ہمارے پیچھے اور اندھیرے میں تھی۔ ہم میں سے کسی نے اسے وہاں سے جاتے نہ دیکھا تھا۔

”کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے اس سے؟“ دروازہ بند کر دیا گیا تو میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

جنگر نے صرف اپنا سر ہلا دیا اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ ان دنوں میں وہ ایسا معلوم ہوتا تو جیسے خواب کی دنیا میں رہتا تھا۔

لیوٹن نے جواب دیا۔ ”سب بکواس اور وہابیات ہے ان آدم خور وحشیوں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ ہولون لوگوں سے صلہ آشتی کی باتیں محض باتیں ہی باتیں ہیں۔“

یہ تم نے غلط نہیں کیا۔ اگر ان کا مقصد محض امن قائم کرنا ہی ہوتا تو وہ اس مسئلے پر یوں سلی اور مختصر گفتگو کرنے کے بجائے گہری اور طویل بحث کرتے۔ بڑی بڑی شرطیں پیش کرتے یا سفیروں سے برغالیوں کے تبادلے کی بات چیت کرتے۔ اس کے علاوہ اگر ایسا ہوتا تو انہوں نے شانبو کی رائے پیش کی ہی طلب کر لی ہوتی۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ شانبو مختار کل ہے اور ڈیونو اس کا ہتھیار ہے۔ چنانچہ اب اگر واقعی امن قائم کرنا مقصود ہوتا تو شانبو نے یہ بات پہلے ہی کہہ دی ہوتی۔ بشرطیکہ یہ شانبو کو خیالی پیکر نہ ہو۔ بلکہ حقیقت میں اس کا وجود ہو۔

بہر حال اگر ہم زندہ رہے تو ساری باتیں معلوم کر ہی لیں گے۔ اگر مر گئے تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب اگر تم میری رائے پوچھتے ہو تو یہ کہتا ہوں کہ شانبو کو ڈالو جنہم میں اور کل صبح جو پہلا ڈونگا مل جائے اس میں سوار ہو کر ہولون لینڈ لوٹ چلو۔“

”میں تو بہر حال اس شانبو سے ملنا چاہتا ہوں۔ جنگر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اپنا بھی یہ ہی ارادہ ہے۔ یعنی ایضاً۔“ لیوٹن نے کہا۔ ”لیکن اس مسئلے پر نئے سرے سے بحث کرنا فضول ہے۔“

”بے شک۔“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”جیسا کہ تم نے کہا“ واقعی پاگلوں سے بحث کرنا فضول ہے۔“

”اگر دیوتا مر جائے گا تو پھر انکلو بھی مر جائیں گے۔ یہ بہت پرانی پیش گوئی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ شانیدہ دیوتا کی ایسی خبر گیری اور حفاظت کرتا ہے جیسی کہ ایک ماں اپنے بچے کی چنانچہ اس کے بعد جب تک نیا دیوتا نہیں مل جاتا مقدس پھول کی ماں یعنی ”ملکہ جن“ حاکم ہوتی ہے اور وہ بڑی رحم دل ہے۔ چنانچہ کسی کو اس کی طرف سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور اس کے زیر سایہ میں حکومت کروں گا اور مائیتیا اپنے دشمنوں کا خاتمہ کر دوں گا۔ خصوصاً اس جادوگر گریس کا۔“

اور اس وقت میں نے ہوا میں ایک آواز سنی جیسے سانپ کی پھنکار ہو لیکن چونکہ یہ آواز دوبارہ سنائی نہ دی اس لئے میں نے سمجھا کہ یہ میرا دم ہوگا۔“

اس کے علاوہ ڈوینو نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”میں تمہیں سونے کے برادے سے لادوں گا اور وہ تحائف دوں گا جو تم پسند کرو گے اور تم کو بحفاظت جمیل کے اس پار تمہارے دوستوں میں یعنی ہولون لوگوں میں پہنچا دوں گا۔“

”ڈوینو۔“ یہ میں نے کہا۔ ”پہلے ہمیں یہ معاملہ پوری طرح سمجھ لینے دو۔ جھگڑم ہماری باتوں کا ترجمہ لیموشن کو ساتھ ساتھ سنا تے جانا۔ ہاں تو دوست ڈوینو! پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہ دیوتا کون ہے۔ جس کا تم ذکر رہے ہو؟“

”انس راج! یہ ایک زبردست گوریلا ہے جو اتنا بوڑھا ہے کہ سفید ہو گیا ہے یا پھر سفید ہی پیدا ہوا تھا۔ بہر حال یہ میں نہیں جانتا کہ وہ سفید کیوں ہے۔ اس کا قد اونچے سے اونچے انسان سے دگنا ہے اور اس میں میں انسانوں کی طاقت ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں آدی کو پکڑ کر یوں توڑ سکتا ہے جس طرح ہم خشک زسوں کو آسانی سے توڑ دیتے ہیں یا وہ آدی کا سر اپنے منہ میں لے کر صاف کاٹ لیتا ہے جس طرح کے اس نے میری انگلی کاٹ لی تھی۔ جب وہ کسی بھی ڈوینو سے تھک جاتا ہے تو ان سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے اور وہ شروع ہی سے ایسا کرتا ہے۔ پہلے وہ ڈوینو کی انگلی کاٹ کر اسے چھوڑ دیتا ہے اور دوسری دفعہ انہیں پکڑ کر توڑ دیتا ہے جنہیں سوختی قربانی کیلئے منتخب کیا جاتا ہے۔“



”اسی طرح جس طرح کہ مجھ پر کر سکتے ہو۔ چنانچہ کہو جو کہنا ہے یا پھر جاؤ۔ ہاں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ ہم جموینڈ میں باتیں کریں تو کیا کوئی انہیں باہر سے سن سکتا ہے؟“

”نہیں اے روتانو! دیواریں موٹی ہیں۔ چھت پر کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی آس پاس ہے۔ یہ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں اور اگر کسی نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی تو ہم اس کی آواز سن لیں گے۔ اس کے علاوہ تمہارے آدی جو دروازے پر کھڑے ہیں اسے دیکھ لیں گے۔ چنانچہ ہماری باتیں کوئی نہیں سن سکتا۔ سوائے دیوتاؤں کے۔“

”اگر ایسا ہی ہے تو پھر دیوتاؤں کی فکر نہ کرو اور کہو جو کہنا ہے۔ میرے ساتھی تمہاری پچھل داستان سے واقف ہیں۔“

”میرے آقا۔“ اس نے کہنا شروع کیا اور اپنے دیدے چاروں طرف گھمانے لگا۔ اس جانور کی طرح جس کے پیچھے شکاری لگا ہوا ہو۔ ”ایک خوفناک آئی ہوئی ہے۔ مجھ پر رمتانو! جب میں تم سے ملا تھا اس کے بعد مجھے اس سفید دیوتا کے حضور جانا ضروری تھا جو پہاڑ کے جنگل میں رہتا ہے۔ ہاں مقدس بیج بکھیرنے کیلئے میرا وہاں جانا ضروری تھا۔ لیکن میں بہانہ کر کے بیمار پڑ گیا اور میری جگہ گریس ہونے والا ڈوینو دیوتاؤں کے قریب سے گزرا ہے اور صحیح سلامت واپس آ گیا۔ اب کل پورے چاند کی رات ہے اور میں چونکہ ڈوینو ہوں اس لئے پھر ایک ارسفید دیوتا کے حضور جا کر بیج بکھیرنے ہیں۔“

لیکن روتانو! مجھے مار ڈالے گا۔ کیونکہ ایک دفعہ وہ مجھے کاٹ چکا ہے۔ وہ یقیناً میرا خاتمہ کر دے گا اور میری جگہ گریس ڈوینو بن کر حکومت کرے گا۔ اور وہ تم سب کو مار ڈالے گا۔ یعنی اس طرح جس طرح تم نے سمجھ لیا ہوگا۔ ”گرم موت۔“ کیونکہ وہ تمہیں دیوتاؤں پر بھیٹ چڑھا دے گا تاکہ انکلو عورتیں ایک بار پھر بہت سے بچے جننے لگ جائیں۔ ہاں۔ ہاں۔ اگر ہم نے اس دیوتا کا خاتمہ نہ کر دیا جو پہاڑ کے جنگل میں رہتا ہے تو پھر ہم سب مارے جائیں گے۔

اور وہ خاموش ہو گیا۔ وہ کانپ رہا تھا اور اس کے ماتھے پر پسینہ پھٹک رہا تھا۔ ہوں۔ ہوں۔“ جھگڑنے کہا۔ لیکن فرض کر دو کہ ہم نے اس دیوتا کا خاتمہ کر دیا تو اس کے بعد ہم شانیدہ اور تمہارے ان خونخوار لوگوں سے کس طرح بچ پائیں گے۔ یقیناً یہ لوگ ہماری اس گستاخی کا بہانہ بنا کر بہر حال ہمیں قتل کر دیں گے۔“

”نہیں روتانو! ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“

”کیوں؟“



بچ سکتے ہیں۔ جہاں یہ زبردست گوریلا رہتا ہے؟ اور اگر ہم وہاں پہنچ بھی گئے تو اس کا خاتمہ کیسے کر سکیں گے۔ کیونکہ تم نے جانور کے مقابلے ہمیں آتھیں اسلحہ تو یہاں لانے ہی نہیں دیا۔“

”ہاں۔ ہنس راج! دیوتا کریں کہ اس کی عیاری کے عوض سفید دیوتا کے دانت اس کی کھوپڑی کا چورا کر دیں۔ ہاں وہ مر جائے اس طرح جس طرح کہ میں جانتا ہوں کہ اسے کس طرح مرنے ہے۔ وہ پیش گوئی کہ جس کا ذکر گرلیس نے تمہارے سامنے کیا ہے۔ قدیم نہیں ہے بلکہ صرف گزشتہ چاند سے ہی یہ بات یہاں مشہور ہے اب یہ میں نہیں جانتا کہ کسی سفید قام کے گرجنے والے ہتھیار سفید دیوتا کے مارے جانے کی پیش گوئی کس نے کی ہے۔ خود گرلیس نے یا شانہو نے؟ یہاں میرے علاوہ اور چند آدمیوں نے ان آہنی نلکیوں کے متعلق سنا ہے جو دھوپ اور گرج کے ساتھ موت اگتی ہے۔“

چنانچہ ان کے متعلق کوئی بھی پیش گوئی قدیم کیسے ہو سکتی ہے؟

”یہ تو بے شک میں نہیں جانتا ڈوینو بہر حال میرے بقیہ سوال کے جواب دو۔“

رہا یہ سوال کہ تم اس جنگل میں کیسے پہنچو گے جہاں یہ سفید دیوتا رہتا ہے۔ وہ پہاڑ کی ڈھلوان پر جنگل میں رہتا ہے تو یہ کام بہت آسان ہے۔“

”مثلاً کس طرح؟“

”اس طرح کے شانہو اور لوگ یقین کر لیں گے کہ میں تم لوگوں کو دھکے سے جنگل میں اس لئے لے جا رہا ہوں کہ تمہیں دیوتا پر سمیٹ چڑھا دوں اور چند وجوہات کی بناء پر وہ لوگ چاہتے بھی یہی ہیں اور اس نے سرخ و سفید اور موٹے لیوشن کی لچاکی ہوئی نظروں سے دیکھا۔“ رہا یہ سوال کہ تم اپنی آہنی نلکیوں کے بغیر دیوتا کا خاتمہ کس طرح کرو گے تو یہ میں نہیں جانتا، لیکن جب تم لوگ بڑے بہادر اور زبردست جادوگر ہو اس لئے بھینا کوئی راہ تلاش کر لو گے۔“

اس بات کو سن کر جنگل نے اپنا سراٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔

”بے شک“ وہ بولا۔ ہم کوئی راہ تلاش کر لیں گے۔ چنانچہ ڈوینو تم فکر نہ کرو۔ ہم اس زبردست گوریلا سے نہیں ڈرتے جسے تم دیوتا کہتے اور سمجھتے ہو۔ تاہم اس کی کوئی اجرت ہونی چاہئے۔ اجرت کے بغیر ہم اس گوریلا کے خاتمہ کرنے اور تمہاری جان بچانے کی کوشش نہ کریں گے۔“

”کیا اجرت چاہتے ہو تم؟“ ڈوینو نے بے چینی سے پوچھا۔ ”بیویاں اور مویشیاں؟ نہیں بیویاں تم کو چاہئیں نہیں۔ رہے مویشی تو تم انہیں جمیل کے دوسرے طرف نہ لے جا سکو گے کہ یہ ناممکن ہے۔ البتہ یہاں ہاتھی دانت اور سونا ہے اور یہ دونوں چیزیں میں دینے میں دینے کا وعدہ کر چکا ہوں اور کچھ نہیں ہے میرے پاس جو پیش کر سکوں۔“

”آ۔ ہاں۔ ایک زبردست گوریلا تو میرا خیال غلط نہ تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ خوشخوار گوریلا کب سے تمہارا دیوتا بنا ہوا ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید ابتدائے آفریش سے وہ شروع سے وہاں ہے۔ جس طرح کہ شانہو شروع سے ہے کیونکہ وہ دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی دو قالب ہیں جان ایک ہے۔“

”یہ ابتدائے آفریش والی بات تو بہر حال گپ ہے۔“ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور پھر ڈوینو سے پوچھا۔ ”یہ“ ملکہ جن کون ہے؟“ کیا وہ بھی اس جگہ رہتی ہے جہاں گوریلا رہتا ہے؟“

”نہیں۔ ہنس راج۔ وہ ہماری تمہاری طرح فانی ہے اور جب وہ وقت آتا ہے تو وہ مرجاتی ہے اور پھر اس کی جگہ نئی ”ملکہ جن“ لے لیتی۔ چنانچہ موجودہ ”ملکہ جن“ ایک سفید قام عورت ہے۔ جواب ادھیڑ عمر ہو چکی ہے۔ جب وہ مر جائے گی تو اس کی جگہ اس کی بیٹی ”ملکہ جن“ بنے گی۔ اس کی بیٹی بھی سفید اور بہت خوبصورت ہے اور پھر جب وہ مر جائے گی تو دوسری سفید پیدا ہو جائے گی۔“

”ملکہ جن“ کی اس بیٹی کی عمر کیا ہے؟ جنگل نے پرشوق آواز میں پوچھا۔ ”اور اس کا باپ کون ہے؟“

”یہ لڑکی کوئی بیس برس پہلے پیدا ہوئی تھی۔ رتا نو! جب موجودہ ملکہ جن کو پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا تو اس کے بعد ہی اس نے اس لڑکی کو جنم دیا تھا۔“ ملکہ جن“ کا کہنا ہے کہ اس کی بیٹی کا باپ بھی ایک سفید قام ہے۔ ملکہ جن اس سفید قام کی بیوی تھی۔“

”رہی بات یہ کہ“ ملکہ جن“ کہاں رہتی ہے۔ یہ ڈوینو نے کہا۔ ”تو اس کی قیام گاہ جمیل میں ایک جزیرے پر ہے اور وہ پہاڑ کی اس چوٹی پر رہتی ہے جس کے چاروں طرف پانی ہے۔ سفید دیوتا سے ملکہ جن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ لیکن اس کی چوٹی پر رہتی ہے۔ جس کے چاروں طرف پانی ہے۔ سفید دیوتا کیلئے غلہ اگایا جاتا ہے اور جس کے بیج ڈوینو تکمیر آتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم سمجھ گئے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ خود تمہاری کیا تجویز ہے۔ ہم اس جگہ کس طرح

”کس طرح لوٹ جاؤ گے۔ ہنس راج! اگر تم سفید دیوتا کے دانتوں سے کسی طرح بچ بھی گئے تو تم کو گرم موت کیلئے منتخب کیا جا چکا ہے اور اس طرح مرنا تمہارے لئے مقدر ہو چکا ہے۔“

”بڑی آسانی سے ہم گر لیں یعنی ہونے والے ڈوبنے سے خود تمہاری سازشوں کا ذکر کریں گے کہ کس طرح تم ہمارے ذریعہ گوریلے کا خاتمہ کروانا چاہتے تھے۔ لیکن ہم نے انکار کر دیا جبکہ میرے خیال میں تو مناسب ہوگا کہ تمہاری سازشوں کا بھانڈا اسی وقت پھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اس وقت تم ہمارے میں موجود ہوشیار تم کو معلوم ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں باہر جا کر اس بڑے برتن کو لکڑی سے بجاتا ہوں۔ حالانکہ کافی رات گزر چکی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔ نہیں ڈوبنے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ ہمارے پاس چاقو اور ہمارے ملازموں کے پاس بھالے تو ہیں ہی۔

”آقا۔“ وہ بولا۔ ”ملکہ جن اور اس کی بیٹی تمہارے حوالے کروں گا اور مقدس پھول اور اس کا پودا جڑ سمیت تم کو دے دوں گا۔ اور میں یہ بھی قسم کھاتا ہوں کہ اگر میرے اختیار میں ہو تو تم سب کو جمیل کے اس پار پہنچا دوں گا۔ البتہ درخواست ضرور ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ چل سکوں گا۔ کیونکہ اس کے بعد میں اس ملک میں نہ رہ سکوں گا۔ تاہم عذاب تو نازل ہوگا ہی۔ ہاں۔ میں اس سے بچ نہیں سکوں گا۔ لیکن میں کل اس دیوتا کے دانتوں سے مرنے پر عذاب میں بچنے کو مرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ہائے میں پیدا ہی کیوں ہوا۔“

اور وہ ہلک ہلک کر رونے لگا۔

تو ہم پرستی کے جہنم میں پھنسنے ہوئے اس وحشی کی حالت دیکھ کر میرا دل پکھل گیا تھا۔ یہ مرد جو یقیناً بہادر تھا اس نفرت انگیز اور خوفناک قوت سے پچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اس بھیاںک صورت میں اسے موت آجائے یہ گناہن جس کے لئے خود اس کے دیوتا کے ہاتھوں مرنا مقدر ہو چکا تھا۔ جس طرح اس سے پہلے والے ڈوبنے کیلئے مقدر ہو چکا تھا اور جس طرح کہ وہ سب اس دیوتا کے ہاتھوں مر گئے تھے۔ اور جس طرح کہ وہ مارے جائیں گے اس کے بعد ڈوبنے میں گئے۔“

”بہر حال“ میں نے کہا۔ ”تمہارا فیصلہ ٹھنڈی پر مبنی ہے اور ہم تمہارے وعدوں پر اعتبار رکھتے ہیں اور اگر تم ہمارے وفادار رہے تو ہم بھی خاموش رہیں گے اور کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن یہ یقین کر لو ڈوبنے اگر تم نے غداری کی کوشش بھی کی تو ہم جو بظاہر بے بس نظر آتے ہیں لیکن دراصل بے بس نہیں ہیں۔ تمہارا راز فاش کر دیں گے اور پھر ہم نہیں بلکہ تم مارے جاؤ گے۔ تو یہ طے رہا۔“

”ہاں۔ ہنس راج! طے رہا۔ لیکن معاملہ الٹ جائے تو پھر مجھے الزام نہ دینا کیونکہ دیوتاؤں کو

”ہے۔ ڈوبنے ہے۔“

”تو پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا ہے تمہاری اجرت؟“

”سنو! اجرت کے طور پر تم وہ سفید قام عورت جسے ملکہ جن کہتے ہو اور اس کی بیٹی کو ہمارے حوالے کر دو گے کہ ہم انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔“

”اور“ لیوٹن بچ میں بولا پڑا۔ ”بذات خود مقدس پھول بھی پورے اور جڑ سمیت۔“

اس نے جب یہ غیر معمولی درخواستیں سنیں تو غریب ڈوبنے کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔

”اے مہذب دنیا کے لوگو! وہ بولی۔ جانتے ہو کہ تم کیا طلب کر رہے ہو؟ تم میرے ملک کے دیوتا کو طلب کر رہے ہو۔“

”پاگل۔“ جھگر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”بے شک ہم تمہارے ملک کے دیوتا کو ہی طلب کر رہے ہیں اور یہ ہی ہماری اجرت ہے نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔“ ڈوبنے جھوپڑی سے نکل بھاگنے کیلئے پر تول رہا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

”سنو..... دوست! معاملہ اس طرح ہو۔ تم ہم سے درخواست کر رہے ہو کہ ہم اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈال کر تمہارے ملک کے اس دیوتا کا خاتمہ کر دیں جو سب سے بڑا دیوتا ہے اور اس طرح تمہاری جان بچائیں اور اپنے اس کام کے صلے میں ہم تمہارے ملک کے بقیہ دیوتا طلب کر رہے ہیں اور یہ کہ تم ہمارے ساتھ ان دیوتاؤں کو بھی صحیح سلامت جمیل کے اس پار پہنچا دو اور اب بتاؤ کہ تم کو یہ سودا منظور ہے؟“

”نہیں۔“ ڈوبنے نے جواب دیا۔ ”اگر میں نے یہ سودا منظور کر لیا تو میری روح پر وہ عذاب نازل ہوگا جس کو بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔“

”اور نا منظور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلا عذاب تمہارے جسم پر نازل ہوگا۔ یعنی یہ کہ چند گھنٹوں بعد ہی وہ زبردست دیوتا تمہیں توڑ کر چاڈالے گا۔ ہاں۔ وہی گوریلے جسے تم دیوتا کہتے ہو۔ ہاں وہ تمہیں توڑ دے گا اور تمہاری کھوپڑی چبا جائے گا اور پھر شاید تمہیں جبینٹ کے طور پر پکا کر کھالیا جائے گا۔ کیوں۔ ڈوبنے! یہی ہوگا تمہارا انجام؟“

ڈوبنے نے کراہ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بہر حال“ میں نے سلسلہ پر کالم جاری رکھا۔

”ہم خوش ہیں کہ تم نے یہ سودا منظور کیا کیونکہ اب ہم ایک خطرناک کام اور خطرے سے محفوظ رہے ہیں۔ چنانچہ صحیح سلامت ہولون لوگوں میں لوٹ جائیں گے۔“

سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے اور پھر وہ ان معاملات پر ہنستے ہیں جو طے کئے جاتے ہیں اور ان لوگوں پر عذاب نازل کرتے ہیں جو ایسے معاملات طے کرتے ہیں۔ لیکن جو ہوتا ہے ہو کر رہے گا۔ چنانچہ میں تمہارا وفادار رہنے کی وہ قسم کھاتا ہوں جو توڑی نہیں جاسکتی۔“

اور پھر اس نے اپنے پچکے میں سے خنجر نکال کر اس کی نوک اپنی زبان کی نوک میں چسودئی خون کا ایک قطرہ فرش پر پڑا۔

”اگر میں اپنی قسم توڑوں۔“ اس نے کہا۔ ”تو میرا گوشت اس طرح سرد ہو جائے جس طرح خون کا قطرہ سرد ہو گیا ہے اور میرا جسم اس طرح سڑ جائے جس طرح کہ یہ قطرہ خون گل سڑ جائے گا اور وہاں میری روح بھوتوں کی دنیا میں اس طرح برباد ہو جس طرح کہ یہ قطرہ خون دھول میں مل کر برباد ہو گیا ہے۔“

”یہ بڑا ہی لرزہ خیز منظر تھا۔ جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ خصوصاً اس لئے اس وقت مجھے الہام سا ہوا کہ اس بد نصیب انسان کی قسمت میں وہی موت لکھی جا چکی ہے جس سے وہ بچنا چاہتا ہے۔“

”ہم لوگ خاموش تھے۔ دوسرے ہی لمحے ڈوینو نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر چادر ڈالی اور مزید کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

”میں کہتا ہوں یا راس غریب کے ساتھ ہمارا سلوک ذرا ویسا ہی رہا ہے۔“ لیموئن نے کہا۔

”وہ عورت..... وہ سفید قام عورت اور اسکی بیٹی۔“ جنگر بڑبڑایا۔

”ٹھیک ہے۔“ لیموئن نے کہا۔ ”دوسفید قام عورتوں کو اس جہنم میں سے نکالنے کیلئے آدی کوئی سی بھی چال چل سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان دونوں عورتوں کا وجود اور سبھی اس پولن کو بھی لے لیا جائے تو کیا برائی ہے۔ کیونکہ تم جانو وہ پھول بیچارہ اپنی ماں کے بغیر تنہائی محسوس کرے گا۔ یہ اچھا ہوا یا ر کہ مجھے بات یاد آگئی۔ یعنی یہ پھول کی تنہائی والی بات کیوں کہ اس پھول نے میرے ضمیر کو خاموش کر دیا ہے۔“

”خدا کرے کہ تمہارا ضمیر اس وقت بھی خاموش رہے جب ہم تینوں کو اس منحوس آنگینے میں پر لایا جائے۔ یہ دیکھ چکا ہوں کہ وہ آنگینے میں اتنی بڑی ہے کہ اس پر بیک وقت تین آدمیوں کو بھونا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا ”اور لب خاموش رکھو“ کیونکہ میں سونا چاہتا ہوں۔“

میں لینے لینے سوچنے لگا کہ انگوٹی لوگوں کا زبردست گوریل شیطان یا دیوتا سے شر ہو سکتا ہے۔ مقدس پھول بار آوری اور عمدہ پیداوار کی علامت ہوگا۔ اس طرح ملکہ جن رحمتوں کی دیوی ہوگی۔

انچہ یہ ہی وجہ ہے کہ اس کا خوبصورت اور سفید قام ہونا ضروری ہو اور غالباً اس لئے کھنے جنگل میں اس بلکہ پہاڑ کی چوٹی پر اس کا مقام ٹھہراتا کہ وہاں سے وہ اپنی رحمتوں کی بارش کر سکے۔ بہر حال ملکہ ن کا کیا مقام تھا۔ یادہ کا ہے کی دیوتا تھی یہ میں کبھی معلوم نہ کر سکا۔ رہے انگوٹی تو ان کا معاملہ صاف۔ وہ ایک مرتبا ہوا قبیلہ تھا۔ کسی عظیم الشان قوم کی یادگار جس کی نسل اندر ہی اندر شادی کرنے کی وجہ ختم ہو رہی تھی۔ ابتداء میں یہ لوگ غالباً کسی مذہبی رسم کی بجائے آوری کیلئے انسان کا گوشت کھا لیا تے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی انہیں عادت پڑ گئی اور وہ آدم خور بن گئے۔

اور یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ افریقہ کے کسی بھی آدم خور قبیلے میں انسان کے گوشت کو دوسرے شت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کا تو مجھے یقین تھا کہ ڈوینو نے ہمیں اس امید پر بلایا تھا کہ ہم اس نائے شر کا خاتمہ کر کے اس کی جان بچالیں۔ اس کے برخلاف گریس اور شانبو نے اس لئے ہمیں مابلایا تھا کہ وہ ہمیں اپنے دیویا پر ہیمنٹ چڑھا کر ہمارا گوشت کھالیں۔ ہمارے پاس بندوقیں نہ تھیں۔ چنانچہ ہم اس لرزہ خیز انجام سے اپنے آپ کو بچا سکتے تھے۔ اِلایہ کہ کوئی فیبی قوت ہماری مدد سے۔ ادھر جنگر کو یقین تھا کہ وہ عورت جو ملکہ جن تھی۔ دراصل اس کی وہی بیوی تھی جس کی تلاش وہ پچھلے بیس برس سے افریقہ کے بیابانوں کی خاک چھان رہا تھا اور دوسری طرف وہ لڑکی جنگر یقین کے مطابق خود اس کی بیٹی تھی۔ جنگر کا یہ یقین غلط تھا یا صحیح بہر حال یہ بات تو صاف تھی کہ دو قام عورتیں اس جہنم میں پھنسی ہوئی تھیں اور انہیں بچانا ہمارا فرض تھا۔ اور پھر خدا جانے میں کب سو گیا۔

دفعتاً میری ایک آنکھ کے بند پونے پر چوٹیاں سی ریگنے لگیں اور میں نے آنکھیں کھولیں۔ سورج کی ایک کرن سیدھی میری آنکھ پر پڑ رہی تھی۔

”یہ دھوپ کہاں سے آ رہی ہے۔ میں نے سوچا۔ کیونکہ ان جھونپڑیوں کی کھڑکیاں نہ تھیں۔ میری نظر نے اس ایک کرن کا تعاقب کیا اور وہ سوراخ تلاش کر لیا جس سے یہ اندر ریگ آئی۔ فرش سے کوئی پانچ فٹ اوپر جھونپڑی کی دیوار میں ایک سوراخ تھا۔ میں نے اٹھ کر اس سوراخ سے اُتار کیا تو پتہ چلا کہ یہ سوراخ تازہ تھا۔ کیونکہ سوراخ کے چاروں طرف کی مٹی بے رنگ نہ تھی۔ نے سوچا کہ اگر واقعی کوئی کن سونیاں لینا چاہتا ہو تو اس کیلئے یہ سوراخ واقعی مناسب ہے۔

چنانچہ میں اپنی تحقیق کے آگے بڑھانے کیلئے جھونپڑے سے باہر آ گیا۔ جھونپڑی کی یہ دیوار نرتی باڑے سے کوئی چار فٹ دور تھی۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی باڑ توڑ کر اندر نہ آیا تھا۔ تاہم اس سوراخ موجود تھا اور سوراخ کے مین نیچے زمین پر پلستر کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں

”چرواہا کہاں ہے؟“ وہ گرجا۔

لوگ چرواہے کی تلاش میں دوڑ گئے اور چند منٹوں بعد ہی وہ اسے کھینٹے ہوئے ڈوینو کے سامنے لے آئے۔ چرواہا ایک کم عمر لڑکا تھا اور جھاڑیوں کے پیچھے سو رہا تھا۔ ڈوینو نے پہلے مویشیوں کی طرف پھر ٹوٹی ہوئی باڑ کی طرف اور آخر میں تقریباً اجڑے ہوئے باغ کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکا گڑگڑانے اور معافی طلب کرنے لگا۔

”قتل کر دوا سے“ ڈوینو گرجا۔

اس پر چرواہا زمین پر لیٹ گیا۔ اس نے ڈوینو کے ٹخنے پکڑ لئے۔ وہ اس کے قدم چومنے اور رو رو کر کہنے لگا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا۔ وہ موت سے ڈرتا ہے۔ ڈوینو نے اپنے ٹخنے چمڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنے چوڑے پھل والا بھالا اٹھایا اور ایک ہی وار میں چرواہے کی گریہ داری کا بھی خاتمہ کر دیا۔

سپاہیوں نے خوشی کے طور پر یا سلام کیلئے تالیاں بجا لیں۔ اسکے بعد ڈوینو نے اشارہ کیا اور چار سپاہی چرواہے کی لاش اٹھا کر باڑی کی طرف چل دیے۔ اس رات بھینٹا چرواہے کی لاش کو سائبان میں اس بڑی انکھٹیں پر بھونٹا گیا ہوگا۔ جس کی ایک جھلک ہم دیکھ چکے تھے۔



جنگر نے ڈوینو کی یہ سفاکی دیکھی تو اس کی داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے اور لیموشن نے دانت چس کر کہا۔ ”بے درد“ اور اپنا گھونہ بلند کیا۔ جیسا کہ ڈوینو کو ابھی فرش پر چت کر دے گا اور اگر میں عین وقت پر لیموشن کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو یقیناً وہ ڈوینو پر گھونہ رسید کر دیتا۔

”ڈوینو۔“ جنگر نے کہا۔ ”غالباً تم نہیں جانتے کہ خون کا بدلہ خون ہے۔ جب تمہارا وقت آئے تو اس چرواہے کو یاد کر لیتا۔ جسے تم نے یوں بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔“

”تم سحر کر رہے مجھ پر۔ سفید قام؟“ ڈوینو گرجا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو پھر.....“

اور اس نے ایک بار پھر اپنا بھالا بلند کیا اور جنگر بڑی بے خونی سے جہاں کھڑا تھا وہاں کھڑا رہا۔ گریس جلدی سے آگے بڑھ کر جنگر اور ڈوینو کے درمیان آ گیا۔

”روتانو! پیچھے ہٹ جاؤ۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ہمارے معاملات میں دخل نہ دو۔ ڈوینو زندگی اور موت کا آقا ہے۔“

جنگر جواب دینے جا رہا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔

نے آگرس کو طلب کر کے پوچھا کہ جب وہ چادر میں لپٹا ہوا آدمی گزشتہ رات ہمارے پاس آیا تھا تو کیا وہ یعنی آگرس جمونپڑی کے چاروں طرف پہرہ دیتا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ بے شک اور یہ کہ وہ قسم کھانے کو تیار تھا کہ اس وقت کوئی جمونپڑی کے پاس نہیں آیا تھا۔ کیونکہ آگرس کئی دفعہ جمونپڑی کے پچھواڑے جا کر اپنا اطمینان کر آیا تھا۔

آگرس کے اس جواب سے تسلی تو ہوئی۔ لیکن پورا اطمینان نہ ہوا۔ بہر حال میں نے جمونپڑی میں جا کر اپنے ساتھیوں کو بیدار کیا لیکن اس معاملہ کے متعلق ان سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ بلاوجہ انہیں خوفزدہ کرنا ناگھبرا دینا حماقت تھی۔ چند منٹ بعد ہی طویل القامت اور خاموش عورتیں ہمارے لئے گرم پانی لے کر آگئیں۔ گرم پانی ایک بڑی نعمت تھی۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ انگوئی لوگ بھی شلووؤں کی طرح صاف سترے رہتے تھے۔ البتہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب کے سب پانی استعمال کرتے تھے یا نہیں۔ بہر حال انہوں نے ہمارے لئے پانی مہیا کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد یہ ہی عورتیں ہمارا ناشتہ لے کر آگئیں۔ ناشتے میں بھونٹا ہوا بھیڑ کا بچہ تو اور چونکہ علم تھا اس لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے کم سیر ہو کر یہ گوشت کھایا۔

اس کے کچھ دیر بعد گریس آ گیا۔ سلام کے بعد مزاج پرسی کی اور پھر اس نے پوچھا کہ کیا ہاں شانبو سے ملنے جانے کیلئے تیار ہیں؟ اس نے کہا کہ شانبو بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ اسے کیونکہ معلوم ہوا جبکہ یہ بات ہم نے گزشتہ رات ہی ملے کی تھی اور یہ کہ وہ یوز شانبو کا گھر ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ لیکن گریس صرف مسکرایا۔ اور ایک ہاتھ ہلا دیا۔

چنانچہ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنا تمام سامان لے کر روانہ ہو گئے۔ چونکہ تحائف ڈوینو کی خدمت میں پیش کئے جا چکے تھے۔ اس لئے اب ہمارا سامان زیادہ وزنی نہ رہا تھا۔

چوڑی اور ہموار سڑک پر پانچ منٹ تک چلتے رہنے کے بعد ہم باڑی کے دروازے پر پہنچے وہاں ڈوینو تین آدمیوں کے ساتھ ہمارا منتظر تھا۔ یہ لوگ صرف بھالوں سے مسلح تھے اور ہولوار سپاہیوں کا خاص ہتھیار تیر اور کمان اس کے پاس نہ تھا۔ ڈوینو نے بلند آواز میں کہا۔ وہ مقدس ہستی آ درگاہ تک ہمیں لے جائے گا اور اس طرح ہمیں عزت بخشے گا۔

جھاڑیوں اور درختوں کے ایک جھنڈ کو عبور کرنے کے بعد ہم ایک ہاڑ کے قریب سے گز رہے تھے۔ ہاڑ چند باغات کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی اور چند مویشی ہاڑ توڑ کر اندر کھس گئے تھے اور ہودوں اور کئی کی کھڑی فصل کو اجاڑ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ باغات ڈوینو کے تھے۔ چنانچہ جب اس نے مویشیوں کو فصل سے ناشتہ اڑاتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

برخلاف وہ چٹان جس میں یہ دیوار شی نرم پتھر کی تھی۔ چنانچہ موسموں کے ردوبدل اور جمیل کے آنے گھس گھس کر اسے یہاں وہاں سے توڑ دیا تھا۔ اس دیوار میں غار کا دہانہ تھا اور یہ غار قدرتی۔ یہ غار صدیوں پہلے رہا ہوگا اور جمیل جب تک پوری بھر جاتی ہوگی تو اس کا زائد پانی اسی غار یا لے سے اس طرف نکل آتا ہوگا اور اس وقت انگوٹی علاقہ زیر آب آباد ہوگا۔

ہم رک گئے اور اس اندمیرے غار کی طرف دیکھنے لگے۔ یقیناً یہ وہی غار تھا جہاں لوگاٹ اپنی نی میں آیا تھا۔ ڈوینو نے کوئی حکم دیا اور چند سپاہی ان جھونپڑیوں کی طرف چلے جو غار کے دہانے، قریب تھیں۔ میرے خیال میں ان جھونپڑوں میں شانبو کے خدمت گار نگہبان رہتے تھے۔ حالانکہ لوگوں کو ہم نے کبھی نہ دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ سپاہی واپس آئے تو سسکتی ہوئی مشطیں لئے ہوئے۔ یہ مشطیں ہم لوگوں میں تقسیم کر دی گئیں اور ہم کانپتے ہوئے اس اندمیرے غار میں اور اس رخ داخل ہوئے کہ ڈوینو آ رہے سپاہیوں کے ساتھ ہمارے آگے اور گرلیں آدھے سپاہیوں کے تھ ہمارے پیچھے تھا۔

غار کا فرش اور چھت دیواریں بھی بچنی اور پتھدار تھیں۔ غالباً یہ پانی کا عمل تھا۔ غار سیدھا بھی تھا بلکہ اس میں موڑ تھے۔ پہلے موڑ پر پہنچتے ہی انگوٹی لوگ کوئی گیت گانے لگے اور ان کا یہ گیت غار اپوری طوالت تک جاری رہا اور یہ غار میرے اندازے کے مطابق تین سو گز سے زیادہ لمبا تھا۔ دیواروں کے قریب بڑے الاؤ روشن تھے جو اس جگہ کو روشن کر رہے تھے۔ ان الاؤں سے کوئی سا قدم دور غار کا دوسرا دہانہ تھا اور وہاں سے مزید روشنی غار میں آ رہی تھی۔ غار کے دہانے کے بعد ان کی چادر بھی ہوئی تھی جو دو سو گز چوڑی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کے دوسرے کنارے سے پہاڑ اڈھلانیں شروع ہو گئی تھیں۔ جو عظیم الشان درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک خلیج میں در آئی تھی اور ٹھیک اس جگہ آ کر ختم ہو گئی تھی۔ جہاں وہ دو الاؤ روشن تھے۔ یہ خلیج جو چھ فٹ لمبی اور زیادہ گہری نہ تھی۔ ایک خاصے بڑے ڈونگے کی گودی کا کام دے رہی تھی۔ وہ ڈونگا وہاں جو د تھا۔

آخری موڑ سے لے کر خلیج کی ٹوک تک کی دونوں دیواروں میں دروازے بنے ہوئے تھے۔ وہ دروازے غار کے دائیں اور دو بائیں دیوار میں ہر دروازے کے سامنے ایک طویل القامت عورت تھیں جو جلتی ہوئی مشعل لئے کھڑی تھیں۔ ان عورتوں نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ سفید تھا۔ میرے اہل میں یہ نگہبان عورتیں تھیں۔ جو ہمیں راستہ دکھانے اور ہمارے استقبال کیلئے وہاں کھڑی تھیں۔ ہونکہ جب ہم آگے بڑھ گئے وہ اپنے اپنے حجرے میں گھس گئیں۔

”خدا کیلئے چپ رہو۔ جنگل ورنہ تمہارا حشر بھی چرواہے کا سا ہوگا۔ ہم سب اس شیطان کے اختیار میں ہیں۔“

خدا کا شکر تھا کہ جنگل سمجھ کر پہنچے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم یوں آگے روانہ ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ البتہ اس واقعہ کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ ہمیں یہ فکر نہ رہی کہ ڈوینو کے ساتھ کیا واقعہ ہوتا ہے۔ چاہے زندہ رہے۔ چاہے مر جائے۔ ڈوینو گزشتہ رات ہمارے قدموں میں لوٹ رہا تھا اور ہمیں اس پر رحم آ گیا تھا اور اب وہ رحم ہمارے دلوں میں نہ تھا۔ تاہم اس کی سفاکانہ حرکت کا یہ جواز پیش کیا جاسکتا تھا کہ موت کے خوف سے وہ دیوانہ ہو رہا تھا اور نہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کم سے کم وہ جنگل پر تو کبھی بھالانا اٹھاتا۔

دن بھر یہ ایک ہموار اور زرخیز علاقوں میں سفر کرتے رہے۔ چند علامتوں سے پتہ چلتا تھا کہ یہ پورا علاقہ کبھی لہلہاتے کھیتوں سے بھرا رہا ہوگا۔ اب کھیت بہت کم تھے اور وہ بھی ایک دوسرے سے کافی دور۔ چنانچہ ہر طرف ہالن کی قسم کے جنگل تھے۔

دوپہر کے وقت ہم نے تالاب کے کنارے قیام کیا اور کچھ دیر سنانے کے بعد ہم پھر روانہ ہو گئے۔ ہم اس عجیب اور سیاہ چٹانی دیوار کی طرف بڑھ رہے تھے جو عموماً معلوم ہوتی تھی۔ جہاں پہاڑ عجیب شان سے بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ کوئی تین بجے ہم اس چٹانی دیوار کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جو شرفا غرابا حد نظر تک چلی گئی تھی۔ اس دیوار میں ایک بڑا سا سوراخ تھا اور اسی سوراخ تک پہنچ کر یہ راستہ ختم ہو جاتا تھا۔

یہ سوراخ ایک غار کا دہانہ تھا۔ ڈوینو ہمارے پاس آیا اور بڑے خجل انداز میں ہم سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ میرے خیال میں اس پہاڑ کو دیکھتے ہی جس کے قریب ہم پہنچ رہے تھے اس کا خوف عود کر آیا تھا۔ چنانچہ اب ڈوینو ہمارے دلوں سے برا اثر مٹانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ ہمیں اپنا نجات دہندہ یقین کر چکا تھا۔ ہمیں اس نے مطلع کیا کہ چٹانی دیوار میں وہ سوراخ دراصل عظیم شانبو کے گھر کا دروازہ تھا۔ میں نے سر ہلا دیا اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اس خونی بادشاہ کے قرب سے مجھے گھن آنے لگی تھی۔ چنانچہ وہ ہمارے قریب سے ٹل گیا۔ لیکن وہ بڑی لجاجت اور ساتھ ہی ساتھ شک سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہم اس حیرت انگیز چٹانی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ جو سخت پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ اور غالباً صدیوں سے طوفان کا مقابلہ کرتی آئی تھی۔ اس

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی اس خلیج پر ڈوٹے کے عین اوپر ایک چوٹی پلیٹ فارم تھا۔ تقریباً آٹھ مربع فٹ رہا ہوگا۔ پلیٹ فارم کے دونوں طرف حیرت انگیز طور پر دو بڑے ہاتھی دانت کھڑے کئے تھے اتنے بڑے ہاتھی دانت میں نے پوری زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ یہ ہاتھی دانت ان پرانے تھے کہ کالے پڑ گئے تھے۔ پلیٹ فارم کے پر اور ہاتھی دانت کے درمیان کسی قسم کے ہمو قائلین پر کوئی چیز بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں یہ چیز جس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ مجھے ایک غیر معمولی طور پر بڑا مینڈک معلوم ہوئی ویسی ہی کھر درئی ٹھکن دار جلد ابھری ہوئی ریڑھ کی ہڈی اور پتلی پھیلا ہوئی ٹانگیں۔

میں یہ پوچھنے کیلئے ڈوینو کی طرف گھوم گیا کہ وہ کیا بلا تھی۔ لیکن ابھی میں نے اپنے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اس چیز نے حرکت کی اور وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف گھونٹنے لگی۔ ہم منتظر کھڑے رہے۔ آخر کار اس کا سر ہمارے سامنے آ گیا۔ فوراً ہی انگوٹھی لوگوں نے اپنا کام ختم کر دیا اور وہ سب کے سب ڈوینو سمیت سجدے میں گر گئے۔ حتیٰ کہ وہ بھی جنہوں نے مشطیں اٹھا رکھی تھیں۔

میرے خدا کیا چیز تھی یہ مینڈک نہ تھا۔ بلکہ انسان تھا۔ جو چاروں ہاتھوں پیروں پر حرکت کر رہا تھا۔ اس کا غیر معمولی طور پر بڑا اور گنجا سر شانوں میں دھنسا ہوا تھا۔ خدا جانے یہ عیب پیدا کیسی تھا طویل عمر کی وجہ سے کیونکہ یہ شخص بہت بوڑھا تھا۔ میں نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر سوچا کہ اس کی عمر کتنی ہوگی؟ لیکن میں اس کا اندازہ نہ لگا سکا۔ اس کی زبردست داڑھی والے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں اور وہ دھوپ میں سکھائی ہوئی کھال کی طرح خشک تھا۔ پچلا ہونٹ اس کے آگے کو بڑے ہوئے استخوانی جڑے پر لٹک رہا تھا۔ دو نوکدار دانت، سور کے سے پیلے دانت، ہونٹوں کے دونوں کونوں سے ابھر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے بقیہ دانت غائب تھے اور اس کی سرخ زبان اس کے سفید موڈوں کو بار بار چاٹ رہی تھی۔ لیکن اس انسان نما درندے میں جو چیز سب سے زیادہ حیرت انگیز بلکہ عجیب تھی وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں کے ارد گرد کا گوشت سکڑ گیا تھا۔ چنانچہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بڑے اور گول دیدے کو پڑی کے خالی حلقوں میں بٹھا دیئے گئے ہوں۔ یہ آنکھیں صحیح معنوں میں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں اور بعض دفعہ تو وہ اندھیرے میں شیر کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگتیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس عجیب مخلوق کو دیکھ کر میں لمحہ بھر کیلئے خوفزدہ ہو گیا تھا اور میرے اعضا، مفلوج ہو گئے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ میری آنکھیں جسے دیکھ رہی ہیں وہ ایک انسان تھا۔

میں نے آنکھوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ وہ بھی سبہ ہوئے تھے۔ لیونٹ کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ جنگر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر خدا سے اپنی حفاظت کی دعا کر رہا تھا

برآگرس نے سر ہلا کر کہا۔

”باس! دیکھو! سامنے بوڑھا شیطان بذات خود موجود ہے۔“

جونہی انگوٹھی۔ لوگوں کے ساتھ سجدہ ریز تھا اور بوڑھا رہا تھا کہ وہ اپنے سامنے موت دیکھ رہا تھا۔ صرف فوٹابے خوف اور سیدھا کھڑا تھا۔ غالباً اس لئے کہ وہ خود بھی ایک وحش ڈاکٹر تھا۔

پلیٹ فارم پر بیٹھی ہوئی مینڈک جیسی مخلوق کچھوے کی طرح آہستہ آہستہ اپنا سر گھمانے اور ہمارا اندازہ لینے لگی۔ آخر کار اس نے اپنی زبان کھولی اس کی آواز موٹی اور لہجہ لڑکھڑاتا ہوا تھا۔ وہ جو زبان لہ رہا تھا افریقہ کے اس علاقہ میں عام تھی جو ہولون لوگوں کی زبان تھی۔

”تو تم ہو دوسری دنیا سے آئے ہوئے لوگ۔ ڈوینو کا انحصار میرے اس بھائی کی مرضی پر ہے۔ جو دیوتا ہے اور وہاں رہتا ہے۔“ اور اس نے ایک خوفناک ہنسی کے ساتھ اپنے سر پر پہاڑ کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے حکومت کی ہے۔ چند نے بیس برس تک اور چند نے چار برس تک لیکن چار برس سے کم کسی نے حکومت نہیں کی۔“

”تم اول درجے کے جموئے ہو۔“ میں نے دل میں کہا کیونکہ اگر ہر ڈوینو کے دور حکومت کا تخمینہ دس برس لگایا جائے تب بھی ہماری ملاقات دو صدیوں پہلے ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ سوچنا بھی پاگل بن تھا۔

”اس وقت تمہارا لباس مختلف تھا۔“ ثانیو نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”تم دونوں نے اپنے سر پہلو ہے کی ٹوپیاں لگا رکھی تھیں اور سفید داڑھی والے کا سر منڈا ہوا تھا۔ میں نے اپنے خاص لوہار سے اپنے کی تختی پر تمہاری تصویر بنوائی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جو اس نے ہمارے سامنے پھینک دی۔“

ہم نے اس چیز کی طرف دیکھا یہ تانبے یا کالن کی تختی تھی جو بہت پرانی تھی۔ کیونکہ سیاہ ہو گئی تھی۔ اس پر ایک شخص کی تصویر کندہ تھی۔ اس شخص کی داڑھی تھی۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں صلیب تھی اور تختی پر دو دوسرے آدمیوں کی تصویر تھی۔ یہ دونوں پست قامت تھے۔ سر پر انہی ٹوپیاں تھیں۔ لباس عجیب تھا اور ان کے جوتوں کی نوکیں چوکور تھیں اور انہیں سے ایک کے ہاتھ میں نیوز یا فیتہ تھا۔ بس یہی ہم معلوم کر سکے۔

ثانیو! تم وہ دور کا ملک چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لئے کہ ہمیں خوف تھا کہ دوسرے سفید قام تمہارا انتظام لینے آ جائیں گے۔ حالانکہ میں نے اس کے خلاف مشورہ دیا تھا کہ اس کے باوجود اس دور کے ڈوینو نے یہی حکم دیا تھا لیکن جو کچھ

کیونکہ اس کا جادو میرے جادو سے کم درجہ ہے۔ لیکن وہ چھوٹا زرد چہرے والا جو اپنے ہاتھ میں لمبا ڈنڈا اور پیٹھ پر گھٹھر لئے کھڑا ہے۔ ہاں۔ میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ اس کا خاتمہ فوراً ہی کر دیا جائے۔“

وہ خاموش ہو گیا اور ہم کانپ گئے کیونکہ اس نے اگر غریب آرمس کو قتل کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تو پھر کون اسے روک سکتا تھا؟ لیکن آرمس جس نے زبردست خطرہ دیکھ لیا تھا اپنی عیاری کو بروئے کار لے آیا۔

”شانبو۔“ وہ بولا۔ ”تم کو مجھے قتل نہ کرنا چاہئے کیونکہ میں ایک سفیر کا خادم ہوں یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ تمام علاقہ کے دیوتا ہر شخص سے نفرت کرتے اور پھر ان سے انتقام بھی لیتے ہیں جو سفیروں یا ان کے خادموں کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اگر کوئی گزند پہنچا سکتا ہے تو وہ صرف دیوتا ہیں۔ اگر تم نے مجھے قتل کیا تو اے شانبو! میں بموت بن کر تمہیں پریشان کر دوں گا۔ ہاں..... میں تمہارے کندھے پر سوار ہوں گا اور راتوں کو تمہارے کالوں میں بکواس کرتا رہوں گا۔ چنانچہ تم سونہ سکو گے یہاں تک کہ مرجاؤ گے۔ حالانکہ تم بہت بوڑھے ہو۔ لیکن شانبو ایک دن تمہیں مرنا تو ہے ہی۔“

”ہاں..... سچ ہے۔“ شانبو بولا۔ ”کیوں کہا تھا میں نے کہ یہ شخص کمزور ہے؟ سارے دیوتا اس شخص سے انتقام لیں گے جو سفیروں یا ان کے خادموں کے قتل کریں گے۔ بے شک۔ شانبو بھیا تک ہنسی ہنسا۔ ”یہ دیوتاؤں کا حق ہے۔ چنانچہ اس کا فیصلہ انگوئی کے دیوتاؤں کو ہی کرنے دو۔“

میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ شانبو نے سلسلہ کلام جاری رکھا، لیکن اب اس کی آواز بدلی ہوئی اور لہجہ غیر جذباتی اور سراسر کاروباری تھا۔

”کہو ڈینو!“ تم ان سفید قاموں کو میرے پاس کس معاملہ میں گفتگو کرنے لائے ہو؟“ کیا وہ میرا خواب تھا کہ ہولون لوگوں اور ان کے بادشاہ سے صلح کرنے کا معاملہ ہے۔؟“ اٹھو اور کہو۔“

چنانچہ ڈینو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے بڑے ادب سے مناسب و موزوں الفاظ میں ہماری آمد کا مقصد بیان کیا، پھر کہا کہ ہم جوسی کے سفیر ہیں اور پھر شرائط بیان کرنے کے بعد اب صرف شانبو کی منظوری مقصود تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہولون لوگوں سے صلح کرنے کے معاملہ میں شانبو کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ جب تک ڈینو بولتا رہا۔ شانبو اونگھتا رہا۔ شاید اس لئے کہ ہمارے سامنے تقریر کرنے کے بعد وہ تھک گیا تھا یا پھر اس کے یوں اونگھ جانے کی کوئی اور وجہ یا وجوہات تھیں۔ جب ڈینو خاموش ہو گیا تو شانبو نے اپنی آنکھیں کھولیں اور گریس کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

ہوتا ہے اس سے ہم بچ نہ سکیں گے اور یہ جانتا تھا۔ بہر حال ہم چلتے رہے اور چلتے رہے۔ یہاں کہ اس علاقہ میں پہنچ گئے اور تب سے ہم یہیں مقیم ہیں۔ دیوتا بھی یہاں آ گئے۔

تمہارے پاس وہ آہنی تلکیاں نہیں ہیں جن سے ہم ڈرتے ہیں کیونکہ دیوتا نے ہم سے ہے۔ ہاں میری زبان سے کہا ہے اور مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ جب سفید قام آہنی تلکی کے ساتھ آگے کے تو دیوتا مارا جائے گا۔ میں بھی مر جاؤں گا مقدس پھول نوج لیا جائے گا اور ملکہ جن چلی جائے اور انگوئی لوگ کھمر جائیں گے اور وہ بھگتے رہیں گے اور غلام بن جائیں گے اور اس نے یہ بھی کہا اگر سفید قام آہنی تلکیوں کے بغیر آئیں گے تو چند راز افشاں کئے جائیں گے۔ نہیں۔ ان رازوں۔ متعلق پوچھو کیونکہ وقت آنے پر وہ ظاہر کر دیئے جائیں گے اور پھر انگوئی لوگ ایک بار پھر پھیلیں۔ اور بڑھیں گے اور ایک بار پھر ان کا قبیلہ زبردست ہوگا۔

چنانچہ اس لئے اسے سفید قامو! ہم تم کو خوش آمدید کہتے ہیں ہاں تمہیں کہ تم بموتوں کی دنیا۔ آئے ہو اور اس لئے کہ تمہارے ذریعہ یہ انگوئی لوگ پھیلیں گے اور عظیم بنیں گے۔

دفعتاً وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا سر اس کے شانوں پر ڈوب گیا اور بہت دیر تک خاموش رہا۔ لیکن اس کی سرخ جلتی ہوئی آنکھیں ہم لوگوں پر جمی رہیں۔ جیسے وہ ہمارے خیالات کا جائزہ لے رہی ہو یا ہمارے خیالات پڑھ رہی ہوں۔ اب اگر وہ اس میں کامیاب ہوا تھا تو امید ہے کہ میرے خیالات پڑھ کر اسے مسرت ہوئی ہوگی۔ سچ یہ ہے کہ میں اس وقت خوف و کراہت کے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے جو کچھ بکواس کی تھی اس کے کسی ایک لفظ پر بھی مجھے یقین تھا۔ تاہم مجھے اس سے سخت نفرت ہو گئی تھی جو صرف نیم انسان تھا۔ میرا پورا وجود اس کے وجود اور آواز کی باتوں سے کراہت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی یقینی بات تھی کہ شانبو کے ارادے برے تھے۔ بہت ہی برے۔ دفعتاً وہ پھر بولے۔

”وہ چھوٹا پیلا آدمی کون ہے؟ وہ بوڑھا جس کا چہرہ کھوپڑی کی طرح ہے۔“ اس نے آرمس کی طرف اشارہ کیا جو شانبو کی نظر سے اوجھل رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہی سوکھا ہوا اور گومڑی ناک والا شخص جو میرے بھائی کا بھائی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس دیوتا کا کوئی بات ہو! وہ اتنا چھوٹا ہے۔ پچھلے اتنے بڑے ڈنڈے کی کیا ضرورت ہے۔ شانبو نے پھر ایک بار آرمس کے لمبے ہالں کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے خیال میں یہ کمزور ہے اس طرح بھرا ہوا ہے جس طرح کے نئی تو بنی پانی سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور یہ دیو قامت افریقی اس نے فونا کی طرف دیکھا۔ تو میں اس سے نہیں ڈرتا۔“

”بس یا اور کچھ؟“

”اے دیوتا کی زبان کچھ اور بھی۔ گزشتہ رات اس مجلہ مشاورت کے بعد جس کا ذکر کیا جا چکا ہے ڈوینو نے اپنے آپ کو چادر میں لپیٹا اور سفید قاموں سے ان کی جموپیڑی میں ملاقات کی میں جانتا تھا کہ ایسا ہی کرے گا۔ چنانچہ میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ میں نے باڑ کے باہر ہی سے بھالے کی نوک سے جموپیڑی کی دیوار میں سوراخ کیا پھر ایک پولانزل لے کر باڑ میں سے گزار کر جموپیڑی کی دیوار میں بنائے ہوئے سوراخ میں داخل کر دیا اور نزل کے دوسرے سرے پر کان رکھ کر میں نے سارنی باتیں سن لیں۔“

”شاباش..... شاباش.....“ آرمس بے اختیار بڑبڑایا۔ اور میں اس نزل کے نیچے سے گزرتا رہا اور مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ آرمس! تو نے دنیا دیکھی ہے۔ اس کے باوجود تجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔“

”دوسری باتوں کے علاوہ میں نے یہ بھی سنا“ گریس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”اور میرے خیال میں یہ ہی ایک بات بتا دینا کافی ہوگا۔ البتہ اگر شانبو نے حکم دیا تو میں دوسری باتیں بھی بیان کروں گا۔ میں نے سنا۔“

گریس کی آواز غار کی کھل ترین خاموشی میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ ”ہاں۔ میں نے سنا کہ ڈوینو! جو غلطی دیوتا کہلاتا ہے سفید قاموں کے ساتھ یہ سودا کر رہا ہے کہ وہ دیوتا کو قتل کر دیں گے۔“

”کس طرح.....؟“ یہ میں نہیں جانتا کیونکہ اس کے متعلق ان کے درمیان کچھ نہیں کہا گیا اور یہ کہ اس کے عوض ”ملکہ جن“ اس کی بیٹی اور مقدس پھول اور اس کا پودا جزسیت ان کے حوالے کر دیا جائے گا اور سفید قام ان تینوں کو اپنے ساتھ جمیل کے اس پار لے جائیں گے بس میں کہہ چکا شانبو۔“ غار میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور شانبو شعلہ باز نظروں سے سجدے میں پڑے ہوئے ڈوینو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسے گھورتا رہا اور پھر یہ خاموشی ٹوٹ گئی۔ کیونکہ خوفزدہ ڈوینو ایک دم کھڑا ہوا اس نے بھالا کھینٹ لیا اور اسکی نوک اپنے سینے کی طرف کردی۔ لیکن اس سے پہلے کہ بھالے کی نوک اس کے سینے کو چھوتی بھالا اس کے ہاتھ سے چھین لیا گیا۔ چنانچہ اب ڈوینو نہتا کھڑا تھا۔

ایک بار پھر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ لیکن ایک بار پھر یہ خاموشی ٹوٹ گئی چونکہ ایک دفعہ خود شانبو ”اپنی منہ“ پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایک زبردست پھولی ہوئی گھناؤنی چیخ، وہ غصے کے عالم میں زخمی پھینسے کی طرح ڈکرایا۔ مجھے یقین نہ آیا تھا۔ کسی بھی بوڑھے کے پیمبروں سے ایسی آواز نکل

”اے ہونے والے ڈوینو! اٹھو.....“

چنانچہ اب گریس اٹھا اور اس معاملہ میں نے اس کو اپنی کارگزاری بیان کی اور بتایا کہ اس نے کس طرح جوسی سے ملاقات کی اور یہ کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ ایک بار شانبو پھر اٹھ گیا۔ لیکن اس وقت گھڑی کیلئے اس نے اپنی آنکھیں ضرور کھول دیں۔ جب گریس نے یہ بتایا کہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے کس طرح ہمارے سامان کی تلاشی لے کر یہ اطمینان کر لیا کہ ہمارے پاس آنکھیں اسلحہ نہ تھے۔ اس پر شانبو نے اپنا سر ہلایا اور پتلی زبان سے اپنے ہونٹ چبائے۔ گریس نے اپنا بیان ختم کیا۔

”دیوتاؤں نے مجھے کہا ہے کہ تدبیر عقلمندانہ اور عمدہ ہے۔ کیونکہ نئے خون کے بغیر گریس لوگ مر جائیں گے۔ لیکن اس معاملے کا انجام صرف دیوتا جانتا ہے۔ بشیر طیکہ وہ مستقبل میں جھانک سکتا ہو۔“

شانبو خاموش ہو گیا۔ لیکن پھر اس نے حکمانہ لہجہ میں پوچھا۔

”اب ہونے والے ڈوینو! تم کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو۔ دفعتاً دیوتا نے یہ الفاظ میری زبان پر رکھ دیئے ہیں۔“

”ہاں..... کچھ کہنا ہے۔ کئی چاندوں پہلے دیوتا نے ہمارے عظیم آقا۔ ڈوینو کی ایک انگلی کاٹ لی تھی۔ اسی زمانے میں ڈوینو کو پتہ چلا کہ ایک سفید قام جو چاقو سے اعضاء کاٹنے میں ماہر ہے اس وقت ہولون لینڈ کی سرحد پر مقیم ہے۔ وہی سفید قام جس کی لمبی داڑھی ہے جس کا نام روتا نو ہے اور جو اس وقت سامنے کھڑا ہوا ہے۔“

چنانچہ ڈوینو ایک ڈونگے میں سوار ہو کر اس جگہ پہنچا جہاں روتا نو مقیم تھا۔ کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سفید قام کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا ڈونگا اور ان لوگوں کو بھی جو میرے ساتھ تھے ساحل سے کافی دور نرسلوں میں چھپا دیا۔ میں خود اٹھنے پانی میں چل کر کنارے پر پہنچا۔ اور سفید قام کے کپڑے کے گھر کے بہت قریب جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ میں نے دیکھا سفید قام نے ڈوینو کی انگلی کاٹ لی اور میں نے ڈوینو کو سفید قام سے یہ درخواست کرتے بھی سنا کہ وہ آہنی ٹنگیوں کے ساتھ ہمارے علاقے میں آئے اور اس دیوتا کا خاتمہ کر دے جس نے ڈوینو کی انگلی کاٹ لی تھی۔“

یہ الفاظ نہ تھے۔ ایک بجلی تھی جو سب پر کڑک کر گری سب دم بخود رہ گئے تھے اور خود ڈوینو ایک بار پھر سجدے میں گر گیا۔ اور بے حرکت پڑا رہا۔ صرف شانبو نے حیرت کا اظہار نہ کیا۔ غالباً اس لئے کہ وہ اس داستان سے واقف تھا۔



سکتی ہے۔ پورے ایک منٹ تک اس کی غراہٹ غار میں گونجتی رہی۔ ادھر انگوٹی لوگوں نے سجدے سے اپنے سر اٹھائے اور اپنی انگلیاں ڈوینو کی طرف بڑھا دیں۔ ان سب کے غصے کا ہدف غریب ڈوینو بنا ہوا تھا۔ حیرت ہے کسی کو ہم پر غصہ نہ تھا۔

شانبو نے اپنے پھولے ہوئے جسم کو مینڈک جیسی پتلی ٹانگوں پر سنبھالے ہوئے تھا اور اس کی سرخ آنکھیں اس کے پیچھے جمیل کی پرسکون سطح پر پھیلی ہوئی شام کی روشنی اور اس کے غضب میں جنگل کے درختوں پر سورج کی سرخ کرنیں۔ بکھری ہوئی اور سفید چٹخوں میں ملبوس انگوٹی جو جھکے ہوئے تھے۔ لیکن ڈوینو کی طرف دیکھ کر سانپوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ خدا جانے کتنی دیر یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ شانبو نے ایک بار پھر وہ سینک اٹھا کر پھونکا۔ فوراً ہی مختلف جمروں میں سے عورتیں نکل آئیں۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ بلا وہ ان کیلئے نہ تھا تو وہ جہاں تھیں اسی حالت میں بت بن گئیں۔ سینک کی آواز اور ساتھ ہی دوسری آوازیں بھی خاموش ہو گئیں۔ غار میں قبر کی سی خاموشی تھی۔ البتہ الاؤ میں جلتی ہوئی لکڑیوں کے پچھنے کی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔

”نہس راج! قصہ ختم ہوا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”چنانچہ صاحبزادے! آخری سفر کی تیاری کرلو۔ لیکن ہم یوں آسانی سے نہ مریں گے۔ پیٹھ سے پیٹھ بڑھا لو۔ بھالے تو ہیں ہی۔ چنانچہ ہم لڑیں گے۔“

اور پھر جب ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے تو ایک بار پھر شانبو نے بولنا شروع کیا۔

”تو وہ جو ڈوینو تھا۔“ شانبو چیخا۔ ”تو تم نے ان سفید قاموں سے مل کر دیوتا کا خاتمہ کرنے اور اس کے عوض انہیں مقدس پھول ملکہ چن اور اس کی بیٹی دینے کی سازش کی تھی؟“ بہت اچھا۔ تم جاؤ گے تم سب جاؤ گے اور دیوتا سے گفتگو کرو گے اور میں یہاں بیٹھ کر دیکھوں گا کہ کون مرتا ہے۔ دیوتا یا تم لوگ۔ لے جاؤ انہیں۔“

ایک خوفناک نعرے کے ساتھ سپاہی ہم پر ٹوٹ پڑے۔ فوٹا بہر حال اپنا بھالا بلند کر کے ایک سپاہی پر وار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ میں نے اس سپاہی کو لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ کر گرتے دیکھا اور پھر اس نے حرکت نہ کی۔ لیکن ہم لوگوں کیلئے انگوٹی سپاہی بڑے تیز ثابت ہوئے نصف منٹ سے بھی کم وقت میں وہ لوگ ہمیں پکڑ چکے تھے۔ بھالے ہمارے ہاتھوں سے کھینچے جا چکے تھے اور ہمیں اور ہمارے ساتھ ڈوینو کو بھی دھکیل کر ڈونگے میں پھینک دیا گیا تھا۔ ہم چھ اور ایک ڈوینو۔ چنانچہ کل سات اور ہمارے ساتھ چند ہی سپاہی جن میں گرلیں بھی تھا۔ کوڈر ڈونگے میں سوار ہو گئے۔ ڈونگے کو

دھکیل کر اس پلیٹ فارم سے جس پر شانبو بیٹھا ہوا تھا نکال کر کھاڑی یا جمیل کے دہانے کے پرسکون پانی میں لایا گیا۔ یہ کھاڑی یا جمیل کا دہانہ جو کچھ بھی تھا۔ اس چٹانی دیوار کو جس میں شانبو کا غار تھا پہاڑ سے الگ کر رہا تھا۔

جب ہمارا ڈونگا غار کے اس دوسری طرف کے دہانے سے باہر نکل رہا تھا تو شانبو اپنی ”منہ“ پر گھوم گیا۔ اب اس کا منہ ہماری طرف تھا اور اس نے چیخ کر ایک حکم صادر کیا۔

”اے ڈوینو!“ اس نے کہا۔ اس کو جو ڈوینو تھا اور تین سفید قاموں کو اور ان کے تین ملازموں کو اس جنگل کی سرحد پر جو دیوتا کا گھر کہلاتا ہے چھوڑ کر تم لوگ واپس آ جاؤ اور بستی کی طرف لوٹ جاؤ۔ کیونکہ یہاں بیٹھ کر تمہاں ان کا انجام دیکھوں گا اور جب معاملہ ختم ہو جائے گا تو میں تمہیں طلب کروں گا۔“

گرلیں نے اپنا سر جھکا دیا۔ پھر اس کا اشارہ پا کر دو سپاہیوں نے چھو اٹھائے اور ڈونگے کو کھینچنے لگے۔ اس جمیل کے متعلق سب سے پہلی بات میں نے یہ دیکھی کہ اس کا پانی روشنائی کے رنگ کا تھا۔ یہ غالباً اس لئے تھا کہ اول تو یہ جمیل بہت زیادہ گہری تھی اور دوم اس لئے کہ اس کے ایک طرف بلند چٹان تھی اور دوسری طرف بلند ہلالا درخت تھے اور ان کا سایہ ان کی پرسکون سطح پر پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے دونوں کناروں پر بے شمار مگر چھ تختوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ آگے بڑھ کر جہاں جمیل ذرا تنگ معلوم ہوتی تھی پانی کی سطح پر دندانے دار ٹہنے ابھرے ہوئے تھے۔ جیسے بڑے بڑے درخت جمیل میں گر پڑے ہوں۔ یا گرا دیئے گئے ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ لوگاٹ نے کہا تھا کہ جب وہ نوجوانی میں یہاں سے فرار ہوا تھا تو ایک ڈونگے میں سوار ہو کر اس نے یہ دہانہ عبور کیا تھا اور میں نے سوچا کہ ان ابھرے ہوئے ٹہنوں کی وجہ سے لوگاٹ اب اس طرح فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اِلا یہ کہ اس نے کھاڑی زبردست سیلاب کے وقت عبور کی ہو۔

چند منٹوں بعد ہی ڈونگا دوسرے کنارے پر جو غار کے دہانے سے صرف دو سو گز دور تھا پہنچ چکا تھا۔ ڈونگے کا اگلا حصہ کنارے کے پتھروں سے ٹکرایا تو ایک زبردست مگر چھ گہری نیند سے بیدار ہوا اور بھاگ کر ایک چمپا کے کی آواز کے ساتھ پانی میں کود پڑا۔

”کنارا آ گیا آقا۔“ گرلیں نے کہا۔ ”اب جاؤ اور دیوتا سے ملاقات کرو جو یقیناً تمہارا منتظر ہے۔ اب چونکہ ہماری ملاقات نہ ہوگی اس لئے الوداع۔ اگر آئندہ کبھی تم اس دنیا میں آؤ تو میرا یہ مخلصانہ مشورہ یاد رکھنا کہ صرف اپنے دیوتا سے چپکے رہنا اور دوسرے لوگوں کے دیوتاؤں میں دلچسپی نہ لینا۔ ایک بار پھر الوداع۔“

”دیکھو..... الو کی دم۔“ میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ ”اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو بے شک مر جاؤ۔ لیکن ہمیں ایسی جگہ لے جاؤ جہاں ہم تمہارے اس دیوتا سے محفوظ رہیں۔“

”ہنس راج! کوئی بھی اس دیوتا سے محفوظ نہیں ہے۔ خصوصاً اس کے اپنے گھر میں۔“ اس نے اپنا سر ہلایا۔ ”ہم کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جب کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے اور درخت بھی اتنے بلند ہیں کہ ان پر چڑھنا ممکن نہیں۔“

”میں نے درختوں کی طرف دیکھا۔ ڈوینو نے غلط نہیں کہا تھا۔ درختوں کے تنے بہت موٹے تھے اور ان پر پچاس ساٹھ فٹ تک ایک ٹہنی بھی نہ تھی۔ اس کے علاوہ ممکن تھا کہ ان درختوں پر دیوتا ہماری بہ نسبت آسانی سے چڑھ جاتا ہو۔ ڈوینو جنگل کی طرف چلا گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”قبرستان میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہڈیوں کے ساتھ وہاں بھالے بھی ہیں۔“ ڈوینو کے الفاظ سن کر میں چونک پڑا۔ اندھیرے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ہمارے پاس چاقوؤں کے علاوہ کوئی ہتھیار باقی نہ رہا۔ ایسے وقت میں بھالے بھی بڑا سہارا ثابت ہو سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ بھالوں کی موجودگی کی خبر سن کر میرے مردہ جسم میں قوت عود کر آئی، میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

تین چار سو قدم کے بعد ہم ایک میدان میں تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدیوں پہلے یہاں کے درخت گر گئے ہوں گے اور کسی وجہ سے پھر نہ اگ سکے ہوں گے۔ اس میدان میں نہ ٹوٹنے اور نہ سڑنے والی لکڑی کے بہت سے بنے ہوئے بکس یا تابوت رکھے ہوئے تھے اور ہر تابوت پر ایک ٹوٹی ہوئی یا مٹی بنی ہوئی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔

”دیکھو..... یہ ڈوینو تھے! اس ڈوینو نے کہا۔ جو ہمارے ساتھ تھا اور دیکھو گریس نے میرا تابوت تیار کر رکھا ہے اور اس نے تابوت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔

”بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا اس نے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے ہمیں وہ بھالے دکھاؤ جن کا ذکر تم نے کیا تھا۔

وہ ایک نسبتاً نئے نظر آتے ہوئے تابوت کے قریب پہنچا اور کہا کہ اس کا ڈھکن ہم اٹھائیں کیونکہ وہ خود ایسا کرتے ڈر رہا تھا۔

میں نے ڈھکن اٹھا کر ایک طرف دھکیل دیا۔

تابوت میں انسانی ہڈیاں کسی چیز میں لپٹی الگ الگ رکھی ہوئی تھیں۔ کھوپڑی ان ہڈیوں میں نہ تھی۔ کیونکہ وہ تابوت کے ڈھکن پر رکھی جاتی تھیں۔ ہڈیوں کے ساتھ مٹی کے چند برتن بھی تھے۔ جن



انگو لی لوگوں کے بھالوں کی نوکیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہمیں اپنی خیریت اس میں نظر آئی کہ ہم ڈونگے میں سے اتر آئیں اور یہی ہم نے کیا۔ سب سے پہلے جنگل نے اور سب کے آخر میں ڈوینو نے پکینی کچڑ میں قدم رکھا۔ جنگل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی یہ مسکراہٹ مجھے احمقانہ معلوم ہوئی۔ کیونکہ آپ جلدیے ہم اپنی موت کے منہ کی طرف جا رہے تھے۔ چنانچہ یہ مسکرانے کا موقع نہیں تھا اس کے برخلاف ڈوینو اتنا سہا ہوا تھا کہ وہ ڈونگے سے اترنے کیلئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس کے جاشین گریس نے اسے جبراً نیچے دھکیل دیا۔ بہر حال جب وہ کنارے کی کچڑ میں سے گزر کر کنارے پر پہنچا تو اس کی جرأت ایک حد تک عود کر آئی اور اس نے ڈونگے کی طرف گھوم کر گریس سے کہا۔

”ڈوینو! یاد رکھو کہ آج جو میرے ساتھ ہوا ہے آئندہ وہی تمہارے ساتھ ہوگا دیوتا اپنے کانہوں سے جلد ہی اکتا جاتا ہے۔ اسی سال! آئندہ سال! یا چند برسوں بعد وہ تم سے بھی اکتا جائے گا۔“

جب سپاہی ڈونگا واپس لے جا رہے تھے تو گریس نے کہا۔

”جب تمہارا دیوتا تمہاری ہڈیاں توڑ رہا ہے تو اس سے درخواست کرنا کہ آئندہ برس تک وہ مجھ سے اکتا جائے۔“ اور ہم خاموش اور بے بس کھڑے ڈونگے کو جاتے دیکھتے رہے۔

”آمین۔ شکر ہے ہم کسی مشکل کے بغیر یہاں پہنچ گئے۔“ لیوٹن نے کہا۔

”چنانچہ میں تو خدا کا احسان ہی کہوں گا۔ چنانچہ ہپ ہپ تیرا۔“

اور پھر اس نے اپنی ٹوپی اچھال دی۔ اس نے تالیاں بجانیں اور وہ اسی غلیظ اور پکٹی کچڑ میں ناچنے لگا۔ میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن میری اس نظر کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

”دیوانہ۔“ میں بڑبڑایا۔ اور پھر ڈوینو سے پوچھا۔

”دیوتا کہاں ہے؟“

”ہر جگہ۔“ اس نے اپنا کانپا ہوا ہاتھ گھنے اور حد نظر تک پھیلے ہوئے جنگل کی طرف ہلا کر جواب دیا۔ شاید اس درخت کے پیچھے یا یہاں سے بہت دور بہر حال صبح ہونے سے پہلے ہم کو معلوم ہو جائے گا۔“

”اور اب تم کیا کرو گے؟“

”مر جاؤں گا۔“

میں سونے کا برادہ بھرا ہوا تھا اور دودھ بھالے بھی ان کے پھل چونکہ تانبے کے تھے اس لئے انہیں زنگ لگا تھا۔ باری باری سے ہم نے دوسرے تابوت کھولے اور ان میں سے بھالے نکال لئے یہ بھالے مرنے والوں کے ساتھ اس لئے رکھ لئے گئے تھے کہ سایوں کی دنیا کے سفر میں وہ انہیں استعمال کر سکیں۔ اکثر بھالوں کے دستے نمی کی وجہ سے مڑ گئے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے پھل کے اوپر دو اڑھائی فٹ تک دستے پر تانبے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ اب بھی ایک حد تک قابل استعمال تھے۔

”ہاں۔ باس بے حد کمزور۔“ آگرس نے بڑی بٹاشت سے کہا۔ ”لیکن میرے پاس ان سے بہتر ہتھیار ہے۔“ میں نے اور ہم سب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا چکلیوں والے سانپ؟“ فونانے پوچھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا سواہتوں کے نلفے؟ یہ مذاق کا کون سا وقت ہے؟ کیا ایک مسخرہ کافی نہیں ہے؟“ میں نے لیوشن کی طرف دیکھا۔

”مطلب باس! تو کیا تم نہیں جانتے کہ میرے پاس وہ چھوٹی بندوق ہے جس کا نام انومسی ہے۔“ یہ بات میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتائی تھی کہ میرا خیال تھا کہ تم جانتے ہو۔ مگر نہ جانتے تھے تو یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے تم کو نہ بتایا۔ کیونکہ اگر تم جان لیتے تو وہ انگوئی کینہ پرور بھی جان لیتے اور اگر جان لیتے۔“

”پاگل“ جگر نے اپنے ماتھے پر شہادت کی انگلی مارتے ہوئے کہا۔

”غریب پاگل ہو گیا ہے اور صورتحال کے پیش نظر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔“

میں جگر کے اس فیصلے سے متفق تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر غور سے آگرس کو دیکھا وہ

پاگل تو نہیں البتہ کچھ زیادہ ہی عیار نظر آ رہا تھا۔

”آگرس! میں نے کہا۔“ بتاؤ کہاں ہے یہ رائفل ورنہ میں تم کو پچھاڑ دوں گا۔ اور فونانے تمہارے

جسم پر ڈھڑے برسائے گا۔“

”کہاں باس! حیرت ہے کہ رائفل تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے لیکن تم اسے دیکھ نہیں

سکتے۔“

”جگر! تم نے غلط نہیں کہا۔“ آگرس واقعی پاگل ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن لیوشن ایک دم سے آگرس پر ٹوٹ پڑا اور اسے بری طرح سے جھنجھوڑنے لگا۔“

”باس مجھے چھوڑ دو۔“ آگرس نے کہا۔ ”ورنہ رائفل کو نقصان پہنچ جائے گا۔“

لیوشن نے مارے حیرت کے اسے چھوڑ دیا اور پھر آگرس نے اپنے بانس کے سرے پر کچھ کیا اور پھر اسے اوندھا دیا اور ہماری حیرت سے بچتی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ اس میں سے جی ہاں۔ بانس میں سے رائفل کی تالی پھسل آئی جو تیل آلود کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔

خدا کی قسم میں نے آگرس کا منہ چوم لیا ہوتا۔ جی ہاں۔ میری خوشی اتنی بڑی ہوئی تھی کہ میرا جی چاہا کہ آگرس کا گندہ اور بدبودار منہ چوم لوں۔“

لیکن کندا؟“ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”تم جانو آگرس کندے کے بغیر تالی محض بیکار ہے۔“

”ہاں۔ باس“ آگرس مسکرایا۔ ”اتنے عرصے سے تمہارا شکار کرتا رہا ہوں چنانچہ کیا میں اتنی سی بات نہیں سمجھتا کہ بندوق کا کندا ہونا ضروری ہے؟“

اور اب اس نے اپنی پیٹھ پر سے گھڑاتار کر ہمارے سامنے دھر دیا۔ کبل کے اوپر بندھی ہوئی ڈوریاں کھول لیں اور اس کبل میں تمباکو کے چوں کا وہ گولایا گٹھا تھا جو جمیل کے دوسرے کنارے پر میری اور گریس کی دلچسپی کا باعث بنا تھا۔ اس نے تمباکو کے چوں کا یہ گٹھا کھولا تو اس میں سے رائفل کا پورا کندا نکل آیا۔

”آگرس“ میں نے کہا۔ ”تم ہیرا ہوا اور سونے میں تولے کے قابل ہو۔“

”ہاں۔ باس حالانکہ یہ بات تم نے آج پہلی دفعہ کہی ہے۔ ہاں میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب میں موت کے سامنے سونہ جاؤں گا۔ بتاؤ اب تم میں سے کون اس چارپائی پر سوائے گا جو جوی نے میرے لئے بھیجی تھی؟“

اس نے رائفل کو جوڑتے ہوئے کہا۔

”شاید تم بیوقوف ہو فونانے تم کبھی اپنے ساتھ بندوق نہ لاتے اگر تم اتنے بڑے ساحر ہوتے جس کا تم دعویٰ کرتے ہو۔ تو تم نے ہم سے پہلے بندوقیں بھیج دیں کہ جب ہم یہاں آتے تو وہ ہمیں تیار مل جائیں۔ بتاؤ اے موٹی عقل والے شلو بتاؤ کیا اب بھی تم مجھ پر ہنسو گے؟“

”نہیں.....“ فونانے فوراً جواب دیا۔ ”بلکہ اب تمہارے لئے قصیدہ سناؤں گا۔“

”اس کے باوجود“ آگرس نے کہا۔ ”میں مکمل ہیرو نہیں ہوں۔ چنانچہ پورا نہیں بلکہ آدھا سونے میں تولے جانے کے قابل ہوں۔ کیونکہ باس میری جیب میں بہت سی بارود اور گولیاں تو ہیں لیکن ٹوپیاں میری پاکٹ کے سوراخ میں سے نکل کر کہیں گر گئی ہیں۔ تمہیں یاد ہے باس کہ میں نے کہا تھا کہ گڈے کہیں گر گئے ہیں؟ تو ان سے میری مراد ٹوپوں سے ہی تھی۔ بہر حال اب صرف چارہ رہ

گئی ہیں۔ کیونکہ ایک تو نبل پر چڑھی ہوئی ہے۔ لو پاس انٹومی تیار اور بھری ہوئی ہیں اور اب وہ سفید شیطان آئے تو تم اس کی آنکھ میں گولی مار سکتے ہو اور اسے دوسرے ہی شیطانوں کے پاس اس بڑی آگ میں بھیج سکتے ہو جو اوپر کی دنیا میں جل رہی ہے۔“

اور پھر بڑی خود اعتمادی سے اس نے بندوق کا گھوڑا چڑھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اور مسکرا کر میری طرف بڑھا دی۔

شکر اور احسان ہے۔ اس خدا کا۔ جگر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”جس نے اس کرنٹائی کو سکھایا کہ کس طرح ہماری خدمات کی جائے۔“

پاس جگر! خدا نے ایسی کوئی بات مجھے نہیں سکھائی بلکہ خود میں نے اپنے آپ کو سکھایا، لیکن دیکھو اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ کیا مناسب نہ ہوگا کہ ہم آگ جلا لیں؟“ اور رائفل کو بھول کر وہ ایدھن تلاش کرنے لگا۔

”آرگس! لیوشن نے کہا۔“ اگر ہم کبھی اس جہنم سے زندہ نکل آئے تو میں تم کو پانچ سو پونڈ دوں گا یا میرے والد دیں گے۔ جو بہر حال ایک ہی بات ہے۔“

”شکریہ پاس، شکریہ۔“ لیکن اس وقت مجھے براٹری کا ایک قطرہ مل جائے اور یہاں جلائے کی لکڑی تو مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی۔“

آرگس نے یہ غلط نہ کہا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عجیب و غریب قبرستان کے کنارے ہر چند زبردست شے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن وہ اتنے بڑے تھے کہ انہیں جمعیت کر یا کاٹ کر لانا ناممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس منحوس جنگل کی طرح اتنے نم تھے کہ انہیں جلانا ناممکن تھا۔

اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ لیکن یہ اندھیرا مکمل ترین نہ تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر ہی چاند طلوع ہو گیا۔ لیکن پھر یہ بات بھی تھی کہ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ جو چاند کو چھپا لیتے تھے۔ اس کے علاوہ بلند و بالا درخت بچی بچی روشنی کو گویا جذب کر لیتے تھے۔ چنانچہ ہم اس مہیب میدان کے بیچ میں ایک دوسرے سے بھڑک رہے تھے۔ جتنے بھی کبل ہمارے پاس تھے انہیں بچھائے کہ اس جنگل کی نمی سے محفوظ رہ سکیں۔ جونی کو جب ڈونگے میں پھینکا گیا تھا تو اس کی پیٹھ سے ایک تھملا بندھا ہوا تھا۔ اگر تھیلے میں سکھایا ہوا گوشت اور بھنی ہوئی مکئی تھی۔ چنانچہ یہ کھانا ہم نے کھایا۔ یہ تھملا ساتھ لے چلے آ خیال مجھے آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی بہت دور سے ایک خوفناک آواز ابھری۔ گرج کی سی آواز جس کے فوراً بعد ہی ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی دیو اپنے گھونے سے کسی چیز کو پیٹ رہا ہو۔ گرج کی ایسی آواز،

میں سے کسی نے پہلے کبھی نہ سنی تھی، کیونکہ یہ آواز شیر اور کسی درندے کی آواز سے مختلف تھی۔

”کیا تھا وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”دیوتا؟“ ڈوینو نے کہا۔ ”جو چاند کی عبادت کر رہا ہے، کیونکہ چاند طلوع ہوتے ہی دیوتا بھی بیدار ہو جاتا ہے۔“

”میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس وقت میں کچھ سوچ رہا تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک رائفل اور چار شاٹ تھے جو بھینا نا کافی تھے۔ چنانچہ مجھے بڑی احتیاط سے کام لینا تھا اور اپنے حواس بجا رکھنے تھے۔ ایک گولی بھی بیکار نہ جائے۔ آرگس اُلوکا پٹھا ہے۔ میں دل میں بولا۔ اس نے وہ نئی جیکٹ کیوں نہیں پہن لی جو میں نے اسے دی تھی۔ اس کے بعد وہ خوفناک آواز پھر نہ سنائی دی۔ چنانچہ جگر ڈوینو سے پوچھنے لگا کہ وہ ملکہ جن کہاں رہتی ہے؟“

”آقا۔“ ڈوینو نے مضطرب ہو کر جواب دیا۔ ”وہاں مشرق میں۔“

”آقا! اگر ہم ڈھلان پر چڑھنے لگیں تو اس وقت میں جتنے وقت میں سورج اپنا پاؤ سفر طے کرتا ہے ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ ایک راستہ اوپر جاتا ہے۔ اس راستے کے درختوں پر دندائے بنا دیئے گئے ہیں اور یہی اس راستے کی پہچان ہے۔ دیوتا کے باغ کے عقب میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک جمیل اور ہے جس کے بیچ میں ایک جزیرہ ہے۔ وہاں جمیل کے کناروں پر کی جھاڑیوں میں ایک ڈونگا چھپا کر رکھا گیا ہے اور اس میں سوار ہو کر جزیرے تک پہنچا جاسکتا ہے اور جزیرے پر ملکہ جن رہتی ہے۔“ جگر کو اس جواب پر شاید اطمینان نہ ہوا۔ ”اس نے کہا کہ ڈوینو آئندہ کل ہمیں راستہ بتائے گا۔“

”میرے خیال میں تو یہ راستہ آپ کو بھی نہ بتا سکوں گا۔“ بچے کی طرح کانپتے ہوئے ڈوینو نے کہا۔

عین اسی وقت وہ دیوتا ایک بار پھر گرجا اور اس دفعہ اس کی آواز نسبتاً قریب سے بہت قریب سے آئی تھی اور اب ڈوینو کے اعصاب بالکل ہی جواب دے گئے تھے اور خدا جانے کون سے جذبے کے تحت وہ جگر سے حیات بعد الموت کے متعلق سوالات پوچھنے لگا۔

”چنانچہ جگر ان سوالات کے جواب اور تسلی دے رہا تھا کہ دفعتاً دیوتا کسی قسم کا نقادہ پٹنے لگا۔ بس نقادہ پٹنہ رہا۔ کم سے کم ہمیں تو وہ نقادہ ہے ہی کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ اس بھیا تک جنگل کی خاموشی نے اور اس عالم میں کہ ہمارے چاروں طرف تابوت پر انسانی کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آواز بڑی ہی لرزہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ آواز خاموش ہو گئی۔ جگر ایک بار پھر ڈوینو کو تسلی دینے لگا اور

اس کے کلوے اڑا رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ ڈوینو مر چکا تھا۔ لیکن شاید اس کی ٹانگوں میں اب بھی جان باقی تھی۔ کیونکہ وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور راکفل کی نالی کی زد میں اس کے ماتھے کو لے کر میں نے ہلبی دبا دی۔ اب یا تو ٹوٹی یا پھر بارود ہمارے حالیہ سفر کے دوران نم ہو گئی تھی۔ چنانچہ گولی فوراً ہی نہ چلی بلکہ ایک لمحہ سے بھی کم وقت کیلئے رکی رہی۔ اس لئے انتہائی کم وقت میں بھی اس شیطان نے اس سے بہتر نام میں اسے ہی نہیں سکتا۔ مجھے دیکھ لیا یا شاید وہ شعلہ دیکھا جو نالی پر چمک رہا تھا۔

بہر حال اس نے ڈوینو کو پھینک دیا اور اس طرح جیسے وہ سمجھتا ہو کہ اس شعلے کا کیا مطلب ہے۔ اس نے اپنے دونوں زبردست بازو یوں اٹھائے جیسے بچوں سے اپنا چہرہ ڈھکتا چاہا ہو۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اس کے بازو حیرت انگیز حد تک لمبے اور کسی پہلوان کی رانوں کی طرح موٹے تھے۔

اور پھر راکفل گرجی اور میں نے گولی کے اس زبردست جسم پر گلنے کی آواز سنی اس شیطان کا ایک بازو کھینچے ہوئے ٹہنے کی طرح لٹک گیا۔ اور پھر جنگل اس کی خوفناک اور مسلسل آوازوں سے گونج اٹھا۔ ہر گرج ڈھکی کتنے کی سی۔ یعنی ”واؤ۔ واؤ۔“ کی آواز پر ختم ہوتی تھی۔

”ہاس گولی! اس کے گلے ہے۔“ آگس نے کہا۔ ”اور وہ بھوت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تکلیف سے بے تاب ہے۔ تاہم وہ بڑا جاندار ہے۔“

”ذرا قریب آ جاؤ۔“ میں نے کہا اور اپنے بھالے آگے اٹھا رکھو۔“

یہ احتیاط اس لئے ضروری تھی کہ کہیں وہ شیطان دفعتاً ہم پر حملہ نہ کر دے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی جب کہ ساری رات نہ تو ہمیں کہیں نظر آیا اور نہ ہی ہم نے اس کی آواز کو سنا اور میں تو یہ سمجھنے لگا کہ بدوق کی گولی اس کے کسی نازک حصے میں پھنسی ہو گئی ہے اور وہ بڑا بندر مر گیا ہے۔

ایسی خوفناک اور آزمائشی رات کا تجربہ ہم میں سے کسی کو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ آخر کار صبح طلوع ہوئی۔ ہم لوگوں کے چہرے سفید تھے اور ہم دھند میں بیٹھے سردی سے کانپ رہے تھے۔ لیوشن اس سے مبرا تھا۔ کیونکہ وہ فونا کے نشانے پر سر رکھے بڑے آرام اور اطمینان سے سو رہا تھا۔ یہ بے فکرانہ نوجوان ایسا سلیم الطبع تھا اور اس کے اعصاب ایسے تھے کہ جب قیامت کے دن اسرافیل صور پھونکیں گے تو لیوشن میرے خیال میں پوری دنیا کے آخر میں بیدار ہوگا۔ جب ہم نے اسے بیدار کیا اور جب وہ دوچار انگڑائیاں اور جمائیاں لے چکا تو میں نے یہی بات اس سے کی۔

پھر ایک کالے بادل نے آگے بڑھ کر چاند کو اپنا آغوش میں لے لیا۔ مہیب جنگل میں مہیب تاریکی چھا گئی۔ خوفناک سائے کا احساس ہوا۔ میں اسے کوئی اور نام نہیں دے سکتا۔ یہ سایہ اندھیرے سے زیادہ کالا تھا۔ جو میدان کے ایک سرے سے حیرت انگیز تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔

دوسرے لمحے اس جگہ سے جہاں میں بیٹھا ہوا تھا چند فٹ دور سے کچھ سرسراہٹ کی سی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد ہی ایک گھٹی ہوئی چیخ اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ سایہ اسی طرف جا رہا تھا جس طرف سے آیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”دیا سلائی جلاؤ۔“ جنگل نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں کچھ ہوا ہے۔“

”میں نے جلدی سے دیا سلائی کی تیلی سلگائی۔ ہوا چونکہ بند تھی اس لئے اس کا شعلہ الف کی طرح کھڑا رہا۔ اس کی روشنی میں پہلے مجھے اپنے ساتھیوں کے حیرت زدہ چہرے نظر آئے اور پھر ڈوینو جو کھڑا ہوا تھا اور اپنا دایاں بازو جس سے خون لپک رہا تھا اور جس کا ہاتھ غائب تھا۔

”دیوتا آیا تھا۔ اور میرا ہاتھ لے گیا ہے۔“ ڈوینو نے کراہ کر رونی آواز میں کہا۔ کسی نے کچھ بھی نہ کہا۔ سب پر ایک سناٹا طاری تھا۔ لیکن ہم نے تیلیوں کی روشنی میں ڈوینو کے بازو پر پٹیاں کسنے کی کوشش ضرور کی۔

اندھیرا اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا اور اس مہیب جنگل کی مکمل ترین خاموشی میں ہمارے نفس کو آواز گونجتی رہی۔ کبھی کبھی کسی پھر کی جھنجھٹا بھی خاموشی کو لرزادیتی تھی۔ کبھی کوئی مگر مجھ جھیل مٹر پھاند پڑتا تو اس کے جھپکے کی آواز فضا میں لہریں پیدا کر دیتی اور ڈوینو ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ایک بار پھر میں نے اسی خوفناک سائے کو اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ میرے بائیں طرف سے ایک پھر سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ آگس میرے اور ڈوینو کے درمیان بیٹھا ہوا تھا اور اس کے بعد ایک طویل آہ.....“

”وہ جو بادشاہ تھا چلا گیا۔“ آگس نے سرگوشی کی۔ میں نے اسے جاتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے ہوا اسے اڑا کر لے گئی ہو۔ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا وہاں اب کچھ نہیں ہے۔“

یہ ایک چاند بادلوں میں سے نکل آیا اور اس کی عریضانہ روشنی میں میں نے دیکھا میرا خدا۔ میدان کے سرے پر اور کوئی تیس گز دور۔ شیطان جیسے کسی بھگی ہوئی روح کو تلف کر رہا تھا۔ شیطان جی ہاں۔ وہ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا اس زبردست بھورے اور کانے رنگ کی مخلوق نے دبلے پتلے ڈوینو کو دیوچ رکھا تھا۔ یہ دوزخی عفریت ڈوینو کا سر لٹک گیا تھا اور اب اپنے بڑے بڑے کالے ہاتھوں سے

میرے پاس تھی۔ اس لئے میں آگے چل رہا تھا۔ ہم نے کوئی آدمی میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک بار پھر وہی فقارے کی سی آواز سنائی دی۔ میرے خیال میں دیوتا اپنا سینہ کوٹ رہا تھا اور اس سے یہ آواز پیدا ہوا کرتی تھی۔ البتہ اس دفعہ کی آواز اس آواز سے جو گزشتہ رات ہم نے سنی تھی قدرے مختلف تھی۔ یعنی اس آواز کی طرح مسلسل اور ایک لے میں نہ تھی۔

”ہاں۔“ آگس نے کہا۔ ”وہ شیطان اب صرف ایک چوب سے ڈھول پیٹ رہا ہے۔ کیونکہ دوسری چوب باس کی گولی نے توڑ دی ہے۔“

ہم لوگ کچھ آگے بڑھے تھے کہ دیوتا گر جا ہمارے بہت قریب اور اتنے زور سے کہ پوری فضا قرا گئی۔

”چوب چاہے بیکار ہوگئی ہو۔ آگس۔ لیکن خود ڈھول کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ میں نے کہا۔ سو گز اور آگے بڑھے اور آفت آگئی۔

ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک درخت گر گیا تھا۔ چنانچہ جگہ پا کر روشنی جنگل میں اتر آئی تھی۔ درخت معلوم ہوتا تھا کئی برس پہلے گرا تھا۔ کیونکہ اس کے تنے پر کائی کی موٹی تہہ تھی۔ درخت کے اس طرف یعنی ہماری طرف کوئی چالیس فٹ تک کھلی جگہ تھی اور دن کی روشنی ایک موٹی لکیر کی طرح سیدھی اس جگہ میں اتر آئی تھی۔ میں نے اس گرے ہوئے درخت کی طرف غور سے دیکھا تو اس کے پیچھے سائے میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں اور پھر غور سے دیکھا تو پھر اس عفریت کا سر بھی نظر آ گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ سر کیسا تھا۔

صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ وہ کسی بہت بڑے عفریت کے سر کی طرح تھا اور چہرہ انگارہ سی آنکھوں سے جھلکی ہوئی بھنویں۔ اور منہ کے دونوں طرف باہر کو نکلے ہوئے دو پیلے اور نکیلے دانت۔

اس سے پہلے کہ میں بددوق اٹھاتا ایک دل دہلانے والی چیخ کے ساتھ وہ عفریت ہمارے سروں پر تھا۔ میں نے اس کے دیو جیسے قد کو گرے ہوئے درخت کے تنے پر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ چشم و زون میں وہ حیرت انگیز تیزی سے انسان کی طرح دو ناگوں پر بھاگتا ہوا میرے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کا وہ بازو جو میری طرف تھا۔ بے جانی سے جھول رہا تھا۔ ابھی میں گھوما ہی تھا کہ ایک خوفناک چیخ سے جنگل گونج اٹھا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ عفریت ہمارے ہولوں جونی کو پکڑ چکا تھا اور اپنے سینے سے بھینچنے لئے جا رہا تھا۔ جونی جیسا طویل القامت اور پورا جوان آدمی اس کی گرفت میں ایک بچہ معلوم ہو رہا تھا۔ فوٹا جنگلی بھینسے کی طرح بہادر تھا۔ چنانچہ اس نے بلا جھجک وہ بھالا جو اس کے ہاتھ میں تھا عفریت کے پہلو میں اتار دیا اور پھر ہم

بہن راج تمہیں نتیجہ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے وہ بولا۔ ”یعنی یہ دیکھو کہ میں تازہ دم ہوں اور تم سب ایسے ہو رہے ہو جیسے کسی رقص کی محفل میں رات بھر ناچ کر آئے ہو۔ وہ ڈوینو کو تلاش کیا اب تک یا نہیں؟“

تھوڑی دیر بعد دھند چھٹی تو ہم ایک قطار میں ڈوینو کو تلاش کرنے چلے اور مناسب ہوگا کہ میں یہ بیان نہ کروں کہ ہمیں اس کی لاش کس حال میں ملی۔ ڈوینو ظالم اور بے درد تھا۔ جیسا کہ اس غریب چرواہے کے واقعہ سے پتہ چلتا تھا ہم اس کی لاش دیکھ کر میرا دل پکھل گیا۔ بہر حال اس دنیا میں تو ڈوینو کے خوف اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔



ڈوینو کے کھڑے اس تابوت میں رکھ دیئے گئے جو گریس کی مہربانی سے ہمیں قبرستان میں ہی مل گیا تھا۔ جھگر آخری دعا پڑھ چکا تھا تو کافی بحث و مباحثہ کے بعد ہم لوگ اس راستے کی تلاش میں جو مقدس پھول کے گھر تک جاتا تھا لیکن حال یہ تھا کہ ہم میں سے کسی کا دل ٹھکانے پر نہیں تھا۔ ابتدائی سفر آسان رہا۔ کیونکہ ایک راستہ جو بہر حال نظر آتا تھا۔ قبرستان کے کنارے سے شروع ہو کر ڈھلان چڑھ گیا تھا۔ لیکن ایسے گھنے جنگل میں بیلین بہت کم تھیں۔ لیکن بلند دھالا درختوں کی چھٹی چوٹیاں اور آپس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ آسمان نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ اکثر جگہ رات کا سا اندھیرا تھا۔

یہ سفر عمر بھر یاد رہے گا۔ اگر اس وقت کوئی ہمیں دیکھتا تو دیوانہ سمجھ لیتا کیونکہ ہم دیوانوں کی طرح دوڑ دوڑ کر ایک ایک درخت کے قریب پہنچ رہے تھے ورنہ دندانون کو تلاش کر رہے تھے جن کا ذکر مرحوم ڈوینو نے کیا تھا کہ یہ دندانے اس راستہ کا پتہ دیتے تھے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ اس کے علاوہ ہم باتیں بھی سرگوشیوں میں کر رہے تھے۔ کیونکہ خوف تھا مبادا ہماری آواز اس خوفناک دیوتا کو ہماری طرف متوجہ کر دے۔ ایک دو میل کے سفر کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ ہماری احتیاط کے باوجود دیوتا ہماری طرف متوجہ تھا۔ کیونکہ ہمیں کبھی کبھار درختوں کے موٹے موٹے تنوں کے درمیان ایک زبردست سائے کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ جو ٹھیک ہمارے متوازی چل رہا تھا۔ آگس نے اصرار کیا۔ ”میں اس پر گولی چلا دوں۔“ لیکن میں تیار نہ ہوا کیونکہ نشانہ خطا ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے اور میرے پاس صرف تین شاٹ یا تین گولیاں تھیں۔ چنانچہ احتیاط لازمی تھی۔

ایک جگہ رک کر ہم نے مشورہ کیا۔ طے پایا کہ یہاں رک کر دیوتا کا انتظار کرنا حماقت تھی۔ چنانچہ آگے ہی بڑھے رہنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ہم حتی الامکان شانہ بشانہ آگے بڑھتے بددوق چونکہ

سب نے اس دیوتا پر حملہ کر دیا۔

جنگر، لیوشن، آگرس، فونا۔ سب کے سب اپنے اپنے بھالے سے اس دیوتا کو گریلے پر حملے کر رہے تھے اور اس چھوٹے سے میدان میں یہ عجیب جنگ ہو رہی تھی۔ حالانکہ بھالوں کے وار گریلے کیلئے ایسے ہی تھے جیسے کہ ہم میں سے کسی کو سوئی کی نوک چبھ جائے۔ گوریلا جونی کو چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھا اور چونکہ اس کا صرف ایک ہی بازو سالم تھا اور اس سے وہ جونی کو دیوچے ہوئے تھا۔ اس لئے وہ حملہ آوروں پر صرف غرا ہی سکتا تھا۔ بے شک وہ اپنی ٹانگ اٹھا کر کسی ایک کو رگید سکتا تھا۔ لیکن اس طرح وہ صرف ایک ٹانگ پر اپنا بھاری جسم سنبھال نہ سکتا تھا اور یقیناً لڑھک جاتا۔

آخر کار گوریلے نے جونی کو گھما کر جنگر اور آگرس پر پھینک دیا۔ وہ دونوں جونی کا بوجھ نہ سہار سکے اور دھڑام سے گرے اب عفریت فونا کی طرف لپکا۔ فونا نے اس بلا کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے بھالے کا پچھلا حصہ یعنی پیتل کے خول کا سرا خود اپنے سینے پر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گوریلے نے جب فونا کو دیوچ کر اپنے سینے سے بھینچنا چاہا تو بھالے کا پھل خود اس کے سینے پر اتر گیا۔ درد محسوس کر کے اس نے فونا کو چھوڑ دیا اور اس نے اپنے الٹے ہاتھ کے ایک ہی تھپڑ سے لیوشن کو کئی فٹ دور تک پھینک دیا اور پھر اس نے ایک ہی ضرب میں فونا کا کچھور بنا دینے کیلئے اپنا زبردست ہاتھ اٹھایا اور یہی وہ موقع تھا جس کا میں منتظر تھا۔ اب تک میں نے اس خوف سے گولی نہ چلائی تھی کہ کہیں اپنے ہی کسی ساتھی کو زخمی نہ کر دوں اور اب تھوڑی دیر کیلئے میرے ساتھی اس دیو سے دور تھے۔ میں نے جلدی سے بندوق اٹھائی اور اس کے سر کو زد میں لے کر بلبلی دھاوی۔

نالی سے لکھتا ہوا دھواں ہوا میں تحلیل ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ گوریلا یوں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ جیسے بت بن گیا ہو۔ دفعتاً اس نے اپنا سالم ہاتھ بلند کیا۔ اپنی جلتی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا دیں۔ ایک خوفناک آواز حلق سے نکالی اور ڈھیر ہو گیا۔

بندوق کی گولی کان کے عین پیچھے سے داخل ہو کر اس کے پیچھے میں داخل ہو گئی تھی۔ جنگل کی مکمل خاموشی جیسے ہم پر در آئی تھی۔ کیونکہ بہت دیر تک ہم میں سے تو کسی نے جنبش کی اور نہ ہی کچھ کیا۔ نیچے کائی میں سے مجھے ایک باریک مری ہوئی آواز سنائی دی۔

بے حد شاندار نشانہ۔ اس آواز نے کہا۔ ”قابل تعریف لیکن اگر باس دیوتا کو مجھ غریب پر سے اٹھالیں تو میں ان کا شکریہ ادا کروں گا۔“

’شکریہ ادا کروں گا۔ یہ الفاظ بتدریج مدھم ہوتے ہوئے ڈوب گئے اور اس میں تعجب کی بات نہ تھی۔ کیونکہ آگرس بچارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ مردہ گوریلے کے نیچے دبا پڑا تھا۔ البتہ صرف اس کی

ٹانگ مردہ عفریت کے بدن اور بازو کے بیچ میں سے نظر آ رہی تھی۔ اگر زمین پر کائی کی نرم اور موٹی تہ نہ ہوتی تو میں سمجھتا ہوں آگرس چپاتی بن گیا ہوتا۔ بڑی کوششوں اور دقتوں کے بعد ہم گوریلے کو آگرس پر سے لڑھکانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے حلق میں دھسکی کے قطرے پٹکائے تو اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ چند سیکنڈ بعد ہی آگرس اٹھا اور ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح لمبے لمبے سانس لے کر مزید دھسکی طلب کرنے لگا۔

جنگر کو یہ ہدایت کر کے وہ آگرس کا معائنہ کرے کہ وہ زخمی تو نہیں میں جونی کی خبر معلوم کرنے چلا، پہلی ہی نظر کافی تھی۔ جونی مر چکا تھا۔ گوریلے نے اسے یوں چر مر کر دیا تھا جس طرح اڑو دھا مینڈے کے گرد کنڈلی مار کر اس کی ہڈیوں کا چورا کر دیتا ہے۔ جنگر نے مجھے بعد میں بتایا کہ گوریلے کی زبردست گرفت میں جونی کے دونوں بازو تقریباً ساری پسلیاں اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ کیا بات ہوئی کہ گوریلا ہم سب کو چھوئے بغیر قطار کے آخری میں پہنچا اور اپنے غصہ کا ہدف جونی کو بنایا؟ اس کا جواب میں صرف یہ ہی دے سکتا ہوں کہ چونکہ جونی گزشتہ رات ڈوبنے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے جونی کو اس کی بو سے پہچان لیا۔ لیکن پھر ڈوبنے کے دوسری طرف آگرس بھی تو بیٹھا ہوا تھا؟“

اس سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ آگرس کے جسم کی بو وہ نہ تھی جس سے وہ نفرت کرتا تھا اور اس بو والے کو مار ڈالنا اس عفریت نے سیکھا تھا یا پھر یہ بات ہو کہ جونی کے بعد وہ آگرس کو ختم کرنا چاہتا ہو۔

جونی کی اب ہم ظاہر ہے کوئی مدد نہ کر سکتے۔ چنانچہ اب ہم آپس میں ایک دوسرے کا معائنہ کرنے لگے۔ کسی کو کوئی گہرا زخم نہیں آیا تھا۔ البتہ چند خراشیں سب کے جسم پر آئی تھیں اور لیوشن کا نصف سے زیادہ لباس غائب تھا اور ہم نے انگوٹھی لوگوں کے دیوتا کا معائنہ کیا۔ حقیقت میں وہ بڑا ہی خوفناک گوریلا تھا۔ اس کا وزن اور قد معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں تھا۔

چنانچہ اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ایسا پہاڑ کا پہاڑ گوریلا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بے ہوش آگرس پر سے اور بعد میں اس کی کھال اتارنے کیلئے ادھر سے ادھر لڑھکانے کیلئے ہم پانچ آدمیوں کو اپنے جسم کی پوری قوت صرف کرنا پڑی تھی۔ اس کا قدم میرے اندازے کے مطابق سات فٹ رہا ہوگا۔ اور یہ گوریلا بوڑھا بھی تھا۔

چنانچہ اس کا اتنا بوجھل اور وزنی ہونا واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ اس کے بہت بوڑھے ہونے کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اس کے دانت کثرت استعمال سے نصف سے زیادہ ٹھس گئے

تھے۔ آنکھیں حلقوں میں بہت دور تک دھنسی ہوئی تھیں۔ سر کے بال عموماً سرخ یا بھورے ہوتے ہیں۔ بالکل سفید تھے۔ حتیٰ کہ اس کا رنگا سیدہ بھی جسے سیاہ ہونا چاہئے بھورا تھا۔ اس کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا تو نامکن ہے۔ تاہم کوئی بھی اسے دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ اس کی عمر دوسو بیس یا اس سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ جیسا کہ شانہ نے کہا تھا۔

لیوشن نے کہا کہ اس کی کھال اتاری جائے۔ حالانکہ اس کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ کہ ہم اس کی کھال اپنے ساتھ نہ لے جا سکیں گے۔ تاہم میں نے سوچا کہ کیا پتہ ہے اس عجوبے کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں اور اسی امید کے سہارے میں اس کام میں اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ حالانکہ جنگر ”فضول کی زحمت“ اور وقت ضائع کرنے کے متعلق مسلسل بوڑھاتا رہا لیکن ہم اپنے کام میں لگے رہے اور ایک گھنٹے کی ان تھک کوشش کے بعد اس کی وزنی کھال الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اتنی موٹی تھی کہ بھالوں کے پھل اسے چر کر گوشت تک نہ پہنچ پائے تھے۔ وہ گولی جو میں نے گزشتہ رات چلائی تھی بازو کی اوپری ہڈی میں پیوست تھی۔ حالانکہ وہ ہڈی توڑ نہ سکتی تھی۔ تاہم بازو کو بیکار کر گئی تھی۔ اور یہ ہی اچھا تھا۔ کیونکہ اگر یہ عفریت اپنے دونوں بازو استعمال کر سکتا تو اپنے حیلے میں جونی کے علاوہ ہم میں سے کسی اور کا بھی طلوہ بنا دیتا۔

ہاتھوں کے علاوہ اس کے پورے جسم کی کھال اتاری جا چکی تو ہم نے اسے اس جگہ جہاں درخت کے گرنے کی وجہ سے دھوپ اتر آئی تھی۔ بچھا کر اس کے کناروں پر کھونٹے ٹھوک دیئے تاکہ وہ خشک ہو جائے۔

اس طرف سے فرصت پا کر جونی کو گرے ہوئے درخت کے کھوکھلے تنے میں دفن کر دیا گیا۔ پھر ہم نے نم کائی سے منہ ہاتھ دھوئے اور جو کچھ ذخیرہ بچ رہا تھا اس میں سے کھانا کھایا اور جب ہم آگے روانہ ہوئے تو نسبتاً بٹاش تھے۔ بے شک جون مر گیا تھا لیکن ساتھ وہ خوفناک دیوتا بھی مارا گیا تھا۔

چنانچہ اب ہم محفوظ اور مطمئن تھے۔ اس گرے ہوئے درخت سے تھوڑی دور پر ہم پھر ایک میدان میں نکل آئے۔ یہ وہی میدان تھا جو دیوتا کا باغ کہلاتا تھا اور جہاں ڈوینو سال میں دو دفعہ مقدس بیج بکیر نے آیا کرتا تھا۔ پہاڑ کی گویا زینہ دار ڈھلوان پر پھیلا ہوا یہ خاص وسیع و عریض باغ تھا اور جہاں غلہ اگ رہا تھا اور یہ ہی غلہ دیوتا کی غذا تھی۔ کیونکہ اکثر علامتوں سے پتہ چلتا تھا کہ دیوتا جب بھی بھوکا ہوتا ہوگا یہاں آ کر ہاتھ مار لیتا ہوگا۔

باغ عمدہ تھا اور اس میں کسی بھی جگہ گھاس نہ اگ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ دیوتا کے باغ کی

دیکھ بھال کون کرتا ہوگا؟ اور مجھے یاد آیا کہ ڈوینو نے بتایا تھا کہ دیوتا کے باغ کی دیکھ بھال دو عورتیں کرتی ہیں جو ملکہ چمن کی خدمت پر مامور ہیں اور جو عموماً گوری یا پھر گونگی ہوتی ہیں۔

دیوتا کا باغ عبور کر کے ہم تیزی سے پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ راستہ نسبتاً ہموار اور سیدھا تھا اور ہم نے دیکھا کہ ہم آتش فشاں کے دہانے کے قریب پہنچ رہے تھے۔ ہمارا اشتیاق اس انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ ہم کسی سے اور کچھ کہے بغیر دیوانہ وار اوپر چڑھ رہے تھے اور جنگر کا تو یہ حال تھا کہ اپنی لنگڑی ٹانگ کے باوجود ہم سے کئی قدم آگے تھا۔

چنانچہ منزل پر سب سے پہلے وہی اور اس کے بعد لیوشن پہنچا اور میں نے دیکھا کہ جنگر یوں بیٹھ گیا جیسے اس پر غشی طاری ہو گئی ہو اور لیوشن بھی حیرت زدہ تھا۔

میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور دیکھا کہ دوسری طرف ایک عمودی ڈھلوان تھی۔ جس پر ایک درخت بھی نہ اگ رہا تھا جو ایک خوبصورت جمیل کے کنارے جا کر ختم ہو گئی تھی۔ جمیل کوئی دوسوا ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس جمیل کے جو بعد میں معلوم ہوا کہ ایک جزیرہ تھا جس کا رقبہ بیس پچیس ایکڑ سے زیادہ نہ تھا۔ جزیرہ زرخیز تھا کیونکہ اس پر کمیت کھجور کے اور دوسرے پھلدار درخت نظر آ رہے تھے۔

جزیرے کے عین بیچ میں ایک صاف سترا مکان تھا۔ جس کی چھت حالانکہ گھاس پھوس کی تھی۔ لیکن خود عمارت مہذب دنیا کی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ افریقی جمونپڑیوں کی طرح گول نہیں بلکہ مستطیل تھی۔

اس مکان سے کچھ دور چند جمونپڑیاں تھیں اور اس کے سامنے ایک مختصر سا احاطہ تھا۔ جس کے چاروں طرف دیوار تھی اور اس میں بانس گاڑ کر چٹائی کی چھت ڈالی گئی تھی۔ جیسے یہ انتظام کسی چیز کو دھوپ اور ہوا سے بچانے کیلئے کیا گیا ہو۔

”میں شرط بدلنے کیلئے تیار ہوں کہ وہی مقدس پھول کا گمر ہے۔“ لیوشن نے کہا۔ ”وہ دیکھو..... سورج کے رخ چٹائی ذرا اوپر اٹھا دی گئی ہے اور وہ کھجور کے درخت اس کے چاروں طرف اس لئے اگائے گئے ہیں کہ پھول سامنے میں رہے۔“ ملکہ چمن وہاں رہتی ہے۔“

جنگر نے مکان کی طرف انگلی اٹھا کر سرگوشی سے کہا۔ ”کون ہے وہ؟“ ”خدا یا کون ہے وہ؟ کہیں میرا اندازہ غلط نہ ہو۔“ ”خدا یا اگر ایسا ہوا تو پھر میں برداشت نہ کر سکوں گا۔“

یوں اندازہ لگانے سے کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ آؤ چل کر معلوم کریں۔“ میں نے کہا اور ہم تقریباً بھاگتے ہوئے ڈھلوان اترنے لگے۔



اس احاطے سے پانچ قدم دور نسلوں کی بلند باڑھی جو مکان کے چاروں طرف بنی ہوئی تھی۔ اس باڑ میں نسلوں کا ہی دروازہ تھا۔ جو کھلا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں چلا۔ کیونکہ دوسری طرف سے کچھ آوازیں آرہی تھیں۔

ادھر کھلے دروازے کے قریب پہنچا اور جھانک کر اندر دیکھا چار پانچ فٹ دور سامنے ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

دروازے کے دوسری طرف دو ترک چھلانگیں بھیجی ہوئی تھیں اور عورتیں آنے سامنے بیٹھی ایک دوسرے کو خوشخوار لگا ہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھا اور دوسرے لمحے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے زمین الٹ پلٹ ہوتی نظر آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں سوتے سوتے جاگے اٹھا ہوں۔ جو کچھ میں کرتا رہا تھا جو کردار میرے گرد بکھرے ہوئے تھے وہ سب قصہ کہانی محسوس ہونے لگے۔ میں سکندر شاہ تھا جسے زبردستی راج ہنس بنا دیا گیا تھا اور مجھے میرے دین میرے نصیب سے ہٹانے والی مجھے دردر بھٹکانے والی ہی دونوں عورتیں تھیں۔ یعنی..... روپ بھائی اور کالی دیوی۔ قدرت جب بھی اپنا کھیل بدلنا چاہے اسی طرح بدل دیتی ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ اتنی آسانی سے بدل لیتی ہے کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ میں نجانے کب سے اپنے آپ میں بھٹک رہا تھا اور اپنی صحیح منزل نہیں پا رہا تھا جبکہ میری دلی آرزو تھی کہ میں ان مشکلات سے نکل کر زندگی کے صحیح راستے پر چل پڑوں۔

اکثر رات کی تنہائیوں میں میری سوچوں میں میرا پرانا ماحول آ جاتا تھا۔ گویا۔ میں اپنے آپ کو بھولانہیں تھا۔ اس طویل عرصے میں بے شمار کردار ملے تھے۔ بڑے بڑے انوکھے اور بڑے بڑے اجنبی لیکن اس وقت ان دونوں عورتوں کو دیکھ کر جو میری آنکھوں میں مٹے مٹے اور دھندلے نقوش جاگ رہے تھے ان میں سے ایک روپ بھائی کا تھا اور دوسرا ہندو دھرم کی سب سے مکروہ شخصیت کالی دیوی کا۔ دونوں عورتوں نے اپنا روپ بدل لیا تھا۔ اب وہ مجھے خوشخوار نظروں سے گھور رہی تھیں اور میرے جسم میں سرد لرہیں دوڑ رہی تھیں پھر وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا ہے ناں..... تو؟ دونوں کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ کہنے لیکن کب تک پکڑا تو جانا تھا ناں تجھے۔ آج تو ایک ایسی جگہ موجود ہے جہاں سے نکلنے کی زندگی بھر کوشش کرے تو نہیں نکل سکتا۔ فیصلہ کرنا ہوگا تجھے۔ آج فیصلہ کرنا ہوگا۔ نجانے کہاں سے میرے اندر ایک قوت سے ابھر آئی۔ میرے دل سے خوف نکل گیا تھا۔ ان دونوں شیطان زاد یوں سے بھاگنا چاہتا تھا میں۔ میرا دل ان میں سے کسی ایک کو بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ان لوگوں نے زبردستی مجھ پر قبضہ جما رکھا

پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے قدموں میں تھے اور حالانکہ تھکے ہوئے تھے اور ہماری سانس پھول رہی تھی۔ اس کے باوجود ہم نسلوں میں ڈونگا تلاش کر رہے تھے۔ جس کا ذکر ڈوینو نے کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آگس نے جو ہمارے بائیں جانب تھا اپنا ہاتھ اٹھا کر سینہ بجائی۔ ہم دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئے۔

”یہ ہے باس!“ اس نے نسلوں کے جمنڈ میں اشارہ کیا۔ ہم نے نسل ہلائے تو ڈونگا نظر آیا جو اتنا بڑا تھا کہ اس میں بیک وقت چودہ آدمی سوار ہو سکتے تھے۔ اس میں چھبھی پڑے ہوئے تھے۔ دو منٹ بعد ہم ڈونگے میں تھے اور اسے جزیرے کی طرف لے جا رہے تھے۔

ہم لوگ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس طرف بانسوں کا پلٹ فارم سا بنا ہوا تھا۔ میں نے ڈونگا ایک بانس سے باندھ دیا۔ کیونکہ دوسروں نے یہ احتیاط ضروری نہ سمجھی تھی۔

چند ثانیوں بعد ہی ہم اس پلڈی پر تھے جو کیمتوں میں سے گزر رہی تھی۔ میں بھری ہوئی رائفل لے آئے آگے آگے چل رہا تھا۔ کیونکہ کیا پتہ کوئی ہم پر حملہ کر دے۔

اول تو جزیرے کی خاموشی اور پھر کسی جگہ کوئی انسان نظر نہ آ رہا تھا۔ چنانچہ ممکن تھا کہ حملہ آور گھاٹ لگائے بیٹھے ہوں۔ کیونکہ یہ تو ممکن ہی تھا کہ کسی نے ہمیں جھیل عبور کرتے نہ دیکھا ہو۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جزیرہ ویران کیوں آ رہا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ دوپہر کا وقت تھا اور اس وقت غلام کھانا کھانے اور آرام کرنے اپنی اپنی جمونپڑیوں میں چلے جاتے تھے۔ دوم یہ کہ نگہبان نے جیسا کہ اس عورت کو کہا جاتا تھا ہمارا ڈونگا دیکھ لیا تھا۔

لیکن وہ یہ سمجھتی تھی کہ ڈوینو ”ملکہ جن“ کے پاس آ رہا ہے۔ اب چونکہ ”ملکہ جن“ اور ڈوینو کی ملاقات ایک مذہبی رسم یقین کی جاتی تھی اور دونوں کا بالکل تنہائی میں ملنا ضروری تھا۔ اس لئے نگہبان وہاں سے ٹل گئی تھی۔ پہلے ہم اس احاطے کے قریب پہنچے جس پر چٹائی کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ لیٹوٹن دوڑ کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا اور دوسری طرف جھانکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا اور دیوار پر بیٹھا ہوا تھا وہ دیوار پر سے اس طرح دم سے نیچے آیا تھا جیسے کسی نے اس کے ماتھے پر بندوق کی گولی پھونک دی ہو۔

”خدا کی قسم۔“ وہ بولا۔ ”اوہ..... خدا کی قسم۔“

اس سے زیادہ اس کی زبان سے اور کوئی الفاظ نہ نکلا حالانکہ میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔

تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبالا اور خو خوار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم دونوں اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے روزِ اول سے تم میں سے کسی کو تسلیم نہیں کیا۔ کالی دیوی تو بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ تو نے مجھے دھوکے سے اپنے جال میں پھانسا تھا اور روپ بگمائی تو میرے ذریعے کالی دیوی کو شکست دے کر اس کی جگہ بلند مقام پانا چاہتی تھی۔ میں وقت کے ہاتھوں بھٹکتا ہوا یہاں تک آ گیا۔ لیکن تم دونوں یقین کرو کہ میرا دل آج بھی تمہیں تسلیم نہیں کرتا۔ میرے کانوں میں آج بھی ”اللہ اکبر“ کی صدا گونجتی ہے۔ وہی میرا ایمان ہے۔ وہی میری منزل۔ مجھے دھوکہ ہوا ہے۔ مجھے دھوکہ ہوا ہے۔ میں اپنی منزل سے بھٹکایا گیا ہوں ورنہ مقدس بزرگو! میرے باپ سمندر شاہ اچھی طرح جانتے ہو تم کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو میرے کان میں اذان دی گئی تھی۔ اذان کی وہ آواز آج بھی میری روح میں محفوظ ہے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں ہے۔ میرے دماغ کے آخری گوشوں میں ہے۔ میں اب بھی پورے غلوں سے اللہ کو پکارتا ہوں۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر!..... اللہ اکبر! اللہ اکبر!“ نجائے کہاں سے میرے اندر شدید جذبات ابھر آئے تھے اور دونوں شیطان زادیاں بری طرح بے چین ہو گئی تھیں۔

”کہاں تھاناں میں نے تجھ سے روپ بگمائی۔ یہ کیونکہ نہ تیرا ہے نہ میرا یہ ہم دونوں کو بیوقوف بناتا رہا ہے۔ یہ مجھ سے بھاگتا رہا ہے اور ادھر ادھر پناہ لیتا رہا ہے۔ اس نے تیرے لئے بھی کبھی غلوں سے کام نہیں کیا۔“

”فنا کروں گے ہم اسے..... ہم اسے اس روئے زمین سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت کر دیں گے۔ مارو اسے مارو.....“ میرے بیرو۔ چھلنی کر دوائے اس کائنات سے مٹا دوا سے۔ اچانک ہی مجھ پر چاروں طرف سے چھوٹے چھوٹے تیر برس پڑے۔ میرے پورے بدن پر یہ تیر بیوست ہوتے جا رہے تھے اور میرا لباس خون آلود ہوتا جا رہا تھا۔

نجائے کیوں اس وقت میرے ان زخموں میں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ میرا دل ایک عجیب سے جذبے سے سرشار ہو رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر ان دونوں کو دیکھا اور پھر..... میرے منہ سے کلمہ طیبہ نکلنے لگا۔ شاید قدرت کو میری استقامت پسند آئی تھی۔ شاید وہ جذبہ جو میرے سینے میں چھپا ہوا تھا قدرت کی پسندیدگی کا باعث بن گیا تھا۔ ورنہ مجھے کیوں نہ معلوم تھا کہ میرے جسم میں دوڑتی ہوئی غلاطت مجھے میرے دین سے دور کر دیا گیا تھا۔ وہ اذان جو میرے کانوں میں اس وقت دی گئی تھی جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی اور کسی بھی چیز کو نہیں سمجھ سکتا تھا، لیکن اس اذان کی آواز میری روح میں رچی بسی تھی اور اب وقت جب میرے جذبے آسمان کو چھونے میں کامیاب ہو گئے

تھے وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ”اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!“ میرے بدن میں ہیوست ہونے والے تیر بدستور میرے جسم کو چھلنی کر رہے تھے اور میرے سارے بدن سے خون کے فوارے بلند ہو رہے تھے۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا اور اس کے بعد میرے ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ نجائے کب تک میں اس عالم میں رہا۔ نجائے کب تک۔

وقت گزرتا رہا۔ پہلے نہیں زندگی کیا چیز ہوتی ہے؟ اور موت کیا چیز ہوتی ہے؟ زندگی سے تھوڑی سی واقفیت تھی۔ موت کو نہیں جانتا تھا۔ لیکن موت اس قدر پرسکون ہوتی ہے۔ اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ یادداشت بھی ساتھ دے رہی تھی اور آنکھوں کی روشنی بھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ روپ بگمائی اور کالی دیوی کے تیروں نے میرے جسم کو چھلنی کر دیا تھا اور میرے بدن کا سارا خون بہتا چلا جا رہا تھا۔

”ہاں۔ وہ فاسد خون جو اس ناپاک ارواح نے تیرے بدن میں داخل کر دیا تھا۔ اس نے تجھے دھوکے سے وہ گندہ خون پلا کر تیرے سارے خون کو غلاطت کے جراثیموں میں ڈبو دیا تھا۔ لیکن اپنی ہی بیوقوفی سے انہوں نے وہ خون تیرے جسم سے خارج کر دیا۔ ان کے بیروں نے جو تیرے جسم میں چلائے تھے انہوں نے تیری رگ رگ سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دیا اور تو اپنے بدن کے سارے غلیظ خون سے پاک ہو گیا۔ تب خدا کی قدرت نے تجھے نئی زندگی سے نوازا اور کیا مشکل ہے اس کیلئے جس نے وعدہ کیا ہے کہ موت کے بعد ایک دن تم میں سے ہر ایک کو زندہ کیا جائے گا اور وہ دن تمہارا یوم حساب ہوگا۔

لیکن ہر کام کا ایک وقت متعین ہے۔ تیری زندگی کا ایک دن بھی مقرر ہے۔ وہ ناپاک روحم تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ ازل سے ابد تک وہ ایک دوسرے کی دشمن رہی ہیں اور رہیں گی۔ وہ اپنی انا کیلئے لڑ رہی ہیں۔ وہ لڑتی رہیں گی۔ لیکن کوئی ایسا وجود جس نے ایک بار بھی غلوں سے کلمہ پڑھا ہو کم از کم ان کا معاون نہیں بن سکتا۔ تو اب ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں نے تیرا علاج کیا ہے اور تو اپنی دنیا سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تو اس وحشت کدے کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے جسے صحرائے اعظم افریقہ کا نام دیا گیا ہے اور وہاں تو ایسے بہت سے ناپاک وجود پرورش پا رہے ہیں۔ جن کے ارادے جن کے مقاصد نجائے کیا کیا ہیں۔ لیکن تیرے خون کو غلاطت والے خون سے پاک کر کے میرے ذمے داری شروع ہوئی اور میں نے یہاں لا کر تیرا علاج کیا۔ اب دنیا تیرے سامنے کشادہ ہے۔ جاو اور اس کائنات میں خدا کے حکم کے مطابق اپنی جگہ اپنا مقام حاصل کر۔ یہ تیرے زادراہ کیلئے ہے۔“ میں نے اس مقدس فرشتے نما بزرگ کو دیکھا۔ جن کا چہرہ انتہائی نورانی تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں

سے جلال پک رہا تھا۔

انہوں نے چڑے کی ایک تھیلی میری طرف بڑھائی اور میرا لرزتا ہاتھ آگے بڑھا۔ جو کچھ میرے کانوں نے سنا تھا۔ وہ میری روح کی سرشاری کیلئے کافی تھا۔ پھر اچانک ہی مقدس بزرگ غائب ہو گئے اور میں اس جگہ سے باہر نکل آیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ میں ایک نئی زندگی کی طرف گامزن تھا۔ پر دوستو! قصور اس وقت بھی میرا نہیں تھا۔ میں فطرتاً شریر تھا اور چونکہ میرے والد صاحب تعویذ گنڈوں کا کاروبار کرتے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے لاتعداد روحوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ بس وہ بھی ایک احساس، ایک عمل تھا۔ جو میرے ذہن میں جڑ پکڑ گیا تھا جبکہ حقیقت شاید کچھ بھی نہیں تھی۔

آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ میری بڑی دلچاہ ہے۔ تین بچے ہیں جن میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ میں ایک چھوٹی سی فرم میں ملازمت کرتا ہوں۔ نہ مجھے دولت کی ہوس ہے نہ میں اپنے قریب و جوار میں جائیدادوں کے اخبار لگانا چاہتا ہوں۔ زندگی بڑی سادہ سی چیز ہے۔ آتی ہے چلی جاتی ہے۔ ہاں اگر روح کی پاکیزگی قائم رہے تو بات ہی کیا ہے۔